

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224036

UNIVERSAL
LIBRARY

۱۸۹۲-۱۹



چتر نمبر

جامعہ

اُردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم اے، پی ایچ ڈی

پروفیسر محمد عاقل ایم اے

فی پرچہ ۸

مطبع جامعہ دہلی

قیمت سالانہ ۵۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

جلد ۲۴ مایچ ۱۹۳۵ء نمبر

فہرست مضامین

- ۱۔ ترکی اور جنگِ آزادی خالہ ادیب خانم صاحبہ ۱۹۶
- ۲۔ مطلعِ اسلام مترجمہ مولانا حسن جاز چوی ۲۱۲
- ۳۔ خطابت اور اس کی مختصر تاریخ مولوی حلیل الرحمن صاحب متعلم جامعہ ۲۳۱
- ۴۔ ویدول پر ایک سہ سہری نظم مولوی بدر الحسن صاحب متعلم جامعہ ۲۴۶
- ۵۔ سہیلی کی بھنگی (ڈراما) صادق علی صاحب عباسی متعلم جامعہ عثمانیہ ۲۶۱
- ۶۔ تنقید و تبصرہ ۲۷۴
- ۷۔ قطعہ استقبالیہ حضرت علیل قدوائی ۲۸۴
- ۸۔ نذرِ خالہ ہرالمحی صاحب مجاز متعلم مسلم یونیورسٹی ۲۸۵
- ۹۔ عنزل حضرت کوکب شاہ بھجان پوری ۲۸۷
- ۱۰۔ شذرات ۲۸۸
- ۱۱۔ اشتہار استقامت ۲۸۸

محمد حبیب بی سٹک ڈاکٹر (پرنٹر) پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

ترکی اور جنگ آزادی

یہ خالدہ ادیب خانم صاحبہ کے چوتھے توسیمی لکچر کا ایک حصہ ہے۔
لکچروں کا مجموعہ مکتبہ جامعہ کی طرف سے جلد شائع ہونے والا ہے۔

خواتین اور حضرات !

اگرچہ میں دل سے دعا کرتی ہوں کہ دنیا میں جنگ و جدل کا خاتمہ ہو جائے مگر اس کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ البتہ سترہ سو میں جب دو کروڑ آدمی قتل ہو چکے تھے ملک کے ملک اجڑ چکے تھے، بے شمار مخلوق خدا خانماں پر بادری کی مصیبت میں گرفتار تھی غرض دنیا تو بالابلا ہو گئی تھی۔ تمام انسانوں کے دل امن و امان کی آرزو سے معمور تھے۔ فاسخ اور مفتوح دونوں خلوص اور جوش سے اس بات کی تمنا کرتے تھے کہ دنیا میں صلح و آسائش کا دور دورہ ہو جائے۔ نوع انسانی کی تاریخ میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جب دنیا کی سب قومیں عدل و انصاف اور ہمدردی کا ایک نیا دور شروع کرنے پر اس قدر مائل ہوں جتنی اس زمانے میں تھیں۔

جنگ سے ترکوں کو جتنا نقصان پہنچا اتنا شاید ہی کسی قوم کو پہنچا ہو۔ وہ پورے دس سال سے میدانِ جنگ میں دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے اور ادھر خود ان کے گھر میں خونریزی اور انقلاب کا بازار گرم تھا۔ جس کی وجہ سے ملک کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ وہ صلح کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار تھے۔ یہ قیمت ماضی صلح سے قبل عربی مدبروں کے اعلانات میں معین کی جا چکی تھی۔ لائڈ جارج نے ۱۹۱۵ء جنوری ۱۹ء کو اعلان کیا تھا کہ وہ علاقہ جہاں ترک خود آباد ہیں اور دارالسلطنت قسطنطنیہ ترکی کے قبضہ میں رہنے دیا جائے گا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ اسے اپنے دو تہائی مقبوضات سے

ہاتھ دھونا پڑے گا۔ ترکِ اِسی کو غنیمت سمجھتے تھے کہ انہیں اپنے گھر میں چین سے بیٹھنا نصیب ہوگا اور غیر ملکی مداخلت سے محفوظ رہ کر اپنی نئی زندگی کی تشکیل اور نشوونما کا موقع ملے گا۔

پریسڈنٹ ولسن نے کہا تھا ”جتنے ملک جنگ میں شریک ہیں ان کی نئی تقسیم ریاستوں کے مطالبات کے اعتبار سے نہیں بلکہ رعایا کے مفاد کے لحاظ سے کی جائے گی“ ایک اور موقع پر انھوں نے فرمایا تھا ”ہمارا فیصلہ بے لاگ ہوگا۔ اس میں یہ تفریق نہیں کی جائے گی کہ جن کے ساتھ ہم چاہیں انصاف کریں اور جن کے ساتھ نہ چاہیں نہ کریں۔ انصاف ایسا ہونا چاہئے جس میں کسی کی رعایت نہ کی جائے جس کا معیار صرف یہ ہو کہ قوموں کے حقوق میں مساوات برقی جائے۔“ پُرانے مدبّروں میں صرف یہی ایک شخص تھا جس نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ نوعِ انسانی امن کی آرزو مند ہے۔ ان الفاظ میں جو شیکسپیر کا سا زورِ بیان اور انجیل کی سی سادگی رکھتے تھے اس نے اپنے چودہ اصولوں کا اعلان کیا۔ حضرت موسیٰ کے دس احکام کے مقابلے میں ولسن کے چودہ احکام بھی یادگار رہیں گے۔ مگر فرق یہ تھا کہ حضرت موسیٰ اپنے احکام کو نافذ کرنے کی قوت رکھتے تھے اور ولسن اس سے محروم تھا۔ وہ دنیا کی بزمِ مشورہ میں ایک بھولے بھٹکے مسافر کی طرح آجکل۔ اور تھوڑی دیر بھٹک کر چلا گیا۔ صلح کی شرطیں انھیں پُرانے طرز کے مدبّروں نے طے کیں۔ یہ بڑے قابلِ لوگ تھے اور جنگ سے پہلے محبتِ وطن کے جو معنی سمجھ جاتے تھے ان کے لحاظ سے محبتِ وطن بھی تھی۔ مگر سب کے سب اتنے بے بصیرت تھے کہ خدا کی لٹا نیوں کو جو نور کے حروف میں دیوار پر نظر آرہی تھیں نہیں دیکھ سکے، اتنے بے حس تھے کہ جذبات کی نئی لہروں کو جو جمہور کے دلوں میں اٹھ رہی تھیں نہیں سمجھ سکے، اتنے ناہنم تھے کہ انھوں نے جنگِ عظیم کے بعد بھی یہ سبق نہیں سیکھا کہ جو محبِ وطن اپنے ملک کی سلامتی چاہتا ہے اُسے اپنے ہمسایہ ملکوں میں بھی

امن و امان کی فضا پیدا کرنی چاہئے۔

عارضی صلح کے بعد اتحادیوں کی فوجوں نے استنبول، سلیشیا اور چنگ پر قبضہ کر لیا۔ ترکوں کی فوجیں منتشر ہونے لگیں۔ چہرے تک ترک اس دھوکے میں رہے کہ یہ قبضہ عارضی ہے اور صلح نامہ پر دستخط ہونے کے بعد ختم ہو جائے گا۔

مگر حریفوں نے جب یہ دیکھا کہ ترکی کے پاس فوج نہیں۔ ہی ہے، تمام ملک میں ابتری اور بے بسی کی حالت ہے تو ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور وہ خواہشیں جی بننا چنٹی معاہدے کئے گئے تھے پھر اٹھ آئیں۔ آرٹوڈو آجی اپنی کتاب ”ترکی“ میں لکھتا ہے: ”جس طرح بھوکے بھڑیے شکار کی تاک میں خیمہ گاہ کے گرد چکر کاٹتی ہیں اسی طرح مغرب کی ریاستیں اس فکر میں تھیں کہ موقع پا کر ترکی پر لوٹ پڑیں۔ کیونکہ ترکی ایک نذیر ملک ہے اور یورپ کی شہنشاہیت بہت لاپچی ہے۔“

اندرونی حالت | اتحاد و ترقی کے لیڈر ملک سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان کی انجمنوں کی رہبری کرنے والا کوئی نہ تھا۔ کوئی اور منظم پارٹی موجود نہ تھی جو اس کی جگہ لے لیتی۔ اور قوم کی نایندگی کرتی اس لئے کہ نوجوان ترکوں نے کوئی اور پارٹی قائم ہی نہیں کرنے دی تھی۔ ایک پارٹی کی حکومت میں یہ بھی ایک بڑا عیب ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ جنگ اور انقلاب کے زمانے میں بہت کامیاب ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ نئی اصلاحات کو بہت جلد عمل میں لاسکے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ جہاں اس میں انتشار پیدا ہوا پھر ملک کی سیاسی حالت سنبھالنے نہیں سنبھلتی۔ پارٹی اپنے آپ کو کل قوم کا نمائندہ سمجھتی ہے اور اس کے دشمن بھی یہی سمجھتے ہیں۔ اس لئے اگر انھیں اس پارٹی سے کوئی نقصان پہنچا ہو تو وہ کل قوم سے اس کا بدلہ لیتے ہیں۔ ایک طرف اتحادی ریاستیں اور دوسری طرف اتحاد و ترقی کے اندرونی دشمن، نوجوان ترکوں کی زیادتیوں کی سزا بے قصور ترکی قوم کو دینا چاہتے تھے۔ جو لوگ دراصل قصور وار تھے وہ تو

چلے گئے تھے۔ اب صرف وہ لوگ باقی تھے جنہوں نے صرف بعض چیزوں میں جماعت اتحاد و ترقی کا ساتھ دیا تھا اور جن کا وجود ترکی کے لئے نہایت مفید اور ضروری تھا۔ مشکل یہ تھی کہ ملک کے سربراہ و درودہ اشخاص میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو کبھی نہ کبھی اس جماعت کا رکن نہ رہا ہو۔

حکومت پھر سلطان کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے پارلیمنٹ کو درخواست کر دیا۔ چونکہ اس پارلیمنٹ کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی اس لئے اس کے برخاست کئے جانے سے کوئی حرج نہیں ہوا۔ مگر سلطان نے نئے انتخابات کا حکم نہیں دیا۔ اور ملک کی حکومت خود اس کے اور ان ریاستوں کے ہاتھ میں رہی۔ جن کی فوجیں قسطنطنیہ پر قابض تھیں۔ وہ اپنی مجلس وزراء میں کبھی کبھی ایسے لوگوں کو بھی رکھتا تھا جن کی قابلیت و حرب و دھن میں شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ مگر جہاں انھوں نے بیرونی کمزوریوں کے احکام پر آنکھ بند کر کے عمل کرنے سے انکار کیا وہ فوراً موقوف کر دیے جاتے تھے۔

ترکی کے حصے بجزے کرنے کی تجویز | ترکوں کے سامنے صلح کی شرائط پیش کرنے سے پہلے اتحادی ترکوں کے متعلق ایک خطرناک فیصلہ کر چکے تھے۔ وہ یہ تھا کہ مشرقِ ادنیٰ میں ایک یونانی سلطنت قائم کی جائے جس میں مشرقی اور مغربی تھریس، سمرا اور اس کے عقب کا علاقہ شامل ہو۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس ترکیب سے آبنائے اتحادیوں کے لئے کھلا رہے گا اور ترک، بلغاریہ اور روسی اس کے قرب نہ آنے پائیں گے۔ انھوں نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ مشرق میں شمسوں سے لے کر بحیرہ اخضر تک اور بحیرہ روم سے سیلیشیا تک جو بحرِ اسود کے کنارے واقع ہیں آرمینیہ کی خود مختار ریاست قائم کی جائے گی۔ اس نئی ریاست کے لئے وہ نہ صرف ترکی کا علاقہ بلکہ ایران اور روس کا کچھ حصہ بھی چھیننا چاہتے تھے۔ اس دوسری تجویز کو عمل میں لانے کی انھیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ ترکی آرمینیہ کی مستقل حیثیت کو

پہلے ہی تسلیم کر چکا تھا۔ نئی تجویز سے اور شرقی سلطنتوں کے بھرپور جانے کا اندیشہ تھا۔ اس کے علاوہ کاظم قارا ایکر سپردہ ہزار باقاعدہ ترکی فوج لئے ہوئے موجود تھا اور سرحد پر جو مسلمان قابل رہتے تھے وہ بھی بڑے جنگجو لوگ تھے۔ اتحادی جہازوں کی توپوں کی زد سے یہ علاقہ باہر تھا۔ البتہ پہلی تجویز یعنی سمرنا کو یونانیوں کے حوالے کر دینا، قابل عمل تھی اور اس کے لئے یہ موقع بھی بہت اچھا تھا۔ اس لئے کہ اٹلی جو خود سمرنا کا دعویدار تھا صلح کی کانفرنس سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ آرنلڈ ٹو آجی اتحادیوں کی اس قسم کی حرکتوں کو ایک دوسرے کی جیبیں کترنے سے تعبیر کرتا ہے۔ اتحادیوں نے چوبیس گھنٹے پہلے یہ نوٹس دیا کہ ہماری فوجیں جہاز سے اتر کر سمرنا میں داخل ہوں گی۔ اس جہانے سے یونانی فوج ۱۵ مئی ۱۹۱۹ء کو سمرنا پہنچادی گئی۔ اس واقعہ نے دم بھر میں کایا پلٹ کر دی۔ ترکوں نے اپنی فوجوں کو منتشر کرنا روک دیا۔ اور فوراً رٹنے مرنے کو تیار ہو گئے۔ آرنلڈ ٹو آجی جو موثر فائدہ بے نقصی اور انصاف پسندی کی وجہ سے نوع انسانی کے لئے فخر کا باعث ہے یونانی فوج کے سمرنا میں داخل ہونے کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے :- ” ۱۵ مئی ۱۹۱۹ء کو مغربی اناطولیہ پر ایک بلائے ناگہانی نازل ہو گئی جیسے کوہِ آتش فشاں پھٹتا ہے اور لوگ حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ کیا ہو گیا۔ جنگ یورپ کے ختم ہونے کے چھ مہینے بعد ایک روز دفعۃً سمرنا کی گلیوں میں شہر کے لوگوں اور نہتے سپاہیوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ مچلے کے محلے اور گاؤں کے گاؤں لوٹ لئے گئے۔ عقبی خطے کی زرخیز وادیوں میں آگ کے شعلے بھڑکنے لگے اور خون کی ندیاں بہ گئیں۔ ایک فوجی دیوار کھڑی ہو گئی جس نے قسطنطنیہ اور سمرنا کی بندرگاہوں کو اندرونی ملک سے جلا کر کے تجارت کو تباہ کر دیا۔ لڑائی کے دوران میں مکان، پل اور سڑکیں مسمار کر دی گئیں۔ ملک کے باشندے تلوار کے گھاٹ اُتارے گئے اور جو بچ رہے وہ یا تو زبردستی فوج میں بھرتی کر لئے گئے۔“

یا جلاوطن کر دئے گئے۔ غرض قتل و غارت کا یہ سیلاب سمرنا سے شروع ہوا اور دور دور تک پھیلتا چلا گیا۔

مغربی مسئلہ یونان اور ترکی میں | ترکی کی طرف سے جو رد عمل ہوا اُس کے متعلق یہ بات دنیا کو نہیں بھولنی چاہئے کہ اس کا آغاز حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ خود جمہور کی طرف سے ہوا۔ جن میں کسان، پہاڑی لوگ، بلکہ عورتیں تک شامل تھیں۔ استنبول سے فوجی انسر بے اجازت بھاگ کر تھریس پہنچے اور انھوں نے چھوٹے چھوٹے جتھے بنا کر لڑنا شروع کیا۔ سارے ملک میں احتجاج کے جلسے کئے گئے دو چیزوں نے اس قوت جذبات کو کامیابی کی منزل پر پہنچایا۔ ایک تو یہ کہ اوسط طبقے کے ترکوں میں سے ہزار ہا آدمی ایسے نکل آئے جنھوں نے نہ صرف اپنی جانوں کو قربان کیا بلکہ تنظیم میں بھی کمال کر دیا۔ دوسرے یہ کہ معدودے چند لیڈر جو انہیں ہاتھ آئے اس مادی اور اخلاقی قوت سے کام لینے کی خداداد قابلیت رکھتے تھے۔ میں نے یہ حیرت انگیز تاریخی ڈراما اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اپنی لفاظی کے مطابق اس میں حصہ بھی لیا ہے۔ مجھے بڑے سرداروں کی قابلیت اور ان کی خدمات کا دل سے اعتراف ہے مگر میرے نزدیک لڑائی کی جان اور کامیابی کا راز جمہور کا عزم تھا۔ جنھوں نے زندگی و ایس ہو کر دل میں سمجھ لیا تھا کہ بھیڑوں کی طرح ذبح کئے جانے سے بہتر یہ میدان جنگ میں لڑ کر مارے جائیں۔ اس بات کو پیش نظر رکھ کر ہم جنگ کے واقعات نہایت اختصار کے ساتھ بیان کریں گے۔

اندرونی قوتیں اور ان کا اتحاد | جب لڑائی شروع ہوئی تو اتحادیوں کی ایک لاکھ فوج ترکی میں موجود تھی۔ اس کے مقابلے میں ترکوں کے پاس مشرق میں کاظم قارا بکر کی پندرہ ہزار باقاعدہ فوج، وسط اناطولیہ میں علی نواد پاشا کی چھوٹی سی جمعیت اور چند اندیم سرح دستے تھے جو ادھر ادھر پھیلے ہوئے تھے۔ باقی جو کچھ تھے وہ رضا کار

کے بے قاعدہ جتھے تھے جن کے پاس سامانِ جنگ برائے نام تھا۔

اتحادیوں کو مشرق کی طرف سے زیادہ اندیشہ تھا۔ اس لئے انھوں نے سلطان سے کہہ کر مصطفیٰ کمال پاشا کو دہاں ناظر حربی کی حیثیت سے بھجوا دیا کہ ترکی فوج کو منتشر کر دیں۔ مصطفیٰ کمال نے دہاں جانے سے پہلے استنبول میں فوج کے سرداروں سے خفیہ طور پر ملاقات اور گفت و شنید کر لی تھی۔

اماسیا کا اقرارنامہ | ۱۹ جولائی ۱۹۱۹ء کو مصطفیٰ کمال پاشا، رفعت پاشا، علی فواد پاشا اور رفوت بے نے اماسیا کے مقام پر جمع ہو کر ایک اقرارنامے پر دستخط کئے۔ جسے موجودہ ترکی ریاست کی بنیاد سمجھنا چاہئے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے: ملک کی مرکزی حکومت، بیرونی ریاستوں کے ہاتھ میں ہے، ترکی جمہور نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اسے غیر یکپارگی کے ماتحت رہنا ہرگز منظور نہیں اور وہ ان سے لڑنے کو تیار ہے۔ قوم کی قوت اور جدوجہد کو متحد اور منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک کانگریس جو تمام قوم کی نمائندہ ہو منعقد کی جائے اور وہ یہ فیصلہ کرے کہ ملک کی حفاظت کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

ایزن روم کانگریس | ۲۳ جولائی ۱۹۱۹ء کو پہلی کانگریس مصطفیٰ کمال پاشا کی صدارت میں منعقد ہوئی اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک نمائندہ جماعت منتخب کی جائے جو ضرورت کے وقت اناطولیہ کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے اور ملک کی حفاظت کا سامان کرے۔ اس کانگریس کی ہدایت کے مطابق تمام ترکی فوجیں جویونانی حملے کی ناکاہت رہیں اناطولیہ کے مرکز کے ماتحت متحد ہو گئیں اور ایک قومی عہد نامہ طیار کیا جانے لگا جو ساری قوم کے لئے قابل قبول ہو۔

سیواس کانگریس | ۴ ستمبر ۱۹۱۹ء کو سیواس کانگریس نے ایک قدم اور آگے بڑھنا اناطولیہ سلطان کی حکومت سے علیحدہ ہو گیا اور اس نے ملکی اور فوجی انتظام اپنے ہاتھ میں

لے لیا۔ سلطان نے خوف زدہ ہو کر داماد فرید پاشا کی وزارت کو جو اتحادیوں کا اکہ کار سمجھی جاتی تھی معزول کر دیا۔ اور ایک نئی کا بیہ مقرر کی جس کے اکثر ارکان قوم پرورد پارٹی کے تھے۔ یا اس سے ہمدردی رکھتے تھے۔ اسی کے ساتھ اس نے پارلیمنٹ کے انتخابات کا بھی حکم دے دیا۔ ملک نے قوم پرورد پارٹی کو بہت بڑی تعداد میں منتخب کیا۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں پارلیمنٹ کا اجلاس استنبول میں منعقد ہوا۔ اس کے سپر بالفعل روف بے تھے۔ خوش قسمتی سے صفحے کمال اور دوسرے فوجی سردار اناطولیہ ہی میں رہے۔

پارلیمنٹ نے پہلا کام یہ کیا کہ قومی معاہدے کو مکمل کر کے شائع کر دیا۔ اس کا مضمون قریب قریب وہی رہا جو پہلی بار ارض روم کی کانگریس میں تجویز ہوا تھا۔ اس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ جن علاقوں میں ترکوں کی اکثریت ہے اور جن پر عارضی صلح کے وقت اتحادیوں نے قبضہ نہیں کیا تھا وہ ترکی کی حکومت میں رہیں۔ بقیہ علاقے جن پر اس وقت قبضہ کیا گیا تھا (اور جن میں زیادہ تر عربوں کی آبادی تھی) اپنی قسمت کا فیصلہ خود کریں اور اس میں ان کے باشندوں کو آزادی سے رائے دینے کا حق دیا جائے۔ ترکی کی طرف سے یہ وعدہ کیا گیا کہ باسفورس اور درانیال میں سب قوموں کے تجارتی جہازوں کو آنے جانے کی اجازت ہوگی بشرطیکہ وہ اس بات کا ذمہ لیں کہ استنبول اور بحیرہ مارمرودہ بیرونی دست اندازی سے محفوظ رہے گا۔ ترکی میں اقلیتوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ہمسایہ ملکوں میں مسلم اقلیتوں کو حاصل ہیں۔

ابھی اتحادیوں نے صلح کے شرائط کا جوہ ترکی کے سامنے پیش کرنے والے تھے عام اعلان نہیں کیا تھا کہ انھیں قومی معاہدے کی اطلاع بھیج دی گئی۔ اب ان کے سامنے دو صورتیں تھیں یا تو وہ ترکوں کی یہ شرائط جو خود انھوں نے عارضی صلح سے پہلے ترکوں کے سامنے پیش کی تھیں منظور کر لیں اور جنگ ختم کر دیں

یاسینہ ندوی سے کام لے کر ترکی کے حصے بخرے کرنے کی تجویز پر اُڑے ہیں انھوں نے دوسری صورت اختیار کی۔

۱۶ رمارتج کو اتحادیوں نے وہ معرکے کا حملہ کیا جو دنیا میں مشہور ہو گیا۔ انھوں نے استنبول میں اور فوجیں اُتار دیں جو تمام قوم پروروں کے گھروں پر چھاپہ مار کر انھیں اُن کے بستروں سے کھینچ لائیں۔ اس کے بعد وہ پارلیمنٹ پر ٹوٹ پڑیں اور بہت سے قوم پرور ممبر جن میں رؤف بے بھی شامل تھے گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیئے گئے۔ جہاں ہزاروں آدمی جو اتحاد و ترقی کے رکن تھے یا سمجھ لئے گئے تھے، پہلے سے نظر بند تھے۔ اتحادیوں نے مارشل لا جاری کر دیا اور یہ اعلان کیا کہ جو شخص کسی قوم پرور کو اپنے گھر میں پناہ دے گا اُسے قتل کی سزا دی جائے گی۔ عیسائیوں کے جتنے مسلح کر کے اُن سڑکوں پر جو اناطولیہ کو جاتی تھیں متعین کر دیئے گئے کہ قوم پرور بھاگ کر اُس طرف نہ جانے پائیں۔ ترکوں نے بھی فوراً اپنے جتنے بنا لئے اور قوم پروروں کو بھاگنے میں مدد دینے لگے۔ اتحادیوں اور فوجوں کے قدغن کے باوجود بہت سے لوگ سامانِ جنگ کے ساتھ بچ کر مکمل گئے۔

سلطان کی حکومت نے ایک عدالتِ خاص قائم کی۔ جس کی طرف سے ان قوم پروروں کی جو سزائے موت کے مستوجب قرار دیئے گئے تھے پہلی فہرست شائع کی گئی۔ اس میں مصطفیٰ کمال پاشا، علی فواد پاشا، ڈاکٹر عدنان اور ایک عورت کا نام بھی شامل تھا۔ اس کے علاوہ شیخ الاسلام نے فتویٰ دیا کہ جو مسلمان ان لوگوں میں سے کسی شخص کو قتل کرے گا وہ سیدھا مسلمانوں کی جنت میں جائے گا۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ شیخ الاسلام نے پہلی بار نہ صرف غیر ملکی حکومتوں کا ساتھ دیا بلکہ ظلم و استبداد پر کمر باندھ لی۔

اس اثناء میں مصطفیٰ کمال پاشا نے جو کچھ دن پہلے انگورہ پہنچ چکے تھے

یہ اعلان کیا کہ قومی پارلیمنٹ کا اجلاس انگورہ میں ہوگا۔ جمہور کو چاہئے کہ پرانے ممبروں میں سے جو لوگ اس میں شریک نہیں ہو سکتے یا نہیں ہونا چاہتے ان کی جگہ دوسرے ممبروں کو منتخب کر کے بھیجیں۔ یہی وہ جماعت تاجیسی تھی جس نے نئی ریاست قائم کی۔

قومی مجلس عالیہ کی حکومت | جماعت تاجیسی کا اجلاس ۲۳ اپریل ۱۹۳۷ء کو انگورہ میں ہوا۔ اس نے ملک کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس کا نام قومی مجلس عالیہ رکھا۔ مشرق میں یہ پہلی جمہوری حکومت تھی جو خود جمہور نے قائم کی۔ مشرق اور مغرب کی کشمکش میں یہ سب سے اچھی مغربی چیز تھی جو مشرق نے اختیار کی۔ تاریخ میں پہلی بار نہایت نازک موقع پر ملک کی حکومت کا پورا بار اہل اناطولیہ کے کاندھوں پر رکھا گیا۔ جمہور کے نمایندوں نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ان لوگوں کا کام اتنا ہی مشکل تھا جتنا ان ٹھٹی بھرستہ سالی ترکوں کا جنہوں نے تیرہویں صدی میں شمالی سلطنت کی ایسی مضبوط بنیاد رکھی کہ وہ سات سو سال تک ہلائی نہ ملی۔ قومی مجلس عالیہ کی حکومت اور انقلاب فرانس کی حکومت میں بہت مشابہت تھی۔ وہ مقتدر اور عالمہ دونوں کے فرائض ساتھ ساتھ انجام دیتی تھی۔ مجلس کا پریسیڈنٹ حکومت کا افسر اعلیٰ تھا۔ وائس پریسیڈنٹ پارلیمنٹ کے اجلاس میں صدارت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس کی انتظامی کمیٹی مجلس وزراء کا کام کرتی تھی۔ ہر وزیر کا انتخاب مجلس علیحدہ علیحدہ کرتی تھی۔ اور وہ انفرادی حیثیت سے مجلس کے سامنے جواب دہ تھا۔ اس مجلس کا دستور اساسی اس قابل ہے کہ اس کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔ اس لئے کہ دنیا کی تاریخ میں کسی طرز حکومت کی مثال جو حقیقی جمہوریت سے اتنی قریب ہو، مشکل سے ملے گی۔

اپریل سے جون تک اس حکومت کے لئے سب سے مشکل زمانہ تھا۔ اسے

سارے ملک میں عدالتی اور انتظامی محکمے قائم کرنے تھے۔ اس کام میں کسی قدر آسانی اس وجہ سے ہوگئی کہ نوجوان ترکوں نے جو نظم قائم کیا تھا وہ اب تک چل رہا تھا۔ مرکزی حکومت کی ترتیب میں زیادہ دقت پیش آئی۔ کیونکہ ایسے لوگ جو اس میں حصہ لے سکتے ہوں یا لینا چاہتے ہوں بہت کم تھے۔ مگر سب سے بڑی مشکل اور سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ ملک میں بد امنی پھیلی ہوئی تھی۔ وسطِ اناطولیہ کی حفاظت کا دار و مدار بے قاعدہ فوج پر تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس فوج میں بعض لوگ بڑے بلند خیالات کے تھے اور وہی اس قومی تحریک کے ہر اول تھے۔ مگر عام سپاہیوں میں نظم و ضبط قائم رکھنا بہت مشکل تھا۔ اور وہ بعض اوقات اتنی ہی زیادتیاں کر بیٹھتے تھے جتنی یونانیوں کی فوجیں کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ سلطان نے استنادیوں کے روپے سے غیر ترکی فوجیں بھرتی کی تھیں اور انھیں افواجِ خلافت کے نام سے اناطولیہ میں قوم پروروں کو لڑنے کے لئے بھیج دیا تھا۔

معاہدہ سیوے اور اس زمانے میں دو باتیں ایسی ہوئیں جن سے قومی مجلس عالیہ بڑا قاعدہ فوج کا خاتمہ کی حکومت کی بن آئی۔ ان میں سے پہلی چیز سیوے کا معاہدہ تھا جس پر دستخط کر کے سلطان کی حکومت نے ترکی قوم کو سزائے موت کا حکم سنایا۔ اس معاہدے کی شرطیں ترکی کے متعلق یہ تھیں کہ سمرنا اور اس کا عقبی علاقہ اور مشرقی اور مغربی تھریس یونان کو دے دیا جائے، مشرق سے لے کر جنوب میں سلیشیا تک جس میں کروڑوں کا علاقہ شامل تھا آرمینیہ کی ریاست قائم کر دی جائے، بندرگاہیں استنادیوں کے سپرد کر دی جائیں، در دانیال استنبول اور بحیرہ مارمرہ کے مشرقی اور مغربی ساحل استنادیوں کے انتظام میں رہیں۔ ترکی کی مالیات بھی ان کی نگرانی میں دے دی جائے۔ قدیم تجارتی اور عدالتی حقوق صحتِ فاتح قوموں کے لئے بحال کر دئے جائیں۔ ترکی کو ہوائی یا جنگی جہاز رکھنے کی اجازت

نہ ہو بلکہ صرف سپندرہ ہزار بری فوج جس میں فوجی پولیس شامل ہے باقی رہنے دی جائے، اناطولیہ کا بے آب و گیاہ علاقہ جو ترکوں کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا وہ بھی مغربی ریاستوں کے حلقہ ہائے اثر میں تقسیم کر دیا جائے۔

سلطان کا معاہدہ سیورے پر دستخط کرنا اور پھر غیر ملکی فوجوں کے ساتھ افواج خلافت کو ترکی قوم کا خون بہانے کے لئے بھیجنا ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے لوگ سلطنت اور خلافت دونوں کے نام سے بیزار ہو گئے۔

ادھر نئی حکومت نے اپنی باقاعدہ فوج ترتیب دی اور بے قاعدہ جمعیتوں کو اس میں شامل ہونے پر مجبور کیا۔ بعض جمعیتوں نے سرکشی اختیار کی اور وہ بھی عین اُس وقت جب یونانیوں کی طرف سے شدت کا حملہ ہو رہا تھا۔ مگر نئی حکومت کی چھوٹی سی فوج نے انونو کے مقام پر ایک طرف یونانی فوج کو اور دوسری طرف ترکوں کی باغی فوج کو شکست دی۔ اس فتح سے ترکی قوم کے حوصلے بڑھ گئے اور اسے اپنے اوپر اعتماد پیدا ہو گیا۔ اب لوگ دل و جان سے نئی حکومت کا ساتھ دینے لگے۔

اس زمانے میں لندن میں جو کانفرنسیں اناطولیہ کے مسئلے کے متعلق ہوئیں ان کا ذکر میں چھوڑتی ہوں۔ یہ اُسی وقت کی جاتی تھیں جب ترکوں کی فتح ہوتی تھی۔ ان کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ یونانی فوج کو سنبھالنے کی مہلت مل جائے۔

معرکہ سقاریہ | ترکوں اور یونانیوں کی فیصلہ کن لڑائی سقاریہ کے مقام پر ہوئی۔ یونانیوں نے اسکی شہر میں ترکوں کو شکست دینے کے بعد تمام ریلوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور انکوہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ ترکوں کے لئے نازک وقت تھا مگر ان کی قوم اور قومی مجلس اس امتحان میں پوری اُتری۔

مصطفیٰ کمال پاشا سپہ سالار اعظم بنائے گئے اور انھیں غیر معمولی اختیارات

دیئے گئے عصمت پاشا محاذ جنگ کے سپہ سالار، فیضی پاشا اُن کے نائب اور رفعت پاشا وزیر جنگ ہوئے۔

ترکوں کو بڑی بڑی مشکلوں کا سامنا تھا۔ انھیں مشرق سے سپاہی اور سامان جنگ محاذ پر پہنچانا تھا۔ موسمِ انتہا سے زیادہ خراب تھا۔ راہ میں صحرا اور پہاڑ حائل تھے۔ بار برداری کا ذریعہ اونٹوں، بیل گاڑیوں اور انسانوں کے کندھوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ مردوں اور عورتوں کو چار سو میل سے زیادہ کی سنگلاخ اور دشوار گزار راہ پیدل طے کرنی پڑی، اسلحہ سازی کے عارضی کارخانے قائم ہو گئے۔ اور ریلوں کی کچی کھچی ٹریڈ اُکھاڑ کر ہتھیار ڈھالے جانے لگے۔

یونانیوں کے پاس اتنی ہزار تربیت یافتہ فوج، اعلیٰ درجے کا توپ خانہ جس میں دو سو توپ تھیں، سامانِ جنگ بہ افراط، ریلیں۔ لاریاں اور مغربی ترکی کی عمدہ سڑکیں، ترکوں کی کٹھن کا نناٹا کچیس ہزار فوج جس کے پاس کچھ نئی کچھ پرانی، کچھ مازا کچھ ماٹینی بندوقیں، کُل چھ توپیں، بہت تھوڑا سامانِ جنگ اور باقی خلا کا نام۔

ترکوں نے جو شجاعت میدانِ جنگ میں دکھائی زبان میں طاقت نہیں کہ اُسے بیان کر سکے۔ تینیس دن کی لڑائی میں ساڑھے سولہ ہزار ترک کام آئے جن میں افسروں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ ترک حملہ کرتے تھے انہی گینی چھ توپوں کے سہارے پر یونانیوں کا پشت پناہ زبردست توپ خانہ تھا۔ مگر کیا مجال کہ ایک ترک سپاہی بھی میدانِ جنگ سے منہ موڑے۔ کاظم قارا کیر پاشا نے میدانِ جنگ سے جو تار مصطفیٰ کمال پاشا کو بھیجا تھا اُس سے ترکی قوم کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ”جب تک پہاڑی کی کسی چوٹی پر ایک ترک سپاہی بھی باقی رہے گا، مقابلہ جاری رہے گا۔“ مصطفیٰ کمال پاشا نے اُن دنوں ایک تقریر کی تھی جس کے چند دلاویز فقرے میں آپ کو سنائی ہوں۔

”قومی مجلس کے صدر کی حیثیت سے میں آپ حضرات کے سامنے یہ اعلان

کرنا ہوں کہ مہارامقصد جنگ نہیں ہے۔ ہم صلح کے طالب ہیں۔ میرے خیال میں کوئی چپینر ہمیں اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اگر یونانی فوج یہ سمجھتی ہے کہ ہم اپنے جائز حقوق چھوڑ دیں گے تو یہ محض اُس کی خام خیالی ہے۔ دشمن ہمارا نام صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں۔ ہم نے اپنی حفاظت کے لئے تلوار اٹھائی ہے۔ اس کو بڑھکر اور معقول بات کیا ہو سکتی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم یونانی فوج کو ڈھکیلے چلے جائیں گے یہاں تک کہ اُس کا ایک سپاہی بھی ہماری زمین پر باقی نہ رہے۔ ترکوں کو سقاریہ میں فتح حاصل ہوئی۔ کلیئر پرائس نے اپنی کتاب ”ترکی کی دوبارہ زندگی“ میں اس فتح کی پوری اہمیت ذیل کے الفاظ میں دکھائی ہے:-

”ترکوں کو دریائے سقاریہ کے کنارے جو فتح حاصل ہوئی اُس نے مشرقِ ادنیٰ اور مشرقِ وسطیٰ کا سیاسی نقشہ بدل ڈالا۔ دو سو سال سے مغربِ قدیم عثمانی سلطنت کو پارہ پارہ کر رہا تھا۔ مگر سقاریہ کے کنارے اس کا سامنا خود ترکی قوم سے ہوا۔ اس چٹان سے ٹکرا کر ہٹا۔ دھارے کا رُخ پلٹ گیا۔ موڑ خوں پر ایک دِنِ حقیقت کھل چکے گی کہ سقاریہ کی بیچوٹی سی لڑائی ہمارے زمانے کا سب سے زبردست فیصلہ کن معرکہ تھا۔ اس فتح کی بدولت نئی حکومت کے قدم جم گئے۔ یونانی فوج کی کمر ٹوٹ گئی اور اتحادیوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ فرانس نے صلح کر لی، قومی مجلسِ عالیہ کی حکومت کو تسلیم کر لیا اور سیشیا سے اپنی فوجیں ہٹالیں۔ اٹلی نے عدالیہ کو خالی کر دیا۔ سوڈیت روس نے سلطہ عینِ انگورہ کی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اس سے ہمیں بہت بڑی مادی اور اخلاقی مدد ملی کہ لڑائی کے زمانے میں جب ہمیں اپنی ساری قوت مغربی سرحد پر مجتمع کرنی تھی ہم مشرقی سرحد کی طرف سے مطمئن رہے۔ ایک بڑی وجہ کامیابی کی یہ بھی تھی کہ کاظم قارا بکر پاشا نے آرمینیہ کی لڑائی میں اردھان اور قرص لے کر صلح کر لی تھی۔ اس لئے سقاریہ کی جنگ میں ترکی کو مشرق سے فوجیں اور سامانِ جنگ برابر پہنچا رہا۔

اس نازک زمانے میں ہندوستان نے بھی ترکوں سے بڑی ہمدردی کی۔ اور انھیں بہت مدد دی۔ میں اس معرکے کے ایک ناچیز کارکن کی حیثیت سے آپ لوگوں کے سامنے سہریا زخم کرتی ہوں اور دلی مسرت کے ساتھ یہ الفاظ کہتی ہوں ”بھائیو اور بہنو! میرا شکریہ قبول کیجئے۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے“

آخری فتح | جنگ ستاریہ کے سال بھر بعد اگست ۱۹۲۲ء میں ترکی فوج نے مصطفیٰ کمال پاشا کی سرکردگی میں جارحانہ اقدام شروع کیا اور سہرناکو فتح کرنے سے پہلے اپنا سارا ملک یونانی فوجوں سے خالی کر لیا۔ مغربی ریاستوں نے یہ فیصلہ کیا کہ لوزان میں صلح کی کانفرنس منعقد کی جائے۔ دنیا نے مان لیا کہ ترکی قوم لڑائی کی آگ میں تپ کر، تلوار کی بارھ پرچل کر اپنے امتحان میں پوری اُتری۔

لوزان کانفرنس | مغربی ریاستوں نے استنبول کی حکومت اور قومی مجلس عالیہ کی حکومت دونوں کو کانفرنس میں مدعو کیا۔ لوزان جانے سے پہلے اس دعوئی کی گتھی کو سلجھانا ضروری تھا مجلس عالیہ نے ایک طویل اور معرکہ الاراء اجلاس کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ سلطنت اور خلافت کے منصب الگ الگ کر دئے جائیں سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور سلطان منصب حکومت سے معزول کر دیا گیا۔ استنبول نئی حکومت کا ایک صوبہ قرار دیا گیا۔ (نومبر ۱۹۲۲ء) سلطان وحید الدین نے استخادیوں کے ایک جنگی جہاز میں پناہ لی۔ اور مجلس نے عبد المجید آفندی کو خلیفہ منتخب کر لیا۔ لوزان کانفرنس نومبر ۱۹۲۲ء میں شروع اور جولائی ۱۹۲۳ء میں ختم ہو گئی۔ قومی مجلس عالیہ کی حکومت اور استخادیوں کے درمیان جو صلح نامہ ہوا اس میں ترکوں کے قومی معاہدے کی تمام دفعات تسلیم کر لی گئیں خواتین اور حضرات!

آپ سب لوگ اور ساری دنیا سجا طور پر ان شاہیر کی قدر کرتی ہے جنہوں نے ترکوں کو اس جنگ میں کامیابی کی منزل پر پہنچایا۔ مگر آپ کو کیا معلوم، دنیا کیا جانے کہ

اُن ہزاروں گنہگار عورتوں اور مردوں نے جو اِس لڑائی میں کام آئے کیسی عظیم الشان قربانیاں کیں اور کیا کیا کارہائے نمایاں کر دکھائے۔ میری التجا ہے کہ جب آپ مسجدوں اور مندروں میں جا کر دُعا مانگیں تو اِن لوگوں کو نہ بھولیں۔ شہیدوں کی یہ جماعت 'مرد'، عورت، بوڑھے، جوان، بچے، جنھوں نے اِس کوشش میں جان دی کہ اُن کی قوم امن اور عزت کے ساتھ دنیا میں رہ سکے اِس قابل ہیں کہ دُنیا کی ساری قومیں قیامت تک اُن کے لئے دُعا کرتی رہیں :



مطلع اسلام

(مستند از نزول ردائے مصنفہ ایڈورڈ گبین)

ٹھیک اُس وقت جب رومی حکومت فارس والوں کی جنگ سے تھک کر چور ہو گئی تھی اور کلیساں سطورین اور منوفیون کی وجہ سے پریشان تھا حضرت محمدؐ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن لئے ہوئے روم اور نصرائیت کے کھنڈروں پر اپنا تخت بچھا رہے تھے۔ رسولِ عربی کی قابلیت اور ذہانت، ان کی قوم کے اخلاق و عادات، اور ان کے مذہب کے جوش و دلولے میں روم کی مشہور حکومت کے زوال کے اسباب مضمّن ہیں۔ اب ہماری آنکھیں حشر کے ساتھ اس سب سے زیادہ یادگار انقلاب پر گڑھی ہوئی ہیں جس نے کرہٴ ارض کی قوموں پر ایک بالکل نرالا اور دیر پا نقش چھوڑا ہے۔

ملک عرب کا حال

فارس۔ شام۔ مصر اور حبشہ کے درمیان جو خالی جگہ تھی اس میں جزیرہ نمائے عرب ایک وسیع مگر بے قاعدہ مثلث کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ شمالی کونے (بالیس) سے لے کر جو دریا سے فرات پر واقع ہے خاکنا دریا اب الہند تک جہاں لوہاں پیدا ہوتا ہے پندرہ سو میل کا فاصلہ ہے۔

مشرق سے مغرب تک یعنی بصرہ سے سویز تک اور خلیج فارس سے بحیرہ احمر تک درمیانی چوڑائی اس کی نصف (۲۵۰ میل) سمجھ لیجئے۔ مثلث کے ضلع تدریجاً بڑھتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جنوبی ضلع بحر ہند پر ایک ہزار میل کا محاذ بناتا ہے۔

زمین اور آب ہوا | جزیرہ نما کا پورا رقبہ جرمنی یا فرانس سے چھ گنا ہے لیکن اُس کے بڑے حصے پر جائزہ طہ سے رنگستانی یا کوہستانی علاقہ چھنے کا

۱۵ یہ پیمائش صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ چوڑائی ۹۰۰ میل ہے جنوبی ضلع ۱۲۰۰ میل ہے۔ ۱۲

الزام عائد ہوتا ہے۔

گئے گزرے صحرائے تآثر کو بھی قدرت نے تباہ و درختوں اور ہری بھری جڑی بوٹیوں سے آراستہ کر دیا ہے۔ کوئی راہ روجو اُدھر جا بھلے ان سبز قامتوں کی موجودگی سے آرام پاتا ہے اور تنہائی محسوس نہیں کرتا لیکن عرب کا سنسان بق و صحرا تو ریت کا ایک ناپیدا کنارہ ہوا رسید ان ہے جس کو کہیں کہیں نوکیلے عریان پہاڑ کاٹتے ہوئے بھل جاتے ہیں۔ نہ کہیں سایہ ہے نہ جائے پناہ۔ صفحہ رنگستان، برج سرطان کے آفتاب کی تیز اور سیدھی شعاعوں سے جھلکتا رہتا ہے۔

خوشگوار ہواؤں کے بدلے آندھیاں چلتی ہیں۔ بالخصوص جنوب و مغرب کے چلنے والی آندھی جو نہریلے کیا بلکہ مہلک بخارات پھیلاتی ہے۔ خاک کے تودے جو ان ہواؤں کے چلنے سے بنتے اور گڑتے رہتے ہیں سمندر کی اونچی اونچی لہروں سے مشابہہ جھٹے میں۔ کاروان کے کاروان۔ لشکر کے لشکر اس طوفانِ گرد میں دب کر رہ جاتے ہیں۔ پانی مٹی عام فائدے کی چیز بھی اس قدر کمیاب کہ اس پر وہاں لوگ جان دیتے اور اکثر لڑھکتے ہیں۔ لکڑی کی اس قدر قلت ہے کہ آگ جیسے معمولی عنصر کو محفوظ رکھنے اور ایک سے دوسرے کو پہنچانے کے لئے بھی بڑی کارگیری کی ضرورت ہے۔

جہاں زانی کے قابل دریا جو ایک طرف تو زمین کو زرخیز بناتے ہیں اور دوسری طرف ملکی پیداوار کو قریبی ملکوں تک لے جاتے ہیں عرب میں ناپید ہیں۔ چشمے (ندی نالے) جو پہاڑیوں سے بہ کر آتے ہیں۔ پیاسی زمین جذب کر لیتی ہے، کمکیاب اور سخت تنے والے پودے مثلاً ملی، ببول وغیرہ جن کی جڑیں چٹانوں میں سے پھوٹ نکلتی ہیں۔ شبنم کے سہارے پھلتے پھولتے ہیں۔ بارش کے پانی کا تھوڑا سا ذخیرہ حوضوں اور تالابوں میں جمع کر لیا جاتا ہے۔ بہتے کنوئیں اور چشمے تو وہ تو رنگستان کے پوشیدہ خزانے ہیں۔

خشک اور گرم میدانوں کے طویل سفر کے بعد جب حاجی لوگ وہ پانی پیتے ہیں جو

گندھک آمیز یا شور زمین پر نہ کر آیا ہے تو اُن کی طبیعت بہت مکدر ہوتی ہے۔
یہ عرب کا ایک مختصر سا خاکہ ہے۔

تکلیف اٹھانے کے بعد اگر کسی مقام پر معمولی سا آرام بھی مل جائے تو اُس کی قدر قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ ایک سایہ دار کبج۔ ہری بھری سپرگاہ یا تازہ پانی کا ایک چشمہ اقامت گزین عربوں کی نوآبادی کو اس مبارک مقام کی طرف کھینچنے کے لئے کافی ہے جہاں اُن کو اور اُن کے مویشیوں کو کھانا اور آرام مل سکے اور اُن کی گھجروں اور انگوروں کی زراعت سرسبز ہو سکے۔ وہ سطح مرتفع جو بحر ہند کے ساحل کے قریب پانی اور لکڑی کی افراط کی وجہ سے ایک خاص استیلاز رکھتی ہے۔ وہاں ہوا نسبتاً معتدل ہے۔ پھل اس پاس کے دوسرے خطوں کی بہ نسبت لذیذ ہوتے ہیں۔ حیوانات اور انسان بھی وہاں زیادہ ہیں۔ زمین کی زرخیزی دیکھ کر کسان محنت پر آمادہ ہوتا ہے اور خاطر خواہ منافع حاصل کرتا ہے۔ اس سرزمین کا مخصوص تحفہ بخورات اور قہوہ ہیں جن کی کشش ہر زمانے میں تاجروں کو یہاں لاتی رہی۔ اگر اس خطے کا بقیہ حبنیرہ نما سے مقابلہ کریں تو بے شک یہ الگ جھلک قطعہ زمین اس کا پورے طور پر مستحق ہے کہ اس کو شاہ داب کے خطاب سے یاد کیا جائے۔ اس ملک کے تعلق تخیل اور فسانے کی یہ شاندار رنگ آمیزی جو تم دیکھتے ہو تضاد نے تجویز کی ہے اور فاصلہ و مسافت نے اس کی شکل و صورت بنا دی ہے۔

اس خردوں ارضی ہی کے لئے قدرت نے اپنے منتخب عیٹے اور حیرت انگیز صنائع محفوظ رکھے تھے۔ نقیث فراوانی اور سادگی کی گونا گوں برکتیں یہاں کے رہنے والوں کی قسمت میں لکھی گئیں۔ زمین سونے اور جواہرات سے مالا مال تھی۔ اور حیرت و بر دونوں کو خوشبودار لذتوں سے بہرہ مند ہونے کی عادت ڈالی گئی تھی۔

عرب کی تقسیم، ریگستانی، کوہستانی اور شاہ داب علاقوں
عرب کے طبعی حصے | میں یونانیوں اور رومیوں میں تو عام ہے لیکن خود عرب اس

تقسیم سے نابلد ہیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ کوئی ملک جو زبان اور باشندوں کے لحاظ سے ہمیشہ ایک رہا ہو اپنے قدیم جغرافیہ کی شکل کو محفوظ رکھے۔ عرب کے ساحلی علاقے بحرین اور عمان، فارس کی حکومت کے مقابل ہیں۔ بین کا علاقہ شاداب عرب کی حدود یا کم از کم محل وقوع کو ظاہر کرتا ہے۔ نجد نام کا خطہ اندرونی علاقے میں پھیلا ہوا ہے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ کی ولادت کے شرف نے حجاز کے خطے کو جو بحیرہ احمر کے ساحل پر واقع ہے مشہور و معروف کر دیا ہے۔

بدوؤں کے اخلاق و عادات | مردم شماری کا دارو مدار گذر اوقات کے سامان کی قلت یا کثرت پر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی ایک چھوٹے سے ریزیر و صنعتی صوبے کی آبادی اُس وسیع جزیرہ نمائی آبادی سے زیادہ ہو اور ابتدائی عہد میں (خلج فارس، بحر ہند اور بحر اہمر کے ساحل پر وحشی لوگ جن کا گذارہ پھلی پر پٹھا اپنی خوراک کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے۔ اس ابتدائی اور بے سروسامانی کی حالت میں جس کو سماج کہنا سماج کا نام بدنام کرنا ہے۔ ابن بن ماش کو جو نہ صنعت و حرفت سے آگاہ تھا نہ قانون سے واقف۔ جو کچھ سے عاری اور زبان سے نا آشنا تھا، حیوانِ مطلق کے گروہ سے علیحدہ کرنا مشکل ہے۔ اس خاموش تغافل کی حالت میں نسلیں اور بُدیں گذر گئی ہوں اور ان نکاوٹوں، حوائج اور مشاغل کی وجہ سے جو اس بے بس وحشی انسان کو تنگنائی ساحلِ بحر میں نہ کے ہوئے تھے وہ اپنی نسل بڑھانے سے معذور رہا ہوگا۔

لیکن اس قدیم زمانے کے ابتدائی حصے ہی میں عربوں کی ایک بڑی جماعت نے اپنے آپ کو اس مصیبت کی حالت سے نکال لیا تھا۔ چونکہ کث دست صحرا، شکاری لوگوں کی پرورش نہیں کر سکتا تھا اس لیے انھوں نے یک بخت ترقی کر کے چرواہوں کی زندگی اختیار کر لی۔ جس میں شکاری کی زندگی سے زیادہ محفوظ اور منفعت بخش سیر حاصل ہے۔

برگستان کی خانہ بدوش قوموں کا طرز زندگی اُس زمانہ سے لے کر اب تک یکساں

چلا آتا ہے۔ اور موجودہ زمانے کے بدوؤں کی شکل و صورت میں ہم اُن کے اُن آباد و اجداد کے خدو خال کا پتہ لگا سکتے ہیں جو حضرت موسیٰ باحضرّت رسول خدا کے عہد میں بالکل ایسی ہی خیموں میں رہتے تھے اور اپنے گھوڑوں، اونٹوں اور بھیرول کو انھی چیموں یا چراگا ہوں کی طرف ہنکاتے تھے۔

مضید جانوروں کے قابو میں آجانے سے ہماری محنت کم اور دولت زیادہ ہو جاتی ہے۔ عرب چرواہوں کو بھی ایک وفادار دوست (گھوڑا) اور ایک محنتی ذکر (اونٹ) ہاتھ آگیا تھا۔ علمائے طبیعیات کے قول کے مطابق عرب گھوڑوں کا اصلی وطن ہے۔ یہاں کی آب ہوا اس شریف الطبع جانور کے قد و قامت کے لئے نہ بھی مگر تیزی اور پھرتی کے لئے بہت سازگار ہے۔ بارب اسپینی اور انگریزی نسل کے گھوڑوں کی خوبی عربی خون کی آمیزش ہی سے پیدا ہوئی ہے۔

بدو لوگ اس احتیاط کے ساتھ جو توہم کی حد تک پہنچ گئی ہے اپنے خالص نسل کے گھوڑوں کے کارناموں کی یاد محفوظ رکھتے ہیں۔ نہ بہت گران قیمت پرفروخت کئے جاتے ہیں اور مادہ کو تو شاید ہی کبھی جدا کیا جاتا ہو۔ کسی اچھی نسل کے بچڑے کے پیدا ہونے کو عربی قبائل میں نیک فال سمجھا جاتا تھا۔ اور (اس موقع پر) ایک دوسرے کو مبارکباد دی جاتی تھی۔ گھوڑوں کو عرب اپنے اُن خیموں میں جہاں بال بچے رہتے ہیں اُن و محبت کے ساتھ سدھاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ اُن میں شرافت اور خاندان کے ساتھ اُلفت کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ صرف قدم چلنے اور سرپٹ دوڑنے کے عادی بنائے جاتے ہیں۔ ہمیز اور چابک کے لگا تار غلط استعمال سے اُن کے احساسات کو کسب نہیں کیا جاتا۔ اُن کی قوتوں کو بھانگنے اور تعاقب کرنے کے مواقع کے لئے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ جیسے ہی وہ ہاتھ کی پٹکی یا رکاب کا اشارہ پاتے ہیں تو ہوا کی طرح اڑنے لگتے ہیں۔ اور اگر اُن کا سوار اُن کی رشتہ کی تیزی کی وحشت بربا سے جُدا ہو جائے تو فوراً رنگ جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ پھر اپنی نشست جمائے۔

افریقہ اور عرب کے ریگستان میں اونٹ ایک مقدس اور بیش بہا حیوان ہے۔ یہ مضبوط اور صابر باربر وار لیجر کھائے پئے کئی کئی دن تک سفر کر سکتا ہے۔ تازہ پانی کا ذخیرہ ایک بڑی پتیلی میں محفوظ رہتا ہے جو حقیقت میں اس جانور کا جس کے جسم پر محنت و شفقت اور غلامی کے نشانات پڑے ہوئے ہیں پانچواں پیٹ ہے۔ بڑی نسل کے اونٹ ہزار پونڈ تک بوجھ لے جاسکتے ہیں۔ اور ناقہ جو ہلکا چھلکا اور پھر تیلے بدن کا ہوتا ہے۔ قدر میں تیز سے تیز گھوڑی کو مات کر سکتا ہے۔

مردہ یا زندہ اونٹ کے جسم کا ہر حصہ انسان کے لئے کارآمد ہے۔ اس کا دودھ بہتر ہوتا ہے اور اس میں غذائیت ہوتی ہے۔ نو عمر اونٹ کا نرم گوشت بچھڑے کے گوشت کی طرح لذیذ ہوتا ہے۔ اس کے پیشاب ایک قسم کا قیمتی نمک بکالا جاتا ہے۔ اس کی میٹگنیاں، ایندھن کی قلت کو دور کرتی ہیں۔ اس کے لمبے لمبے بالوں سے جو ہر سال گر کر نئے پیدا ہوتے ہیں، بوفول کے کپڑے، فرش فروش اور خیمے بنے جاتے ہیں۔

برسات کے موسم میں وہ ریگستان کی کمیاب اور ناکافی گھاس بھوس پر گزارہ کرتے ہیں۔ موسم گرما کی شدت اور سردی کے قحط کے زمانے میں وہ اپنے ڈیرے خیمے ساحل کی طرف یمن کی پہاڑیوں میں یا فرات کے اس پاس لے جاتے ہیں۔ اکشر انہوں نے دریائے نیل کے ساحل یا شام و فلسطین کے دیہات پر پڑنے کا خطرناک اقدام بھی کیا ہے۔

خانہ بدوش عرب کی زندگی خطرہ اور مصیبت کی زندگی ہے۔ اور کوبعض اوقات وہ لوٹ یا تبادلہ کے ذریعہ سے اپنی کاریگری کا ٹرچال کر لے گمہ یورپ کا ایک معمولی شہری عرب کے اس صاحبِ انتخار امیر سے جو میدانِ جنگ میں ۱۰ ہزار سواروں کی کمان کرتا ہو زیادہ دولت و عیش کا مالک ہے۔

عرب کے شہر | لیکن پھر بھی عربی قبائل اور تنہا قوم کے وحشی گردہوں میں ایک خاص

فرق پایا جاتا ہے۔ کیونکہ عربوں میں سے بہت سے لوگ شہروں میں رہتے تھے اور تجارت و زراعت میں مشغول تھے۔ ان شہری عربوں کے وقت اور صنعت کا ایک حصہ اپنے مریشیوں کے انتظام کی نذر بھی ہوتا تھا۔ وہ صلح اور جنگ میں اپنے بدوی بھائیوں سے ملتے جلتے تھے اور بدوی ان لوگوں کے تعلقات کی وجہ سے اپنی ضروریات کے سامان اور صنعت و حرفت اور علم کی شد بد حاصل کرتے تھے۔

عرب کے بیاہیں شہروں میں سے جن کے نام ابوالفدا نے گنائے ہیں سب سے پرانے اور سب سے زیادہ آباد شہر، عرب کے زرخیز خطہ میں واقع تھے۔ صنعا کی میناریں اور مارتب کے حیرت انگیز حوض حمیری بادشاہوں کے بنوائے ہوئے تھے۔ لیکن ان کے بڑی سیاح جہ و جلال پر مدینہ و مکہ کی پستی بہت زیادہ عظمت کی وجہ سے پردہ چڑ گیا۔

مکہ | مکہ و مدینہ، یہ دونوں شہر بحیرہ احمر کے کنارے ایک دوسرے سے ۷۰ میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ محترم الذکر مقدس شہر یونانیوں میں مکہ دبا کے نام سے مشہور تھا اس کے آخری حرف (با) سے اس کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ جو درحقیقت اپنے عروج کے زمانہ میں بھی کیا لمبا طویل و عرص اور کیا لمبا طویل مردم شماری مارسیلز سے نہیں بڑھا۔ کسی پوشیدہ مقصد نے، شاید تو ہم پستی نے اس شہر کے بانیوں کو اس بنجر زمین کے انتخاب پر آمادہ کیا ہو گا۔

تین خشک پہاڑوں کے دامن میں مدینہ، لمبے اور ایک میل چوڑے میدان میں انہوں نے اپنے مٹی اور پتھر کے مکانات کھڑے کر دیئے۔ زمین پتھریلی ہے۔ زمزم کے مقدس کنوئیں تک کا پانی کٹھا اور سیلا ہے۔ چراگاہیں شہر سے فاصلہ پر ہیں۔ انکو تقریباً ستر میل دور طائف کے باغوں سے یہاں لائے جاتے ہیں۔

مکہ کے عالم قلبیہ قریش کا جوش و خروش اور ان کی شہرت عربی قبائل میں نمایاں تھی۔ لیکن ان کی بنجر زمین زراعت کے موافق نہ تھی۔ اس لئے ان کی حالت تجارتی جدوجہد کے لئے

سازگار تھی۔ جدہ کی بندرگاہ کی وجہ سے جو صرف چالیس میل کے فاصلہ پر ہے وہ ابی سینیا کے ساتھ آسانی سے تعلقات رکھتے تھے۔ یہی عیسائی حکومت تھی جس نے پہلے پہل حضرت بنی کریم کے اصحاب کو اپنے ہاں پناہ دی۔ افریقہ کی دولت جزیرہ نما کے اس طرف جبرہ یعنی قلیف تک جاتی تھی جو بحرین کے صوبہ میں ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس کے لئے مشہور ہے کہ کلدانیہ کے نکالے ہوئے لوگوں نے شور چٹان سے بنایا تھا۔ وہاں سے یہ سامانِ خلیج فارس کے مٹیوں کے ساتھ بیڑوں پر فرات کے دہانہ تک پہنچایا جاتا تھا۔

مکہ :- دامنِ طرفِ یمن اور بامیں طرفِ شام، ان دونوں کے بیچ میں مکہ تقریباً مساوی فاصلہ پر یعنی ایک مہینہ کی راہ پر واقع ہے۔ اول الذکر مکہ کے (تجارتی) کاروانوں کا سرمائی مستقر اور آخر الذکر گرمائی مستقر تھا۔ ان کاروانوں کی وقت پر آمد ہندوستان کے جہازوں کو بحرِ احمر کے تکلیف دہ سفر کی زحمت سے بچالیتی تھی۔ صنعا اور ماریب کی منڈیوں میں، عمان اہل عدن کی بندرگاہوں پر قریش کے اونٹ خوشبودار مصالحوں کے قیمتی سامانِ تجارت سے لادے جاتے تھے۔ اور بصری اور دمشق کے بازاروں سے غلہ اور مصنوعات خریدا جاتا تھا۔ اس منفع بخش تہاؤل اجناس کی بدولت مکہ کی گلیوں میں دولت اور افراطِ بکھری بکھری پھرتی تھی۔ اور وہاں کے شریف زادے فنونِ جنگ کے شغف کے ساتھ ساتھ تجارت کو بھی اپنا مشغلہ بناتے تھے۔

عربوں کی فوجی آزادی | عربوں کی اُولی آزادی کی اپنے اور پرانے سب قصیدہ خوانی کرتے چلے آئے ہیں اور فنِ مناظرہ کی بدولت تو یہ عجیب واقعہ اسمعیل کی اولاد کے حق میں ایک پیشینگوئی اور سمجھ بن گیا ہے۔ بعض مستثنیات جن کو نہ نظر انداز کیا جاسکتا ہے نہ چھپایا جاسکتا ہے، اس قسم کے طرزِ استدلال کو فضول اور لامبانی بناتے ہیں ولایتِ یمن کے بعد نجد کے حبشیوں، ایرانیوں، مصری سلاطین اور ترکوں کے ماتحت رہتی چلی آئی ہے؛

حرین شریفین تو کئی بار ایک سیٹھین غلام کے سامنے جھک چکے ہیں۔ عرب کے رومی صوبے میں تو رخصتیت سے، وہ مخصوص صحرا شامل تھا جس میں کسٹیل اور اُن کے فرزندوں نے اپنے بھائیوں کے مقابل خیمے لگائے ہوں گے۔

خسیر یہ مستثنیاتِ عارضی یا مقامی حیثیت رکھتی ہیں۔ بحیثیت ایک قوم کے عرب بڑے سے بڑے شہنشاہ سے بھی مغلوب نہیں ہوئے۔ سیاست پس ہو یا سائرس۔ پوتی ہو یا طہرجان کوئی بھی عربوں پرستخ حاصل نہ کر سکا۔ ترکوں کا موجودہ بادشاہ ایک مہموم امتدار رکھتا ہو تو رکھتا ہو مگر اُس کا سارا خیر صرف اِس بات تک محدود ہے کہ وہ ایک ایسی قوم کی دوستی کا خواہاں ہے جس کو اشتعال دلانا خطرناک ہے اور جس پر حملہ کرنا بے سود ہے۔

ان کی آزادی کے اسباب نمایاں ہیں اور اُن کے کردار اور اُن کے ملک کے چپے چپے پر ثبت ہیں۔ ظاہری اسباب اُن کے اور اُن کے ملک کے حالات میں مضمر ہیں۔ حضرت رسولِ خدا سے صدیوں پہلے جارحانہ اور مدافعانہ جنگوں کے دوران میں اُن کی ہیبتناک شجاعت کا سکہ اُن کے ہمایوں کے دلوں پر جم چکا تھا۔ صبر و استقلال اور پھرتی کی سپاہیانہ صفیتیں شبانی زندگی کی منضبط عادتوں کی بدولت غیر محسوس طور پر نشوونما پاتی ہیں۔

بھیڑوں اور اونٹوں کی نگہداشت کا کام قبیلے کی عورتوں پر چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن جنگجو نوجوان گھوڑے پر سوار اپنے امیر کے علم کے زیر سایہ ہمیشہ میدانِ جنگ میں حاضر رہتا ہے اور کمان، نیزہ اور خنجر کے استعمال کی مشق بڑھاتا رہتا ہے۔ اُن کی حریت اور آزادی کی طویل یاد اِس امر کی ضمانت ہے کہ وہ ہمیشہ آزاد رہیں گے۔ اور اُن نے والی نسلیں اپنے آپ کو غلبہ صالح ثابت کرنے کے لئے بے چین اور اپنی اِس موروثی خصوصیت کو قائم رکھنے کے لئے جوش و خروش کے ساتھ آمادہ رہتی ہیں۔ مشترک دشمنی کے حملے کے وقت اُن کی خانہ جنگیاں ملتوی ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ترکوں سے ان کی پھیلی جنگ میں کتے کا کاروان اتنی ہزار اتحادیوں نے لوٹ لیا تھا۔

جب وہ لڑائی کے لئے بڑھتے ہیں تو فتح و ظفر کی امید اُن کی نظروں کے سامنے اور بھاگ کر صاف نکل جانے کا یقین اُن کے عقب میں ہوتا ہے۔

ان کے گھوڑے اور اونٹ جو آٹھ دس دین میں پانچ پانچ سویل کے دھاوے مارتے ہیں فاتح کی نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ رنجستان کے پوشیدہ چشے اس کی تلاش و جستجو سے باہر ہوتے ہیں۔ ایک ایسے اوجھل دشمن کے تعاقب میں جو اُس کی کوششوں کو خاک میں ملا دیتا ہے اور مرنے میں رنجستان کے بیچ میں کسی پتے ہوئے گمشدے میں آرام لیتا ہے اس کا ظفر یاب لشکر بھوک پیاس اور تھکان سے چکنا چور ہو جاتا ہے۔

بدوؤں کے ہتھیار اور اُن کا رنجستان صرف انہی کی آزادی کا ضامن نہیں بلکہ یہ شاداب عرب کے لئے بھی روک ہیں۔ جہاں کے باشندے لڑائی سے الگ تھلگ رہنے اور زمین اور آب و ہوا کی دی ہوئی نعمتوں کی افراط کی بدولت بزدل ہو گئے ہیں۔ غسطنس نے جب حملہ کیا ہے تو اُس کا لشکر بیماری اور تھکان کے مارے تتر بتر ہو گیا تھا۔ اور یہ صرف بکری قوت ہی ہے جس کی بدولت کبھی کبھی عین کو کا مسیابی کے ساتھ زیر کیا جا سکا ہے۔

جب نبی کریم علیہ آلہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا مقدس علم بلبت فرمایا تو یہ خطہ حکومت فارس کا ایک صوبہ تھا۔ لیکن پھر بھی سات حمیری شہزادے پہاڑوں میں حکمرانی کرتے تھے۔ اور کسریٰ کے نائب سلطنت کو اپنے دور دراز ملک اور بد قسمت آقا کو بھول جانے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ جسطیفین کے عہد کے مورخین نے آزاد عربوں کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے جس کو مشرق کی طویل جنگوں کے زمانہ میں قلعن یا مفاد نے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ قبیلہ غسان کو شامی علاقہ میں آباد ہونے دیا گیا۔

۱۔ ص ۲۴۰۔ م میں جب غسطنس روم کا قیصر تھا تو اُس کے حکم سے ایلینس گیلیس حاکم مصر نے عرب پر حملہ کیا۔ پہلی جرقہ زامد کا مشہور کوئز ہے لکھا ہے کہ اُس نے مدینہ کے قریب انگر اندونیا اور ایک ہزار سئیں تک دھاوا مارا۔ مگر بے سود۔ فوج گرم آبلے تھامی "ناب نہ لاسکی اور سیمار پڑ گئی" :

حیرہ کے شہزادوں کو بابل کے کھنڈروں سے تقریباً چار میل جنوب کی طرف ایک شہر بنانے کی اجازت دے دی گئی۔ میدان جنگ میں تو یہ لوگ پھرتی اور بہت سے کام کرتے تھے۔ مگر ان کی دوستی بے بقا، وفاداری ناپائدار اور دشمنی مستعجل تھی۔ ان خانہ بدوش و شیون کو مشغول کر دینا ہلکڑاُن سے ہتھیار رکھوا دینا مشکل تھا۔

جنگ کے دوران میں ملنے جلنے کی وجہ سے انھوں نے روم اور فارس دونوں کی ساند کا مرمی کا پتہ لگا لیا تھا اور وہ اُس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔

یونانیوں اور رومیوں نے مکہ سے لے کر فرات تک رہنے والے تمام عربی قبائل کو "سیراسنس" کا مہم لقب دے رکھا تھا۔ یہ وہ لقب ہے جو عیسائی کی زبان پر خوف اور نفرت کے ساتھ آتا ہے۔

عربوں کی خانگی آزادی اور حُریت | خانگی استبداد کے بندے خواہ مخواہ اپنی قومی حریت کی شہنی گھارتے ہیں۔ مگر عرب سچ پنج شخص آزادی کا مالک ہے۔ خدا کے لئے ہوئے مخصوص احتیارات کو ہاتھ سے لئے بغیر وہ ایک حد تک سوسائٹی کی برکات سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے ہر قبیلے میں توہم، احسان، یا دولت کی وجہ سے ایک مخصوص خاندان اپنے ہمسروں پر سبقت لے جاتا ہے۔ ریاست اور امارت ہمیشہ اسی مخصوص نسل میں چلتی رہتی ہے۔ لیکن وراثت کا قانون بے ضابطہ اور غیر معین ہوتا ہے۔ اپنے زمینداروں سے جھگڑے چکاتے اور اپنی (اعلیٰ) مثال سے ہماروں کی رہنمائی کرنے کے سادہ مگر اہم عہدے کے لئے اپنے شریف اقرباء میں سے سب سے زیادہ لائق یا معزز بزرگ چُن لیا جاتا ہے۔ ملکہ زینوبس کے ان ہوطنوں نے عقل و فراست والی پرجوش عورتوں کو کبھی حکمرانی کرنے کا موقع دیا ہے۔

چند قبیلوں کا ہنگامی طور پر ایک جگہ جمع ہو جانا لشکر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ذرا اور گہرا تعلق قائم ہوا تو ایک قوم بن گئی۔ اب ان کا بڑا سردار امیر الامراء جس کا علم

اُن کے سَرول پر لہرا رہا ہے باہر والوں کی نظر میں شاہی خطاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔
 اگر عربی اُمراء اپنی قوت کا غلط استعمال کرتے ہیں تو اُن کو فوراً ہی یہ سزا مل جاتی ہے کہ
 اُن کی رعایا جو نرم اور پدرانہ سلوک کی عادی ہے اُن کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔
 اُن کی نوح آزاد ہے۔ اُن کے قدم غیر مقید۔ ریگستان کھلا ہوا ہے۔ قبال اور
 خاندان باہمی اور خستکاری سمجھوتے سے مجتمع رہتے ہیں۔

یمن کے نسبتاً نرم باشندے شاہی شان و شوکت کی تائید تو کرتے تھے لیکن اگر
 بادشاہ اپنی جان کو خطے میں ڈالے بغیر محل سے نہیں نکل سکتا تھا تو حکومت کی عالمانہ قوت
 اُمراء اور قاضیوں کے ہاتھ میں چلی جاتی تھی۔ ایشیا کے بیچوں بیچ مکہ اور مدینہ کے شہر
 (یوں سمجھ لیجئے کہ) دولت مشترکہ کی شکل یا ہسولی پیش کرتے ہیں۔ حضرت نبی کریم کے دادا
 اور اُن کے آباؤ اجداد، خارجی اور داخلی معاملات میں ملک کے حاکم نظر آتے ہیں۔
 لیکن ایتھنز کے پیری کلیس اور فلورنس کے میڈیچی کی طرح وہ اپنی عقل اور دیانت کی
 وجہ سے حکمران تھے۔ اُن کا اثر اُن کے ترکے کے ساتھ ساتھ تقسیم ہوتا رہا۔ اور امارت
 رسول کریم کے اعام سے نکل کر قریش کی ایک نوخیز شاخ کے قبضہ میں چلی گئی۔

اہم مواقع پر وہ بزم شوریٰ منعقد کرتے تھے۔ نوع انسانی سے اپنی بات منوانے
 کے وہی طریقے ہو سکتے ہیں۔ باتو قوت کے زور سے اُسے دبایا جائے یا اُس کو ہم خیال
 بننے کی ترغیب دی جائے۔ قدیم عربوں میں فنِ خطابت کا رواج اور شہرت اس بات کا
 کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اُن میں جمہوری آزادی موجود تھی۔ لیکن اُن کی سیدھی سادی آزادی
 یونان اور روم کی جمہوریتوں کی اس لطیف اور مصنوعی مشینری سے جدا تھی۔ جس میں ہر رکن
 جماعت کے شہری اور ملکی حقوق میں غیر منقسم حصہ رکھتا تھا۔ عربوں کی نسبتاً زیادہ سادہ
 ریاست میں قوم بالکل آزاد ہوتی ہے۔ کیونکہ ملت کا ہر فرد کسی آقا کی ذلیل اطاعت
 کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا سینہ ہمت و شجاعت۔ صبر و استقلال، رقت و

پرسہ نگاری کی سخت و ترش صفات سے مضبوط رہتا ہے۔ آزادی کی محبت اُس کو خود جستجاری کی عادتوں پر عمل پیرا ہونے پر آمادہ کرتی رہتی ہے اور بے عزتی کا ٹھٹھا اُس کو تکلیف۔ خطرے اور موت کے ذیل خوف سے محفوظ رکھتا ہے۔ اُس کے ارادے کی پختگی اُس کے ظاہری حرکات و سکنات تک سے نمایاں ہوتی ہے۔ اس کی گفتگو آہستہ وزن دار اور مختصر ہوتی ہے۔ وہ شاید ہی کبھی کھل کھلا کر ہنستا ہو۔ وہ صرف ایک ہی حرکت کرتا ہے کہ اپنی ڈاڑھی پر جو مردانگی کا قابلِ عزت نشان ہے ہاتھ مارتا ہے۔ اپنی عزت کے احساس نے اُس کو اپنے ہنر متب لوگوں کے ساتھ بے تکلف اور اپنے سے بڑے رتبہ والوں کے ساتھ بے خوف ہو کر بات چیت کرنا سکھا دیا ہے۔

عربوں کی آزاد منشی اُن کی فتوحات کے بعد بھی قائم رہی۔ خلفائے سابقین اپنی رعایا کی صاف گوئی اور آزاد بسیانی کی قدر کرتے تھے۔ وہ جامعیتِ ملین کو اپنا ہنجیال بنانے اور باخبر کرنے کے لئے "کمشنر" منبر پر جاتے تھے۔ دار الخلافہ کے بطلے کے کنارے منتقل ہو جانے سے قبل عباسیوں نے ایرانی اور بازنطینی دربار کی متکبرانہ ذوق برقیں بھی جستجاری نہ کی تھیں۔

ملکی جنگیں اور ذاتی انتقام | اقوام اور افساد کا مطالعہ کرتے وقت ہم اُن اسباب بنا دیتے ہیں یا اُن کے سماجی کردار کو محدود یا وسیع یا دھما یا مینز کر دیتے ہیں۔

عرب باقی دنیا سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ "عربی" اور "دشمن" کے لفظ کو مترادف سمجھنے لگے ہیں۔ ملک کے افلاس نے ایک اصولی قانون بنا دیا جس کو وہ اب تک مانستے ہیں اور اُس پر عمل پیرا ہیں۔ اُن کا گمان ہے کہ جب زمین تقسیم ہو رہی تھی تو سیر چل اور زرخیز قلیں نسل انسانی کی دوسری شاخوں کو دے دی گئی تھیں۔ اب مافران اسمیل کی اولاد اپنا وہ حصہ جس سے وہ محروم رکھی گئی تھی واپس لینے کا حق رکھتی ہے خواہ جبراً

یا دھوکے سے۔

پہلینی کے بیان کے مطابق عربی متباہل تجارت اور لوٹ مار دونوں کے مساوی طور پر عادی ہیں۔ وہ کاروان جو ریگستان میں سے گزرتے ہیں یا تو لوٹ لئے جاتے ہیں یا ان کو خدیہ لے لیا جاتا ہے۔ ہمسایہ ہالاک کے باشندے یونس اور سیاسطرس کے زمانہ سے ان کے غارتگرانہ جوش و خروش کا شکار ہوتے چلے آئے ہیں۔

جب کوئی بد کسی تنہا مسافر کو دور سے آتا ہوا دیکھتا ہے تو غصے میں بھرا ہوا اس کی طرف گھوڑا بڑھاتا ہے اور چلا کر کہتا ہے ”کپڑے لٹے اُتار کر رکھ دو“ تمہاری جچی (یعنی میری بیٹی) بے چاری ننگی بیٹھی ہے۔ اگر وہ فوراً ہی اس حکم کی تعمیل کر دے تو جسم کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ مزاحمت ظالم کو اور برا ٹکینختہ کرتی ہے۔ جو خون (مسافر) اپنی جائز حفاظت کے لئے بہانا چاہتا ہے۔ اس کا کفارہ صرف اس کا خون ہی ہو سکتا ہے۔

کوئی اکاؤنٹ قزاق یا چنند سامتی تو اپنے اصلی نام سے پکارے جاتے ہیں لیکن ایک پردے گروہ کی ترکتا زیاں جائز اور قابلِ فخر جنگ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ ایک ایسی قوم کا مزاج جو نوعِ انسانی کے خلاف یوں آمادہ جنگ بیٹھی تھی، لوٹ مار، قتل و غارت اور انتقام کی خاندان ساز اجازت سے اور مشتعل ہو گیا۔

یورپ کے قانون اساسی میں آج کل صلح و جنگ کرنے کا اختیار چند گنے پھنے معزز بااختیار آدمیوں کو حاصل ہے۔ اور اس اختیار کو استعمال کرنے کا حق اور بھی کم گروہوں کو ہر۔ لیکن ہر ایک عرب بے خوف و خطر اور کھلم کھلا اپنے نیٹے سے کسی ہون پر حملہ کر سکتا ہے۔

قوی اتحاد، زبان اور اخلاق کی ایک مبہم مشابہت پر مشتمل تھا اور ہر جماعت میں قاضی کا اقتدار اور اثر برائے نام تھا۔

زمانہ جاہلیت (یعنی نبی کریم کی آمد سے قبل) کی سترہ سو لڑائیوں کا حال روایتوں میں موجود ہے۔ کسی بدخلق گروہ کی عداوت کی وجہ سے لڑائی چھڑ جاتی تھی۔ کسی ہٹی ہوئی جنگ کا بیان

نظم یا شعر میں سُننا دینا حریف قبائل کی اولاد کے سینوں میں عداوت کی بجھی ہوئی آگ کو بھڑکا دینے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ خانگی زندگی میں ہر آدمی یا کم از کم ہر خاندان اپنے مقدمات کا خود ہی بیج اور خود ہی بدلہ لینے والا تھا۔

خود داری کا وہ لطیف احساس جو نقصان سے زیادہ ہتک حرمت کو اہمیت دیتا ہے عرب کی لڑائیوں پر ہلک زہر پاشی کرتا ہے۔ ان کی عورتوں اور ڈاڑھیوں کی ہتک عزت بڑی جلدی ہو جاتی ہے۔ کسی ہامشائیت فعل یا قابل نفرت لفظ کا کفارہ صرف ملزم کے خون ہی دے ہو سکتا ہے۔ اور اندر سے اُن کا صبر آزما استقلال کہ ہمینوں اور برسوں وہ انتقام کی گھات میں لگے رہتے ہیں۔ جرمانہ یا خونبہا کا راج ہر زمانہ کے حشیوں میں رہا ہے مگر عرب میں مقتول کے وارثوں کو اختیار ہے خواہ خونبہا قبول کر لیں یا قانون انتقام پر عمل درآمد کریں۔

عرب کے اعلیٰ طبقہ کی عداوت کا تو یہ حال ہے کہ قاتل کا سر لینے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ بلکہ مجرم کے بدلے کسی بے گناہ کو فدیہ قرار دیتے ہیں۔ قاتل کے خاندان کے بہترین اور سربراہ اور وہ آدمی کو مار کر انتقام کی آگ بجھاتے ہیں۔ اگر وہ ان کے ہاتھوں مارا جاتا ہے تو اب اُن سے انتقام لینے کی باری آتی ہے۔ اور اُن کی جان ہر وقت خطرے میں ہے۔ اس خونی قرضہ کا اصل اور سود اسی طرح جمع ہوتا رہتا ہے۔ فریقین میں سے ہر قبیلے کے افراد عداوت اور بدگمانی میں زندگیاں گزار دیتے ہیں اور بعض اوقات انتقام کے حساب کتاب کو طے کرتے ہوئے نصف صدی گزر جاتی ہے۔

یہ خونی جوش و خروش جس میں رسم اور عفو کا پتہ بھی نہیں چند اصول اخلاق نے پیدا کر دیا ہے۔ ان اصول کی رو سے یہ ضروری ہے کہ ان متجارب فریقوں کی عمر قوت۔ تعداد۔ اور ہتھیار میں کچھ مساوات ہو۔

حضرت نبی کریم سے قبل عرب دو ماہ یا شاید چار ماہ کو مقدس سمجھتے تھے اور اس زمانے میں اُن کی تلوار مذہبی احکام کی رو سے زیرِ نیام رہتی تھی۔ حاجی اور غلی کسی قسم کی لڑائی

میں حصّہ نہ لیتے تھے۔ یہ عارضی صلح کا زمانہ اُن کی سرکشانہ اور غازیانہ عادات کا مضبوط ثبوت ہے۔
شہری عادات و خصال | لوٹ مار اور انتقام کا جذبہ، تجارت اور ادبیات کی سکون بخش
 اثر سے اعتدال پر آگیا تھا۔ یہ تاریک جزیرہ سماجی طور سے
 عہد قدیم کی ہندو تہذیب ترین اقوام سے گھرا ہوا ہے۔ تاجر، فروع انسانی کا ہمدرد ہوتا ہے۔ سالانہ
 آنے جانے والے (تجارتی)، کھانوں نے علم اور سائنس کی ترقی کے ابتدائی اصول شہروں
 اور ریگستان کے خیروں تک میں داخل کر دیئے۔ عربوں کا حسب و نسب کچھ ہی کیوں نہ ہو
 لیکن اُن کی زبان، زبانوں کے اُسی خاندان کی شاخ ہے جس سے عبرانی، سریانی اور
 کلدانی زبانیں نکلی ہیں۔

مستقبل کی آزادی کا اثر اُن کی مخصوص بولیوں پر بھی نمایاں تھا۔ لیکن اپنی زبان کے بعد
 قریبیدگئے کے خالص اور صفات محاورات کو سبجا طور پر ترجیح دیتا تھا۔
 یونان کی طرح عرب میں بھی زبان کی تکمیل، اخلاق و آداب کی تہذیب پر سبقت لے گئی
 تھی۔ ان کی گفتگو میں شہد کے لئے ۸۰ سانپ کے لئے ۲۰۰ شیر کے لئے ۵۰۰
 اور تلوار کے ۱۰۰۰ مختلف نام استعمال ہوتے تھے۔ اور یہ حال اس وقت تھا جب لمبی چوڑی
 نعت، جاہل قوم کی قوتِ حافظہ کے سپرد تھی۔ حمیریوں کی یادگاروں پر ایک متروک اور مخفی
 رسم الخط میں کتبے لکھے ہوئے تھے لیکن خط کو فی جس پر موجودہ خط کی بنیاد رکھی گئی ہے، فزات
 کے کنارے ایجاد ہوا تھا۔ اور اس جدید ایجاد کی تعلیم کئے میں ایک اجنبی آدمی نے پھیلائی جو حضرت
 بنی کریم کی ولادت کے بعد اس شہر میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ فنِ صرف و نحو، عروض و معانی و بیان
 سے عرب کے آزاد فصحا نا بلد تھے۔ لیکن ان کی قوتِ فہم تیز۔ ان کی قوتِ متحدہ بھرپور اور ان کی
 عقل و فراست پختہ، چچی ملی تھی۔ اُن کے محنت سے تیار کئے ہوئے خطبے زور و اثر طریق پر
 سامعین کے سامنے بیان کئے جاتے تھے۔ اور اُن کے دل پر اُن کا اچھا خاصا اثر ہوتا تھا۔
 ایک نوخیز شاعر کی جدت اور کمال پر اُس کے اور اُس کے عزیز قبیلوں کے لوگ خوشامیاد

مناتے تھے۔ شاد مار دعوت کی جاتی تھی۔ جس میں عورتیں اپنی شادی کی سی شان و شوکت کا مظاہرہ اپنے لڑکوں اور شوہروں کے سامنے کر کے دف سجا بجا کر اپنے مقبیلہ کی اس خوش قسمتی کے گیت گاتی تھیں کہ ایک بہادر سپاہی ہو گیا ہے جو ان کے حقوق کی نگرانی کرے گا اور ایک نقیب نے آواز بلند کی ہے جو ان کے نام کو حیاتِ جاوداں نکھٹے گا۔

دور و دراز مقامات پر رہنے والے یا دشمن قبائل ایک سالانہ میلے میں جمع ہوتے تھے جو ابتدائی مسلمانوں کے مذہبی تعصب کی وجہ سے بند ہو گیا۔ یہ ایک قومی اجتماع تھا جس کے اثر نے ان وحشی لوگوں کو سنیائیت بنانے اور میل جل پیدا کرنے میں ضرور امداد کی ہوگی۔ تیس روز شراب اور غلے ہی کے نہیں بلکہ فصاحت و بلاغت اور شاعری کے یعنی دین کے شغل میں گذر جاتے تھے۔ شاعر لوگ دل کھول کر اس انعامی مقابلے میں حصہ لیتے تھے۔ اور فاتح کا شہکار امر اور وہ ساء کے خزانوں میں محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ ہم اپنی زبان میں وہ سات اصل نظمیں پڑھ سکتے ہیں جو سنہری حرفوں سے لکھ کر کعبہ کے معبد میں معلق کر دی گئی تھیں۔ عرب کے شہزاد اپنے عہد کے مورخ اور معلم اخلاق ہوتے تھے۔ اور اگر ایک طرف وہ اپنے ہم وطنوں کے تعصبات سے ہمدردی رکھتے تھے تو دوسری طرف ان کی صفاتِ حسنہ کو بھی بڑھاتے چڑھاتے تھے۔ سخاوت اور شجاعت کا چلی دامن کا ساتھ ان کے قصیدوں کا محبوب موضوع ہوتا تھا۔ اور جب وہ کسی بُرے خاندان کی سخت ہجو کرنا چاہتے تھے تو وہ بُرا بھلا کہتے کہتے یہ بیان کرتے تھے ان کے مرد دینے کا اور ان کی عورتیں انکار کرنے کا نام بھی نہیں جانتیں۔

دہی مہمان نوازی جس کا مظاہرہ حضرت ابراہیمؑ نے کیا تھا اور جس کی تعریف ہوسر شاعر نے کی ہے اب بھی عربوں کو

سخاوت کی مثالیں

خیوں میں موجود ہے۔ جو سخاوت بدو جس سے سالارِ نجستان کا پوتا ہے بغیر سوال و جواب یا تال کے اس اجنبی مسافر کو گھلے لگا لیتا ہے جو اس پر اعتماد کر کے اس کے خیمے میں داخل ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہر بانی اور ادب سے سلوک کیا جاتا ہے اور وہ اپنے میزبان کی

منفلی یا امیری میں حصہ دار ہو جاتا ہے اور جب وہ آرام کر چکتا ہے تو شکریے کے ساتھ دعاؤں کے ساتھ اور کبھی کبھی تحفہ تحائف کے ساتھ رخصت کیا جاتا ہے۔

اگر کوئی بھائی یا دوست حاجمند ہو تو دل اور ہاتھ زیادہ کشادہ ہو جاتے ہیں۔ جو عامۃ الناس کی تحسین و آفرین کے مستحق ہوتے ہیں بہادرانہ کارنامے وہ ہیں جو تمیز اور تجربے کے تنگ انداز سے بالا ہوں۔ ایک بحث شروع ہوئی تھی کہ کتے کے باشندوں میں سب سے زیادہ سخی کہلانے کا مستحق کون ہے۔ یکے بعد دیگرے اُن تین آدمیوں کو آزمایا گیا جو سب سے زیادہ اس کے مستحق نظر آتے تھے۔ عبد اللہ بن عباسؓ کو ایک لمبا سفر درپیش تھا انھوں نے پاؤں رکاب میں رکھا تھا کہ ایک سائل کی آواز سنی۔ ”اے ابنِ عسّم رسول! میں ایک مصیبت زدہ مسافر ہوں“ وہ فوراً اتر پڑے اور زائر کو اپنا اونٹ مع قیمتی ساز و سامان اور چار ہزار اشترنیوں کی ایک ٹھیلی کے عطا فرمایا۔ صرف تلواریں بچا لی یا تو اس لئے کہ وہ پہلی فولاد کی تھی یا اس لئے کہ کسی عزیز کا تحفہ تھی۔

قیس کے غلام نے دوسرے سائل سے کہا کہ میرا آقا خواب راحت میں ہے مگر لو یہ سات ہزار اشترنیوں کی ٹھیلی ہے (بس اس وقت چار سے پاس ہی ہے) اور یہ ایک نوشتہ ہے جس کے ذریعے تم کو ایک اونٹ اور غلام مل جائے گا۔ آقا جب خواب سے بیدار ہوا (تو یہ حال سن کر) اُس نے دفا دار غلام کی تعریف کی اور اُس کو آزاد کر دیا۔ مگر اُس کو یہ نرم سی ملامت بھی کی کہ میری غنیمت کا خیال کر کے تم نے میری سخاوت پر دھبہ لگایا ہے؛ ان بہادروں میں سے تیسرا عہدہ نابینا نماز کے وقت دو غلاموں کے کا بندھوں پر سہارا لگائے ہوئے جا رہا تھا۔ اُس نے سائل کا سوال سن کر کہا ”اُسوں میرا خزانہ خالی ہے۔ لو تم ان غلاموں کو فروخت کر ڈالو۔ اگر تم ان کو قبول نہیں کرتے تو میں ان سے دست کش ہوتا ہوں“ یہ کہہ کر اُس نے نوجوان غلاموں کو علیحدہ کر دیا۔ اور لالچی کے سپہ سالار دیوار ٹول کر راستہ چلنے لگا۔

حاتم کی سیرت عربی صفات کا مکمل نمونہ ہے۔ وہ بہادر بھی تھا اور سخی بھی۔ فصیح البیان شاعر بھی تھا اور کامیاب لکیر بھی۔ اس کے وہاں نواز دسر خوان پر چالیس اونٹ کباب کئے جاتے تھے۔ ایک دشمن سائل کی درخواست پر اُس نے قیدی اور مال غنیمت دونوں واپس کر دیئے تھے۔ اس کے ہم وطنوں کی آزاد منشی کے سامنے قانونِ عدل کی کچھ حقیت نہ بھٹی۔ وہ خنجر کے ساتھ حرم اور مہربانی کے فطری جینے سے مغلوب ہو جاتے تھے۔



خطابت

اور

اُس کی مختصر تاریخ

بلسلہ مابقی

وعظ گوئی | خطابت کی ایک قسم وعظ گوئی بھی ہے۔ مذہبی حیثیت سے اُس کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اُس لئے کہ واعظ درحقیقت خلیفۃ اللہ اور نائبِ محل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس کے موضوع کا تعلق روحانیت اور نجاتِ ابدی سے ہوتا ہے۔ وہ سامعین کے ایمانی جذبات کو براہِ کھینچ کر کے اُن تمام حقوق کو واضح کرتا ہے جو خدا کے اُس پر اور اُس کے خدا پر ہیں۔ وہ جو کچھ کہنا ہے خدا اور رسول کی طرف سے کہتا ہے اُس لئے وہ دماغ میں جلا، جسم میں حرارت اور دلوں میں غل کا جوش پیدا کر دیتا ہے۔

مذہب کا اثر اور اُس کی ضرورت | دنیا میں اب تک جتنے بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے ہیں اُن پر اگر ہم نظر غائر ڈالیں نیز اُن انقلابات کی آڑ میں جو مختلف عوام پر پھیلے ہیں اُن کی بھی جستجو کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ اُن حالات کے دوران میں انسان ہمیشہ خیالات کا ایک مخصوص جامہ پہن لیتا ہے۔ اور انہیں مخصوص خیالات کا اُس پر غلبہ ہوتا ہے جن سے وہ اثر پذیر ہوتا ہے۔ اور وہی اُس وقت اُس کے اعمال کے محرک ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مجموعہ خیالات جو اُس وقت انسان پر حاوی ہوتا ہے اُس کی تعبیر اگر ہو سکتی ہے تو صرف لفظ ”مذہب“ یا ”دین“ سے۔

انسان کے لئے ہمیشہ ایک دین و مذہب کی ضرورت رہی ہے۔ جب تک کوئی مذہبی عقیدہ اُس کے دل و دماغ پر غلبہ حاصل نہیں کر لیتا اُس وقت تک اُس کو

قوائے عملِ شل اور اُس کے اعضاء بے حس و حرکت رہتے ہیں۔ مذہب کو لوگوں کے مشاعر و احساسات اور اعمال و افعال پر جو تسلط اور غلبہ حاصل ہے اُس کی بنا پر اس کی اہیت سے کسی سمجھ دار شخص کو انکار نہیں ہو سکتا۔

دنیا پر جب سے آفتاب تمدن نور افگن ہوا ہے اُس وقت سے اب تک انسان ہمیشہ مذاہب ہی کے آگے سرنگوں رہا ہے اور بانیانِ مذاہب ہی کے لئے اُس نے مختلف زمانوں میں طرح طرح کے بت، ہیاکل اور معاہدہ تعمیر کئے ہیں۔ دنیا کا ہر وہ تمدن جو کبھی روئے زمین پر آب و تاب سے جلوہ گر ہوا اُس کے آگے آگے ہمیشہ مذاہب ہی کی شعلیں رہنمائی کرتی رہی ہیں۔

ہر قوم کے لئے اُس کے عقائد اساسی نعمت ہوتے ہیں۔ اُن کی قدر کرنا اور شورشوں سے اُن کو محفوظ رکھنا اُس قوم کا اولین فرض ہوتا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ اُن کے زوال کا دن دراصل وہی ہے جب اُن کے عقائد کی بنیادیں کھوکھلی ہو جائیں اور معتقدات نشانہ ہدف بن جائیں۔

چونکہ لوگ ہمیشہ اپنے اپنے معتقدات کے پیچھے سرگردان رہتے ہیں اِس لہٰذا واعظوں کا اُن پر بہت آسانی سے منتر چل جاتا ہے۔ وہ بڑی شان سے اُن کے افعال و اعمال کی نگرانی کرتے ہیں اور اُن کے قوائے عمل سے حسب موقع اپنی مرضی کے مطابق جو چاہتے ہیں کام لیتے ہیں اور اُن کے خوف زدہ دلوں کے لئے سامانِ امید فراہم کرتے رہتے ہیں۔ گویا سامعین اُن کے ہاتھ میں ایک آلہ بے جان مچھتے ہیں۔ وہ انہیں جدھر چاہتے ہیں گھماتے رہتے ہیں۔

اقتدار اور پرہیزگاری | واعظ کو حقائقِ دینیہ اور احکامِ شرعیہ سے بخوبی واقف ہونے کے علاوہ دین دار اور متقی بھی ہونا چاہئے۔

یونان میں ڈیماسٹینز ایک مشہور جادو بیان خطیب گذرا ہے۔ جو فنِ خطابت کے

اسرار و دقائق کا بخوبی ماہر تھا۔ ایک مرتبہ لوگوں نے اُس سے دریافت کیا کہ ”خطابت میں کامیابی کا اصل راز کیا ہے؟“ اُس نے جواب دیا ”عمل“ لوگوں نے پوچھا اُس کے بعد؟ اُس نے کہا ”عمل“ انہوں نے پھر یہی سوال کیا کہ اُس کے بعد؟ اُس نے اِس مرتبہ بھی یہی جواب دیا کہ ”عمل“۔

دنیا میں کامیابی جس چیز کا نام ہے وہ دراصل تمام تر نتیجہ ہے اُس کے عمل اور پریہیزگاری کا۔ تاریخ میں صد ہا ایسی ہستیاں گزری ہیں جو علم و فضل، عقل و دانائی کے اعتبار سے گجائے روزگار تھیں لیکن اپنی بد عملیوں کی وجہ سے کج مرقع عبرت بنی ہوئی ہیں۔

دنیا میں گو صد ہا واعظ پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر غصہ سے دیکھا جائے تو ایسے بہت کم نکلیں گے جو وعظ گوئی کی درحقیقت اہلیت بھی رکھتے ہوں۔ مقررین اور دلائین کی فہرست میں ایسے لوگ بکثرت نظر آئیں گے جو اپنے موثرانہ خطبوں اور سپیچوں کے ذریعے لوگوں کو مسح کرتے تھے اور اپنے تقدس سے مرعوب کر کے لوگوں کو اپنے ذاتی اغراض کا شکار بناتے تھے۔ اور اِس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوتے تھے مگر آخر تلخ کہاں تک اِس حقیقت کو چھپا سکتا ہے کہ کبھی نہ کبھی انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا ہی پڑتا تھا۔

تاریخ میں اِس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں کہ بڑے بڑے پارساجن کے علم و فضل اور تقدس کی دور دور تک شہرت تھی جب اُن کا جائزہ پارسائی چاک ہوا تو کیا کچھ داغ سیہ کاری دیکھنے میں نہیں آئے۔

دور اکبری کا مشہور عالم قاضی مخدوم الملک جو ایک عرصہ تک ہندوستان کی مسند شیخ الاسلامی پر بھی متمکن رہ چکا تھا اد جس کی پابندی شریعت کی ایک دنیا ملاح تھی جب اُس کی قلعی کھلی تو دیکھنے والوں نے دیکھا اور سننے والوں نے

حیرت و استعجاب کے کانوں سے سنا کہ غضب کا سارا مال اُس کے یہاں سے برآمد ہوا۔ پھر آخر جو کچھ اُس کا حشر ہوا دنیا سے پوشیدہ نہیں۔

روکس پیر ایک زبان اور خطیب تھا جسے انقلاب فرانس کے دورِ اولین میں ایک خاص زعمانہ اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ مگر اُس کی بد اخلاقیوں نے اُس کی قسمت کا پانسہ پلٹ دیا۔ انقلابات کا جدید دور اُس کے زوال کا پیش خمیہ ثابت ہوا۔ اُترت کی دبی ہوئی مخالفتیں ابھری جو بالآخر اُس کے نام و نمود، عزت و اقتدار کو خاک میں ملا کر رہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو بات واعظ کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قبل اس کے کہ وہ مسند و عظم پر اپنے لئے کوئی جگہ چاہے اُس کو چاہئے کہ وہ اپنے عمل اور کردار کی اصلاح کرے، اپنے ظاہر و باطن کو درست کرے۔ اپنے غرور، ادا سے، عقائد و خیالات میں کچنگلی پیدا کرے۔ دعوت الی الحق اور اشاعتِ دین میں دنیا کا خوف، حکومت کا ڈر، جان و مال کی محبت، اعزاز و اقدار کی ملامت، کسی چیز کی پروا نہ کرے۔ اپنے اندر قوتِ ایمانی پیدا کرے۔ یہ ایک ایسی قوت ہے کہ جس شخص میں یہ پیدا ہو جاتی ہے اُس کی قوتِ اثر اندازی میں دس گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔

دنیا میں اب تک جو لوگ تاریخی انقلابات کے باعث ہوئے ہیں۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو وہ صرف چند سکین ہستیاں نکلیں گی جن کی قوتِ ایمانی نہایت مضبوط اور مستحکم تھی۔

انسان کی اصلی دین داری کا ظہور اُس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے اِلہ اور اپنی ذات کو معبودِ حقیقی کے اِلہ اور اُس کی ذات پر چھوڑ دیتا ہے اور اپنی مرضی کو اس کی مرضی کے لئے بالکل فنا کر دیتا ہے۔ جب یہ اعتقاد کی کیفیت انسان میں پیدا ہو جاتی ہے

تو اُس وقت تمام دوسرے خیالات کے گرد و غبار سے اُس کا شیشہ دل پاک صاف ہو جاتا ہے اور اُس کے تمام افعال و اعمال کا محور اور مرجع صرف وہی ذات ہوتی ہے جس کی رضا جوئی اور ذات پر اُس نے اپنی مرضی اور شخصیت کو نشا کر دیا ہے۔

عمدہ ہر شخص کی زبان اُس کے خیالات اور جذبات کی صحیح ترجمان ہوتی ہے۔ ایک متقی اور دارِ سیدہ شخص کی زبان پر وہی الفاظ آتے ہیں جو دنیا کی بے ثباتی، کائنات کی بوجھلک، حیاتِ دینی اور طاعتِ خداوندی کے مسترد ہوتے ہیں۔

مگر اس کے برعکس ایک دنیا دار اپنی بات چیت اور گفتگو میں انھیں الفاظ کا خگر بوتا ہے جن سے دنیا پرستی، غفلتِ شغری، عیشِ پسندی اور بیکرداری ظاہر ہوتی ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے وہ صد ہا خطبات جو نہ صرف خطابت و بلاغت کی جان سمجھے جاتے ہیں بلکہ حمیتِ دینی، غیرتِ مذہبی، خدا پرستی اور اُس کی رضا جوئی کی حقیقی جانگزی تصویریں ہیں۔ اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ آپ نے کیا اوصاف تھے اور کن باتوں کی وجہ سے مذہبِ دین کے مقدس صفحات پر اپنے عزت و نام پایا ہے۔ بطور نمونہ کے ایک خطبہ درج ذیل ہے۔

اتقوا اللہ عباد اللہ! یا دروا	بندگانِ خدا! خدا کے مذابِ ڈرو، تقویٰ اختیار کرو
یا ایہاکم باعما لکم وابتاعوا	اور اعمالِ خیر کے ساتھ اپنی موت کی طرف عملت کرو۔
ما یمتے لکم بما یزول عنکم	اُس چیز کے عوض میں جو تمہاری پس پڑائیں محض دنیوی
ویرحلوا فقد جد بکم واستعدوا	وہ چیز خریدو جو تمہارے پاس ہمیشہ رہنے والی ہے تم
للموت فقد اظلمکم وکونوا	کچھ کرو اور دیوید کرو، موت کے لئے تیار ہو جاؤ جس کا
قوماً صیحہم فانتبہوا واعلموا	سایہ تم پر چھایا ہوا ہے۔ تم وہ قوم بن جاؤ جو آواز دینے پر
ان اللہ نیا لیست لکم بد اس	بہت جلد بیدار ہو جاتی ہے اور جان لو کہ تمہارا اصلی
فاستبدلوا فان اللہ سبحانہ	گھر دنیا نہیں ہے۔ تم اس کو تبدیل کر دو اللہ تعالیٰ نے

تم کو بے کار نہیں پیدا کیا ہے اور تم کو بہل
نہیں بنایا ہے۔

تمہارے اور جنت یا دوزخ کے مابین،
موت کے سوا کوئی حد فاصل نہیں ہے۔
تمہاری عمر اور بقا کی مسافت جس کو
ایک ایک لمحہ فنا کئے ڈالتا ہے،
تقلیلِ مدت کے لالچ ہے

لم یخلقکم عبثاً ولم یترکم
سدىٰ -

وما بین احدکم و بین
الجنة و النار الا الموت
ان یزل به و ان عناية
تقصها اللحظة و تهدھا
الساعة لجذرة بقصر امدّة

کس قدر انسوس کر اُس غافل شخص پر جس کے
لئے اُس کی زندگی ایک حجتِ دُبران ہے
لیکن وہ اپنا زمانہ شقاوت میں گزار
رہا ہے۔

ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہم کو
اور تم کو اُن لوگوں میں سے بنا دے
جن کی نعمتیں انھیں تکبر اور سرکشی
میں مبتلا نہیں کرتیں اور کوئی دنیاوی قائدہ
انھیں عبادتِ پروردگار سے باز نہیں رکھتا اور نہ
اُن کو موت کے بعد ندامت اور پشیمانی ہوتی ہے۔

نیأ لها حسرة علی کل
ذی عقلۃ ان یرکون
عمره علی حجة و ان
تؤدیہ ایامہ الی شقوة
نسئل اللہ سبحانہ ان
یجعلنا و ابائکم ممن لا
تبطرہ نعمة و لا تقصر بہ
عن طاعة ربہ غایة و لا
تحد بہ الموت بدامة
ولا کابرة ۝

تاریخ خطابت | قدیم ترین خطبات کا بیشتر حصہ جو مدون ہو چکا ہے وہ صرف وہ ہے جو حضرت موسیٰ کلیم اللہ یا دیگر انبیائے بنی اسرائیل کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام سے قبل یونانیوں کے اندر بہت سے ماہرین خطابت پیدا ہو چکے تھے جنہوں نے اپنے زورِ بیان سے قوم و ملک میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ انہی عہد کی ایک گراں قدر ہستی امام الفلاسفہ ارسطاطلیس ہے جس نے اس فن کی باقاعدہ دانع ہیل ڈالی؛ اُس کے اصول و قوانین مرتب کر کے جامہٴ تدوین سے آراستہ کیا۔

پانچویں صدی ہجری میں شیخ الرئیس ابوعلی حسین بن عبداللہ بن سینا نے ارسطو کی اس کتاب کا ترجمہ عربی میں کیا جو کتاب الخطابہ کے نام سے مشہور ہے۔ بعد ازاں چھٹی صدی ہجری میں علامہ ابن رشد اندلسی نے اس کتاب کا خلاصہ کیا جس کا نام نفیس الخطابہ ہے۔ اُس میں علمی طریقے سے مندرجہ ذیل مضامین پر بحث کی گئی ہے۔

- (۱) خطابِ قیاسات کی تعریف جو جلسوں میں تقریر کرتے وقت سود مند ہوتے ہیں۔
- (۲) خطابِ قیاسات کے اقسام یعنی مشاورہ، مضامہ، مشاجرہ وغیرہ وغیرہ۔
- (۳) وہ تدابیر جو قوم کے مائل کرنے اور اُجھانے یا کسی چیز کی تحقیر و تعظیم کرنے میں کارگر ہوتی ہیں۔

(۴) عذر یا عتاب کرنے کا طریقہ۔

(۵) کسی قصہ یا سیکچر کے بیان کرنے کے وقت مضامین کی مہتد و ترتیب۔

عہد عیسوی | حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور و وقتا جب خطابت ابتدائی منازل طے کر کے مرتبہ کمال کو پہنچ چکی تھی۔ آپ کے شاگرد وہاں ہی بطرس، پولیس، وغیرہ خطابت کے بڑے ماہر تھے۔ اُن کے خطبات بڑی بڑی مجلد کتابوں میں موجود ہیں۔

جو اُن کے کمالِ خطابت کی زندہ یادگار ہیں۔ مذہبِ عیسوی اُن پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

عہدِ اسلامی | زمانہ جاہلیت میں قوتِ خطابت سے جو کام لئے جاتے تھے، اُن کا دائرہ محدود تھا اس لئے اُس زمانے میں خطابت اور تقریر کو وہ عروج نہ ہوسکا جو شعر و شاعری کو حاصل تھا لیکن زمانہ اسلام میں یہ حالت بدل گئی سیاسی واقعات اور غزوات و فتوحات نے عرب کی پرچوش طبیعتوں کے لئے بہت سے نئے میدان کھول دیئے جن میں اُن کو زبانِ آدمی کا جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ اس بنا پر اسلام کے بعد اگرچہ عربی شاعری میں زمانہ جاہلیت کا زور باقی نہیں رہا تاہم اُس کی طاقتِ خطابت اور تقریر کی طرف منتقل ہو گئی۔

داصل خطابت اور شاعری کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ جو خطیب ہوتا ہے وہ شاعر بھی ہوتا ہے۔ اور جو شاعر ہوتا ہے وہ خطیب بھی ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعضوں کی طبیعت کا رجحان شاعری کی طرف زیادہ ہوتا ہے وہ شاعر بن جاتے ہیں اور بعضوں کی طبیعت کا میلان خطابت کی طرف زیادہ ہوتا ہے وہ آخر خطیب کے لقب سے مشہور ہو جاتے ہیں۔

علامہ جاحظؒ نے ”الجمع بین الخطابة والشعر ومن اشتغل بذا لك“ کا عنوان قائم کر کے اُن تمام ادباء کی ایک مکمل فہرست لکھی ہے جو خطباء بھی تھے اور شعراء بھی خطباء عرب میں جبری جماعت وہ ہے جس کا دور عہدِ اسلامی تھا۔ تاہم کچھ ایسے گزرے ہیں جن کا زمانہ اسلام سے قبل تھا۔ جن میں سے سحبانِ دہلِ بابلی خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ یہ شخص اپنے زمانہ کا ایک بلند پایہ خطیب اور امام مانا جاتا ہے۔

جس کی خطابت آج تک ضرب المثل ہے۔ کسی اسپیکر کی بہت زیادہ تعریف کرنی

ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے ”هو اخطب من سبحان وائل“۔

سبحان کا خاص کمال یہ تھا کہ وہ خطبہ دیتے دیتے پسینہ پسینہ ہو جاتا تھا لیکن نہ دلائل تقریر میں کہیں ٹھہرتا تھا اور نہ سارے خطبے میں کوئی لفظ دہراتا تھا۔ لوگ اس کے خطبہ کو خطبہ شوالہ کہا کرتے تھے۔

تس بن ساعدہ ایادی نے عہد جاہلیت اور عہد اسلامی دونوں پائے تھے۔ آنحضرت صلعم نے ایک مرتبہ اس کو سوچ عکاظ میں دیکھا کہ سرنج اونٹ پر بیٹھا ہوا خطبہ دے رہا ہے۔ آپ نے اس کے خطبہ کو بغور سنا اور اس کی بلاغت پر تعجب بھی کیا وہ کہہ رہا تھا:-

اھیا الناس ! اجتمعوا فاستمعوا
ودعوا - من عاشى مات ومن
مات فات - وكرما هو
ات آت

لوگو! جمع ہو اور سنو! اور یاد رکھو! جس کو
زندگی عطا ہوئی ہے وہ مرے گا اور جو
مر گیا اس کا قصہ ختم ہوا۔ اور جو کچھ مجھے ملا
ہے ہو کر رہے گا۔

مالی اری الناس یتوتون
ولا یرجعون ارضوا فاقاموا،
ام حبسوا فناموا۔

مجھے کیا ہوا ہے کہ بتوں کو دکھتا ہوں
مرتے ہیں اور پھر واپس نہیں جوتے، کیا وہ
پسند کرتے ہیں اور ٹھہر جاتے ہیں یا لوگ
لے جاتے ہیں اور جاتے ہیں۔ گرفتہ آیا وابتداء

یا معشر ایاد این شعور
وعاد، واین الیاء و الاحداد
این المعروف الذی لم یشکر
والظلم الذی لم ینصد۔

کیا ہوتے شعور و عا و کہاں گئے آباء و اجداد،
وہ احسان کیا ہوا جس کا شکر نہیں ادا کیا گیا
اور وہ ظلم کہ عمر گیا جس کا کبھی انکار نہیں کیا

قسم قسم باللہ ان اللہ دینا
گیا۔ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ بیشک خدا کا

هُوَ اَرْضِي لِي مِنْ دَمِيْكَ هٰذَا - اِيْكُنْ يَوْمَ حِسْ كُوْدَهْ مَتَّاهْ اِسْ دِيْنْ سَهْ
(کتاب البیان والتبیین ص ۱۶۵) زیادہ پسند کرتا ہے :

حضرت ہبیل بن عمرو نہایت پر جوش خطیب تھے۔ حالتِ کفر میں وہ اسلام کی مخالفت پر تقریریں کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلعم سے عرض کیا کہ اُن کے نیچے کے اگلے دو دانت ٹیڑھا دیکھتے ہو کہ تقریر کرنے میں اُن کی زبان نہ چلنے پائے۔ آپ نے فرمایا اگرچہ میں نبی ہوں لیکن میں مسئلہ نہیں کر سکتا۔ عسماً! اس کو جانے دو ممکن ہے کہ اُن کی تقریر سے کبھی اسلام کو فائدہ پہنچے۔

چنانچہ وہ مشرقت بہ اسلام ہوئے اور رسول خدا صلعم کی وفات کے بعد جب تمام عرب میں ارتداد کی ہوا چل پڑی تو انھوں نے قریش کے سامنے ایک تقریر کی جس کا یہ اثر ہوا کہ تمام قبیلہ قریش اسلام پر قائم رہا اور کسی قسم کی بد امنی ظہور نہ پائی۔

اَيُّهَا النَّاسُ ! اِنْ يَكُنْ مُحَمَّدٌ
مَاتَ فَاَنْتَ اللهُ حَيٌّ لَمْ يَمُتْ
وَفَدَّ عَلِمْتَ اَنْ اَكْثَرَكُمْ
قَتْبَانِي بَرٍّ وَجَارِيَةٌ فِي بَحْرِ
فَاَنْتُمْ اَمِيرُكُمْ وَاَنَا
ضَامِنٌ اَنْ لَمْ يَمُتْ اِلَّا مَرَّةً
اَنْ اَرْدَهَا عَلَيَّكُمْ
لوگو! اگر محمد صلعم وفات پا گئے تو خدا زندہ ہے
جو نہیں مرا۔
تم جانتے ہو کہ میں بہت زیادہ بری و بکری
سفر کیا کرتا ہوں۔ میں اپنے تجلے کی بنا پر کہتا
ہوں کہ تم اپنا خلیفہ مقرر کر لو، میں ضمانت
کرتا ہوں کہ اگر معاملہ خلافت طے نہ ہوا
تو اُس کو میں تم پر لوٹا دوں گا۔
(کتاب البیان والتبیین ص ۱۶۵)

اہل عرب کو فطرتاً زبان کا ذوق تھا اور قدرت نے جذبات اور مدہ کات کے اظہار پر ان کو ایسی قوت عطا فرمائی تھی کہ اُن زمانے کی بڑی سے بڑی شائستہ اور متقدم قومیں ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھیں۔ اُن کی آتش بیانی لڑائیوں کی آگ بھڑکا دیتی تھی جو صدیوں بجھائے نہیں جھبکتی تھی۔ سخن سخن، سخن فہمی، شعر گوئی اور زبان آوری کا بازار گرم تھا۔ عرب کا بچہ بچہ ہومر اور شکسپیر ہو رہا تھا۔ ان کے کسی قبیلہ میں جب کوئی نیا شاعر یا خطیب پیدا ہوتا تھا تو ہر طرف سے مبارکباد کے پیغام پہنچتے تھے۔ عورتیں اس خوشی میں رقص و سرود کے جلسے منعقد کرتی تھیں اور سارے قبیلے میں خوشیاں منائی جاتی تھیں۔

ٹھیک اُسی زمانے میں جب عرب کی شاعری اور خطابت بلاغت کی مزاج پر پہنچ چکی تھی اور اہل عرب اس ذوق سے محمور اور اس نشہ میں سرشار نظر آ رہے تھے حجاز کی مقدس سرزمین مکہ سے ایک نئی آواز سنائی دی جس کو سب نے حیرت و استعجاب کے کانوں سے سنا۔ یہ داعی حق مغنیہ بر اسلام صلعم کی آواز تھی جو ایک ولولہ انگیز اور مغلوب نہ ہونے والی طاقت رکھتی تھی۔ اور بلاغت کے اُس مرتبہ کی مدعی تھی جو بشری طاقت سے بالاتر ہے۔ سارا عرب مقابلے کے لئے تیار ہوا لیکن اُس عظیم الشان جبروت اور جلال نے مخالفانہ ہمتوں کو سست اور ارادوں کو لپٹ کر دیا۔

اب کیا تھا؟ قوت خطابت نے اور زور کپڑا۔ اہل عرب کے مذہبی جوش اور ان کی فطری بے باکی نے اس قوت میں اور چار چاند لگا دیئے۔ جذبات بہیمیہ کا اظہار موقوف ہو گیا اور ان کی زبان آوری، دعوت الی الحق، حمایت دین، ترغیبِ نجات اور تعلیمِ اخلاق میں صرف ہونے لگی۔

خطباء اسلام اپنی تقریروں کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کے لئے کثیر آیات قرآنی سے استدلال کرتے تھے۔ بلکہ بسا اوقات آیات کے مجموعے سے پورا پورا

خطبہ تیار کر لیتے تھے۔ چنانچہ مصعب بن زبیر نے اہل عراق کو اپنے بھائی عبداللہ بن زبیر کی اطاعت پذیری پر آمادہ کرنے کے لئے جو خطبہ دیا تھا درج ذیل ہے :-

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
طَسَمَ . یہ کتاب مبین کی آیتیں ہیں ہم تم کو
موسیٰ اور فرعون کا سچا قصہ سناتے ہیں اُن
لوگوں کے لئے جو ایمان لانا چاہیں۔ بنی شاک
فرعون نے دنیا میں سرکشی کی اُس نے زمین
کے پہنے والوں کے بہت بڑا گروہ کر دیئے۔
بعض اُن میں سے کمزور تھے جو اپنے لڑکوں کو بیج
کرتے تھے اور اپنی عورتوں کے بارے میں شرم
کرتے تھے بیشک فساد کرنے والوں میں سے تھے۔
(اور اپنے لڑکے سے شام کی طرف اشارہ کیا)
ہم چاہتے ہیں کہ اُن لوگوں پر حسان کریں جو ملک
میں کمزور ہیں اور ان کو امام بنادیں اور اُن کو
ملک کے وارثین میں سے رکھیں (اور ہاتھ سے حجاز کی طرف
اشارہ کیا) اور ہم تم ملک میں انھیں طافور بنادیں
اور فرعون اور ہامان اور اُن کے لشکروں میں سے
اُن لوگوں کو دکھادیں جو ہمیں نہیں کہتے ہیں
(اور ہاتھ سے عراق کی طرف اشارہ
کیا)

طَسَمَ . تلك آيات الكتاب
المبین . نتلو علیک من نبأ
موسیٰ وفرعون بالحق لقوم یؤمنون
ان فرعون علا فی الارض جعل
اہلہا شیعاً یستضعفون طائفۃ
منہم یدبج ابشاء ہم وستیجی
نساء ہم انہ کان من
المفسدین . و اشار بیدہ
نحو الشام) و ترید ان تمنت
علی الذین استضعفوا فی الارض
ونجعلہم ائمتۃ ونجعلہم
الوارثین . و اشار بیدہ
نحو الحجاز) و نمکن لہم فی
الارض و نری فرعون و ہامان
و جنودہما منہم ما کانوا
یحذرون . و اشار بیدہ
نحو العراق)

(آداب اللغۃ العربیہ جز اول ص ۱۹۲)

قائد اور سپہ سالار مواقع جنگ پر اپنے خطیبانہ اندازِ بیان میں بہت ہی پر جوش خطبے دیا کرتے تھے، جس میں فوجوں کی ترتیب، صف بندی کے اصول، دشمن پر حملہ کرنے اور اُس سے بچنے کے قواعد پر زور دیا جاتا تھا۔ اور فتح و شکست کے مواقع کو نمایاں کر کے مسلمانوں کے دلوں میں قومی غیرت اور دینی حمیت کے جذبات برانگیختہ کئے جاتے تھے اور انھیں بتایا جاتا تھا کہ بقائے حیات کے لئے صرف یہی ضروری نہیں کہ انسان اپنے دشمنوں کی مدافعت کئے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خود سبقت کر کے اُن کو فنا کرنے اور شکست دینے کی کوشش کرے۔

اس موضوع پر اُن کے پر جوش خطبے ہی دراصل اُن کی کامیابی کا اصلی راز تھے تھے چنانچہ جنگ یرموک میں حضرت خالد بن ولید کا خطبہ، جنگ قادسیہ میں حضرت مغیرہ کا خطبہ، غزوہ فارس میں حضرت خلید بن منذر کا خطبہ، اور فتح اندلس میں حضرت طارق بن زیاد کا خطبہ مذکورہ بالا بیان کی زین مثالیں ہیں جن کے ساحرانہ اندازِ بیان اور زورِ خطابت پر اگر تبصرہ کیا جاوے تو بڑی بڑی مجلد کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ روم اور یونان کی تاریخیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں قومیں فنِ خطابت میں بہت کمال رکھتی تھیں۔ اُن میں بہت سے خطباء ایسے گذرے ہیں جنہوں نے اپنی زبان کی طاقت اور زورِ بیان سے بڑے بڑے انقلابات برپا کر دیئے۔ اُن کے خطبے آج بھی کمالِ خطابت کی بے مثال یادگار ہیں۔

مخصوصاً یونان، تہذیب و تمدن، تعلیم و ترقی کے اعتبار سے بہت ہی امتیازی شان رکھتا تھا۔ وہاں اس فن کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی تاکہ وہ قوم و ملک کی بہتر سے بہتر طریقہ پر خدمات انجام دے سکیں۔ اس موضوع پر سب سے پہلی تصنیف اسی خطبہ ارضی کی یادگار ہے۔ لیکن اہل عرب کو یہ خاص فخر و امتیاز حاصل ہے کہ جب اُن پر ترقی کا سایہ بھی نہ پڑا تھا اُس وقت بھی زبانِ آوری اور فصیح البیانی اُن کے قومی حضائص میں داخل سمجھی جاتی تھی۔

اور اُن کے خطیب دُنیا کے بہترین اسپیکر مانے جاتے تھے۔

نو شیرِ وَاں نے جب خطبائے عرب کی تعریفیں سنیں تو اُس کو اُن سے ملاقات کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اُس نے نعمان بن منذر سے کہا ”میں خطبائے عرب میں سے کسی ایک سے ملنا چاہتا ہوں؟“ نعمان نے ہر قبیلے سے دو دو تین تین زبان اور اسپیکر جمع کر کے اُس کی خدمت میں روانہ کئے جن میں قبیلہ بنی تمیم میں سے اکثم بن صیفی، حاجب بن زرارہ، قبیلہ بنو بکر میں سے حارث بن ظالم، قیس بن مسعود، قبیلہ بنو عامر میں سے خالد بن جعفر، علقمہ بن علائہ، عامر بن طفیل وغیرہ جیسے بلند پایہ خطباء شامل تھے۔ اُن میں سے ہر ایک نے نو شیرِ وَاں کے سامنے اپنی جادو بیاں اور سحر آفرینی کا ثبوت دیا اور اپنی زبان اور فصح البیانی پر خراجِ تحسین چاہل کیا جن کو علامہ احمد بن عبد ربہ نے عقد الفرید جزء ثالث میں مفصل بیان کیا ہے۔

ڈیموستھینس، خطبائے یونان کا امام مانا جاتا ہے لیکن اُس کے کل خطبات ۶۱ سے زیادہ نہ تھے۔ مسلمانوں میں حضرت علی مرتضیٰ کے خطبات سینکڑوں کی تعداد میں ہیں جن کو شریف مرتضیٰ نے ایک کتاب کی شکل میں جمع کر دیا ہے جس کا نام ”نبج السلفہ“ ہے۔ ان خطبات میں جہاں ایک طرف سلاست و روانی پائی جاتی ہے وہاں دوسری طرف زورِ بیان اور ایسا جوش و اثر پایا جاتا ہے کہ سننے والوں کے دل لرز اُٹھتے ہیں۔ پھر زورِ خطابت کا عالم وہاں اور واضح ہو کر نظر آتا ہے جہاں حضرت علیؑ نے قوم کو جنگ پر اُبھارا ہے اور اُن کے دلوں میں شجاعت و بہادری، افتخارِ حرب اور اباءِ بغض کے شریعت جذبات برانگیختہ کئے ہیں۔

نمونے کے طور پر آپ کا وہ مختصر خطبہ درج ذیل ہے جو آپ نے جنگِ صفین میں اُس وقت دیا تھا جب موقعِ نہایت نازک تھا۔ سرفرازی و سرِ بلندی کا تاج یا ذلت و رسوائی کا تاریک انجام تقریر کی تاثیر و عدم تاثیر پر موقوف تھا۔ وہو ہذا :-

معاشر المسلمین !

استشعروا الخشية وتجليبوا
السكينة، وعضوا على
النواحين فانه انبى للسيف
من الهام واكملوا
اللامه، وقلقوا السيوف
في اعمادها قبل سلها، و
الحظوا الخزر واطعنوا الشحر
وناخوابا لظباء.. وصلوا
السيوف بالخطاء واعلموا
انكم بعين الله، ومع ابن
عم سهول الله صلعم فعادوا الكثر
واستحيوا من الفراء فانه
عار في الاعقاب وناسر
يوم الحساب. وطيبوا عن
انفسكم نفسا وامشوا
الى الموت مشيا سحيا،
وعليكم بهذا السواد اعظم
والرواق المطنب فاضربوا
بشجه. فان الشيطان كامن
في كسر ۸۔

مسلمانو!

تم خوف خدا کو اپنے لئے شعار بنالو، اور سکین
اطمینان اپنی طرف کھینچ لو، اور دانتوں کی دانت
چلے رکھو۔ اس لئے کہ یہ حالت دشمن کی تلواروں
کو کھوڑی پر کارگر بننے نہیں دیتی اور زہ کو کاٹل
کر لو، اور تلواروں کو کھینچنے سے پہلے نیاموں میں
جمنش دے لو، اور چاروں طرف کنگھیوں
سے دیکھتے جاؤ اور دائیں بائیں نیچے بازی
کئے جاؤ اور دشمن کو تلوار کی باڑھ پر دھر لو اور
تلواروں کو دشمن کے قدموں کی چلنے رکھو تم
خوب جان لو کہ تم خدا کی نظر میں ہو اور ابن عم
رسول کے ساتھ ہو۔ دوبارہ دشمن پر پلٹ پڑو۔
بھاگنے سے شرم کرو۔ اس لئے کہ بدنامی اس کا
انجام دی اور قیامت کے دن عذاب جہنم اٹل بدلہ
ہی اور اپنے نفس کو اس کی خواہشوں کی خوش کرو۔
اور طبیب خاطر موت کی طرف آسانی کے ساتھ
چلے چلو، تم اس زبردست جماعت اور طبیبوں
کے ہرے خیمے پر ٹوٹ پڑو۔ اور اس کے اندر
بیٹھنے والوں پر تلوا میں برسادو۔ اس لئے کہ
شیطان اسی اطراف رواق میں چھپا
ہوا ہے۔

جو آگے بڑھنے کے لئے پیش دستی کرتا ہی	قد متّم للو شبة يدا
پھر واپس ہونے کے لئے پیر پیچھے ہٹاتا ہی۔	واخر لکنوص رجلا
لڑو لڑو یہاں تک کہ قدرتی نشان	فصداً صمداً حتى ينجلى
تمہارے لئے آشکارا ہو جائے۔ تم ہی کو	لکم عهود الحق وانتم
غائب رہو گے۔ خدا کی مدد تمہارے ساتھ	الاعدون والله معكم
ہے۔ وہ تمہارے اعمال کو کم اور مضائقہ	ولن يترككم اعمالکم
نہیں کرے گا پ	ر ر ر

(پنج البلاغہ ص ۵۵)

ویدوں پر ایک سرسری نظر

وید ہندوؤں کی سب سے قدیم مقدس کتاب کا نام ہے۔ جو چار مجموعوں پر مشتمل ہے۔ (۱) رگ وید (۲) سام وید (۳) یجر وید (۴) اٹھروید۔

رگ وید بہ لحاظ مضامین آریہ نسل کے قبائل کی سب سے قدیم کتاب ہے۔ گو کتابی صورت میں وہ بعد میں آئی ہوگی۔ کیونکہ فن تحریر کی ایجاد رگ وید کے بھجنوں کے منظوم ہونے کے صدیوں بعد ہوئی ہے۔ اس کتاب کی قدامت کا اس سے ثبوت ملتا ہے کہ باسک نے ۷۰۰ ق م اس کی ایک شرح لکھی ہے۔ لیکن تاریخ کا تعین نہیں کیا جاسکتا اور جن مورخوں اور سنسکرت دانوں نے جو تاریخیں بتائی ہیں ان میں سینکڑوں برس کا فرق ہے۔ زیادہ یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ گریس کا زمانہ ۸۰۰ ق م کے قریب ختم ہوا۔ یہ کتاب دس حصوں پر منقسم ہے۔ ۲۰ سے ۷ تک یہ حصے تو قدیم سمجھے جاتے ہیں لیکن آٹھویں حصے میں رد و بدل ہے۔ اس کی زیادہ حیثیت نہیں۔ نواں دسواں اور پہلا حصہ یہ بہت بعد کے ہیں کیونکہ ان تینوں حصوں اور خصوصاً دسویں حصے میں فلسفیانہ مضامین ہیں جو اردوں میں نہیں ہیں جن سے ان کے مؤخر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس لئے کہ فلسفیانہ خیالات بعد میں پیدا ہونے شروع ہوئے؛

رگ وید کا انداز شاعرانہ ہے اس میں ۱۰۲۸ اگیٹ ہیں۔ اس کتاب کا کوئی خاص مصنف نہیں۔ طرز و انداز کے مختلف ہونے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب لاکھوں ذی فہم و ماخول کی صدیوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ رہا یہ امر کہ یہ کتاب کہاں تصنیف ہوئی۔ تو اس کے متعلق کوئی تصریح نہیں۔ البتہ اس کے مطالعہ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعض حصے افغانستان، بلوچستان کے علاقے میں لکھے گئے ہیں اور بعض حصے

بیاس اور سوسوتی کے درمیان۔ کیونکہ ان میں جو موسم کے حالات بیان کئے گئے ہیں وہ وہیں پائے جاتے ہیں۔ اور بعض حصوں میں پنجاب کے میدانوں اور دریاؤں کا ذکر ہے جس کی وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کچھ حصے یہاں بھی لکھے گئے ہیں۔ مگر یقینی نہیں۔

رگ وید میں جس مذہب کی تعلیم دی گئی ہے وہ فطرت پرستی سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ مگر وہ ہمارے موجودہ تصورات سے مختلف ہے۔ آریہ قوم نے کائنات کی ان تمام قوتوں کو جن سے انسان اور انسانی زندگی کو فیض پہنچتا تھا دیوتا قرار دے کر ان کی پرستش کو مذہبی شعار بنالیا تھا۔ اندر بادلوں پر سوار برق و رعد کا تازیانہ لئے ہوئے آریوں کا محبوب دیوتا تھا۔ وارن متر اور آگنی کی پوجا کی جاتی تھی۔ رگ وید کی مہجن ان دیوتاؤں کی تعریف سے لبریز ہیں۔ داسوں کو شکست دینے میں ان کا ہاتھ ہر جگہ نظر آتا ہے۔ رگ وید کے کسی مہجن میں چاروں دروڑوں (ڈاٹوں) کا حوالہ نہیں ملتا۔ اس بنا پر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ قیام پنجاب میں آریوں کا جماعتی نظام سخت نہیں ہوا تھا۔ غالباً ذات پات کی تفریق بعد میں محل میں آئی ہے۔

سام وید

وید کا دوسرا حصہ سام وید ہے۔ یہ رگ وید کا اختصار ہے۔ اس کے اندر زیادہ تر گیت ہیں جو پجاریوں کے لئے تیار کئے گئے ہیں اور جن کو پجاری قریبانی کے مختلف اوقات پر پڑھا کرتے ہیں۔

یجروید

تیسرا حصہ یجروید ہے۔ یہ حصہ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس حصے میں صرف قریبانی کے متعلق ہدایتیں پائی جاتی ہیں۔ گویا کہ یہ حصہ قریبانی کے قواعد اور منتروں کا مجموعہ ہے۔ اس میں اور سام وید میں منتر اور منتروں کے ٹکڑے ہیں جو رگ وید سے ماخوذ ہیں اور اس طریقہ پر ان کا سلسلہ رکھا گیا ہے کہ پوجا میں ہر حرکت اور ہر کام کے لئے ایک خاص منتر ہو اور قریبانی کے لئے بھی جن کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ متعدد برہمنوں یہاں تک کہ بعض خاص اوقات

میں سترہ برہمنوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ برہمن مختلف درجوں کے تھے۔ ادھر ایک کے فرائض مخصوص اور محدود تھے۔ سام وید کے جملہ منتروں کی تعداد ۱۴۹۹ تھی اور سوائے ۸ کے سب رگ وید سے ماخوذ تھے۔ یجور وید کے منتر بھی رگ وید سے ماخوذ ہیں، مگر منتروں کے درمیان نثر کی عبارتیں بھی ہیں جن میں ان برہمنوں کے لئے ہدایتیں درج ہیں جو اس کتاب کو استعمال کرتے ہیں۔

اتھرو وید

وید کے چوتھے حصہ کو اتھرو وید کہتے ہیں۔ اس حصے کا اضافہ عرصہ دراز کے بعد ہوا۔ جس کی صحیح تاریخ کے متعلق کوئی قیاس نہیں ہو سکتا۔ یہ اضافہ بہت بعد میں ہوا ہے۔ بہ لحاظ مضامین اور تحریر، ان دونوں ویدوں میں بہت اختلاف ہے۔ اتھرو وید میں رگ وید کے منتر، بہت کم ہیں اور جو ہیں بھی وہ اس کے جدید ترین حصوں میں سے ہیں، بعض ٹھیکوں میں محاسن شعر و شاعری ضرور ہیں۔ مگر زیادہ تر منتر جھاڑ پھونک سے متعلق ہیں۔ رگ وید کے درخشاں اور خوش طبع دیوتاؤں کے مقابلہ میں جنھیں رشیوں نے مخاطب کیا ہے اس وید میں سیاہ اور ڈراؤنے بھوت ہیں۔ اس وید میں ہر ایک برہمن کو خواہ وہ فحط ہو یا بھنکار یا خود انسان کے برے خصال ہر ایک کو ایک دیوتا بنا دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح اُن کو خوش کیا جائے، یا جادو سے اُن کے اثر کو دور کیا جائے۔ یا دوسروں کو اُن کے ذریعے نقصان پہنچایا جائے جس کی وجہ سے پوجا سجاوے عبادت کے سحر سے مستبدل ہوئی اور برہمن پجاری سے ساجر بن گئے۔

ویدوں پر اس مختصر تبصرے کے بعد اب ہمیں یہ بتلانا ہے کہ مختلف مذہبی عقائد کے متعلق اُن کی کیا رائے ہے۔ اور اس زمانے میں متبعین کو کس چیز پر چلنے کی تلقین کی گئی۔

وید اور پوجا

ویدوں کے مذہب میں بیرونی اثرات سے متاثر ہونے کے قبل بت پرستی کا وجود

: تھا۔ اس بارے میں ہندوستان کے آریہ اپنے ایرانی بھائیوں سے پیچھے نہ تھے۔
عالم کائنات اُن کا معبد تھا اور وہ انسان کے بنائے ہوئے مکانوں میں اپنے دیوتاؤں کو نہیں
بٹھاتے تھے۔ اور اپنے شاعرانہ خیالات میں کبھی اپنے دیوتاؤں کو انسانی شکل اور خصال کے ساتھ
بیان کر کے خدا کو انسانی شکل و صورت دے دیتے تھے۔ مگر انھوں نے کبھی بت نہیں بنائے
ابتدائی زمانے میں معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کی پرستش ہوتی تھی۔ یعنی قدرت کی قوتوں کو بحیثیت
جداگانہ ہستیوں کے پوجتے تھے۔

منحصر یہ کہ اس عہد میں فطرت پرستی نہایت ہی مؤثر و دلکش شکلوں میں بڑی عالی و اکمل
شان سے نظر آتی ہے۔ یہ آسمان جو ہمارے سروں پر ایک ہیبتناک جلال و جبروت سے
جھکا ہوا ہے۔ یہ فرحت خیز و روح پرورد ہوا جگہ زمین کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ یہ
شعلہ فشاں آگ جو ہمارے مطخوں میں عجیب کیفیت سے جلتی ہے اور ہم کو گرمی و روشنی
دیتی ہے۔ یہ نورانی صبح جو کبھی حسین اور شرمیلی دھن کے مانند ہم کو خواب غفلت سے چونکا کر
دنیا کے کام کاج میں مشغول کر دیتی ہے۔ یہی وہ سب دیوتا تھے جن پر قدیم زمانے کے
ہندو شیدا ہی نہیں تھے بلکہ اُن کی پرستش دل سے کرتے تھے۔

وید کے دیوتا

رگ وید کے گیتوں میں مختلف دیوتاؤں کا ذکر آتا ہے۔ معمولی دیوتاؤں کو چھوڑ کر رگ وید
میں تقریباً ۳۳ دیوتاؤں کا ذکر ہے۔ جن میں اس زمانہ میں ۲۰ دیوتاؤں کی زیادہ عبادت کی جاتی
ہے۔ بعض اُن میں کے حسب ذیل ہیں:-

اُن میں سب سے پہلا دیوتا دیا کوٹس ہے۔ اس کا مادہ دیو ہے جس کے نفوی معنی درخشنا
پونے کے ہیں۔ ایک گرم یا نسیم گرم ملک میں ایک قوم جس میں شاعری و دلیت تھی، آسمان
کو سوائے نور و درخشنا کے اور کیا کہہ سکتی تھی۔ اور پھر درخشنا کہنا تھا کہ چشم زدن میں
آسمان بھی ایک دیوتا ہو گیا۔ اور دیوتا بھی ایسا جس کو تمام آریہ اقوام اپنا دیوتا مانتی تھیں۔ یہ

دیوتا، آسمان کا دیوتا تھا۔ اس کی تعریف میں رگید میں متعدد مہجن ہیں۔

حصہ ہفتم میں جو ایک رشی مسمیٰ وسشٹھ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یا کم از کم اس کے خاندان میں محفوظ تھا وارن کی تعریف میں بہت سے مہجن ہیں۔ مختصر بیان یہ فقرہ میں اس کو مخاطب کیا گیا ہے جن کو اگر ایک جگہ جمع کیا جائے تو اس دیوتا کی نہ صرف جیتی جاگتی تھیو مع اس کے جملہ جسمانی خصوصیات کے بن جائے گی بلکہ بہت سے مشابہات قدرت و بھی اس کا تعلق معلوم ہو جائے گا جو آسمان کے متعلق ہیں؛ وارن پہلے تو آسمان تھا پھر آسمان کا دیوتا ہو گیا اور اس طور پر وہ جملہ کرشمہ ہاؤ قدرت میں جلوہ گر نظر آنے لگا۔ جو آسمان پر نظر آتے ہیں۔ آفتاب اور ماہتاب اس کی آنکھیں ہیں۔ زمین کی سات ندیاں اس کی بنیں ہیں بارش کا بھیجنے والا بھی وہی ہے۔ وارن کی تعریف کے بھجوں میں سے چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں جن سے دیر کے اس عظیم الشان دیوتا کی خصوصیات ذہن نشین ہو سکیں گی۔ ایک رشی کا گیت ہے :-

”ایک مہجن گاؤ جس سے شاہ وارن خوش ہو جائے۔ یہ مہجن اس کی تعریف میں گاؤ جس نے زمین کو اس طرح پھیلایا ہے جیسے قصاب گھوڑے کے چمڑے کو دھوپ میں پھیلاتا ہے۔ وہی جنگلوں میں ٹھنڈی ہوا میں بھیجتا ہے گھوڑے (آفتاب) کو تیزی دیتا ہے۔ گایوں (بادل) کو دودھ دیتا ہے دماغ میں عقل پیدا کرتا ہے اور پانی میں آگ (بجلی) پیدا کرتا ہے۔“

رگید حصہ پنجم

انسان کو جب اپنے معاشی پریشانی ہوتی تھی تو وہ وارن ہی سے ترحم و مہو کو خواستگار ہوتا تھا۔ رگید میں کئی توبہ کے مہجن ہیں جو بہت پُر اثر ہیں جن میں کا ایک یہ ہے :-

”اے وارن ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ میں غائے گلی میں داخل ہوں رحم اے ہمالی رحم اگر میں ادھر ادھر اس بادل کی طرح بھٹکوں جیسے تیرا

پریشان کرتی ہے تو مجھ پر جسم کر، اے ذاتِ بے لوث میں نے
راہِ راست کو کمزور ہونے کی وجہ سے چھوڑا ہے رحم کر رحم کر، اے وارن
جب ہم آسمانی دیوتاؤں کے دیکھتے ہوئے گناہوں کے مرتکب ہوں اور
تیرے قوانین کی خلاف ورزی کریں تو رحم کو رحم۔

اس دیوتا کی زیادہ دین تک پیش نہیں ہوئی اور زمانہ ابعد کی افسانیاں میں وارن،
پانی کا دیوتا ہو گیا۔ اس کی تمام آسمانی صفات غائب ہو گئیں اور اس کی اخلاقی صفات
میں سے بھی وہی گول کے دلوں میں جاگزیں رہیں۔ جو ڈرنے والی ہتھیں یعنی وہ صرف سزا
دینے والا خیال کیا جانے لگا اور اس رحم اور انصاف پسند بادشاہ کو بے رحم اور ظلمیت
خیال کیا جانے لگا۔ جس کے متعلق یہ کہا گیا تھا کہ وہ گناہ گاروں پر بھی رحم کرتا ہے۔
اس کے بعد گئی کا ذکر آتا ہے۔ یہ آگ پاک کرنے والی اور انسان کی محافظ اور
دوست ہے۔ اس کے ساتھ ہندی آریاؤں کو بھی وہی محبت ہے جو ایرانیوں کو تھی جو اس کی
آستہ کے نام سے پیش کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ یہ آگ کا دیوتا ہے اور اس کے سوائے
کوئی دیوتا اور ایسا نہیں ہے جو انسان کے ساتھ اس کا مہمان اور دوانی رفیق بن کر رہے۔
اور روزمرہ کے گھر کے کاموں میں اس کی مدد کرے۔

ان دیوتاؤں کے بعد پرتھوی کا جو زمین کی دیوی ہے ذکر آتا ہے۔ اس کی شان میں
اچھے اچھے گیت ہیں۔ پھر اندر کا جو کرطک اور بکلی کا دیوتا سمجھا جاتا ہے ذکر آسنے لگا۔ سورج
کے مختلف اوصاف کو مختلف دیوتاؤں کی صورت دی گئی۔ مثلاً قوت، حیات، سوریا
سوہری کی شکل دی گئی۔ پھول کو پچانے اور زرخیزی کی قوت کو پوشن کی صورت دی گئی۔
اس کی تیز رفتاری کو وشنو کی شکل دی گئی جو آجکل بھی بڑا دیوتا مانا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ شیو بھی
اس وقت بڑا دیوتا شہر کیا جاتا تھا۔ اس وقت اس کا نام گردیہ میں رُدر تھا۔ یہ طوفان کا دیوتا
تھا۔ اس کے بعد طلوع آفتاب کی دیوی اوشس کا بہت ذکر آتا ہے۔ اس کو انسانی صورت

دی جاتی تھی۔ چنانچہ سورج کو انسان اور وہاؤس اور اندر کو ہیل کی شکل دی جاتی ہے۔ گرنیے کے دیوتاؤں میں سب سے بڑی خوبی قوت و جبروت ہے۔ کوئی اخلاقی قوت نہیں، غرض وید کے بھی وہی دیوتا اور دیویاں تھیں جن کو ہائے اسلاف اور بڑے بوڑھے تین چار ہزار برس ہوئے انڈس کے کنارے پر پوجا کرتے تھے۔ قدرت کے دیوتاؤں کا تصور اور وہ بے ریا اور جانمردانہ سرگرمی جس سے وہ پوجے جاتے تھے ایک جبری اور فاتح قوم کی قوت و بے لوثی کو ثابت کرتا اور ایک گروہ کی ترقی کو جس نے ابھی چند روز گزرے کہ تہذیب میں معقول حد تک پیش قدمی کی تھی، منکشف کرتا ہے،

وید اور وحدانیت

ویدوں میں وحدانیت کی تعلیم اور اُس عہد کے آریوں میں وحدانیت کا احساس تھا یا نہیں۔ یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ جہاں تک ویدوں کا تعلق ہے اُن کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان ویدوں میں بہت سے دیوتاؤں کا ذکر ہے جس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ متعدد دیوتاؤں کے وجود کی تعلیم موجود ہے۔ متوفی آبادہ جب ادا کی پرتش کا بھی ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان سچتی بھی اُس کے خصائص میں سے ہے۔ ابتدائی زمانے سے یہ خیال بھی رائج تھا کہ خدا عالم کے ہر ذرے میں موجود ہے۔ جیسے اس اشوک سے ظاہر ہوتا ہے ”وہ خدا سمندر جس کی راہیں ہیں وہی پانی کے اس زمانے میں بھی موجود ہے۔“

ان خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ ہمہ ادست (وحدت وجود) کی طرف زمانہ قدیم سے بھٹکا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے اشوک ملتے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ مختلف دیوتا صرف اُس ذات واحد کے مختلف نام ہیں۔ چنانچہ اُس عہد کے آریوں کے جو اعتقادات تھے وہ وحدانیت سے بہت قریب تھے اور ان کے جانشین یعنی برہمن بھی جن کی قوت تختہ حد درجہ تیز تھی اس کے قریب قریب پہنچے مگر حقیقت کو معلوم کرنے میں

ناکامیاب رہے، وید کے قدیم شعرا بھی وحدانیت کے قریب قریب پہنچ گئے تھے۔ کیونکہ جب وہ وارن کی عبادت کرتے تھے جو گناہوں کی سزا دینے والا اور معاف کرنے والا ہے تو لوگوں سے کہتے تھے ”ڈو اُس سے جس کے ہاتھ میں چابول پائے ہیں قتل اس کے کہ وہ انھیں پھینکے، اُس شخص کا راستہ سیدھا اور بے خار ہے جو نیک کام کرتا ہے۔“ مگر لٹا نہ ذرا خطا کر گیا اور رسوم نے ارتقا و روحانی کا خاتمہ کر دیا۔ اس عہد کا ایک شاعر ہستی یکتا کی عظمت کی مدح سرائی کرتا ہے مگر جب وہ تناقض کو دیکھتا ہے تو پوچھتا ہے کہ کس دیوتا کے لئے ہم قربانی کریں یعنی ان دیوتاؤں میں جن کو ہم اپنے دیوتاؤں میں مخاطب کرتے ہیں یہ ہستی یکتا کون ہے جس کے لئے آج ہم قربانی کرتے ہیں، وہ مجھن یہ ہیں:-

۱۔ ابتداء میں سنہرا کچھ وجود میں آیا، وہ تمام موجودات کا واحد پیدا شدہ مالک تھا، اُس نے زمین اور اس آسمان کو قائم کیا وہ دیوتا کون ہے جس کے لئے ہم قربانی کریں گے؟

۲۔ ”وہ سانس (حیات) دیتا ہے وہ طاقت دیتا ہے، اُسی کے حکم کی تمام دیوتا عظمت کرتے ہیں۔ اس کا پر تو حیات اُزلی ہے۔ اُس کا سایہ موت۔ وہ دیوتا کون ہے؟“

۳۔ ”وہ جس کے سبب سے آسمان و چٹان ہے اور زمین مضبوطی سے جمی ہوئی ہے اور وہ جس کے سبب سے آسمان بلکہ اعلیٰ ترین آسمان بھی قائم ہوا ہے جس نے ہوائی ہضا کو ناپا وہ دیوتا کون ہے؟“

مُسند رجہ بالانظم سے یہ اندازہ تو ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں وحدانیت کا احساس ضرور ہو گیا تھا۔ مگر انہوں نے کہ وہ اپنے اس احساس میں ناکامیاب رہے اور وحدانیت کے پوری طور پر قائل نہ ہونے پائے۔

وید اور موت اور دیگر سومات

کسی قوم یا قبیلے کے متعلق سب سے پہلے جو چیز ہم کو جاننا چاہئے وہ یہ ہے کہ موت کے متعلق اُن کے کیا معتقدات ہیں اور مَرَدے کی لاش کے ساتھ وہ کیا سلوک کرتے ہیں اور کن رسوم کے ساتھ وہ لاش کو دفن کرتے ہیں۔

رگ وید کے دسویں حصہ میں بہت سے ایسے بھجن ہیں جن کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے آریہ ہندو اہل اُن کے اَسلاف کو زندگی سے محبت رکھتے تھے اور آرزو رکھتے تھے کہ اُن کی اور اُن کی اولاد کی حیات صد سالہ ہو مگر موت سے وہ ڈرتے نہ تھے اور گو وہ مَرَدوں کا احترام کرتے تھے اور انھیں محبت سے یاد کرتے تھے مگر مایں ونا اسی دی کے ساتھ اُن کا ماتم نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ اُن کا عقیدہ تھا کہ مرنے والا اپنے آباؤ اجداد اور ہندوگان قوم کے ساتھ خوشی و خیر تہی سے زندگی بسر کرتا ہے اور اپنی اولاد کے آنے کا منتظر رہتا ہے۔

رگ وید کے دسویں حصے کے مختلف بھجنوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل لاش کو دفن کرنے کا رواج تھا۔ سب سے پہلے وہ لاش کو کسی متبرک مقام پر رکھتے تھے، متوفی کی کمان اُس کے ہاتھ میں ہوتی۔ اُس کی بیوی اُس کے سر کے قریب بیٹھی ہوتی۔ اور اعزاء و اقربا ایک وسیع حلقے میں کھڑے ہوتے تھے، بچاری لاش سے کچھ دور اِس حلقے میں ایک پتھر رکھ دیتا۔ یہ پتھر حد فاصل تھا جس کے اِس طرف زندہ لوگ نہیں جاسکتے تھے اور عورت سے بھی یہ التجا کی جاتی تھی کہ اُس کے آگے نہ آئے۔ اِس کے بعد بچاری مَرَدے اور ماتم کرنے والوں سے کچھ کہتا، پھر متنی کا بھائی یا کوئی اور قریبی رشتہ دار بیوہ کا ہاتھ پکڑ کر کہتا۔

”اٹھ اے عورت اور عالم حیات کو دیکھ، جس کے پاس تو بیٹھی ہے اور جس نے تیرا ہاتھ ایک دن اپنے ہاتھ میں لے کر تجھ سے بیاہ کیا تھا وہ

مرچکا ہے اور آب تیرا نکاح لوٹ چکا۔“
 پھر یہی شخص بے جان ہاتھوں سے کمان لے کر کہتا ہے :-
 ”مردے کے ہاتھ سے میں نے کمان لے لی ہے تاکہ اس سے ہمیں
 مدد ملے اور ہمیں قوت و شہرت حاصل ہو، تم ہمیں ٹھہرے ہو۔ ہم
 بہادر لوگ جنگ میں دشمن کو زیر کریں گے۔“

اس کے بعد تدفین شروع ہوتی ہے یعنی لاش زمین میں رکھ دی جاتی ہے اور اس پر
 مٹی ڈھیر کر کے ایک تودہ بنا دیا جاتا ہے جسے مہلت کا مسکن کہتے تھے۔
 مردوں کو صبر و استقلال کے ساتھ بغیر کسی بیہودہ گریہ و زاری کے رخصت کرنے
 کی یہ رسم نہایت قدیم تھی۔ مردوں کو جلانے کی رسم جب جاری ہوئی تو اس کے ساتھ
 دوسری رسوم کو بھی بدلنے اور دوسری عبارتوں کی تلاش کی ضرورت ہوئی جو سب دسویں صدی
 میں موجود ہیں۔ غیر سیاستر (مندی قوانین) میں زمانہ مابعد کی رسوم کو حسب ذیل طبقے پر بتایا گیا ہے
 اور یہ رسوم کم از کم ان میں اس وقت تک جاری تھیں جب وہ گنگا اور جمنہ کے کناروں پر پہنچے
 جہاں دیک مدت کے بعد پرمہنوں کے تمدن کا آغاز ہوتا ہے،

مکانات سے دور چند خاص ہدایات کے بموجب ایک منتخب مقام پر تمام اعزہ
 جمع ہوتے ہیں۔ بارہ سنگھے کی کھال چتا پر بچھائی جاتی ہے جس پر قریبانی کی گھاس بچھادی جاتی
 ہے۔ اور کھال کے اوپر لاش بھی جاتی ہے اور بیوہ اس کے سر پر بیٹھی ہے اور قریبانی کی
 ضروری اشیاء متوفی کے جسم پر ایک خاص ترتیب سے رکھی جاتی ہیں اور مختلف طویل رسموں کے
 ادا کرنے کے بعد جلانے کی رسم ادا کی جاتی ہے جسم کے خاکستر ہونے سے کچھ قبل،
 ہجاری کچھ پڑھتا ہے اور لوگ اس مقام سے چلے جاتے ہیں۔ راستے میں وہ صاف پانی میں
 نہاتے ہیں اور صاف کپڑے پہن کر شام تک وہیں رہتے ہیں۔ دس روز کے بعد متوفی کی جمع
 کی ہوئی ہڈیوں پر مٹی ڈالی جاتی ہے اور سنگ لوح رکھ دی جاتی ہے۔

حیاتِ مقبل

ویدک عہد کی آریہ قوم کو حیاتِ مستقبل پر پورا اعتقاد تھا، موت کو وہ ختم کرنے والا کہتے تھے۔ مگر اس سے مراد صرف دنیاوی زندگی کے ختم کرنے والے سے تھی۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ انسان میں ایک جزو ہے جو نہ پیدا ہوتا ہے نہ مرنے والا ہے اور جسمِ خاکی سے الگ ہو کر اپنے اصل مکان کو چلا جاتا ہے اور ان دوستوں کے ساتھ مل کر جو پہلے دہاں چلے گئے ہیں حیاتِ بعدی حاصل کر کے سٹ اومانی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ زندگی کیسی تھی۔ وہاں لوگوں کے کیا مشاغل رہتے تھے۔ تو اس کا جواب صرف مبہم خیالات میں ملتا ہے۔ جیسے اس گیت میں :-

” یعنی ابرکتِ مُردے، دونوں بادشاہوں وارن اور پامیا کی عظمت کا ذکر کرتے ہیں۔ اور خوبصورت پتے والے درختوں کے نیچے بیٹھے ہوئے

مرنے مرے کے کھانے کھاتے ہیں۔ اور سو ما پیتے ہیں۔ “

خدا ترس لوگوں کا تو یہ صلہ تھا کہ وہ نہایت آرام و سائش کی زندگی بسر کرتے ہیں اور مرنے کے بعد مرے اڑاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ دوسرے گنہگاروں کا کیا حشر ہوتا ہے اور ان کے متعلق اُن کا کیا عقیدہ تھا؟ چونکہ گنہگاروں کے حشر کے متعلق آریوں کے خیالات حد درجہ مبہم ہیں اس لئے اس کا جواب دینا دشوار ہے، آریوں کی ہر چیز میں ”وہی“ تھی۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر نیک لوگ نورِ ازل میں رہتے تھے تو بدکاروں کی جگہ دوائی تاریکی میں تھی۔ اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ وارن کو سزا دینے والا دیوتا بتایا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ دیوتا گنہگاروں کو غار میں ڈال دیتا ہے، مختصر یہ کہ خواہ خدا ترس انسان ہوں یا گنہگار اُن کے لئے ویدک عہد میں حیاتِ بعد المات ہے۔

وید اور ذاتیات

ذاتوں کی تقسیم کا زمانہ رگیدے کے بعد کا زمانہ ہے۔ رگیدے کے عہد میں ذاتوں کی تقسیم بالکل نہیں تھی۔ اور منتروں کے ایک ایسے ضخیم مجموعے رگیدے، میں جس کی تصنیف و تالیف میں ایک عہدت صرف ہوئی ہو اور جمہور کی عادات و روش اور دستور و رواج سے بھرا ہوا ہو ہمیں کوئی ایک فقرہ بھی ایسا دکھائی نہیں دیتا کہ اس عہد کے لوگ موروثی ذاتوں میں علیحدہ علیحدہ ہو گئے تھے۔ اور رگیدے کی دس ہزار چاولوں میں برادری کے ذاتی اصول کی نسبت جھوٹ کو بھی ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے تقسیم ذات کا پتہ چلے۔ اگر اس کا وجود ہوتا تو رگیدے میں اس کا کسی نہ کسی طرح پر اظہار ضرور ہوتا جس میں اس زمانے کے تمدن کا پورا عکس موجود ہے۔ صرف ایک مقدم حصہ وہم میں جسے برش کا بھیجہ کہتے ہیں اس کا ذکر ہے۔ مگر یہ بھیجی نہایت مبہم اور بڑے مضامین نہایت غیر واضح ہے۔ البتہ یہ معزور تھا کسی نے پوجا، کسی نے جنگ جلال، کسی نے تجارت وغیرہ اور کسی نے مذمت گداری ہی کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا اور غالباً اسی وجہ سے بعد میں اسی صورت کو تقسیم ذات کی صورت دے دی گئی۔ اور غالباً یہ وہ وقت تھا جب شام وید، یجور وید اور اٹھرو وید اور دیگر مقدس کتابیں مرتب کی گئیں۔ چنانچہ سب سے پہلے منہ کے دھرم شاستر میں ان چاروں ذاتوں کے فرائض اور باہمی تعلقات کو حسب ذیل طریقہ پر بیان کیا گیا ہے :-

- ۱۔ برہمنوں کے اس دبرمھ (نہ یہ فرائض قرار دیئے ہیں، ویدوں کا پڑھنا اور پڑھانا، اپنوں اور دوسروں کے لئے قربانی کرنا، خیرات لینا اور دینا۔“
- ۲۔ چیتروں کو اس نے حکم دیا ہے کہ لوگوں کی حفاظت کریں، انعام و اکرام میں قربانی کریں، وید پڑھیں۔ شہوت پستی سے پرہیز کریں۔
- ۳۔ بیش ذات کا کام یہ ہے مویشی کی پرورش کرنا، انعام دینا۔ قربانی کرنا، وید پڑھنا، تجارت کرنا، قرض دینا اور کاشت کرنا۔

۴۔ شہدوں کے لئے برہم نے صرف ایک فریضہ مقرر کیا ہے یعنی دوسری تینوں ذلتوں کی بلاچون و سپرا خدمت گذاری کرنا۔

ویدوں کی اخلاقی تعلیم

ویدوں کے بعض منتروں کے شاندار تناسب اور ٹھیک اُمیوں صدی کے سے خیالات نے بڑے بڑے (مکیس مولر، گرلفیتھ) مستشرقین کو مہجوت کر دیا ہے۔ جیسا کہ ویدک تحقیقات میں ترقی ہوگی اور مطلب فہمی کے بہتر طریقے وجود میں آئیں گے ویدوں کی عظیم الشان روحانی معنویت اور ان کے اخلاقی مباحث کی بے نظیر کثرت ضرور آشکارا ہو کر رہے گی۔ خود ان اصحاب کو بھی جو ان خیال کے مؤید ہیں کہ تدیکی ترقی کا نظریہ دنیاوی اخلاقیات پر حاوی ہے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ویدوں کی تعلیم فی حقیقت عظیم الشان اور مہمانہ ہے۔ یہ مقدس کتابیں، صفاتِ قلب اور قول و فعل میں صداقت اور شرافت پیدا کرنے والے خیالات پر مشتمل ہیں۔ ویدوں میں خدا کو صداقت، انصاف و کرم اور جسم، ان جملہ صفات کا مخزن خیال کیا گیا ہے اور انسان کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی دعاؤں میں بار بار ان امور کا خیال رکھے۔ اور پھر اپنے اعمال کون کے مطابق بنائے۔ یہاں ہم صرف چند اسلوبِ درج کرتے ہیں، جن سے ویدوں کی اخلاقی تعلیم کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا:-

- ۱۔ تمام اشیاء مجھے دوست خیال کریں۔ میں بھی تمام اشیاء کو دوست سمجھوں۔
- ۲۔ اے ہم سب ایک دوسرے کی حفاظت کریں۔ سب مل کر کھائیں پیئیں۔ مل جل کر بہادرانہ کام کریں۔ اور ایک دوسرے سے نفرت نہ کریں۔
- ۳۔ خواہ میں زمین پر ہوں یا آسمان پر خدا کرے صداقت کا فرشتہ ہمیشہ ہمارا نگہبان ہو۔

۴۔ اے قادرِ مطلق تمام امراض اور ناپاک خیالات کو نکال۔ دشمنی کے تمام

خیالات کو ہم سے دور رکھ۔
رگ دید

۵۔ میں ہر بشر سے محبت کروں خواہ وہ رذیل ہو یا شریف۔
اقتداء

۶۔ ایک دوسرے سے ایسے جوشِ محبت سے پیش آؤ جیسے ایک گائے اپنے
بچھڑے سے۔

۷۔ اے بیٹی! اپنے والدین کی مطیع ہو۔ اپنے خاندان سے ہمیشہ لطف آمیز
کلمات میں کلام کر۔

۸۔ بھائی اپنے بھائی سے نفرت نہ کرے۔ بہن، بہن پر ناہم زبان نہ ہو۔
نیک نیتی کے ساتھ ایک دوسرے سے گفتگو ہو۔

۹۔ پہلے مہمان کو دے تو۔ اُس کی مہمان نوازی کر لو تو خود کھاؤ۔

۱۰۔ طلبِ نفع کا جواب طلبِ نفع سے نہ دو، سراپ کے بدلے سراپ نہ دو، بلکہ

طلبِ نفعوں اور بددعاؤں کے بدلے دعاؤں کی بوجھار کر دو۔
تذہب

۱۱۔ مکشِ اجسام میں امن ہو، بحسہ، خشکی، تری، دنیا سے نباتات و حیوانات

میں امن ہو، ہر جگہ شانتی ہی شانتی ہو، ہر جگہ سکون ہی سکون ہو؛

یہ ہیں دیدوں کے وہ چند اسلوب جو ہمارے سامنے علمِ الاخلاق کے اعلیٰ
صول پیش کرتے ہیں۔ نسلِ انسانی کی تاریخ کے ایک نہایت قدیم باب کے اقتباسات
میں اس قسم کے اصولوں کو دیکھ کر کہ جو تم کو بددعا دے اُس کو دعا دو، سب محبت کرو،
ماں باپ کا کہنا مانو، بھائی بہن کی عزت کرو، ایسا نذر اور راستباز بنو۔ پہلے مہمانوں کو
کھلاؤ پھر خود کھاؤ، دنیا میں امن و سکون کے متلاشی بنو، پروفیسر مسکس مولر اور گریفیٹھ جیسے مشاہیر
علماء بھی دیدوں کی بلند پایہ معنویت کے مقرر ہیں۔

سچائی کی پھنکی

استخاص

تیس سالہ خوبصورت نوجوان۔ مغربی تہذیب کا دلدادہ
 طاہر کی نہایت حسین فیشن ایبل کچیس سالہ بیوی۔
 طاہر کا ستائیس سالہ نوجوان بھتیجا۔ اسی کے قدم بقدم
 مضبوط کاٹھی کا ساٹھ سالہ باورچی۔
 نوجوان طرہ دار حنا و مہ۔

طاہر
 زہرہ
 نسیم
 کلکو
 زکریا

منظر

طاہر کے مکان کا ایک حصہ

کمرہ نہایت ہی نفاست اور سلیقے کے ساتھ مغربی طرز پر آراستہ کیا گیا
 ہے۔ دو دروازے ہیں۔ ان کے بیچ میں آتش دان ہے۔ آتش دان پر
 طاقتور مقابل میں ایک بڑی کھڑکی۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو مسٹر طاہر آتش دان کے پاس کھڑے نظر آتے
 ہیں۔ کلومیز کے پاس کھڑا ہے۔ میز پر خالی برتن چھنے ہوئے ہیں۔

کلو۔ سرکار وہ چاندی جو چوری ہو گئی تھی مسیکر خیال میں کسی ملازم
 طاہر۔ (غلیں اہجہ میں) اُنھ ! جانے بھی دو کلو۔

کلو — نہیں سرکار.....

طاہر — ربات کا ٹکڑا اُسی لہجہ میں، تم آبا جان کے پاس بھی رہے ہو نہ ؟
کلو — جی ہاں سرکار۔

طاہر — اور دادا جان کے پاس بھی ؟
کلو — جی حضور۔

طاہر — اور میرے.....

کلو — (جلدی سے) جی نہیں سرکار۔

طاہر — کلو! میں نے تم کو ہمیشہ حنیف خواہ پایا۔ آج کل میں ذرا پریشان ہوں۔
کلو — (دہر دانا لہجہ میں) کیا بات ہے حضور !

طاہر — کلو آجکل ایک عجیب قسم کا درد میرے ہوتا ہے۔
کلو — کہاں حضور ؟

طاہر — (دھنڈی سانس لے کر) آہ ! نہ پوچھو !

کلو — نہیں سرکار کچھ تو فرمائیے۔

طاہر — کیا بتائیں کلو۔ تمہاری بیگم صاحبہ کی وجہ سے ناک میں دم ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ
تمہاری بیگم صاحبہ تمام دن کہاں غائب رہتی ہیں ؟ کبھی میرے ساتھ کھانا
نہیں کھاتی ہیں۔

کلو — غریب پرور مجھے کیا معلوم۔ میں تو اپنے دھندوں میں لگا رہتا ہوں۔

طاہر — مجھے خوب معلوم ہے۔ (جیب سے ایک تہ نہ نکالتے ہوئے) اچھا اب میں ان تمام

باتوں کا آج ہی تصفیہ کئے دیتا ہوں۔ یہ ایک چینی دوا ہے۔ اس کا نام ،

”سچائی کی ٹنگی“ ہے۔ میرے ایک دوست نے یکن سے بھیجی ہے۔ اس کی

خاصیت یہ ہے کہ جو کوئی اس کی ایک خرداک استعمال کر لے تو وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ

ایک گھنٹے تک بیچ بولے۔

کلو — تو حضور یہ تو اچھی دوا نہیں ہے۔

طاہر — چاہے کچھ ہو میں اس کو آزمادوں گا ضرور۔

کلو — مگر حضور مجھ پر نہیں۔

طاہر — نہیں۔ میں اس کی ایک خوراک مختاری بیگم صاحبہ کو دوں گا۔ رڈبہ میں سز

ہدایات کے پرچہ کو نکال کر دیکھتے ہوئے) یہ دوا شربت کے ایک گلاس

میں دینی چاہئے۔ تو اس کے ذائقہ کا احساس نہ ہوگا۔ اب ہم کو سب باتیں معلوم

ہو جائیں گی۔ اچھا دوا شربت انار کی بوتل تو دو (بوتل میں سے تھوڑا سا

شربت لے کر اس میں دوا ڈال کر پھر بوتل میں ڈال دیتا ہے) مگر ہاں دیکھو

کسی کو کانوں کاں خبر نہ ہو۔

کلو — کہیں ایسا ہو سکتا ہے حضور۔

زہرہ کی آواز سنائی دیتی ہے

طاہر — کون زہرہ؟

کلو — جی ہاں سرکار بیگم صاحبہ ہی ہیں۔

کلو حاکم دروازہ کھولتا ہے۔ زہرہ داخل ہوتی ہے

زہرہ — معاف کرنا طاہر بہت دیر ہو گئی۔ مگر میں مجبور تھی۔ تمہاری ضرورت کی تمام

چیزیں دکان کی اوپری منزل پر تھیں۔ میں لٹ کے ذلیہ اوپر گئی تو

بیچ میں یکایک لٹ رک گیا۔ مجھے بہت زور کا جھٹکا لگا اور لٹ مین کر

بھی بہت زور کی ٹکر ہوئی۔

طاہر — ارے! زہرہ تم.....

زہرہ — اب آپ لکچر باڑی فرمائیں گے۔

طاہر — نہیں فی الحال تو ارادہ نہیں ہے۔ ہاں یہ کہنا چاہتا تھا کہ ذرا سا شربت پی لو۔
 تمہارے چہرہ پر زندگی چھائی ہوئی ہے۔ تکان وغیرہ سب رفع ہو جائے گی
 زہرہ — نہیں اب تو تکان نہیں ہے دوستی بیگ میں سے آئینہ نکال کر دیکھو تو ہری
 اور نہ میرا چہرہ زرد ہے۔

طاہر — نہیں! نہیں! ہے۔ کیسے نہیں۔ دیکھو شربت پی لو۔ تکان رفع ہو جائے گی۔
 زہرہ — لیکن جی نہیں چاہتا۔

طاہر — نہیں نہیں زہرہ ادھر آؤ۔ کم از کم میسر اصرار ہی سے سہی د شربت سے
 گلاس بھر کر اور کٹو کی طرف دیکھ کر جو تمام باتیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا کھو! کھو!
 کٹو — حضور۔

طاہر — تم جاؤ۔

کٹو سلام کر کے چلا جاتا ہے

زہرہ — مجھے تمہارے اس کھوسٹ باورچی پر ذرا بھی بھروسہ نہیں ہے۔ تم نے
 اس سے پوچھا نہیں۔ شاید اس کو معلوم ہو کہ چاندی کیا ہوئی۔

طاہر — کیسی احمق ہو جس نے لی ہوگی کیا وہ بتا بھی دے گا؟ ادھر آؤ یہ پی لو۔

زہرہ — خیر اگر تم اصرار کرتے ہو تو پئے لیتی ہوں (گلاس لیتی ہے ویسے ہی کٹو داخل
 ہوتا ہے)

کٹو — حضور ٹیلیفون آیا ہے۔

طاہر — (زہرہ سے) ابھی ایک منٹ میں آتا ہوں۔

جاتا ہے۔ جیب سے دستی نکالتے ہوئے ترکیب استعمال
 دوا کا پرچہ گرا دیتا ہے۔ کٹو بھی ساتھ چلا جاتا ہے۔ زہرہ
 پرچہ اٹھاتی ہے۔ پڑھتی ہے اور کچھ سوچنے لگتی ہے،

زہرہ — ”سچائی کی پھنکی“ ہوں! یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے اس کے پینے پر اصرار کر رہے تھے۔ (شربت کے گلاس کی طرف دیکھتی ہے) اُف وہ! کس قدر ذلیل حرکت ہے۔ بدگمانی کی بھی انتہا ہو گئی۔ اچھا اب میں ابھی حضرت کو سبق دوں گی۔ (کاغذ کو اپنے کپڑوں میں چھپالیتی ہے) اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟ اچھا کہیں سے فرضی خطوط ملنے چاہئیں۔ خوب یاد آیا دطابقہ تک جاتی ہے یہ بل خطوط کا کام چھی طرح دے سکیں گے۔ ان کو اچھی طرح خوبصورت فیتہ میں باندھنا چاہئے (بگ سے فیتہ نکالتی ہے اور بلوں کو باندھتی ہے پھر شربت کے گلاس کی طرف دیکھتی ہے) لاؤ اسے پھینک بھی دوں۔ نہیں یہ کسی کو پانا چاہئے۔ اچھا تو پہلے اس بوڑھے کھوسٹ ہی کو کیوں نہ پاؤں۔
گھنٹی بجاتی ہے۔ کھودا حسل ہوتا ہے

کلو — کیا حکم ہے حضور؟

زہرہ — یہ تو شربت بچ گیا ہے۔ ابھی پی لو۔

کلو — مگر غریب پرورد مجھے شربت سے نزلہ ہو جاتا ہے۔

زہرہ — نہیں تم کو پینا پڑے گا۔

کلو — لیکن..... حضور.....

زہرہ — لیکن دیکھ کچھ نہیں..... اچھا بیٹھ جاؤ

کلو بیٹھ جاتا ہے

زہرہ — اپنا منہ کھولو۔

کلو — لیکن غریب پرورد میں.....

زہرہ — (گہڑ کر) تم منہ کھولو (یہ کہہ کر اس کی ناک پر ڈکر اس کے منہ میں تھوڑا سا

شربت ڈال دیتی ہے، ہاں اب تم جاؤ۔

کھو جاتا ہے۔ لیکن جاتے ہوئے زہرہ پر گھونٹا مانتا ہی جس کو وہ نہیں
 دیکھتی ہے اور اپنا منہ آستین سے رگڑتا ہے اور چلا جاتا ہے۔
 زہرہ — (خود ہی) اچھا اب میں اپنے کمرے میں چلی جاؤں اور ذرا سا پوڈر لگا لوں تاکہ
 چہرہ زرد منظر آنے لگے۔

ہنسنتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ نرگس خادمہ داخل ہوتی ہے
 نرگس — معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ابھی سبگیم صاحبہ آئی تھیں (چاروں طرف دیکھتی ہے)
 کھو کی طرف سے لاہرہ ہوا ہو کر شربت کی بوتل اسی طرح چھوڑ گئی ہیں۔ اب اگر
 ملازم نہ پائیں تو بے وقوف ہیں۔

تھوڑا سا شربت لے کر پیتی ہے۔ اتنے میں طاہرہ داخل ہوتا ہے۔ نرگس
 جلدی کر بوتل میز پر رکھ کر چلی جاتی ہے۔ دوسرے دروازے پر زہرہ داخل ہوتی ہے۔
 طاہرہ — پیاری تم بھر زرد منظر آرہی ہو۔ کیا تم نے شربت نہیں پیا۔
 زہرہ — (خالی گلاس دیکھ کر) دیکھو نہ اب ختم ہو گیا ہے
 نسیم داخل ہوتا ہے۔

نسیم — چچی جان تسلیم۔ آداب عرض ہے چچی جان
 زہرہ — اہا نسیم! کہو! اچھے رہے تمہارے چچا جان آج صبح کہتے تھے کہ کل وہ
 تم کو سیر کرنے لے گئے تھے۔

طاہرہ اثبات میں کہنے کا اشارہ کرتا ہے۔

نسیم — جی..... جی ہاں..... ہاں کل ہی تو۔

طاہرہ — کیوں نسیم کل شام کو کلب میں کتنی دلچسپی رہی؟

زہرہ — خوب (نسیم سے) کیا تم کو شربت دوں؟

نسیم — ضرور..... شکریہ

طاہر — (پریشان ہو کر) اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو کبھی نہ پیتا۔

زہرہ — کیوں طاہر کس وجہ سے آحسہ؟

طاہر — کچھ نہیں۔ یوں ہی

زہرہ — لیکن ابھی تو تم ہی تعریف کر رہے تھے۔

طاہر — ہاں لیکن

زہرہ — (گلاس نسیم کو دیتے ہوئے) نسیم یہ لو۔

نسیم — شکریہ چچی جان (گلاس لے کر پی لیتا ہے)

طاہر — نسیم تم نے بہت جلدی کی (نسیم کوٹالنے کی غرض سے) (کچھ نسیم

تم ذرا لاٹیری میں ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔

زہرہ — اس میں جلدی کی کیا بات تھی؟ میرا ارادہ تھا کہ میں کل شام کی دلچسپی کے بلے

میں کچھ پڑھتی۔

طاہر — نہیں پیاری اب اس وقت نہیں

زہرہ — (طاہر کی بات کا خیال نہ کرتے ہوئے) کہو نسیم تمہارے چچا جان نے

کل تم کو کہاں کہاں پھرایا۔

طاہر نسیم کو اشارہ کرتا ہے

نسیم — (طاہر سے) چچا جان میں مجبور ہوں مجھے سچ سچ کہنا پڑے گا۔

طاہر — (الگ) لعنت ہے ایسی دوا پر۔

نسیم — (زہرہ سے) چچا جان نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ میں آپ سے یہ کہوں کہ

میں ان کے ساتھ تفریح کو گیا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک نوجوان لڑکی

کے

طاہر — (غصہ میں) نسیم تم کو غلط واقعات بیان کرنے کی جرأت کیسے ہوئی فوراً

کمرے سے نکل جاؤ۔

نسیم — چچا جان میں معافی چاہتا ہوں۔ بسکین آپ کو معلوم ہے کہ آپ نے ایسا کیا ہے۔ بلکہ آپ نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ لہجی وہ لڑکی ہر ذرا بڑھب.....
ظاہر غصہ میں آکر نسیم کا ہاتھ پکڑ کر روانے کے باہر کر دیتا ہے

زمہرہ — یہ کیا قصہ ہے ؟

ظاہر — میری خود سبجہ میں ہنیں آتا معلوم ہوتا ہے شربت کی تیزی کا اثر دماغ پر ہو گیا ہے۔ مجھے اُسید ہے کہ تم اُس کی باتوں کا کوئی اثر نہ لوگی۔

زمہرہ — یقیناً نہیں۔

ایسا ظاہر کرتی ہے گویا دوا نے اُس پر اپنا اثر کیا

زمہرہ — پیارے ظاہر۔

ظاہر — کہو پیاری

زمہرہ — میری عجیب کیفیت ہو رہی ہے

ظاہر — (الگ) ہوں ! دوا نے اثر کیا

زمہرہ — مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ گویا مجھے تمام باتوں کا استدار گرنا پڑے گا۔

ظاہر — (انجان بن کر) کیا مطلب ؟

زمہرہ — (دراں دارانہ طور پر آہستہ سے) پیارے ظاہر اپنے پچھلے گناہوں کا استدار۔

ظاہر — کیا ؟

زمہرہ — میں نے تم سے ابھی کہا تھا کہ مجھے لفٹ میں جھٹکا لگا.....

ظاہر — تو پھر ؟

زمہرہ — اور لفٹ میں سے ٹکڑ بھی ہوئی.....

ظاہر — ہاں ہاں تو پھر ؟

زہرہ ————— تو سب غلط تھا۔ لعنت وغیرہ کا کوئی قصہ پیش نہیں آیا۔

طاہرہ ————— اور نہ اوپری منزل ہی پر گئی تھیں؟

زہرہ ————— ہاں۔

طاہرہ ————— تو پھر کیوں دیر ہوئی؟

زہرہ ————— میں تم سے اپنی خواہش کے خلاف کہنے پر مجبور ہو رہی ہوں۔ مائے

میرے اللہ..... (اپنا سر کھجلاتی ہے)

طاہرہ ————— پیاری مجھ سے سب کہہ دو۔

زہرہ ————— میں مت از کے پاس گئی تھی۔

طاہرہ ————— (غصہ سے) کون مت از؟ وہ آوارہ، لپٹا، بدعاش.....

زہرہ ————— ربات کاٹ کر نہیں ممتاز مصور۔

طاہرہ ————— تم اس کے ہٹوڈیو (نگار خانے) میں گئی تھیں؟

زہرہ ————— ہاں پیارے طاہرہ۔ اس کا بہت اصرار تھا کہ میں اس کی نئی تصویر کے لئے

نمونہ بنوں۔

طاہرہ ————— (غضبناک ہو کر) اور تم..... لاحول ولا قوۃ، لاحول ولا قوۃ.....

زہرہ ————— ہاں اس نے کہا کہ میرے جسم کی ساخت بہت اچھی ہے۔ کمر بہت پتلے.....

طاہرہ ————— میں اس بدعاش کو مار ڈالوں گا۔ (چچ کر) میں ابھی جاتا ہوں۔

کلو دروازے سے داخل ہوتا ہے

کلو ————— سرکار۔

طاہرہ ————— (پہنے دونوں ہاتھوں میں اپنے منہ کو چھپا کر) نکل جاؤ، میرے سامنے سر نکل جاؤ۔

کلو ————— حضور وہ چھپے جو غائب ہوئے تھے.....

زہرہ ————— (الگ) کتنی عجیب دعا ہے۔

طاہر — (اُسے بڑھتے ہوئے) تم نہیں جاؤ گے ؟
کلو — حضور ۔

طاہر کلو کے پاس تک جاتا ہے لیکن وہ فوراً باہر چلا جاتا ہے
طاہر — تو یہ قصے ہیں ۔ اہ کچھ گل افشانی فرمائیے ۔

زہرہ — اب مجھ سے مزید تفصیل نہ پوچھو ۔

طاہر — (چینچ کر) نہیں تمہیں کہنا پڑے گا ۔

زہرہ — نہ پوچھو ۔ گزری ہوئی باتوں کو جاننے ہی دو ۔ ابھی اور کچھ کہوں گی تو نہ معلوم تمہاری کیا کیفیت ہوگی ۔

طاہر — یا میرے خدا ابھی کچھ اور کہنا باقی ہے ۔

زہرہ — بہت کچھ ۔

کلو داحس ہوتا ہے

کلو — حضور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے سب سچ سچ کہنا پڑے گا.....
حضور وہ شربت کی بوتل جو غائب ہو گئی تھی وہ اور دوسرے کسی
ملازم نے نہیں بلکہ میں

طاہر — (ایک چمچ کھینچ کر مارتا ہے) نکل جاؤ ۔

کلو — بہتر ہے حضور ۔

زہرہ — معلوم ہوتا ہے کہ اس بڈھے کھوسٹ نے شراب پی ہے جو ایسی ہلکی ہلکی
باتیں کر رہا ہے ۔

طاہر — خیر وہ تو وہ مجھے تم پر سب سے زیادہ اعتبار تھا لیکن تم نے ہی مجھے دھوکا
دیا ۔ سچ ہے دنیا میں کوئی اعتبار کے قابل نہیں ۔ معلوم نہیں تم کن کن لوگوں
کے پاس گئی ہو ۔

زہرہ — کیا؟ میں نے تو صرف ایک بے چارے کا نام لیا تھا..... ابھی تک.....

طاہر — کیا ایک کافی نہیں ہے؟

زہرہ — ممکن ہے بعض کے لئے کافی ہو لیکن میرے لئے تو نہیں۔

طاہر — اللہ تم اپنے عشاق کا ذکر اس طرح مجھ سے نہ کرو۔ اگر عورت تو نے

میرا دل توڑ دیا۔

زہرہ — اگر میرے امکان میں ہوتا تو تم سے علیحدگی اختیار کر لیتی لیکن انہیں کہ

میں مجبور ہوں۔ (طاہر تک جا کر کاغذ کا بندل لاتی ہے) یہ دو چند خطوط ہیں

ان کو پڑھو۔

طاہر — مست از کس؟

زہرہ — (دلا پروائی سے) ان اور دوسروں کے بھی۔

طاہر کا غصہ کھینچ کر پڑھنا ہی چاہتا ہے کہ کھوداغل ہوتا ہے

کلو — حضور۔ میرا تصور معاف کریں۔ میں اس وقت ان ہیروں کے ہمنوں کے

مستحق کہنا چاہتا ہوں جو کھوئے گئے تھے۔ حضور وہ میرے ہی پاس تھے

لیجئے یہ حاضر ہیں۔ (جن میز پر رکھ دیتا ہے)

زہرہ — وہی غائب شدہ ہیں.....

طاہر — (کلو سے) چلے جاؤ ورنہ میں.....

میز پر سے چھری اٹھاتا ہے۔

کلو — بہتر ہے حضور۔

دوڑ کر باہر چلا جاتا ہے۔ طاہر دروازہ میں ٹکنی لگا دیتا ہے۔

طاہر — اُن! (چھری پھینک دیتا ہے) اُنھ کو کیا ہو سکتا ہے؟ آخر ہو کیا سکتا ہے؟

زہرہ — ہاں ہاں تحریک ہے۔ پایے ان چیزوں کا خیال ہی نہ کرنا چاہئے۔

طاہر — شیطان !

دروازے تک جاتا ہے۔

زہرہ — کہاں جا رہے ہو؟

طاہر — اپنے مشیر قانونی کے پاس۔ ابھی فوراً طلاق کا انتظام کرتا ہوں۔

زہرہ — ٹھہرو طاہر ٹھہرو۔ (اپنے جیب سے کاغذ نکالتی ہے) پہلے اسے توڑ لو۔

(کاغذ لیتے ہوئے) کھیری اقبال (کاغذ کو رکھتے ہوئے) آہ !

یہ کیا ہے۔

زہرہ — جب تم ٹیلیفون پر گئے تھے تو یہ تمہاری جیب سے گر گیا تھا۔

طاہر — تو تم نے شربت

زہرہ — بے وقوف تو نہیں تھی۔ ہاں کلو اور نسیم نے ضرور پیا۔

طاہر — اور تم نے نہیں؟

زہرہ — یقیناً نہیں میرے پیارے بے وقوف طاہر۔

طاہر — اور کاغذات کو دیکھتے ہوئے یہ کیا ہیں؟

زہرہ — یہ بل ہیں جن میں سے اکثر ابھی ادا نہیں ہوئے ہیں۔

طاہر زہرہ کو سینہ سے لگا لیتا ہے۔ ویسے ہی نسیم داخل ہوتا ہے۔

نسیم — ارے سات کیجئے گا۔ میں سمجھا تھا

زہرہ — خیر کوئی بات نہیں۔

نسیم — میں آپ سے شب گذشتہ کے متعلق اور کچھ کہنے آیا تھا۔

طاہر — (چلا کر) تم خاموش نہیں رہو گے!

نسیم — لیکن میں

نرس داخل ہوتی ہے

نرگس — سرکار میں کچھ عرض کر سکتی ہوں۔

نہرہ — ہاں ہاں ضرور لیکن ذرا ٹھہرو۔ تھوڑی دیر کے بعد۔

نرگس — لیکن بیگم صاحبہ مجھے اندر سے کوئی اسپینہ مجبور کر رہی ہے کہ میں کہوں۔

نہرہ اور طاہر دونوں شربت کی بوتل کی طرف دیکھتے ہیں

نہرہ — (الگ) معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بھی استعمال فرمایا ہے۔ (نرگس سے)
اچھا نرگس کہو کیا کہتی ہو۔

نرگس — حضور میں چھوٹے سرکار نسیم میان کے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

نسیم کے چہرے پر پریشانی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں

نہرہ — ہاں ہاں کہو۔

نرگس — حضور روزانہ صبح کو جب میں نسیم میاں کے کمرے میں چھوٹی حاضری

لے جاتی ہوں تو

کلو کھڑکی کے پاس آکر کہتا ہے :-

کلو — حضور میں کھوئی ہوئی چاندی لے آیا ہوں۔

چاندی کی پتیلی میز کے اوپر خالی کر دیتا ہے

پرکھ

تنقید و تبصرہ

رباعیات سجائی | مولفہ جناب مولوی علی اوسط صاحب اعظم گدھی۔ ڈسٹرکٹ ویشنن جج صوبہ متحدہ
(ریٹائرڈ) لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی۔ حجم ۲۲۲ صفحے۔ قیمت فی نسخہ عام
ملنے کا پتہ :- دفتر اخبار سرگزشت۔ علی گڑھ

مولوی علی اوسط صاحب ایک مشہور علی خاندان کے فرد ہیں۔ باوجود اعلیٰ عہدوں پر رہنے اور
قانونی مصروفیتوں کے بھی ان کا علمی ذوق قائم رہا۔ اور انھوں نے سجائی متوفی مسئلہ کی رباعیات فراہم
کر کے طبع کرائیں۔ متعدد قلمی نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد نو سو رباعیاں ان کے نزدیک سجائی کی کتاب
ہوئیں۔ اور انھیں کو انھوں نے علی قلم سے لکھوا کر چھپوایا۔

عمر خیام اور سجائی کا مقابلہ کرتے ہوئے قابل مولف نے لکھا ہے کہ جس زمانے میں حکم عمر خیام
تھے وہ زمانہ مسلمانوں کی سلطنت کے عروج کا تھا۔ عیش و عشرت کے سب سامان مہیا تھے۔ لہذا
شراب، کباب، معشوق کے خیالات، دل میں آتے تھے۔ سجائی گوشہ عزلت
میں رہتا تھا۔ چالیس برس تک اس نے نجف اشرف کے احاطے سے قدم باہر نہیں رکھا۔ اس غریبے
کو شراب بھی نہ دیکھی ہوگی۔ لہذا اس کی رباعیوں میں اس کا ذکر تک نہیں :-

در اصل اسی میں عمر خیام کی بقولیت اور سجائی کی گمنامی کا راز منتر ہے۔ یعنی شاعری جس قسم
کے خیالات چاہتی ہے وہ خیام کے یہاں موجود تھے۔ بر خلاف اس کے سجائی نے مذہبی جذبات اور پسند
و نسل کا اپنا موضوع بنایا جو کبھی کبھی تو لطف دیتے ہیں۔ لیکن دن رات کا مشغلہ نہیں بن سکتے۔ بے شک
سجائی کا انداز بیان صاف اور تشبیہات بھی کہیں کہیں نادہ ہیں لیکن جدت اور تنوع نہیں ہے۔ ایک ہی
موضوع ہے جس پر اس نے عمر بھر رباعیات کہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا کلام کیوں کر مقبول ہو سکتا تھا۔
مولف کا خیال ہے کہ رباعیاں عمر خیام سے شروع ہوئیں۔ اور سجائی پر ختم ہو گئیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے

خیام سے پہلے ابوسعید ابوالخیر نے رباعیاں لکھی ہیں جو اگرچہ صوفیانہ ہیں مگر زبان اور انداز بیان کے لحاظ سے سجاوی سے کہیں بہتر ہیں۔ ان کا مجموعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے عرصہ ہوا شائع کیا ہے بہر صورت مولف کی یہ علمی کوشش قابلِ داد ہے۔

البنات | مولفہ مولوی محمد سلیم صاحب۔ تقطیع خرد۔ ضخامت ۳۲۰ صفحے۔ لکھائی، چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت درج نہیں۔ ملے کا پتہ دفتر البنات۔ امراد کی برار۔

اس کتاب میں مولف نے قرآن کی تعلیمات کو چھ مختلف عنوانات، مذہبیات، جسمانیات، معاشرت، معاشیات، اخلاقیات اور اجتماعیات کے تحت میں سمجھایا ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے تحت میں ذیلی عنوانات قائم کر کے ان کے متعلق قرآنی آیات سے سلیس اور درجہ کے درج کردی ہیں اپنی طرف سے بجز اس کے کہ کہیں کہیں چند جملے توضیح کے لئے لکھ دئے ہیں اور کچھ نہیں لکھا ہے ہمارے نزدیک اس قسم کی کتابیں مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید ہیں۔ اور ان کو بہ نسبت تفسیروں اور ترجموں کے قرآن کو زیادہ قریب کرنے والی ہیں۔ ہم کو خوشی ہوتی ہے کہ قرآن کی خالص تعلیم کی طرف اب عام رجحان ہو رہا ہے اور توجہ بڑھ رہی ہے جو ہمارے خیال میں اسلامی روح کی بیداری کی علامت ہے۔

الخیر الکثیر | حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی نایاب تصنیف جو اب تک غیر مطبوع تھی دیوبند کی مجلس علمی کی کوشش سے پہلی بار چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب فلسفہ اسلام اور اسرار شریعت کے متعلق نادر تصنیف ہے۔ اس کو شاہ صاحب موصوف کا ایک بلند پایہ علمی اور دماغی کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ ارکان مجلس علمی اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے نہایت کوشش سے متعدد قلمی نسخوں کا مقابلہ کر کے اس کو عمدہ کتابت کے ساتھ اچھے کاغذ پر طبع کرایا۔

ضخامت ۱۳۲ صفحات ہے۔ قیمت فی نسخہ عرصہ ملے کا پتہ:۔ مولانا محمد ادریس صاحب صدر مدرس مدرسہ صدیقیہ۔ پھانگ حبش خان دہلی۔

خاتم النبیین | مصنفہ مولانا النور شاہ صاحب مرحوم۔ بزبان فارسی ضخامت ۶ جزو تقطیع ۲۰۰۰۔
کتابت و طباعت اچھی اور کاغذ اعلیٰ۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ :- مولانا محمد ادریس
صاحب مدرس مدرسہ صدیقیہ پھانک حبش خاں۔ دہلی۔

مولانا النور شاہ صاحب مرحوم نے یہ کتاب قادیانیوں کی تردید میں لکھی ہے جو ختم نبوت
کے مسئلے میں قرآن سے مخالفت کرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے عقلی اور نقلی دلائل سے اس فرقے کی غلطیاں
واضح کی ہیں۔ چونکہ اُن کا مقصد یہ تھا کہ باشندگان کشمیر و بلوچستان خصوصیت کے ساتھ اس
فقے میں پڑنے سے محفوظ رہیں اس لئے انھوں نے اس کتاب کو فارسی زبان میں لکھا۔ یہ اُن کے آخر
عمر کی تصنیف ہے جس کو وہ خود اپنی طرف سے چھپوانا چاہتے تھے۔ مگر زندگی نے وفانہ کی اس لئے ان
کے بعد دیوبند کی مجلس علمی نے نہایت عمدگی کے ساتھ اس کو شائع کیا ہے۔ چونکہ یہ فارسی میں ہے اور
اب فارسی کا رواج ہندوستان سے اٹھا جا رہا ہے اس لئے مجلس علمی نے اس کے مقدمہ میں یہ
اعلان کر دیا ہے کہ عام مسلمانوں کے لئے وہ عنقریب اس رسالے کی شرح اردو زبان میں شائع
کر دے گی۔ مجلس علمی کا یہ کام قدر کرنے کے قابل ہو۔

ہنگارستان کشمیر | مصنفہ قاضی ظہور حسن صاحب ناظم سید ہاروی، کتابت و طباعت اچھی
کاغذ عمدہ۔ ضخامت ۱۰ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۲۶۔ قیمت فی نسخہ عا۔
ملنے کا پتہ :- مولوی محمد ادریس میرٹھی۔ مکتبہ شریفیہ۔ دہلی۔

قاضی صاحب موصوف نے اس کتاب میں کشمیر کا جغرافیہ اور آغاز عہد سے لے کر آج
نہک کی اس کی تاریخ نہایت معتمد ماخذوں سے جو مل سکتے تھے لے کر لکھی ہے۔ وہاں کے راجاؤں
اور بادشاہوں کے علاوہ امراء، شعراء، فضلاء اور صوفیہ وغیرہ کے حالات اور اُن کے کارنامے
بھی بیان کئے ہیں جن کے ذیل میں بہت سے علمی، ادبی، تاریخی اور مذہبی مسائل بھی زیر بحث
آگئے ہیں۔ قاضی صاحب کا نزاد یہ نگاہ خالص اسلامی ہے۔ اور تحریر کا انداز کہیں محققانہ ہو

اور کہیں مناظرانہ۔ مخالفوں کے جوابات خود انھیں کی کتابوں سے دئے ہیں۔
کتاب شروع سے آخر تک دل چسپ ہے اور نہایت محنت سے لکھی گئی ہے۔

دستور پہلوی | مصنفہ جناب دین محمد صاحب ایم اے۔ بزبان فارسی۔ صاف ٹائپ میں اچھے کاغذ
اور بڑی قلمی پریمیت میں چھاپی گئی ہے۔ ضخامت ۲۴۴ صفحے۔ قیمت فی نسخہ ستر
لئے کا پتہ :- دین محمد صاحب بی اے۔ الریاض ہال بازار۔ امرتسر۔ پنجاب۔

ایران کی قدیمی زبان فرس یا ساسانی کے نام سے مشہور ہے جو منجانشی بادشاہوں کے عہد
میں بولی جاتی تھی (۶۵۰ء سے ۳۳۰ء تک) جس کی یادگار اب سوائے چند پرانے کتبوں کے
جو پرسی پولس (تحت جشید) بہستان (بے ستون) میں پائے گئے ہیں اور کچھ نہیں ہے۔ پھر اسکندر
مکہ دنی کی تاخت و تاراج کی وجہ سے ایران میں طوائف الملوک پھیل گئی۔ جو تقریباً سو سال تک رہی
۳۲۶ء ق۔ م میں اردشیر بابکان نے ساسانی حکومت کی بنیاد ڈالی جو اسلامی فتوحات یعنی
عہدِ نیر و گر و تک رہی۔ اس دورہ اشکانی اور عہد ساسانی کی زبان پہلوی کہی جاتی ہے جو رسمی دینی
اور ادبی حیثیت سے مستعمل تھی۔ یہ کتاب اسی زبان کے رسم الخط اور صرف و نحو کے متعلق ہے جو نہایت
کہ وکاوش اور تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ اس کے مخاطب عوام نہیں ہیں بلکہ یہ ان خواص کے لئے
ہے جو ایران کی قدیم لسانی تحقیقات سے ذوق رکھتے ہیں۔ زبردشت کی کتاب اوستا کے متعلق مصنف
نے لکھا ہے کہ ہخامنشان کے عہد میں اس کے صرف دو ہی نسخے ایران میں تھے جب اسکندر نے اسخر
(پایہ تخت) ایران کو جلا دیا تو ایک نسخہ جل گیا دوسرا نسخہ وہ اپنے ساتھ لے گیا۔ جس میں سے طب، نجوم
فلسفہ، اور جغرافیہ کے متعلق جو حصہ تھا اس کو یونانی میں منتقل کر کے بقیہ کو برباد کر دیا۔ اوستا کے قدیم
بہت بڑی کتاب تھی جو ۱۸۰ فصلوں پر تمام ہوئی تھی۔ اور مورخین قدیم کے بیان کے مطابق
گائے کے بارہ ہزار چرم کے پارچوں پر لکھی جاتی تھی۔ عہد ساسانی میں جب اولین شہنشاہ نے اس کو
فراہم کرانے کی کوشش کی تو مویدوں نے اپنی یادداشتوں سے جو کچھ جمع کیا وہ صرف ۳۴۸ تفصیل

نہیں۔ وہ بھی دستبرد زمانے سے رفتہ رفتہ فنا ہوتی رہیں۔ تاآنکہ اب جو کچھ حصہ اوستا کا رہ گیا ہے وہ دورہ ساسانی کے اوستا کے چہارم سے زیادہ نہیں ہے۔

مصنف نے پیشدادیوں کے عہد کی بحث کو غالباً اپنے موضوع سے خارج سمجھا مگر ہم اوستا کی طرح اس کتاب میں دساتیر کے متعلق بھی تاریخی بحث دیکھنا چاہتے تھے۔

مصنف نے اس کتاب کی تصنیف میں نہ صرف مشرقی اور مغربی علما کی تحقیقات اور ان کی علمی اور تاریخی کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ بلکہ بعض موجودہ اہل علم سے بھی استفادہ کیا ہے اس لئے ان کی یہ کتاب تحقیقاتی حیثیت سے بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ انھوں نے نہ صرف زبان اور اس کے قواعد سے بحث کی ہے بلکہ ایرانی زبان جن خطوط میں لکھی جاتی تھی اس کی تحقیقات بھی تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔ ہم اس کو اہل علم کے لئے ایک بیش قیمت تحفہ سمجھتے ہیں۔

(ج ۱)

رسالہ

شاہکار۔ ماہوار | ایڈیٹر و فیصلہ تاجور۔ قلع ادبی دنیا کے برابر۔ ضخامت ۲، صفحہ

قیمت سالانہ تین روپے ۸ مقام اشاعت۔ دفتر شاہکار۔ لاہور

مولانا تاجور بہت کہنے مشق اخبار نویس ہیں۔ پہلے وہ مخزن کے دورانی کے ایڈیٹر تھے۔ پھر

انھوں نے اپنا رسالہ ادبی دنیا نکالا جس سے اب وہ قطع تعلق کر چکے ہیں۔ لیکن وہ اب تک

کامیابی سے جاری ہے۔ اب اپریل سے انھوں نے شاہکار کے نام سے ایک اور شاندار اور بھاری

بہر کم رسالہ ملک کے تعلیمی رہنماؤں اور افسران تعلیم کے مشورے سے جاری کیا ہے اس کے مقاصد

میں ایک اہم مقصد یہ ہے کہ طلباء کو غالباً ادبی تعلیم دی جائے۔ زیرِ نظر رسالہ جلد کا پہلا نمبر ہے

اس میں شروع میں ہیڈ ماسٹر صاحبان کی خدمت میں ایک درخواست ہے۔ تیسرے صفحے پر ادارہ

ہے جس میں جناب مولینا ارشد صاحب نے رسالے کے مقاصد پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی

ڈالی ہے۔ یہ مقالہ افتتاحیہ تکلیف دہ حد تک طویل ہو گیا ہے پھر جناب تاجور صاحب کے شذرات ہیں

اس میں انھوں نے رسالے کا لائحہ عمل یا پروگرام بتایا ہے۔ اس کے بعد مرزا محمد سعید صاحب ایم اے کا مذہب اور باطنیت پر ایک علمی مضمون ہے۔ پھر مولانا عبدالعزیز الدنحادی کی ایک فارسی نظم ہے، پھر بزم تحقیق کے عنوان سے چند استفسارات اور مولانا احسن مارہروی اور جناب کفنی دہلوی کی جانب سے ان کے جوابات ہیں۔ اس کے بعد خواجہ حسن نظامی کے قلم سے بہادر شاہ کی پوتی کی ایک غم انگیز داستان ہے۔ تعلق نامے پر مقبول احمد صاحب صدیقی مصنف حیات جلیل کا ایک مضمون ہے۔ بہادر شاہ اور مرزا غالب کے عنوان سے ہمیش پر شاہد پیکر ہندو یونیورسٹی کا ایک دل چسپ مضمون ہے۔ پھر خیالات کے عنوان کے ماتحت جناب تاجور نے اصول بیانی و اصول اختیاری، کیرکٹر، اور ہندو مسلم اتحاد پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ شاہیر عالم کے تحت میں مشہور فرانسیسی محب وطن موسیو پونکار کے حالات ہیں۔ غیر معر حربلسٹ صاحب کا ایک دل چسپ افسانہ ہے۔ تعلیمات کے زیر عنوان دلی کی تعلیمی کانفرنس اور دوسرے تعلیمی و علمی اجتماعات کی رودادیں اور ان پر اظہار رائے جو جناب سید حسن برنی صاحب نے چند نادقلمی مصاحف کے عنوان سے ایک پراز معلومات مضمون لکھا ہے۔ پھر ریجانہ کے عنوان سے ایک سبق آموز افسانہ ہے۔ تعلیمی ادارات کے تحت میں تقسیم اسناد کے خطبات کی فہرست اور ان خطبوں پر اظہار رائے ہے۔ اصطلاحات کے تحت میں عامل اور جوتشی کی خبر لی گئی ہے۔ سینما کے تحت میں تماشائی صاحب نے صنعت فلم سازی پر خامہ فرسائی کی ہے۔ شخصیات کے زیر عنوان مولانا ظفر علی، چودھری ظفر اللہ، مینڈو ونبیر کے حالات ہیں۔ تنویرات کے تحت میں علمی اور کچھ سیاسی خبریں ہیں۔ مضامین کے بیچ بیچ میں نظمیں اور غزلیں بھی ہیں اور اکثر بلند معیار ہیں۔ آخری منزل کے عنوان سے ایک ہندوستانی مصور کی سہ رنگی تصویر بھی ہے اور بہت خوب ہے۔ رسالے کے بعض عنوانات مستقبل ہیں مثلاً بزم تحقیق خیالات، شاہیر عالم، تعلیمات، تعلیمی ادارات، اصطلاحات، شخصیات، تنویرات۔ اس میں شک نہیں کہ رسالہ نہایت محنت اور سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے مضامین بھی کہنہ مشوق اور مشہور اہل قلم حضرات سے حاصل کئے گئے ہیں متعل عنوانات کے تحت میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی بہت خوب ہے بحیثیت مجموعی یہ رسالہ طلباء اور عوام کے لئے

بہت مفید ہے البتہ اداریہ کے بارے میں اتنی گزارش ہے کہ یہ اس قدر طویل نہ ہونا چاہئے کہ پڑھنے پر طبیعت اکنانے لگے۔ مضمون نگاروں سے بھی مضمون مختصر اور دل چسپ لکھوائے جائیں۔ شخصیات کا عنوان بھی ہمارے خیال میں کچھ ایسا مزدور نہیں ہے اس میں کچھ تقلید کی لو آتی ہے۔ ویسے بھی اس میں فائدہ کم ہے۔ خرابیاں زیادہ ٹائل ملکن ہے طلباء کے لئے جاذب نظر ہوتا ہم بہت شوخ ہے۔ تقطیع کے بارے میں کچھ کہنا شاید بعد از وقت ہو۔

ادب لطیف (ماہوار) | ایڈیٹر چودھری برکت علی بی اے تقطیع ٹرہی۔ ضخامت ۶۴ صفحات، کتابت و طباعت روشن۔ کاغذ متوسط۔ چند سالانہ سے رنی پرچہ سر۔ مقام اشاعت۔ لاہور۔ یہ پرچہ تاریخ کے مہینے سے لکھنا شروع ہوا ہے۔ ہمارے سامنے اس کا پہلا نمبر ہے۔ شروع میں نذر اولین کے عنوان سے ایڈیٹر صاحب کا افتتاحیہ مضمون ہے۔ جس میں انھوں نے رسالے کے مقصد پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر ادب لطیف کے عنوان سے جناب حکیم احمد شجاع صاحب بی اے سابق ایڈیٹر ہزار دستان کا مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ ادب لطیف صحیح معنوں میں کیا چیز ہے اور اس ادب لطیف (رسالے) کو کیسا ہونا چاہئے۔ اس کے بعد دوسرے مضامین نظم و نثر میں مضمون نگاروں میں چند اچھے اچھے لکھنے والوں کے نام نظر آتے ہیں۔ مثلاً قاضی عبدالغفار صاحب۔ چودھری افضل حق صاحب ایم ایل سی۔ پروفیسر علم الدین صاحب، ایم اسلم صاحب، شاہد احمد صاحب، مسز عبدالغفار صاحبہ وغیرہ۔ رسالے کی ظاہری شان بھی اچھی ہے۔ شروع میں ایک تصویر بھی ہے بحیثیت مجموعی رسالہ ہو نہ ہمارا معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر ایڈیٹر صاحب کی کوشش اسی طرح جاری رہیں تو لاہور کے رسائل میں بہت جلد ایک خاص حیثیت حاصل کرے گا۔

رتن ماہوار | ایڈیٹر شانتی سرورپ نشاط۔ سائز بڑا۔ ضخامت ۱۰ صفحات، لکھائی، چھپائی و تیار کاغذ اچھا قیمت سالانہ ۱۰ روپے رنی پرچہ سر۔ مقام اشاعت دفتر سالہ رتن۔ جموں۔

یہ رسالہ بچوں کے لئے ریاست جموں سے نکلتا ہے۔ ایڈیٹر صاحب اسے بچوں کے لئے دلچسپ و مفید بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مضامین، نطموں اور قصوں کے انتخاب میں بچوں کے فائدے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ انعامی معنی اور دل چسپ لطیفے بھی شائع کئے جاتے ہیں۔ رسالہ بچوں کے لئے مفید ہے۔ اگر ایڈیٹر صاحب رسالے کی زبان اور آسان کردیں اور مضامین کے انتخاب میں ذرا سختی سے کام لیں تو اچھا ہو مثلاً زیر نظر پرچے میں ”بچپن“ والا مضمون بچوں کے لئے نہ مفید ہے اور نہ اس سے انھیں کچھ دل چسپی ہو سکتی ہے۔

سالانہ پھول باغ (ماہوار) | ایڈیٹر صاحبزادہ کوثران سنگت پوری، ساڑ بڑا۔ ضخامت ۱۰ صفحہ
قیمت سالانہ سے سالانہ نمبر کی غیر۔ مقام اشاعت ریاست پٹیالہ۔

یہ رسالہ نوجوانوں اور طلبائے مدارس کے لئے پٹیالہ سے ماہوار نکلتا ہے۔ زیر نظر نمبر اس کا سالانہ نمبر ہے۔ ایڈیٹر صاحب نے اچھے اچھے لکھنے والوں کے مضامین نظم و نثر جمع کئے ہیں رسالے میں ہمارا جہ پٹیالہ۔ انسان ریاست اور چند مضمون نگاروں کی تصویریں بھی ہیں۔ کتابت طباعت میں ترقی کی گنجائش ہے

اُتھات سالانہ نمبر | مدیرہ قرینہ سائیکم صاحبہ، لہٹھ بڑی، ضخامت ۱۱۲ صفحے کاغذ اور کتابت و طباعت معمولی۔ قیمت سالانہ سے رخصت سالانہ نمبر ۸۔ مقام اشاعت بھوپال۔

یہ بھوپال کے مشہور زمانہ ہفتہ وار رسالے کا سالانہ ہے۔ اور محنت اور سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے۔ مضامین نظمیں افسانے وغیرہ سب مفید اور نتیجہ خیز ہیں، ابست کتابت و طباعت میں بہت کچھ ترقی کی گنجائش ہے۔ شاید بھوپال میں اس سے بہتر انتظام ممکن نہ ہو سکا۔

مصنف خواجہ غلام السیدین صاحب پروفیسر تعلیمات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بنالہ
 کردہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد۔ حجم ۴۴ ص ۵۰۰ قطع ۲۰×۲۶، کاغذ، کتابت،
 طباعت اکیڈمی کی اور کتابوں کی طرح نہایت عمدہ۔ قیمت تین روپے (چھ روپے)
 واحد ایجنٹ: کتابستان۔ ۱۷ الف اسٹی روڈ۔ الہ آباد۔

خدا کا شکر ہے کہ مدتوں کے بعد اردو میں ایک اعلیٰ درجے کی کتاب نظر آئی۔ اصول
 تعلیم ان کتابوں میں سے ہے جنہیں دیکھ کر امید ہوتی ہے کہ اردو ہندوستان کی اور سب زبانوں کو
 بڑھ جائے گی اور ایک دن یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں کا مقابلہ کرے گی

تعلیم کے متعلق اردو میں ابھی تک چند ترجموں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ تہذیب الاذواق کے
 مصنفین یا سلم ایجوکیشنل پبلیکیشنز کے خطنے ہائے عداوت میں جن کا ذکر اصول تعلیم کے فاضل مصنف نے
 اپنے دیباچے میں کیا ہے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کے علمی مسائل کے متعلق مفید معلومات موجود
 ہے۔ لیکن نظری اور علمی بحث کا کہیں نام بھی نہیں ہے۔ یہی کتاب ہے جس سے ہماری زبان میں
 علم تعلیم یا فلسفہ تعلیم کی بنیاد پڑتی ہے اور اگر بنیاد سے عمارت کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے تو ہم بے
 تامل کہیں گے کہ انشاء اللہ ہمارا آئندہ نظریہ تعلیم نہایت معقول اور مستحکم ہوگا۔

فاضل مصنف نے کتاب کے تین حصے کئے ہیں۔ پہلے حصے کا عنوان تعلیم و تمدن ہے۔ اور
 اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ تعلیم تمدنی زندگی میں کیا اہمیت رکھتی ہے اور اسے قوم کی 'معاشرت'
 معیشت اور سیاست سے کیا تعلق ہے۔ دوسرے حصے میں جس کا عنوان 'دوسری تعلیم' ہے۔ ذہنی
 تعلیم کی ماہیت اور حقیقت اس کے وسائل یعنی نظام تعلیم اور منصاب تعلیم کی بحث ہے اور اسی کے ساتھ
 جسمانی تربیت کے مسئلے پر گہری نظر ڈالی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں جس کا عنوان 'اخلاقی اور معاشرتی
 تربیت' ہے۔ اخلاق کا مفہوم معین کر کے ذہنی اور اخلاقی تربیت کا تعلق اور ضبط و تادیب کا جدید
 نظریہ بیان کیا گیا ہے اور معلم کی شخصیت کو اخلاقی تربیت کا ایک اہم عنصر قرار دے کر طلبہ کی اخلاقی
 سیرت کی تعمیر کے اصول قائم کئے گئے ہیں مصنف کی فاضلانہ بحث کا لب لباب یہ ہے کہ تعلیم کوئی

محرور چیز نہیں۔ بلکہ اس کی جڑیں تمدنی اور معاشرتی زندگی میں بیوست ہیں جس سے جدا ہو کر اس کا پینا محال ہے۔ اس لئے تعلیم کا حقیقی ذریعہ زندگی کو سمجھنا چاہئے۔ اور مدرسے کو بھی زندگی کا ایک چھوٹا نمونہ بنانا چاہئے۔ تعلیم محض ماحول کے اثرات انفعالی طور پر قبول کرنے کا نام نہیں بلکہ اس ماحول پر اثر بھی ڈالا جاتا ہے۔ یعنی ہر قسم کی تعلیم خواہ وہ اخلاقی ہو یا ذہنی عمل سے گہرا تعلق رکھتی ہے اس لئے اس کی بنا عمل پر ہونی چاہئے۔ موجودہ زمانے میں دنیا کا تمدن جمہوریت کا رنگ اختیار کر چکا ہے اور ہندوستان پر بھی یہ رنگ چڑھتا جاتا ہے۔ اس لئے تعلیم ابتدا سے جمہوریت کے سانچے میں ڈھالنا ضروری ہو تاکہ آئندہ نسل جمہوری معاشرت کے لئے تیار ہو جائے۔

کتاب کے مضامین مصنف کی مہارت فن، وسعت مطالعہ، وقت نظر اور جدت فکر کی شہادت دیتے ہیں۔ اور اس کی صاف، سلیس، اشگفتہ عبارت ان کے ذوق ادب اور سلیقہ تحریر کا عمدہ نمونہ ہے۔ ہم مصنف کو اور ہندوستانی اکیڈمی کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد دیتے ہیں۔

قطعہ قلب

﴿مُکَلَّمِ یُنُورِ سُبْحٰی کے اِس جلسہ میں پڑھا گیا جو سید سجاد حیدر صاحب کی صدرات میں منعقد ہوا تھا﴾

زبان میں اُن کی حلاوت ہیاں میں لذت ہے
نیا خیال ہے طرزِ ادا میں حدت ہے
کچھ ایسی حنائی رنگیں یہ اُن کو قدرت ہے
ادب کی جان ہے سرمایہ فصاحت ہے
یہ حسن و دل کشی و ندرت عبارت ہے
حباب میں بھی نہیں اِن میں جو نزاکت ہے
کچھ اپنی قوم سے اِس طرح اُن کو نسبت ہے
حیات جن کی اک عالم کو درس حکمت ہے
کہ جن کے صدق و وفا کی جہاں میں شہرت ہے
کئے ہیں کام وہ مردوں کو بن پر حیرت ہے
ہے جس کے سینوں میں جرأتِ لول میں غیرت ہے
عسریہ ایسی کچھ اِس کو مستاعِ حرمت ہے
یہ ایسی کان کا اک لعلِ بیش قیمت ہے

ادبِ نکتہ شناس و خطیبِ خوش تقریر
فیض و شستہ و جربستہ سخن اُن کا
وہ جذبِ قلب کی لفظوں میں کھینچ دین تصویر
وہ کون؟ خالدہ خانم، کہ جن کا ہر لفظ
جھلک ہی ہے مئے خوشگوارِ شیشہ میں
نہیں نکلنے یہ الفاظ آنگینے میں
وہ خالدہ جو میں ترکی کی زندہ اک تاریخ
لبسِ فکرِ مہتر، و زہیرِ باتِ دبیر
وطن پرست و رضا کار و سپیکرِ خلاص
اگرچہ اُن کو تعلق ہے صفتِ نازک سے
وہ قوم ترکِ محبمِ ثبات و استقلال
جو سرِ کو بیچ کے لیتی ہے مولِ آزادی
یہ ایسی قوم کا ہے اک عزیزِ سرمایہ

ادب میں قوم میں اپنی جوان کی عزت ہے
زبان میں زور نہ مہیکے قلم میں طاقت ہے
”وہ آئیں گھر میں ہمارے حسدِ اِک قدرت ہے“

زبانِ حضرتِ سحبا دے سنیں احباب
میں بے ہنر ہوں کہوں کیا زراہِ استقبال
زبانِ حضرتِ غالب سے ہاں مگر یہ کہوں

کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں !!“

نذر خالہ

(یہ نظم خالہ قائم صاحبہ کے استقبال کی تقریب میں مسلم یونیورسٹی میں پڑھی گئی تھی)
دل مسرت کی فراوانی سے دیوانہ ہو آج
نورِ عشرت سے منور یہ سیاہ خانہ ہو آج
کیفِ صہبا کو طرب میں غرقِ میخانہ ہو آج
ہر شجر ساقی ہو اور ہر بھول پیمانہ ہو آج
غنجِ دگل تھے یہی لیکن یہ رعنائی نہ تھی

اس گلستان میں بہار اس محوم کو آئی نہ تھی
زرگسِ مخمورِ لذت کشِ خوابِ نشاط
پھوٹ بھلا گول و نرسر کی سیلابِ نشاط
اہلِ محفل کے کو مشکلِ ہر آبِ نشاط
پرفشاں ہو جذبہِ پنہاں ابھرنے کے لئے
مضطرب ہو ذرہ ذرہ قفسِ کمنے کے لئے

پھر ادھر آئے نہ آئے یہ شمیمِ جاں نسا
بھرمیر ہو نہ ہو ایسا سماں ایسی ہوا
بھیڑ اس اندازِ سولے مضطربِ نگینِ نوا
ٹوٹ جائے آج اک اک تاریخے ساز کا
مغرب
ذکرِ حبِ بتِ کامہ و پروں کے کاشانے میں ہو

اللہ اللہ آج وہ اپنے صنمِ جانے میں ہو
خالہ! تو بے بہشتِ ترکمانی کی بہار
تیری پیشانی پہ نورِ حریت آئینہ کار
تیرے رخ سے پر تو حسنِ صداقت آشکار
گلِ پشیاں، قلبِ بلبلِ رشک کے دو نیم ہو
تیری بانوں میں خسارِ کوثر و نسیم ہو

لے مقدس حور لے پروردہِ موجِ نسیم
روحِ عشرت گاہِ ساحلِ جانِ طوفانِ عظیم
تو نے ترکوں کو دکھائی ہو صراطِ مستقیم
چھوٹک ڈلے ہیں تھکے مجاہداتِ قدیم
ضعف دکھلایا کبھی گرفتِ احرار نے

اُگ بر سادی ہو تیرے نطق گو ہر بار نے
 رہ چکی ہو ہاتھ میں تیرے وہ تیغ بے نیام
 جس کی جنبش نے بدل ڈالا حکومت کا نظام
 تیرے ہی ہاتھوں نے پھٹکا تو ہیں آزادی کے جام
 تو نے جو احساں کو ہیں ملت احسار پر

نفس ہیں اب تک سمنائے کے درو دیوار پر
 ہاں بتائے ہم کو بھی اے روح ارباب نیاز
 کس طرح مٹا ہو آخر زنگِ فحش کا امتیاز
 دل پہ کیوں کفایت ہو جاتے ہیں آزادی کے را
 چھوڑتے ہیں کس طرح محفل میں بیداری کا سنہ
 تیری آنکھوں میں سرورِ عشرت جھہر رہے
 آہِ یغیت ہائے دس برس کی دور رہے

محم درو و مسرت راز دارِ صبح و شام
 غامشی محفلِ فطرت ہو تجھ سے ہم کلام
 تیری ہستی آسمان ترک کا مہما ہر مقام
 تو محبت ہر نفس تیرا محبت کا پیام
 گلشنِ مشرق میں مانندِ صبا آئی ہے تو
 صبحِ روشن کا پیام جانِ فزا لائی ہے تو

قریبِ گل کس قدر جانِ بخش ہو خاؤں کو پوچھ
 چاند کی منور میں کیا لطف ہو تاؤں کو پوچھ
 نشہ صہبائیں کیا لذت ہو خواؤں کو پوچھ
 چارہ سازی میں مزا کیا ہو یہ مایوں کو پوچھ
 روحِ ددل کو جگمگاے جلوہ آرائی تری
 کم سے کم اتنا تو کر جلے مسیحا ئی تری

کوئی دم میں اس گلستاں کو چکنا ہو ہیں
 فرشِ گل سے دور انکار میں پہ چلنا ہو ہیں
 فارارِ عزم کو پیروں سے چکنا ہو ہیں
 جادۂ منزل پہ گرنا ہے سب بھٹنا ہو ہیں
 درسِ ایسا ہے کہ دل بجائے منسل نہ ہو
 فکرِ لا طائل نہ ہو اندیشہ باطل نہ ہو!

عَنْدَل

جو لطف ہے مدعا پرداز ہے
 لطف میں اب جور کا انداز ہے
 کچھ تو کہئے کن ترانی ہی سہی
 کاروانِ دل بھی پیچھے رہ گیا
 اللہ اللہ شورشِ ضبطِ سکوت
 پر تو حُسنِ تبسم دکھینا!
 درو کا انتخاب دیکھا چاہئے
 کون اٹھا چاہتا ہے بزم سے
 ذرہ ذرہ اہرنہ ہے حُسن کا
 گھنٹگو تک راز تھا ایماںِ دل
 پھر بھی اپنا راز اپنا راز ہے
 مژدہ لے دل ابتداءے ناز ہے
 ذرہ ذرہ گوشِ برآواز ہے
 زندگی کتنی سبک پرواز ہے
 ہم زبانِ حالِ دل کا راز ہے
 گلستاںِ دنیا لے سوزِ سا ہے
 ابتدا تو حشر کا آغاز ہے
 رنگِ محفلِ مائلِ پرواز ہے
 پھر بھی رازِ حُسنِ اب تک از ہے
 اب جنوشتی مدعا پرواز ہے

کو کب اپنا رہنما ہی نورِ عشق
 ہر شعاعِ دل پر پرواز ہے

شذرات

پچھلے پرچے میں ہم تصدق احمد خاں صاحب شروانی مرحوم کی اندوہناک خبر شائع کر چکے ہیں مرحوم کا نام سائے ملک میں ہوا۔ اور اب تک ہو رہا ہے۔ جامعہ ملیہ میں اس سانحے کے دوسرے دن تعزیت کا جلسہ منعقد ہوا جس میں چھوٹے بڑے طلباء اور اساتذہ جمع ہوئے۔ کلام مجید کی تلاوت اور فاتحہ خوانی کے بعد شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے ایک موثر اور مختصر تقریر کی جس میں خاص طور پر چھوٹے بچوں سے خطاب تھا۔ مرحوم کی زندگی کے مختصر حالات بیان کر کے جناب شیخ الجامعہ نے ان کے غلوں اور جوش، سادگی اور اشیاء، حق گوئی اور حق پسندی، بے خوفی اور بہادری کے اوصاف کو نمونے کے طور پر پیش کر کے خدا سے دعا کی کہ جامعہ کے ہر نسل کو ان کی تقلید کی توفیق دے۔ اس کے بعد چھٹی کا اعلان منسہر مایا۔ اور طلبہ کو ہدایت کی کہ اپنی اقامت گاہوں میں جا کر قرآن مجید کی تلاوت کریں اور مرحوم کے لئے مغفرت کی دعا مانگیں۔

جامعہ کی عمارت کے لئے چندے کا کام شروع ہو گیا ہے تجویز یہ ہے کہ جناب شیخ الجامعہ اور شفیع الرحمن صاحب قدوائی ناظم علقہ ہمدردان جامعہ۔ ۲۲ اپریل سے صوبہ متحدہ کا دورہ شروع کریں۔ سب سے پہلے میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور، بجنور، مراد آباد، بریلی، شاہجہاں پور کا ارادہ ہو۔ اس کے بعد مشرقی اضلاع کی باری آئے گی، ہر ضلع کے سربراہ اور وہ اصحاب سے خط و کتابت ہو رہی ہے۔ جامعہ کی طرف سے یہ شرط ہے کہ جس ضلع میں جامعہ کا وفد جائے وہاں سے کم سے کم ایک ہزار یکمشت اور پچیس روپے ماہوار کی مدد ملے۔ اکثر مقامات سے وعدہ کیا گیا ہے کہ اس سے بہت زیادہ چندہ ہو جائے گا خدا کرے یہ امیدیں برائیں اور یہ وعدے پورے ہوں۔

خدا کا شکر ہے کہ دہلی شہر جو جامعہ کا گھر ہے اپنی شان کے مطابق جامعہ کی مدد کر رہا ہو۔ یکم مایچ کے جلسے میں دہلی کی طرف سے پچاس ہزار کی مالیت کی جائداد اور اٹھارہ ہزار نقد کے وعدے ہوئے تھے وعدوں کی قسم وصول ہو رہی ہے اور اس کے علاوہ کم سے کم بارہ ہزار روپے کی مزید امداد کا اہل دہلی نے ذمہ لے لیا ہے۔ جناب حاجی محمد ابراہیم صاحب کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جس میں شہر کے تمام معزز تاجر اور محبان ملت شامل ہیں۔ یہ حضرات چندے کی وصولی کا انتظام خود کر رہے ہیں اور انھوں نے جامعہ کے لوگوں سے کہہ دیا ہے کہ آپ باہر کام کیجئے گھر کا کام ہم پر چھوڑ دیجئے۔ جزاہم الحمد للہ۔ اگر ان باہمت اصحاب کی کوشش کامیاب ہوئی اور انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوگی تو دہلی کا مجموعی چندہ (پچاس ہزار کی جائداد کو ملا کر) اسی ہزار سے زیادہ ہو جائے گا۔ امید ہے کہ ہندوستان کے دارالسلطنت اور سب سے بڑے اسلامی مرکز کی یہ شاندار مثال اور مقامات کے لوگوں میں بھی فیاضی، علم دوستی اور ملت اسلامی کی محبت اور خدمت کے جذبات کو پیدا کر دیے گی، اور جامعہ کا وفد ہر شہر اور ہر قصبے میں کامیاب ہوگا۔

ہم نے جنوری کے پرچے میں رسالہ جامعہ کے قارئین کرام سے اپیل کیا تھا کہ عمارت کے فنڈ میں اپنے حلقے کی طرف سے کم سے کم ایک ہزار روپے کی امداد عطا فرمائیں۔ آج ہم پھر اس کی یاد دہانی کرتے ہیں جامعہ کا ہر شعبہ اس سعی میں سرگرم ہے کہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس مبارک کام میں حصہ لے۔ رسالہ جامعہ نے آج تک کبھی چندے کا کوئی فنڈ نہیں کھولا، اور یہ چیز اس کے مقاصد میں دخل نہیں ہے۔ لیکن بوجہ ایسا ہی کہ ہم اس قسم کا اپیل کرنے پر مجبور ہو گئے۔ قارئین جامعہ سے التجا ہے کہ جب رسالے کو چندہ بھیجیں تو اس کے ساتھ عمارت کے فنڈ کے لئے بھی تھوڑی بہت قسم روانہ فرمائیں یا جب ان کے شہر میں جامعہ کا وفد پہنچے۔ تو رسالہ جامعہ کے اپیل کا حوالہ دے کر حسب توفیق چندہ عطا فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

جلد ۲۴ اپریل ۱۹۳۵ء نمبر

فہرست مضامین

- ۱ - ہندوستان کا تعلیمی نصب العین ڈاکٹر قاضی عبدالحمید ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی (برلن) ۲۹۲
- ۲ - آزادی پر ذبیہ محمد عاقل۔ ایم۔ اے۔ ۳۱۱
- ۳ - ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل پر ذبیہ محمد مجیب بی۔ اے۔ (راکھن) ۳۲۵
- ۴ - غزلیات جو شش عظیم آبادی ۳۴۴
- ۵ - افکار پریشان از گلور مترجمہ حضرت تثنائی ۳۵۰
- ۶ - حیدر علی مولوی بدر الحسن صاحب شلم جامعہ ۳۵۵
- ۷ - انوکھا ظہیر عمر سیف الدین - مترجمہ محمد عاقل صاحب ۳۶۴
- ۸ - تنقید و تبصرہ
- ۹ - شذرات

محمد مجیب بی۔ اے۔ (راکھن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

یاد رکھنے کی بات

مشہور مصنفین اردو مثلاً مرزا غالب، خواجہ حالی، علامہ شبلی، مولانا آزاد، مولانا
علامہ اقبال، منشی پریم چند اور اردو کے جملہ مصنفین کی بلند پایہ تصانیف و تراجم اور لاہور
لکھنؤ، الہ آباد، حیدر آباد، اورنگ آباد، اعظم گڑھ وغیرہ مقامات کی سب کتابیں ہر وقت
ہمارے یہاں موجود رہتی ہیں۔ شائقین فہرست طلب فرما کر اپنی پسندیدہ کتابیں منتخب فرمائیں۔

رعایت۔ مطبوعات جامعہ پر محصول ڈاک اور پکینگ بالکل معاف ہو سکتا ہے بشرطیکہ
(الف) فرمائش مبلغ دو روپے سے کم نہ ہو۔
(ب) رقم بذریعہ منی آرڈر پیشگی ارسال کی جائے۔

مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسری کتابوں پر اس شرط کے ساتھ کہ فرمائش مبلغ (دھ) سے
کم نہ ہو اور رقم پیشگی پہنچ جائے محصول ڈاک معاف کیا جائے گا۔ البتہ ان کتابوں پر جو ہمیں بھی کسی غلو،
رعایت سے نہیں ملتیں یہ ممکن نہ ہوگا۔

مکتبہ جامعہ کے مندرجہ ذیل سائل کے نمونے

کتاب "عنا" (ماہوار) سالانہ چندہ (۱۴)
کتاب "عنا" (ماہوار) سالانہ چندہ (۱۴)
کتاب "عنا" (ماہوار) سالانہ چندہ (۱۴)

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

ہندوستان کا تعلیمی نصب العین

(فلسفہ تارمخ و تمدن کی روشنی میں)

قبل اس کے کہ ہم ہندوستان کا تعلیمی نصب العین اس کے تمدن کی تاریخی روشنی میں متعین کرنے کی کوشش کریں ہیں تعلیم کے متعلق مختصراً اپنے خیالات کا اظہار کر دینا چاہیے۔

تعلیم انسان کی فطری قوتوں اور خارجی اثرات کے تعامل سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ تیسرے داخلی اور خارجی دنیا، من، تو، انسان اور کائنات کے باہمی تاثرات کا۔ انسان کی فطری قوتیں دو قسم کی ہیں۔

۱۔ حیاتی مثلاً ناک، کان، آنکھ، ہاتھ، پیر وغیرہ۔ غرض انسان کا پورا جسم۔

۲۔ نفسی۔ جس میں انسان کی تمام ذہنی اور عقلی، معاشی اور سیاسی، جمالی اور اجتماعی، اخلاقی اور مذہبی

قوتیں اور اس کے جذبات اور احساسات وغیرہ شامل ہیں۔

حیاتی اور نفسی قوتیں تعلیمی عمل کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر نہ موجود ہوں تو تعلیمی عمل وجود ہی میں نہیں

اسکتا۔ اس کا پر علم انفس سے واقفیت تعلیم سے دلچسپی کئے فائدوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسان کی بنیادی قوتیں ان کی ترقی و تنزل کے اسباب۔ ان کے باہمی تاثرات کے قوانین۔ ان کی نفسی نشوونما کی مختلف اہمیت وغیرہ کا صحیح علم حاصل کر سکیں۔ روسو اور پتالوزی کا پیدا کردہ خیال اب ایک حقیقت مسلہ ہے۔ جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

جہاں انسان ان قوتوں کے ذریعے خارجی دنیا کے اثرات قبول کرتا ہے۔ یعنی اُن کو اپنے نفسی قوتوں

کے مطابق ڈھالتا ہے۔ وہاں خارجی قوتیں بھی اس پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔

ان خارجی قوتوں پر ہم تین مختلف عنوانوں کے تحت میں غور کریں گے۔ یعنی

۱۔ تمام کائنات بحیثیت مجموعی۔

۲۔ انسانی تمدن

۳۔ اور ان دونوں کے تحت میں مرتب کردہ ایک مخصوص نظام تعلیم

۱۔ کائنات بحیثیت مجموعی انسانیت کی تعلیم و تربیت میں مصروف عمل رہتی ہے۔ کائنات کا ہر فعل انسانی نفس پر اثر پذیر ہوتا ہے جس سے انسان اپنے آپ کو مطلق آزاد نہیں کر سکتا۔ سیاروں کی گردش، چاند کی چمک آفتاب کا طلوع و مغرب۔ زمین کی حرارت و برودت، موسموں کی تبدیلی، فصلوں کی نشوونما، غرض فطرت کی ہر ہر چیز اور ہر تغیر انسان کے جسم اور نفس پر اثر ڈالتا ہے۔

انسانی نفس ان تاثرات کو ساکت و جامد قبول نہیں کر لیا کرتا بلکہ انہیں اپنے تخلیقی عمل کے تحت میں لاتا ہے۔ اسی لئے مختلف نفوس پر فوہیں فطرت کے مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں عقلیت پسند طبعیت فطرت میں عقل کی کار فرمائی دیکھتی ہیں۔ اور وہ علت و معلول کا سنجائی سلسلہ ختم کرنا چاہتی ہیں۔ بنیویت صرف تجربے پر انکشاف کرتی ہے اور کسی نفس سے جو خود بھی آزادانہ عمل کر سکے انکار کرتی ہے۔ بخلاف اس کے صیبت تمام فطرت میں صرف مدرک کا جلوہ دیکھتی ہے اور مدرک یعنی خارجی دنیا کو ایک حقیر اور فنا فی چیز سمجھتی ہے۔

تصور کائنات صرف افراد ہی کا نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی اقوام کا بھی ہوتا ہے اور اسی بنیاد پر قوم کے تمام تمدن کی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ چیز کسی قوم کے مختلف تمدن کے عناصر میں ایک وحدت اور یکسانیت پیدا کرتی ہے۔ وہ تمام قوم کی ذہنی زندگی میں ایک سرشت کا کام دیتی ہے۔ یہ چیز اگر کسی قوم سے جدا کر دی جائے تو وہ اس قافلے کی طرح ہوجاتی ہے جس کا کوئی منزل مقصود نہ ہو اور جو صحرا میں آوارہ پھر رہا ہو اور بالآخر اپنی بے دردی کے باعث صحرا کے ہلاکت آفریں جھونکوں سے تباہ و برباد ہوجائے۔

موجودہ جرمن قوم کے تمام ایوان تمدن کی بنیادیں جرمن صیبت پر استوار ہیں۔ ان کے شعرا ان کے فلاسفہ، ان کے داعیان مذہب باوجود گونا گوں اختلافات کے اس مرکزی چیز پر متفق ہیں۔ اسی طرح اہل یونان و روم، اہل چین و جاپان، اہل عرب و ہند کا ایک مخصوص تصور کائنات رہا ہے۔ جب تک اس تصور میں اتحاد رہا وہ اقوام اپنا ایک متعل وجود قائم رکھ سکیں۔ لیکن جوں ہی کہ یہ سلسلہ ہاتھ سے چھوٹ گیا

۱۔ اشتراکیت کے گڑھوں میں جاگریں۔

فطرت کی نیزنگیاں چونکہ مختلف افراد اور اقوام پر مختلف اثرات مرتب کرتی ہیں اس لئے تفسیری نصب العین کے متفق کرنے میں یہ تصور کائنات بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ دوسری خارجی قوت جو انسان پر اپنا اثر ڈالتی ہے اور اس کی تعلیم و تربیت میں حصہ دیتی ہے وہ انسانی تمدن ہے۔ اس قوت سے انسان مقابلہ کسی قدر آزاد بھی ہو سکتا ہے۔ مگر کلیتاً نہیں۔ تمدن انسان کے مختلف نفسی قوی کے خارجی دنیا میں انہماک کے باعث پیدا ہوتا ہے اور پھر یہ خود انسانی نفس پر اثر ڈالتا ہے اور اس کی تشکیل میں مدد یا مزامم ہوتا ہے۔ انسان کے تمام سیاسی، اجتماعی، معاشی، اخلاقی اور مذہبی نظامات اسی لئے پیدا ہوئے ہیں کہ یہ قویں انسان میں موجود ہیں۔ انہیں داخلی قوتوں نے ان نظاموں میں خارجی صورت اختیار کر لی ہے جین بت۔ نازک و لطیف اشعار، رنگ و بزم کی تصاویر۔ عالی شان۔

عمارتیں، روح پرورد کو سیتی کہاں ہوتی اگر انسان کا جمالی احساس مختلف طریقوں سے خارجی جلوہ اختیار کر لیتا۔ یہ تمدن کا دوشہ انسان کی تعلیم میں مواد کا کام دیتا ہے جس کے ذریعے انسانی قوتوں کی نشو و نما ہوتی ہے۔

جس طرح تصور کائنات مختلف ہوتے ہیں اسی طرح قوموں کے تمدن بھی۔ بعض اقوام پر جمالیاتی رنگ غالب ہوتا ہے۔ تو بعض پر اخلاقی، بعض پر معاشی اور سیاسی تو بعض پر مذہبی۔ اسی لئے دنیا میں تمدنوں کا یہ تنوع ہے۔ یونانی اور اہل ایران ایک جمالیاتی تمدن کے حامل تھے تو انھیں اہل روم ایک سیاسی تمدن کے

چینی ایک اخلاقی تمدن کے علمبردار ہیں تو اہل ہند کا مجموعہ ایک مذہبی تمدن کے اس کے معنی نہیں ہیں کہ دوسرے عناصر حلقہ کسی تمدن میں موجود نہیں ہوتے بلکہ اس کا صرف اس قدر مفہوم ہے کہ ایک عنصر دوسرے عنصر پر چھایا ہوا رہتا ہے۔ ہم ہندوستانی اپنی ہر معاشی، سیاسی اور جمالی چیز کو مذہب کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے اہل یونان اپنی ہر چیز کو محض کہ مذہب کو بھی ایک جمالی نقطہ نظر سے۔ ہمارا اٹھنا بیٹھنا بھی ایک مذہبی فعل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اہل یونان کا خدا کا تخیل بھی ایک متناسب ہم آہنگ اور حسین وجود کا تھا۔

غرض مختلف قومی خصائص کی بنا پر مختلف تمدن ہوتے ہیں اور انھیں کے سایہ میں اس قوم کی تعلیم و تربیت مہنی چاہئے۔ اگر اس کے خلاف کہا جائے تو اس کی مثال یہ ہوگی کہ ہم آج کا وراثت سانسربا کے

برقانی چٹانوں میں لٹکانا چاہیں جس کے لئے وہ محض نازگاریں۔

لیکن کسی قوم کا موجودہ تمدن صرف تاسخِ ماضی کا ورثہ ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ حال کی تمام تحریکوں اور قبل کی تمام اُمیدوں سے متاثر ہوتا ہے۔

۱۔ کسی قوم کے تصورِ کائنات اور تمدن کی بنیادوں پر اس کا تعلیمی نصب العین تعمیر کیا جاتا ہے۔ بنیعتاً اب اپنے لئے ایک محدود دائرہ عمل اختیار کر لیا ہے جہاں وہ اپنی تشکیل جاتا ہے۔ تعلیمی نصب العین اب بلا واسطہ تعلیمی اداروں کے ذریعے جو نظامِ تعلیم کا اہم جز ہے کسی قوم کو موجودہ بچوں کی جسمانی اور نفسی تربیت اس کے تمدن کے سلب سے کرنا چاہئے تاکہ وہ بعد میں تمدنی زندگی میں حصہ لے سکیں۔ اس کو ترقی کے منازل پر پہنچائیں اور اپنے لئے ایک تصورِ کائنات بنا سکیں۔

یہ ہے ہمارے نزدیک تعلیم کا مقصد جو سادگی و جامعہ طور پر تاثرات کا قبول کر لینا، معلومات کا فراہم کر لینا نہیں ہے بلکہ ایک تخلیقی فعل ہے۔ اور جو اپنی تخلیق کے لئے خارجی اشیاء میں مواد تلاش کرتا ہے۔ اسی اصول بحث سے یہ ظاہر ہو گیا ہو گا کہ ہم ہندوستان کے بچوں کی تعلیم ان کے اپنے تصورِ کائنات اور قومی تمدن کی بنا پر کرنا چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان تمام مفید تحریکات سے بے نیاز نہیں ہونا چاہتے جو ان کے تعلیم و تمدن پر اثر انداز ہوتی ہیں قبل اس کے کہ ہم اس تعلیمی نصب العین کا صاف صاف تعین کریں ہم کو تلاش کرنا چاہئے کہ وہ کون سے تصورِ کائنات ہیں جن پر ہمارے ہندوستانی تمدن کی بنیاد استوار ہے۔ ہمارے تمدن کے کیا عناصر ہیں، ان کے اوپر کون سا رنگ غالب ہے اس تمدن کے کون سے عناصر بحیثیت مجموعی انسانیت کے ارتقا میں مضمر اور مفید ہیں۔

ہندوستان میں چند زبردست قوتیں کارفرما ہیں۔ جو ہندوستان کے تمدنی نصب العین اور اس کے تحت میں اس کا تعلیمی نصب العین متعین کریں گی۔ ان قوتوں کا تاریخی رقص و سرود میں ہم مطالعہ کریں گے۔ ان کے مخصوص خصائص کا ہم ذکر کریں گے۔ ان کے متضاد عناصر کو دیکھیں گے اور ہم اپنے عصر کے لئے ایک تمدن اور تعلیمی نصب العین متعین کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہماری یہ کوشش اس عقیدے پر مبنی ہے کہ جس طرح ہر قوم کا ایک علیحدہ تمدنی نصب العین ہوتا ہے

اسی طرح ہر عصر کا بھی ایک علیحدہ تمدنی اور تعلیمی نصب العین ہوتا ہے۔ یہ نصب العین نتیجہ ہوتا ہے ماضی کی روایات حال کی ضروریات اور مستقبل کی امیدوں کا۔

ہندوستان کی ابتدائی تاریخ میں جو آریاؤں کا تعلیمی نصب العین تھا وہ اب ہمارے لئے کافی نہیں ہے۔ چونکہ وہ نتیجہ تھا اہل ضروریات اور مخصوص تخلیقات کا۔ عہد عباسیہ کا تعلیمی نصب العین بھی جو دس نظامی کی شکل میں اب تک ہمارے بیان موجود ہے ہمارے لئے مفید نہیں ہے۔ اس وقت ایک خاص طرز کی اسلامی حکومت قائم تھی اور اسلامی علوم اور یونانی علوم و فنون کا امتزاج ہو رہا تھا۔ یونانی علوم و فنون بہت کچھ غلط ثابت ہو چکے ہیں اور ہم انہیں فرسودہ بنیادوں پر اپنے نظام تعلیم کی بنیاد نہیں رکھ سکتے۔

یورپ آٹھ اور صدی عیسوی میں عقلیت چھائی ہوئی تھی۔ نہ صرف فلسفہ بلکہ ہر سند کا اصل عقل کے ذریعے دھونڈا جاتا تھا۔ اور لکھن کیا جاتا تھا کہ عقل تمام عقدہ ہائے کائنات کو سلجھا سکتی ہے۔ مذہب عقلی استدلال کا نتیجہ تھا۔ اس بنا پر وہاں کا تمدنی اور اس کے ساتھ تعلیمی نصب العین عقلیت پر رکھا گیا اور صرف عقل کی نشوونما تعلیمی اداروں کا مقصد بن گیا۔ بیسویں صدی عیسوی میں اس دور کی بجائے ایک نئی دور ظہور پذیر ہوا اب صرف عقل کی نشوونما پر بھی زور دیا جانے لگا مختلف صورتوں میں یہ خیال اب تک قائم ہے اس لئے وہی تعلیمی نصب العین گو کہ اس میں بہت کچھ تغیر اور گہرائی پیدا ہوئی چلا جا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر دور میں خاص تحریکیں زور پکڑ جاتی ہیں اور انسانی نفس کے خاص عناصر کا غلبہ ہوتا ہے مثلاً کبھی شعوری عناصر کا تو کبھی غیر شعوری کا یعنی کبھی عقل کا تو کبھی مذہب کا، کبھی اجتماعیت کا۔ تو کبھی انفرادیت کا۔ بقول نیگل ہر اثبات ایک نفی پیدا کرتا ہے۔ جو خود امتزاج دھونڈھتی ہے۔ ایک تو جیسا کہ یہ ہو سکتی ہے۔ بہر صورت فلسفہ تاریخ اب تک اس قسمی کو کاٹتا سلجھانے سے عاجز ہے۔ انہیں تحریکات کے باعث جہاں تمدنی نصب العین تبدیل ہوتا ہے وہاں تعلیمی بھی۔

جس طرح دنیا ہر لحظہ تغیر پذیر ہے نظامات تعلیم بھی۔ اگر کوئی چیز نامی اور زندہ ہے تو یہ ضرور ہوگا۔ ہمیں سکون اور استقلال کی اس طرح تلاش نہ کرنی چاہئے۔ تاہم ایک عرصے کے لئے عام بنیادی خیالات زندگی کے لئے کافی ہوتے ہیں اور انہیں کا ہمیں مطالعہ کرنا چاہئے۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ تعلیم کا مقصد انسانی جسم و نفس کا فکلی نشوونما ہے۔ ہر وہ تحریک یا اس تحریک کے عناصر جو اس نشوونما میں مدد پہنچائیں، تعلیم کے لئے مفید ہیں اور باقی مضر۔ ہر زمانے کی تحریکات سے ہم کو تعلیم کے لئے تعمیری اجزاء کو لے لینا چاہئے اور تخریبی کو علیحدہ کر دینا چاہئے۔

جس طرح ہر اعلیٰ نظام تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص تصور کائنات اور ایک مخصوص تمدن کا تخیل پیش نظر رکھے اس طرح ہر بڑی تحریک کا جو زندگی کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے، ایک مخصوص نظام تعلیم بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے تصور کے مطابق انسانیت کی اسی طرح تعلیم و تربیت کرنا چاہتی ہے۔ ہمیں ہندوستان کی موجودہ عظیم نشان تحریکوں سے ان کے تعلیمی عناصر اور اس کی تعلیمی تحریکوں میں سے اس کے تصور کائنات پیدا کر کے دکھانا ہے تاکہ ہم ایک مشترک ہندوستان کے تعلیمی نصب العین مرتب کر سکیں۔

ہندوستان میں اس وقت چار زبردست تحریکیں جاری ہیں یا بالفاظ دیگر چار اہم قوتیں ہیں جو ہمارے لئے تعلیمی عنصر کا کام لے سکتی ہیں۔ یعنی

۱۔ ہندویت

۲۔ اسلام

۳۔ قومیت اور

۴۔ انسانیت

ہمیں ان چاروں تحریکوں میں تلاش کرنا ہے کہ ان کے کون سے عناصر شخصیت کے ارتقاء میں مفید ہیں اور کون سے مضر

۱۔ ہندویت - ہندویت ہندوستان میں سب سے زیادہ اب تک حاوی رہی ہے۔ اور اس وقت بھی ہے۔ ہمیں اس وقت اس ہندویت سے بحث نہیں ہے جو وہ گذشتہ زمانے میں رہ چکی ہے بلکہ ہم اسے موجودہ ہندوستان کے ایک تمدنی عنصر کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں۔

ہندویت کی ترویج کرنا بہت مشکل امر ہے۔ یہ کوئی خاص مذہب نہیں ہے کیونکہ اس میں بہت سے مذاہب شامل ہیں۔ توحید سے لے کر سینکڑوں بتوں کی پرستش اس میں پائی جاتی ہے۔ جہاں اس میں تہذیب

اعلیٰ فلسفیانہ نظام ہیں وہاں اس میں نہایت منقسم کی رسوم بھی شامل ہیں جو فطرت کی توہم پرستی پر مبنی ہیں اس کی ابتدا آریاؤں نے کی تھی جو فاطمانہ طور پر ہندوستان میں داخل ہوئے جنہوں نے نہ صرف اپنی حکومت قائم کی بلکہ اپنے مذہب کو بھی جو فطرت کی پرستش پر مبنی تھا یہاں رائج کر دیا۔ لیکن خود ان کا مذہب بھی مغتوبین کے عقائد سے اثر قبول کئے بغیر نہ بچ سکا۔ باوجود اس تاثر کے پھر بھی ہندو مذہب جس کو آریا مذہب کہنا زیادہ موزوں ہے ایک اشراقیت مذہب رہا جس نے اپنا سرشت ہمیشہ راجاؤں سے قائم رکھا اس نے اپنی یہ مذہبی اور نسلی اشراقیت ذات پات کی قیود، مہمنوں کے علیحدہ طبقے کے قیام کی غرض سے قائم رکھیں۔

مابعد الطبیعیاتی مسائل سے ہندو قوم کو ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اور ان کے فلسفیانہ نظام عقل کی کوششوں کے بہترین ثمرے ہیں۔ باوجود اس فلسفیانہ شغف کے مذہب ان کی فطرت کا جز رہا۔ وہ مذہب جو عقلیات پر مبنی اور بہت کچھ مابعد الطبیعیاتی غور و فکر کا نتیجہ تھا۔

ان خصائص کے جہاں اچھے نتائج مرتب ہوئے۔ وہاں بہت کچھ مضرب بھی۔ مثلاً نسلی، علمی اور مذہبی تقوق کے جذبے نے عوام کو اپنے لوگوں کے طبقے سے باطل بچانہ کر دیا۔ اور ذات پات کی تفسیر بنی نے جو شر و ع میں معاشی ضروریات پر مبنی تھی منو کے قوانین کے مطابق ایک مذہبی شکل اختیار کر لی۔ بدھ مت کی تحریک ایک اعلان بغاوت تھی اشراقیت کے خلاف مگر وہ خود فنا ہو گئی اور اس کے پائدار اثرات نہ رہ سکے۔ بدھ مذہب کی اخلاقی جمہوریت کی بجائے دوبارہ ششکرا چاریہ کے فلسفے نے اپنا اثر جمالیاجو اشراقیت کی حمایت میں کیا۔

بدھ مت کے بعد دو تحریکوں کے اثرات ہندو دیت پر کسی قدر پائدار مرتب ہو سکے یعنی اسلام اور عیسائیت۔ اسلام سے تصادم کے باعث ہندو دیت کے لاشے میں ایک نئی جان پڑ گئی۔ وہ قوم جو تمام دنیا کو الگ تھلک گونہ نشینی میں زندگی گزار رہی تھی پھر ذہنی غور و فکر کی طرف متوجہ ہوئی تو حید کے دھندے سے خیالات ہندو مت میں مفقود نہ تھے۔ لیکن پہلے وہاں اس خیال نے ایک ہمدوست کے عقیدے شکل اختیار کر لی تھی ہندو دھرم یا بھگتی کی تحریک جو عقیدہ تو حید پر مبنی ہے۔ اسلام کی مرہوں منت ہے۔ اس کے بعد پھر تو بہت سی تحریکیں پیدا ہوئیں جو تو حید کے عقیدے پر ہندو مت اور اسلام کو ایک کونہ چا، متی تھیں مثلاً گرو نانک

وہ تحریک جو ہندو مت کو بعینہ آج سے ہزاروں برس پہلے کی شکل میں دیکھنا چاہتی ہے اس بنا پر غلط ہے کہ وہ حال اور مستقبل کی توقعوں سے بیگانہ سوچنا چاہتی ہے۔ وہ تحریک جو بلا کسی وطنی اور قومی امتیاز کے ایک عالم سطحی انسانیت پیدا کرنا چاہتی ہے۔ وہ بھی اس بنا پر غلط ہے کہ وہ اپنے ماضی کو فراموش کر دینا چاہتی ہے۔ اور اس تمام تمدن کے قصر کو جو صدیوں کی کاوش کا نتیجہ ہے اور جو ہندوستان کے خاص خصوصیات کا منظر ہے برباد کر دینا چاہتی ہے۔

اول الذکر تحریک کے باعث بحیثیت مجموعی انسانیت کے نشوونما سے ہم محروم ہو جاتے ہیں دوسری تحریک کے باعث ہندو نفس کو اپنے مخصوص اور امتیازی کیفیات کے اظہار کا موقعہ نہیں ملتا جو انسانیت کے لئے اسی قدر ضروری ہے۔

ظاہر ہے کہ صرف ایک تیسری صورت جو دونوں کے امتزاج پر مبنی ہو صحیح ہو سکتی ہے یعنی ایک ایسا وطنیت کا نخل جو ہندو مت کے ان بہترین اخلاقی اور بحیثیت مجموعی ان تمام اعلیٰ تمدنی روایات پر مبنی ہو جو ہندوستان میں ایک قومیت کے قیام میں مدد ہو سکیں صرف یہی تحریکیں ہمارے موجودہ نصب العین میں ایک زبردست عنصر کا کام دے سکتی ہے۔

۲۔ اسلام ۱۔ دوسرا اہم عنصر ہندوستان کے تعلیمی نصب العین کے متعین کرنے میں اسلام ہے۔ وہ اسلام جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں جو وہ سو برس کی تاریخ کا۔ دنیا کی ہر تحریک کی طرح اسلام بھی بہت سی تحریکوں سے متاثر ہوا اور مختلف ممالک میں مختلف تحریکوں سے امتزاج کے باعث اس نے مختلف شکلیں اختیار کر لیں۔

اسلام بغاوت ہے بت پرستی اور شرک کے خلاف۔ اس نے صرف ایک خدائے واحد پر ایمان لانے کی تعلیم دی تھی اور اس کی مابعد الطبیعیاتی نشریات سے منع کر دیا تھا۔ وہ اخلاقیات کا ایک صاف اور سادہ نظام تھا اور اس کے احکامات کی بنیادیں جمہوریت پر رکھی گئی تھیں۔ یہ اس مذہب کی بنیادیں، ایمان و ایمان، عمل و جدوجہد پر رکھی گئی تھیں۔ فلسفیانہ غور و فکر اور گوشہ نشینی پر نہیں لیکن جو نہی کہ اس دین کو ان اقوام نے قبول کیا جن کی سرشت میں فلسفیانہ غور و فکر تھا جن کو فطرت

نے ماقوق ایسی مسائل پر غور کرنے کے لئے پیدا کیا تھا جن میں مذہبی عنصر کی بجائے عقلی عنصر غالب تھا اسلام میں بھی یہ عناصر شامل ہو گئے۔ ایک طرف یونانی علوم و فنون کے اثر سے عہد عباسیہ میں فلسفیانہ غور و فکر اسلام میں داخل ہو گیا۔ اب صرف خدا پرستین کرنا نہیں تھا۔ بلکہ اس کی ماہیت اور اس کی صفات کا بھی پتہ چلانا۔ ارسطو کے فلسفے سے جس کو کلمان غلط سمجھے۔ اسلام میں عقلیت کی تحریک پیدا ہوئی اور اسلامی علم الکلام کا مقصد عقلی دلائل سے اسلامی احکامات کی حمایت کرنی تھی، اخوان بصفہ کی تحریک اس سے بھی زیادہ عقلیت پر مبنی تھی۔ جن کے نزدیک نام مذہبی احکامات کے لئے عقل معیار صداقت تھی۔

دوسری نوظلاطونی، ایرانی اور ہندی اثر سے تصوف نے بھی اسلام میں ایک مکمل نظام کی صورت اختیار کر لی۔ قرآن کی تعلیمات میں جس طرح عقلیت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح تصوف کے بھی۔ جہاں شعوری طور پر عقلی قوانین کی بنا پر کائنات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے وہاں لا شعوری طور پر کائنات کو محسوس کرنے کا خیال بھی موجود ہے۔ بنیادی خیال ابن سب میں مسئلہ توحید تھا۔ ایک خدائے واحد کا یقین۔ یعنی تمام کائنات کے لئے ایک واحد مقصد اور نصب العین کا خیال۔ چاہے اس کی مابعد الطبیعیاتی تشریح انسانی عقل اور روشنی کے مطابق کچھ ہی کیوں نہ ہو اس کی فلسفیانہ تشریح ہر زمانے کے علوم و فنون کی ترقی پر منحصر ہو جن کی بنیادوں پر فلسفہ ایک تصور کائنات قائم کرتا ہے۔ جس قدر کہ علوم و فنون ترقی کرتے جاتے ہیں اس تصور میں وسعت اور جامعیت پسند ہو جاتی ہے۔ بقول کانٹ عقل کا یہ خا صہ ہے کہ وہ مابعد الطبیعیاتی کی گتھیوں کو سلجھانے میں لکھے، اور جب تک انسان میں عقل موجود ہے وہ اپنی کادشوں سے باز نہیں آسکتا۔ اسی لئے انسان ہمیشہ اپنی ذہنی تکلیف کے لئے فلسفیانہ نظامات بناتا رہے اور بناتا رہے گا۔

اس کے علاوہ اسلام کی مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کا عقلی نمونہ یعنی رسول اللہ کا اسوۂ حسنہ مسلمانوں کے لئے ہمیشہ شمع ہدایت کا کام دیتا رہا۔ نہایت متضاد مابعد الطبیعیاتی خیالات رکھنے والے ائمہ اسلام مثلاً ابن رشد جو عقلیت پسند تھے اور فلسفہ ارسطو کے متبع اور امام غزالی جنہوں نے

اسلام کی بنیاد اس کے تصوف پر استوار کی ہے۔ امام غزالی جنہیں قرآن کے ظاہری اور لفظی معنی پر ایمان لانے میں حد درجہ غلو تھا حتیٰ کہ خدا کی جہانیت تک کے قائل تھے اور اخوان الصفا جو عقلیت پسند تھے اور بہت زیادہ تاویل کے قائل تھے۔ رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع پر متفق ہیں۔

ہندوستان میں اسلام عقلیت کی تحریکوں سے زیادہ تصوف سے متاثر ہوا۔ جہاں کرڈروں ہندوستان کے باشندوں نے اسلام قبول کیا۔ وہاں انھوں نے اپنے خیالات بھی اس میں شامل کر لئے۔ اسلام میں بھی ایسی تحریکیں پیدا ہوئیں جو دونوں مذاہب کو یک جا کرنا چاہتی تھیں جس میں خاص طور پر دکن میں ست بنیوں کی تحریک ہے۔ لیکن مذہبی اعتبار سے ہندوستان نے اسلام پر بہت ہی تھوڑا اثر کیا۔ بخلاف اس کے ہندوستان خود اسلام سے بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ البتہ تمدنی اعتبار سے مسلمانوں کا اثر ہندوؤں پر کافی بڑا ہے۔ شعر و شاعری، موسیقی، رسم و رواج غرض کہ ہر جگہ اسلام پر ہندویت کا اثر نظر آتا ہے

دوسرا اثر مسلمانان ہند پر اہل مغرب کا ہوا۔ اس تصادم سے مسلمانوں میں قومیت کا خیال پیدا ہوا۔ شروع میں تو یہ خیال سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ اسلام کو اس کے چودہ سو برس پہلے کے رنگ میں دوبارہ زندہ کیا جائے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ خیال مسلمانوں نے اہل مغرب سے لیا ہے کیونکہ رسول اللہ نے خود ایک عرب قوم کی تعمیر کی تھی مگر اس عصر جدید میں جو چیز حرکت کا باعث ہوئی۔ وہ یقیناً طوفان مغرب ہے۔ سرسید اور ان کے معاون اس خیال کے بانی مبادی ہیں۔ اور اس تحریک کو عموماً علی گڑھ کی تحریک سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حالی اور اقبال کی شاعری میں اس کی ترجمانی کی گئی اور بحیثیت مجموعی یہ خیال اب تک مسلمانوں پر حاوی ہے۔

قومیت اور وطنیت کا دوسرا مفہوم یعنی یہ کہ اہل مغرب کی اندھی تقلید کی جائے خوشنیتی سے مسلمانان ہند میں تقریباً کوئی جگہ نہ پاسکا۔ چاہے یہ خیال دوسرے ممالک اسلامیہ پر کتنا ہی ملط کیوں نہ ہو گیا ہو اس معاملے میں مسلمانان ہند۔ ہندوؤں سے زیادہ صحیح اصولوں پر قائم ہے۔

تیسرا خیال جو مسلمانان ہند میں پیدا ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات اور روایات پر

قائم رہتے ہوئے ہندوستانی قوم کی تشکیل میں مدد ہوں۔ ماضی کو ہم بھلا نہ دیں۔ لیکن مستقبل کی طرف سو چشم پوشی بھی نہ کی جائے۔

ایک ادارے کی حیثیت سے جامعہ ملیہ اسلامیہ ان خیالات کی حامی ہے جس کی تشکیل میں مولانا محمود الحسن اور حکیم اجل خاں، مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام کا ہاتھ شامل ہے۔ اور جس کی باگ سنا وقت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو زمانے کی صحیح ضروریات کا احساس رکھتے ہوئے مسلمانوں کے بہترین رہبر ہیں۔

عرض وہ اسلام جس کو ہم اپنے مدنی اور تعلیمی نصب العین کا اہم جزو سمجھتے ہیں نتیجہ ہے بہت سے تاریخی اثرات کا۔ گوکہ بنیادی اصول وہی ہیں جو رسول اللہ نے یہ حکم دہی قائم فرمائے تھے۔

ہمارا نصب العین ہو کہ اسلام اور سب سے زیادہ شخصیت کی نشوونما میں مدد پہنچا سکتا ہو اور اس چیز کی اجتماعی شکل یعنی قومیت کے قیام میں بھی ایک مخصوص قوم کو اس کے مخصوص ماحول کے مطابق نشوونما دیتا ہو۔

۲۔ قومیت :- ہم نے اب تک قومیت کا ضمناً ہندو دیت اور اسلام کے سلسلے میں ذکر کیا ہے لیکن اب ہم اس پر ایک مستقل تمدنی تحریک کی حیثیت سے نظر ڈالیں گے اور بتائیں گے کہ ہمارا تعلیمی نصب العین کے تعین کرنے میں اس کا کس قدر گہرا اثر ہے۔ ہندوستان میں قومیت کا تخیل کچھ نیا نہیں ہے۔ عہد قدیم سے ہندوستان کے شعرا فلاسفہ اور شہنشاہ اس کے خواب دیکھتے آئے ہیں۔ جس میں کبیر، نانک اور اکبر اعظم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن جدید زمانے میں جس چیز نے اسے قوت دی وہ مغربی اقوام سے تصادم تھا خاص طور پر انگریزوں سے۔ ہندوستان میں قومیت کے قیام کے لئے ضروری عناصر میں سے بعض موجود تھے اور بعض مفقود۔ ان سے بعض ایسی تحریکیں پیدا ہوئیں جو ہندوستان کی قومیت کے لئے مفید تھیں۔ مگر اس کے ساتھ بعض ایسی بھی وجود میں آئیں جو مضر تھیں

نسل، مذہب، زبان، تاریخ، معاشی اور سیاسی مفاد۔ اور سب سے آخر گرا سب سے اہم تر

بامقصد ہونے کا جذبہ عموماً قومیت کی تعمیر میں اہم عناصر خیال کئے جاتے ہیں۔ مختلف تحریکوں نے مختلف مقاصد پر زور دیا۔ چنانچہ مختلف قسم کی تحریکات پیدا ہوئیں جن کا ہم اجمالاً ذکر کر چکے ہیں۔ وہ تحریکیں یہ ہیں
۱۔ قومیت کی وہ تحریک جو بعض مغربی اقوام کی تقلید میں صرف معاشی اور سیاسی مفاد کو قومیت کی بنیاد قرار دینا چاہتی ہے۔

۲۔ قومیت کی وہ تحریک جو اپنی بنیاد صرف تاریخی ماضی پر رکھنا چاہتی ہے۔

۳۔ قومیت کی وہ تحریک جو مستقبل کے مقاصد کو پورا تو کرنا چاہتی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ گذشتہ تاریخ کی ان روایات کو لے لینا چاہتی ہے جو صحیح قومیت کی تعمیر میں مدد ہوں۔

ان مختلف تحریکوں کے اثر سے مختلف تعلیمی نصب العین اور ہر نصب العین کے تحت میں الگ الگ تعلیمی ادارے قائم کئے گئے۔ انگریزوں کا ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے رواج دینے میں اس سے زیادہ کچھ مقصد نہ تھا۔ کہ وہ اپنی حکومت کے دشمن کے لئے پرزے ہم پہنچائیں۔ لیکن اس انگریزی تعلیم کے ذریعے ہندوستانی نوجوان مغربی علوم و فنون سے واقف ہو گئے اور ان میں مغربی انداز پر ہندوستان میں یک قوم پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ انگریزی نظام تعلیم کے تحریری پہلو کو نظر انداز کر کے صرف تعمیری پہلو پر نظر ڈالی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ وہاں سے ایسے لوگ پیدا ہوتے جو ہندوستان میں مغربی وضع کی قومیت کا قیام چاہتے تھے۔ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم نے سرسید کی کوششوں کے باعث رواج پایا۔ سرسید کے پیش نظر تقریباً ایک صحیح تعلیمی نصب العین تھا جو مذہب اور مغربی علوم کے صحیح امتزاج پر مبنی تھا۔ مگر وہ نہ اور ان کے بعد آنے والے زمانے کی رو کا مقابلہ کر سکے اور مسلمانوں کی تعلیم بھی صرف اس زمانے کے انگریزی نظام تعلیم کی اندھی تقلید ہو کر رہ گئی۔

دوم قومیت کی وہ تحریک جو ماضی پر اپنی بنیادیں رکھنا چاہتی ہے اس نظام تعلیم کا باعث ہوئی جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات کو اور بڑھا دیا۔ حقیقتاً اس تحریک کو ہم ہندوستانی قومیت کی تحریک کہہ نہیں سکتے۔ مگر لفظ قوم کا ہمارے یہاں استعمال بہت مختلف فنیہ ہے اور اب تک یہ لفظ اس معنی کے لئے مخصوص نہیں ہوا ہے جس میں ہندو اور مسلمان ایک متحدہ قومیت کے بغاوت سمجھے جائیں۔

ہندوؤں میں آریہ سماجیوں نے آریہ دھرم کے پرانے نظام تعلیم کو زندہ کیا۔ اور مسلمانوں نے اس نظام تعلیم کا دوبارہ احیا کیا جو ان کے مخصوص تمدن کی پیداوار تھا اور ان کے مخصوص مذہبی ضروریات کے پورا کرتا تھا اس تحریک کو ہم عموماً دیوبندی تحریک سے موسوم کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ متضاد چیزیں تھیں۔ اس سے ہندوستان کی متحدہ قومیت کا خیال پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

پہلے اور دوسرے تعلیمی نصب العین کے جو مضمر نتائج مرتب ہوئے ان سے ایک نئے اور جامع نصب العین کی طرف توجہ دلائی۔ ایک طرف تو مغرب کی اذھی تعلیم کے باعث ہماری نہیں ہندوستان کی بہترین روایات سے بے پروا ہو گئیں۔ دوسری طرف صرف یکطرفہ مذہبی فرقہ دارانہ تعلیم کے باعث متعصب اور کوتاہ نظر، تیسرا تعلیمی نصب العین ان خامیوں کو دور کرنا چاہتا ہے۔ جہاں وہ ایک متحدہ تمدنی نصب العین کا منظر ہے۔ وہاں اس تمدن پر اثر ڈال کر اس کو اور زیادہ موثر بھی بنانا چاہتا ہے۔ اس کے باعث ہندوستان میں مختلف قومی مدارس قائم ہوئے۔ ظاہر ہے ان مدارس میں ہندو اور مسلمانوں کی بہترین روایات کی حفاظت اور تعلیم ہی چلے جائے۔ لیکن اسی طرح کہ وہ ایک متحدہ ہندوستان کی قومیت میں مفید ثابت ہوں مضمر ہوں۔ ہمارا خیال ہے کہ اسلام کی بنیادی روح اور ارکان ہندوستان کی قومیت میں مددیں مضمر نہیں۔ یہ ہندوستان کے قصر قومیت کو اور زیادہ جین اور دل کش بنانے کا باعث ہوں گے۔ خدا کے واحد کا تخیل، جمہوریت اور عالم گیر برادری کا خیال۔ صاف اور سادہ اخلاقی تعلیمات تو ہم پرستی کی مخالفت اور حقیقت پسندی کا ذوق، نظام اجتماعی وغیرہ۔ اسلام تعلیم کے وہ بے بہا۔ جواہر ہیں جو ہندوستانی قومیت کی تعمیر میں بہترین عناصر ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ہندوؤں کی فلسفیانہ نظران کے غور و فکر کی گہرائی، ان کی ریاضی، ان کا جمالی احساس۔ جس کا افکار ہندوستان کے فنون لطیفہ میں ہوتا ہے۔ ہمارے لئے بیش بہا اجزا ہیں جن کے بغیر ہمارا آئندہ قومی تمدن محض ایک بے جان چیز ہو گا۔

ایسے قومی مدارس میں ہندو اور مسلمانوں کو اس طرح تعلیم ہونی چاہئے کہ وہ ایک دوسرے کے

اچھے پہلوؤں سے واقف ہو سکیں۔ قومی تعلیم کے خیال کے ساتھ مشترک زبان کا خیال پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ اور وہ مشترک زبان صرف وہی ہو سکتی ہے جو کسی قوم کے تمام ارکان کی بہیں قوم کا اہم اکثریت کی زبان ضرور ہو۔ ہر قوم اپنے عمیق ترین جذبات اور احساسات کا اظہار صرف اپنی مادری زبان میں کر سکتی ہے۔ جس طرح جسم بغیر روح کے زندہ نہیں رہ سکتا اسی طرح کسی قوم کی ذہنی زندگی اس کی اپنی زبان کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ ہر قوم اپنا تصور کائنات صرف اپنی زبان میں بدرجہ اتم ظاہر کر سکتی ہے۔ زبان کے متعلق میکاکی نقطہ نظر غلط ہے۔ زبان ایک نامی چیز ہے جہاں وہ ذہنی زندگی کے اظہار کا ذریعہ ہوتی ہے۔ وہاں وہ خود ذہنی زندگی کی پیداوار بھی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں قومیت کے خیال کے ساتھ قومی زبان کا خیال بھی پیدا ہوا، اور قومی تعلیم صرف قومی زبان یعنی ہندوستانی ہی کے ذریعے ممکن ہو سکتی ہے۔ دوسرا اہم مسئلہ اس کے ساتھ لازمی ابتدائی جبر یہ تعلیم کا پیدا ہونا ہے۔ قومیت کا صحیح ارتقا ممکن نہیں ہے جب تک کہ کسی قوم کے تمام ارکان بغیر تہذیب کے اپنی نشوونما کے موقع نہ پائیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بغیر فن و ادب و علم ابتدائی تعلیم کے نہیں ہو سکتا جو پورے تعلیمی فصر کی بنیاد ہے اور قوم کی تعمیر میں غالباً سب سے اہم ضرورت۔

ہم جب اس قدر متحدہ قومیت پر زور دے رہے ہیں تو اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ کچھ کمیوں سے تعلیم ایک نہ کردی جائے تاکہ یہ تفریق ہی مٹ جائے۔ لیکن ہمارا مقصد مختلف اقوام کے مخصوص خصوصیات کو فنا کرنا نہیں ہے بلکہ ان کے بنیادی امتیازات کو باقی رکھنا ہے۔ لیکن اس طرح کہ وہ متحدہ عمارت کے کٹو باعث خوش نہائی ہوں۔ ہندو قوم۔ زیادہ تر فلسفہ اور عقلیات سحر دل چسپی رکھتی ہے بخلاف اس کے مسلمان ایمان و ایمان سے شخصیت کے یہ دونوں اہم پہلو ہیں۔ اور دونوں اقوام نے اپنے مخصوص رنگ میں اس کا اظہار کیا ہے۔ ان کا تلف کرنا گویا کہ انسانیت کی ایک اہم قوت کو نشوونما سے روکنا ہے۔ ہم شین کی طرح ایک ہی قسم کی ٹیٹیں بنانا نہیں چاہتے بلکہ شخصیتیں پیدا کرنا چاہتے ہیں جو نامی اور زندہ ہوں۔ خدا اپنی خدائی کا مظاہرہ یکسانیت سے زیادہ تنوع میں کرنا چاہتا ہے۔ امد کے باغ میں بہت سے رنگ و رنگ کے پھول اور پھولوں کی ضرورت ہے۔ تاکہ اس کی خوش نہائی اور حسن و بآلاہو۔ ہندو اور مسلمان باوجود اپنی اختلافات کے ایک اور اعلیٰ مرکز پر متحد ہو سکتے ہیں یعنی یہ کہ دونوں میں ایک۔ مافوق الطبیعی جذبہ پایا جاتا ہے

جو ایک مذہبی نیکل اختیار کر لیتا ہے گو کہ ایک تشفی قلب ایمان کے ذریعے چاہتا ہو۔ اور دوسرا فلسفیانہ فکر کے ذریعے سے۔

مختصر یہ کہ ہندوستان کی قومیت کے تخیل اور اس کے تحت میں اس کا قومی تعلیم کا نصب العین مندرجہ ذیل عناصر پر استوار ہونا چاہئے۔

۱۔ اس تصور پر جو کائنات میں ایک مقصد اور وحدت دیکھتا ہو جس کو ہم مذہبی اور مافوق الطبیعی جذبے سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲۔ ہندوستانی تمدن کی بنیادوں پر۔

۳۔ قومیت کے تخیل پر جو ہندویت اور اسلام کو یک جا کر سکے اور اس طرح ہندوستان میں ایک قوم پیدا کر سکے۔

ان بنیادی اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے ہم دنیا کے دوسرے تمام تمدنوں کے مفید اثرات ان کے علوم و فنون۔ ان کی صنعت و حرفت وغیرہ لینے کے لئے آمادہ ہیں۔ لیکن اس طرح کہ ہم ان کو اپنائیں جو ہماری تہذیب میں جذب ہو سکیں اور جو ہمارے ارتقا میں مدد ہوں۔ اہل مغرب کے علوم و فنون، ان کی صنعتی و حرفتی ترقی عہد جدید میں مسلم ہے اور ہم اپنی قومیت کی تعمیر میں ان سے بہت کچھ مدد لینا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر سائنس اور صنعت میں ہمیں ان سے بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔ اور ہمارا انتظام تعلیم بغیر ان چیزوں کے بالکل نامکمل رہے گا۔ اور ہمیں کبھی اس قابل نہیں بناسکے گا کہ ہم دنیا کی تک و دو میں اپنا وجود قائم رکھ سکیں جو ہمارے عصر ہمارے تعلیمی نصب العین کے تعین کرنے میں انسانیت کا ہے۔ یہ انسانیت کا

تخیل بھی مختلف قسم کا ہو سکتا ہے ایک تو ایسا کہ جو صرف معاشی مفاد پر مد نظر ہو۔ مثلاً موجودہ زمانے کی اجتماعیت کی تحریک ایک خالص مادی تحریک ہے۔ کارل مارکس مادہ کی مادی تاویل کرتا ہے اس کے نزدیک تمام تمدن صرف انسان کے معاشی جدوجہد کی پیداوار ہے۔ مذاہب کے قیام میں وہ سرباز رہی کا ہاتھ دیکھتا ہو حقیقتاً اس کا نظریہ انسانی نفس کے دوسرے عناصر کی حقیقت نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے جس طرح معاشی جذبہ انسان میں بالذات اپنی جگہ رکھتا ہے اسی طرح جمالی اور مذہبی جذبہ بھی۔ انسانیت کا یہ

تخیل جو گزشتہ تمام تمدن کو برباد کر کے انسان کو صرف پریٹ کا بندہ کر دے ہماری قوم کی بنیادی خصوصیت کے خلاف ہے۔ جس میں اسلام اور ہندویت مشترک ہے۔ لیکن اس کے معنی نہیں ہیں کہ ہم عوام کی اس تباہ حالی اور بربادی کو نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں۔ جو سرمایہ داری کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔ اور اس فلاکت کے دور کرنے کے لئے اگر ضرورت ہو تو ہم اجتماعیت کا تمام نظام معاشی قبول کر لینے کے لئے اور اپنے نظام تعلیم میں زراعت اور صنعت و حرفت کو بہت اہمیت دینے کے لئے آمادہ ہیں لیکن تمدن کا وہ نصب العین جو مکمل طور پر مادیت پر مبنی ہو۔ ہمارے تعلیمی نصب العین کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ دوسرا انسانیت کا نصب العین بھی جو صرف اسلامیات پر مبنی ہو۔ اور مذہبیت واسطہ نہ رکھتا ہو۔ ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ہم فطرۃً مجبور ہیں کہ ایک ہستی پر ایمان رکھیں جو ہماری دعاؤں کو سننے والی ہو جس کا باطنی اعتقاد مصیبت کی گھڑیوں میں ہیں سہارا اور امید ہے۔ ہمارا اپنی قوم کے اس بنیادی خصوصیت کو جسے ہم نہایت عزیز رکھتے ہیں اور جس پر ہمارے تمام تمدن کا قہر استادہ ہو ترک کرنا نہیں چاہتے۔ ورنہ ہم بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح بے راہ و منزل ہو جائیں گے۔ اور اپنی زندگی کی اس باطنی قوت کو کھو بیٹھیں گے جو قوموں کی زندگی کا باعث ہوتی ہے۔

اب صرف یہی باقی رہ جاتا ہے کہ ہم ایک ایسی انسانیت کے قائل ہوں جو عالم گیر برادری اور ایک واحد ہستی کے تصور پر قائم ہو۔ اسلام کا ہمیشہ سے بنیادی خیال رہا ہے اور ہندویت کا ارتقا بھی اسے اسی طرف سے جا رہا ہے۔

ہم نے اس وقت تک ہندوستان کے نصب العین کا تعین کرنے میں صرف ہندویت اور اسلام کا ذکر کیا ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم دوسرے فرقوں مثلاً سکھ، پارسی، یہودی، عیسائی، بدھ وغیرہ کے بہترین اثرات قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہم ان کا اسی طرح حق وجود تسلیم کرتے ہیں۔ اور ہمارا یقین ہے کہ وہ بھی ہندوستان کی قومیت کی تشکیل میں مدد ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور ہمارے ہندوستانی قومی تمدن کی تمام بنیادوں پر ہم سے آکر مل سکتے ہیں۔

غرض ہمارے تمدن کی تاریخی روشنی میں ہمارا تمدنی نصب العین اور اس کے تحت میں

ہمارا تعلیمی نصب العین یہ قرار پایا کہ ہم اپنے نوجوان نسلوں کی جسمانی اور نفسی تربیت جس میں معاشی، سیاسی، اجتماعی، جمالی، اخلاقی، مذہبی قوی شامل ہیں۔ ان کے تمدن کی بہترین روایات پر اس طرح کریں کہ وہ ایک تمدن قومیت کے قیام کا باعث ہو وہ قومیت جو انسانیت کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہو سکے۔

انسانیت مقصود بالذات نہیں ہے۔ وہ بھی ایک عالم ہے بہت سے عالموں میں سے جن کا تصور انسانی عقل کے خلاف نہیں ہے لیکن جن کا احصا اور ادراک انسانی عقل و فکر سے باہر ہے چونکہ عقل اپنی قوتوں میں محدود ہے۔ اس کی رسائی حقیقت کی تلاش میں صرف ایک خاص ذیہ تک ہو سکتی ہے۔ اس کے بلنفس بحیثیت مجموعی جس میں شعوری اور غیر شعوری عناصر دونوں شامل ہیں حقیقت کا بہت حد تک ادراک کرنا ہے کلیتاً تو حقیقت کا ادراک اسی وقت ہو گا جب انسان انسان نہ ہے بلکہ خدا ہو جائے۔

جس طرح تمدن منظر ہے انسانی نفس کا۔ اس طرح تمام کائنات منظر ہے ایک نفس واحد کی جو اپنے اظہار کے لئے مختلف جلوے اور مختلف رنگ و بو ڈھونڈتا ہے۔

دہر فرز جلوہ بختائی معشوق نہیں

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود میں۔ (غالب)

یہ سن کی خود بینی نے اسلوب ہر وقت، ہر زمانے اور ہر عصر میں جاری ہے۔ اسی تخلیقی فعل میں مدد پہنچانے کا نام تعلیم ہے۔ اور یہ فعل جس خاص اسلوب اور رنگ سے کسی زمانے اور کسی قوم میں ظاہر ہوتا ہے اس کو سمجھنے کا نام اس زمانے کے تمدنی اور تعلیمی نصب العین کو سمجھنا ہے۔

کس قدر عظیم انسان اور روح پرور ہے یہ خیال کہ ہم کائنات کی ایک کڑی ہونے کے باعث تمام ابدی سلسلے پر اثر ڈال سکتے ہیں۔ آرزوؤں کی اس بلندی کے ساتھ ہم اپنے ماحول کو دیکھتے ہیں تو دل بیٹھا جاتا ہے۔ ہر طرف نفاق کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ نہ صرف ہندو اور مسلمان بلکہ ایک ایک فرقہ اور ایک ایک جماعت میں جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ ہر شخص اور ہر جماعت اپنی بقا اور برتری کی

کوشش میں ہے اور دوسرے کو نیست و نابود کر دینا چاہتی ہے ان واقعات کو ان مایوسانہ نظروں سے دیکھنا۔ حقیقتاً ہمتوں کی پستی ہے۔ یہ زندگی کی قوتیں ہیں جو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں بعض تحریکیں ختم ہو جانے سے پہلے اب گویا سانس توڑ رہی ہیں بعض نئی قوتیں پیدا ہو رہی ہیں جو اپنا حق وجود ثابت کرنا چاہتی ہیں۔ اکثر جگہ ان میں سخت جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ اور اکثر جگہ ایک امتزاج پیدا ہو رہا ہے۔ ہندوستان اس لحاظ سے کہ فطرت یہاں تمام دنیا کی نسلی، مذہبی اور مقامی اختلافات کا ایک امتزاج چاہتی ہے سب سے زیادہ کشمکش کا آماجگاہ ہے۔ یہاں نہ صرف ہندو اور مسلمان آباد ہیں بلکہ دنیا کے ہر مذہب کے پیرو۔ یہاں نہ صرف آریہ اور سامی نسل کے لوگ بستے ہیں بلکہ تقریباً تمام دنیا کی نسلوں کے۔ انسانیت کے ہم آہنگ امتزاج سے فطرت ایک نئی انسانیت پیدا کرنا چاہتی ہے۔ جو دنیا کے لئے ایک نمونہ ہو۔

اس عظیم انسان شن پورا کرنے کے لئے ہم بھیجے گئے ہیں۔ خدا ہم ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو اس وقت سب سے زیادہ مظلوم اور بے بس ہیں اپنا کام کرنا چاہتا ہے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ثابت کریں کہ ہم کس حد تک اس عظیم انسان امانت کا بار اٹھانے کے قابل ہیں۔

اب رہی یہ کشمکش، یہ جدوجہد، یہ اختلافات، یہ موت کی نہیں زندگی کی دلیل ہیں

اس کشمکش پریم سے زندہ ہیں اقوام۔

آزادی

آزادی کا مفہوم | آزاد ہونا معنی پابند نہ ہونا، مجبور نہ ہونا، محکوم نہ ہونا بلکہ محنت و حاکم اور مت اور ہونا۔ یہ صفیں اپنی انتہائی تکمیل کے ساتھ اپنی مطلق اور غیر اضافی شکل میں تو صرف اُن ذات بے ہمتا اور لامتناہی میں جمع ہو سکتی ہیں جسے مذہبی عقیدے والے حنا کہتے ہیں لیکن جب مجبور اور محدود افراد و نوع انسان کے ساتھ آزادی کی صفت کو منسوب کیا جاتا ہے تو اس وقت آزادی کا جو مفہوم ہمارے پیش نظر ہوتا ہے اس میں کم و بیش پابندی کا پایا جانا ناگزیر ہے، ہر چند یہ ممکن ہے کہ مثالی حالات میں ان پابندیوں کا احساس معدوم ہو جائے۔

تصوّف اور مذہب کی اصطلاح میں آزادی کی انتہائی معراج یہ سمجھی جاتی ہے کہ جزا کُل میں مل جائے مخلوق خالق کی مرضی اور مشیت کو اپنی خواہش اور مستی کے عین مطابق بننے لگے۔ جب تسلیم و رضا کے اس مرتبہ پر کوئی شخص پہنچ جاتا ہے کہ مذہب کی کوئی پابندی اُس کے لئے خارجی پابندی باقی نہیں رہتی بلکہ اُس کی طبیعت اپنے اندرونی میلان سے وہی کام کرنے لگتی ہے جو اُس کے خدا اور رسول کا فرمان ہے یا جب ہم کی قیود اور اُلو و گلوں سے بے نیاز ہو کر آدمی روح کائنات سے ہم کلام بلکہ اُس میں جذب ہو جاتا ہے تو ایسی حالت کو مذہب اور تصوّف کی اصطلاح میں آزادی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

ایسی طرح اخلاقیات میں جب ایک شخص اُن پابندیوں کو جو عقل و ضمیر، نفسِ لوامہ یا اجتماعی نفس اُس پر عائد کرتے ہیں پابندی سمجھتا ترک کر دیتا ہے اور بے عقلی، جہالت اور نفسِ آمارہ کی کسر شری پر اُس قدر قابو حاصل کر لیتا ہے کہ اُس کے اندر ادنیٰ خواہشات اور اعلیٰ خواہشات کی ہر قسم کی کشمکش ختم ہو جاتی ہے اور صراطِ مستقیم پر چلنا اُس کے لئے دشوار نہیں رہتا تو ایسی حالت کو اخلاقی آزادی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

سیاسیات میں بھی آزادی کا نصب العین اسی نوعیت کا متعین کیا جاسکتا ہے جب افراد اور حکومت کے باہمی تعلقات ایسے ہو جائیں کہ جماعت کا سرسود یہ سمجھنے لگے کہ حکومت جو کچھ کر رہی ہے وہ بالکل درہی ہے جو وہ خود کرتا تو ایسی حکومت کو کسٹل آزاد حکومت سمجھنا چاہئے۔ ایسی حالت میں حکومت کے احکام خارجی نہیں رہتے۔ اُس کی اطاعت مجبوری کی اطاعت نہیں بنتی سزا کے ڈر سے لوگ قوانین کی پابندی نہیں کرتے بلکہ خود اپنے اوپر اپنی ذات کی حکومت ہو جاتی ہے۔ قوانین اصول زندگی کا مرتبہ چل کر لیتے ہیں جس پر عمل کر کے خوشی اور طہینان قلب حاصل ہوتا ہے۔ راجہ سورجیہ ہو جاتا ہے۔ جس وقت یہ بات پیدا ہو جاتی ہے تب ہی قوائے جسمانی اور روانی کو تربیت دینے اور مکمل کرنے کا لوگوں کو حوصلہ اور موقع ہوتا ہے علم ادب اور فنون ترقی کرتے ہیں۔ تہذیب و تمدن چھوٹے پھلتے ہیں۔ مادی۔ اخلاقی اور روحانی ترقیاں ہوتی ہیں۔ ہم آہنگی اور مسرت سے فضا میں معمور ہو جاتی ہیں۔

آزادی کے اس مفہوم کے متعلق یہ خیال کرنا کہ انسانی ذہن نے ایسے اپنی تاریخ کے ابتدائی عہد ہی میں سمجھ لیا ہوگا صحیح نہیں ہے۔ دنیا کے مفکروں اور مصطلحوں نے نسل بعد نسل بتدریج اس تحسین کو ترقی دی ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اسی طرح اس سطح نظر کے چل کر نے کی کوششیں بھی ناکام اور کامیاب ہو کر رفتہ رفتہ زیادہ صحیح، بہتر، مضبوط اور مؤثر ہوتی جا رہی ہیں۔ آزادی کی جنگ کا محاذ مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں بدلتا رہا ہے کبھی آزادی کا ایک رخ لوگوں کی صحاح کے سامنے نمایاں رہا ہے کبھی دوسرا۔ لیکن آزادی کی روح ایک عرصہ سے کام کر رہی ہے۔ اور اس کا حلقہ اثر روز بروز وسیع ہو رہا ہے۔

آزادی کی شکلیں | روسو نے اپنی معرکہ الاراء کتاب ”عہدہ مساوات“ کی ابتدا اس جملہ سے کی تھی کہ ”انسان آزاد پیدا ہوا لیکن وہ ہر جگہ پابند بن جاتا ہے“ تاریخ کے مطالعہ کے دوسرے اس بیان کی تائید نہیں ہوتی بلکہ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس کے اس مشہور جملے کی تصحیح یوں کریں کہ انسان غلام پیدا ہوا لیکن وہ آہستہ آہستہ آزاد ہوتا جا رہا ہے۔ انسان نے آزادی کی منزل مقصود کو

جن جن مدحوں سے رفتہ رفتہ تسخیر کرنے کی کوشش کی ہے ان میں سے زیادہ اہم کو اختصار کے تحت ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

مدنی آزادی | تاریخی اعتبار سے آزادی کے لئے جو انتہائی کوشش کی گئی وہ یہ تھی کہ مطلق العنان فرماں رواؤں کی دراز دستوں سے افراد کو محفوظ کیا جائے۔ اور یہی طرح کہ رعایا کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ ان پر حکومت قانون اور دستور کے مطابق کی جائے۔ اس کا منشا یہ تھا کہ بادشاہ کے اختیارات محدود ہو جائیں اور ہر شخص کو یہ بات ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جائے کہ اس کی پابندی کی حد کس قدر ہے۔ منطقی حیثیت سے بھی یہی ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ جب ایک شخص کو کسی دوسرے شخص کے خلاف کوئی قانونی حق حاصل نہیں ہوتا تو وہ بالکل اس کی مرضی اور طبیعت کے تلوں کا پابند ہوتا ہے اور غلاموں کی طرح اس کے اشاروں پر چلنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ اس لئے ہمہ گیر آزادی کی اولین شرط ہمہ گیر پابندی ہے۔ اگر اس قسم کی پابندی نہ ہو تو کچھ لوگ آزاد ہیں گے جو باقیں گے کر سکیں گے اور کچھ پابند ہوں گے اور دہی کر سکیں گے جو کئی آزاد لوگ انھیں اجازت دیں گے۔ مگر جب قوانین مقرر ہو جائیں گے اور حکمران بھی اس کے ہی طرح پابند ہو جائیں گے جیسے حکومت تو من مانی حکومت باقی نہ رہے گی۔ قوانین سے اس میں شک نہیں کہ ایک فرد کی آزادی محدود ہو جاتی ہے، اور وہ دوسروں کے ساتھ جس قسم کا چاہے اپنی مرضی کے مطابق بناو نہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اسے فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ دوسرے بھی اس کے خلاف اپنے غیر محدود اختیارات استعمال کرنے سے معذور ہو جاتے ہیں۔ جس طرح ایک فرد کو قانون پابند کرنا ہے اسی طرح اس جماعت کے جملہ افراد کو جس میں حاکم و محکوم، اونی و اعلیٰ، امیر و غریب، گھوڑے اور کالے مسلمان اور کافر سبھی شامل ہیں۔ بلا تفریق سادی انداز سے پابند کرنا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو من مانی احکامات اور زور آور زبردستی سے لوگوں کو نجات مل جاتی ہے۔ معاشری زندگی میں آزادی کی بھی ایک صورت قابل عمل ثابت ہوئی ہے۔

انگریزی پارلیمنٹ نے سترھویں صدی میں آزادی کی جنگ اسی مورچے پر شروع کی تھی۔
بچی شن آف رائٹ اور ہے میں کارپس اکیٹ اسی مدنی آزادی کے حصول کے ذرائع تھے قانون کی

عدالتی قانون کی نگاہ میں مساوات، غیر جانب دار عدالتیں، یہ مطالبے تھے جو اس وقت پیش کئے گئے تھے۔ حکومت اپنی مرضی کے مطابق لوگوں کو جب چاہے گرفتار اور قید نہیں کر سکتی، یسزا دے سکتی ہے نہ ان کے مال و جائداد پر قبضہ کر سکتی ہے۔ اس قسم کے تمام کام قانون کے مطابق ہونے چاہئیں۔ عدالت کو حکومت کے اثر سے آزاد ہونا چاہئے۔ صفائی کی ہر شخص کو سہولت ملنی چاہئے۔ عدالت تک ہر شخص کی رسائی آسان ہونی چاہئے۔ مقدمے کی پیردی اس قدر گراں نہ ہونی چاہئے کہ نادار لوگ عدالت کے منافع سے محروم رہیں، پڑھے لکھے باعزت اور ذی مرتبہ لوگوں کو جاہلوں اور کم حیثیت لوگوں کے مقابلے میں اپنی علیت، وقار، مذہبی یا نسلی تفوق سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے کا موقع نہ دینا چاہئے۔ یہ مدنی آزادی ہے۔

مالی آزادی | اس سے قریبی طور پر وابستہ مالی آزادی کا مسئلہ ہے جس کو آسانی سے اس لئے سمجھ سکتے ہیں کہ اس سے لوگوں کے روزمرہ کے کاروبار پر براہ راست اثر پڑتا ہے جب حکومت من مانے طریقوں سے محاسل عاید کرتی ہے اور اس کے اختیار پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی تو لوگ عاجز ہو کر انقلاب کے خواہشمند ہو جاتے ہیں۔ انگلستان میں اسٹوارٹ بادشاہوں نے امریکہ میں جارج سوم نے اور فرانس میں لوئی شانزدہم نے اپنے محاسل کے خراب انتظام سے لوگوں میں بغض اور بے اطمینانی کی کیفیت پیدا کر دی۔ رعایا کا مطالبہ یہ تھا کہ حکومت کو اس وقت تک محاسل عائد کرنے کا حق نہیں ہے جب تک وہ نمایندگی کے حق کو تسلیم نہ کر لے جیسی ان لوگوں کے نمایندوں سے جن پر محاسل عائد کئے جا رہے ہیں اس بارے میں استصواب نہ کر لے اور ان کے اعتراضات کا تشفی بخش جواب نہ دے لے۔ یہ مالی آزادی ہے۔

خاتی آزادی | یہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ آزادی کا امکان اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب آدمیوں کے سبائے اصول و قوانین کی حکومت ہوتی ہے۔ اور ان کی اطاعت، جماعت کے تمام افراد پر لازمی ہوتی ہے۔ لیکن اس سے مسئلے کا پورا حل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ قوانین موجود ہوں اور حکمران ان قوانین کی خلاف ورزی بھی نہ کرتے ہوں لیکن پھر بھی (ا) قوانین بنانے والے یا تو ایک مطلق النفاذ

بادشاہ اور اُس کے تنخواہ دار شیرہوں یا اُمراء اور حکام کی ایک مختصر جماعت اس کام کو انجام دیتی ہو (۲) قوانین بذاتِ خود انصاف اور مساوات پر مبنی نہ ہوں بلکہ اُن سے آبادی کے کچھ حصے یا اکثر حصے یا قوانین بنانے والوں کو چھوڑ کر باقی اور تمام لوگوں کی حق تلفی ہوتی ہو اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک طرف تو قوانین بنانے والی مناسب ترین جماعت کا تعین کر دیا جائے اور دوسری طرف اس امر کی صراحت کر دی جائے کہ کن کن صورتوں میں محض قانون کو حکم بنانے کی آزادی کے حصول کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا بلکہ ایسے موقعوں پر خراب اور ظلم پرور قوانین کی ترمیم کا مطالبہ نہایت ضروری ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ کا اول الذکر حصہ سیاسی آزادی سے متعلق ہے جس پر آگے چل کر بحث کی جائے گی۔ فی الحال اس سلسلہ کے دوسرے حصے سے جسے ”ذاتی آزادی“ کے نام سے موسوم کرنا مناسب ہے بحث کی جاتی ہے۔

اس ذیل میں بُنیادی حیثیت خیال کی آزادی کو محصل ہے یعنی اپنے ذہن میں ایک رائے قائم کرنے کے لئے ہر شخص آزاد ہے اور اپنی اس ذہنی رائے کی وجہ سے وہ کسی سزا کا مستحق قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس حق سے انکار انتہائی ظلم ہے، کیونکہ خیال کا قلعہ تو کم از کم ایسا ہونا چاہئے جو غیبیاری کی دستبرد سے قطعاً محفوظ ہو۔ لیکن خیال چونکہ معاشرتی روابط کا نتیجہ ہوتا ہے اس لئے اس کی آزادی اس وقت تک بے کار ہے جب تک مبادلہ خیال کی آزادی بھی نصیب نہ ہو۔ اس لئے تقریرِ تحریر، طباعت اور مباحثے کی آزادی بھی ضروری ہے۔ مگر یہاں سلسلہ نازک اور پیچیدہ ہو جاتا ہے کیونکہ ایک ایسا نقطہ انصال بھی ہوتا ہے جہاں قول و فعل کا فرق اس قدر دھندلا ہو جاتا ہے کہ آزاد تقریر اور لوگوں کو برائی اور بغاوت پر ابھارنا مترادف مفہوم کے حامل ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر اس کے مقابلے میں آزادی کھڑی ہوتی ہے اور انتخاب نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔ مذہبی آزادی کے مسئلے میں بھی بعض اوقات اس قسم کی دشواریوں کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً بعض مذاہب میں آدمِ خدی، انسانی قربانی اور جادو گر نیوں کا جلا ڈالنا جائز ہے لیکن کوئی جدید حکومت ان رجولوں کی کبھی بھی روادار نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان میں تعددِ ادیان کو برطانوی قانون جائز قرار دیتا ہے لیکن

اگر ہندو اور مسلمان انگلستان میں ایک سے زائد شادی کرنا چاہیں تو شاید نہیں کر سکیں۔
 جب صورت حال یہ ہے تو پھر مذہبی آزادی کا کیا مفہوم ہے؟ اس کے مفہوم پر خارجی
 اور باطنی دو حیثیتوں سے بحث کی جاسکتی ہے۔ خارجی حیثیت سے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مذہبی
 خیالات اور ان کے اظہار میں ہر شخص کو آزادی حاصل ہو۔ مزید برآں ہر شخص کو اس بات کی بھی آزادی
 ہو کہ جس شکل میں چاہے عبادت کرے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس کے ایسا کرنے سے دوسرے
 کو نقصان نہ پہنچے اور امن عامہ میں خلل واقع نہ ہو۔ اس شرط میں یہ بات بھی فغنی ہے کہ مذہبی
 خیالات کے اظہار میں متانت، اعتدال اور ضبط سے کام لیا جائے تاکہ دوسروں کے احساسات
 کی توہین نہ ہو۔ اس کے علاوہ مذہبی آزادی اس وقت تک ناقص سمجھی جائے گی جب تک کہ کسی شخص کو
 بھی مذہب کی وجہ سے عہدوں یا تعلیمی منافع سے محروم رکھا جائے گا۔ کھل آزادی کے معنی یہاں بھی
 مکمل مساوات کے ہیں۔ باطنی طور پر مذہبی آزادی سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص کو دوسرے شخص کو تبلیغ
 کے ذریعے سے اپنا ہم مذہب بنانے کا حق حاصل ہے۔ لیکن شرط پھر وہی ہے کہ ایسا کرنے سے
 دوسروں کے مادی حقوق پامال نہ ہوں۔ اور امن عامہ میں خلل واقع نہ ہو۔

معاشری آزادی | زندگی کے روحانی رُخ کے بعد اب ہم اس کے علمی رُخ کی طرف متوجہ
 ہوتے ہیں۔ یہاں آزادی کو ان رکاوٹوں سے جنگ کرنی پڑتی ہے جو سوسائٹی کے درجہ بہ درجہ
 طبقوں میں تقسیم ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ ایک طبقہ کو دوسرے پر فضیلت ہوتی ہے اور یہ
 امتیازات مستقل ہو کر ترکہ اور وراثت کے ذریعہ سے منتقل ہونے لگتے ہیں۔ اوپر کے طبقہ والے
 نیچے طبقہ والوں کو ذلیل سمجھتے ہیں اور ان سے معاشری تعلقات رکھنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔
 ہندوستان میں خصوصیت کے ساتھ طبعتوں کی اس تفریق نے ذات پات کی شکل میں ایسی انتہائی
 صورت اختیار کی ہے کہ نیچی ذات کے لوگوں کا سایہ بھی جس جگہ پڑ جاتا ہے وہ ناپاک سمجھی جاتی ہے
 نیچی ذات والوں کو اجازت نہیں ہے کہ وہ اونچی ذات والوں کے مندروں میں عبادت کر سکیں۔
 ان کے کنوئیں سے پانی بھر سکیں یا ان کے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر سکھوں میں تسلیم پا سکیں۔

انہی ذات کے ساتھ کھانے پینے میں شرکت اور شادی بیاہ کے امکانات تو قطعی طور پر بعید از قیاس ہیں۔ انھیں صرف ذلیل ترین پیشوں کے اختیار کرنے کی اجازت ہے اور ترقی کے تمام امکانات اُن کے لئے اور اُن کی آئندہ نسلوں کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے مفقود ہیں۔ یہ تفریق یہاں کے مذہب، رواج اور قانون کے نزدیک بھی جائز ہے۔ یورپ میں بھی اس شدید شکل میں تو نہیں لیکن کم و بیش اسی قسم کے امتیازات مختلف زمانوں میں پائے گئے ہیں جن کے خلاف جدوجہد کر کے انھیں توڑنے کی وقتاً فوقتاً کوششیں کی گئی ہیں۔ مثلاً بعض عہدے ہوتے تھے جو صرف مردوثی اُمراء اور لاٹ پادریوں کے لئے وقف ہوتے تھے یا بعض پیشے تھے جن کا اجارہ بعض مخصوص جماعتوں کو چل تھا۔ یا تعلیم کی سہولتیں تھیں جن سے غیر دلت ملالوگ فطری اہلیت کے باوجود فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔

معاشری آزادی کا مطالبہ یہ ہے کہ ان بندشوں کو توڑ کر مساوات قائم کی جائے اور ہر شخص کو ترقی کے لئے مساوی مواقع فراہم کئے جائیں۔ لیکن اس سلسلے میں بعض ناؤک دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر ایک طرت افرادیت کی ترقی کے لئے جماعت بندی کو توڑنا ضروری ہے تو دوسری طرت فرقہ بندی اور جماعت سازی مثلاً ٹریڈ یونین وغیرہ کی مشترکہ کوشش سے افراد کے حقوق کی اس طرح نگہداشت ہوتی ہے اور بعض ایسے دوسرے معاشری منافع پیدا ہوتے ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس قدر بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ معاشری آزادی کا ان حالات میں یہ مقصد ہونا چاہئے کہ ایسی جماعتوں کی رکینیت میں وراثت کے اصول کو جاری نہ ہونے دیا جائے۔ نیز ان جماعتوں میں دخل ہونے کے واسطے مصنوعی پابندیاں حال نہ کی جائیں یعنی ایسی کوئی دشواری پیدا نہ کی جائے جس کا منشا یہ ہو کہ برادری میں نئی بھرتی کا سلسلہ مسدود ہو جائے اور جماعت بندی سے جرفائدے حال ہوتے ہیں اُن پر صرف ایک محدود حصہ آبادی کا اجارہ رہے۔

ابھی میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ جنسی قیود بھی فرقہ بندی کی قیود سے بہت مشابہ ہیں۔ ایسی شک نہیں کہ بعض پیشے ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے عورتیں طبعاً موزوں نہیں ہوتیں۔ ایسی صورتوں میں

اہلیت کے جو امتحانات ہیں اُن کے فیصلوں کو کافی سمجھنا چاہئے اور عورتوں کو محض عورت ہونے کی وجہ سے آزاد مقلبے میں شرکت سے محروم رکھنا مناسب نہیں ہے۔

معاشی آزادی | معاشرتی آزادی ہی کی ایک شاخ معاشی آزادی بھی ہے۔ لیکن اس کے مسائل

اِس قدر پیچیدہ ہیں اور افراد اور جماعت کے حقوق و فرائض یہاں باہم اِس درجہ دست و گریباں نظر آتے ہیں کہ ایک قطعی رائے کا اظہار بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ معاہدے کی آزادی، اپنے تمام افعال کے لئے افراد کا ذاتی طور پر ذمہ دار ہونا، تجارتی انجینس بنانے کی آزادی، آزاد تجارت۔ اُن کے حامیوں اور مخالفوں میں سا لہا سال سے مستقل کشمکش کا سلسلہ جاری ہے۔ اِس لگھی کو سلجھانے کے لئے بھی مساوات کے گر کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ ایسی تمام جماعتی پابندیاں جو مساوی سطح پر لانے کے بعد آزادی کے فوائد حاصل کرنے کے امکانات پیدا کرتی ہیں، افراد کی اُن تمام غیر محدود آزادیوں سے بہتر میں جن کی وجہ سے غیر مساوی اور ناموافق حالات میں وہ اپنے دلچسپی سے اپنی ذات کو نقصان پہنچاتے ہیں یا اپنے ذاتی اور عارضی فائدے کی خاطر کل جماعت اور خود اپنے مستقل فائدوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ مثلاً آزاد معاہدہ جب ایک برے سرمایہ دار اور نادار مزدور یا کسان کے درمیان ہوتا ہے تو ایسے معاہدے کو آزاد کے نام سے موسوم کرنا اور اُس کے لئے مزدور کو ذاتی طور پر ذمہ دار متعارف دینا ستم ظریفی ہے۔ بڑا سرمایہ دار انتظار کر سکتا ہے اور مزدور کی خدمات مستثنیٰ ہوتا ہے لیکن مزدور کی نگاہ کے سامنے اپنی معصوم اولاد کے فائدہ چہرے ہوتے ہیں اور جن شرائط پر بھی ممکن ہو وہ فوراً کام کر کے اجرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایسا معاہدہ آزاد معاہدہ نہیں کہلایا جاسکتا۔ اِسی طرح اصول انجمن سازی کی اِس وجہ سے مخالفت کرنا کہ اِس سے افراد کی آزادی ختم ہو جاتی ہے، غلطی ہے۔ انجمن چاہتی ہے کہ آزادی کے ایک خاص معیار کے حصول کے لئے اُس کے ارکان مشترکہ کوشش کریں۔ اب اگر اِس کی وجہ سے زندگی کے خدو خدو ضائع اور ناقص اندیشہ معیاروں کی قربانی ہوتی ہے تو یہ اُپنی آزادی کی خاطر اپنی آزادی کی قربانی ہے جسے جائز سمجھنا چاہئے۔ مثلاً مزدوروں کے مکانات کا مسئلہ بیماری اور دیگر بچا پنے کی حالت میں

اُن کی خبر گیری، اُن کے لئے مستقل طور پر مزدوری فراہم کرنے کی ذمہ داری، بچوں کی تعلیم اور اور انھیں کھانا کھلانا، بچوں اور عورتوں کی ملازمت کے متعلق خاص قوانین بنانا۔ ان اغراض کو حصول کے لئے جب امتداد مشترکہ طور پر انجمن بنا کر کوشش کرتے ہیں اور اس کوشش سے افراد کے انفرادی خستہ کاری کو عارضی نقصان پہنچتا ہے تو اس کی ثنائی، جماعتی اور مستقل فائدوں سے ہوجاتی ہے لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ انجمن کے مطالبات حدود سے متجاوز ہو جائیں اور اتنی قربانی طلب کریں کہ جس کے لئے افراد طیارہ نہ ہوں۔ ایسی صورت میں امتداد کی آزادی کی حفاظت ضروری ہوجاتی ہے اس قسم کی دلیل آزاد تجارت کے خلاف بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔ آزاد تجارت ایسے دو ملکوں کے درمیان تو نہایت موزوں اور مناسب ہے جو صنعتی حیثیت سے مساوی سطح پر ہوں۔ لیکن ایسے دو ملکوں کے درمیان جن میں سے ایک صنعتی حیثیت سے بہت ترقی یافتہ ہو اور دوسرا قدرتی وسائل کے باوجود نہایت پس ماندہ۔ جب آزاد مقابلہ ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پس ماندہ ملک آزاد تجارت کی حالت میں کبھی اپنی صنعتوں کو ترقی نہیں دے سکتا۔ ایسی حالت میں جماعت کے مستقل مفاد کو پیش نظر رکھ کر آزاد تجارت سے عارضی کنارہ کشی ضروری ہوجاتی ہے لیکن یہ مسائل اس کے بعد بھی پوری طرح صاف نہیں ہوتے اور بعض اوقات معاشی آزادی کے نام پر ایک طرف یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ پیشوں، قیمتوں، مزدوروں کی شرائط ملازمت اور آمد و برد کے محفل اور باقی تمام دوسرے معاشی معاہدوں سے ہر قسم کی بیرونی پابندیاں منسوخ کر دی جائیں اور دوسری طرف دعوت دی جاتی ہے کہ ہر جزئی معاشی مسئلے کو حکومت کی نگرانی اور انتظام کے ماتحت لایا جائے اور دونوں نظریوں کے طامی و شوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ صرف انہی کی تجویزوں سے معاشی، آزادی کے امکانات محفوظ کئے جاسکتے ہیں اس کے متعلق مفصل بحث آئندہ کسی باب میں کی جائے گی۔

خانگی آزادی | جماعت میں جتنی انجمنیں بھی پائی جاتی ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم، ہر گیسر اور بااثر تنظیم خاندانی ادارے کی ہے جس زمانے میں ریاستیں مطلق العنان ہوتی تھیں خاندانی زندگی میں بھی استبدادیت اور مطلق العنانی کا دور دورہ تھا۔ اور شوہر اپنی بیوی اور بچوں کے جان و مال کا بہت بڑی

حد تک محنت رکھ کر ہوتا تھا۔ آزادی کی تحریک نے جب خاندانی محاذ سے حملہ کیا تو اس کے پیش نظر تین مقاصد تھے (۱) بیوی کو مساوی طور پر محنت اور ذمہ دار کر دیا جائے۔ اسے جائداد کی ملکیت اپنے طور پر کاروبار کرنے، فریق معترضہ بننے اور شوہر کے مقابلے میں پوری طرح محفوظ ہونے کے حقوق دے جائیں (۲) شادی کو جہاں تک قانون کا تعلق ہے دو ہم ترسبہ فریقوں کے درمیان ایک معاہدہ سمجھا جائے (۳) اولاد کی جسمانی، دماغی اور اخلاقی تربیت کے لئے کچھ تو دلین کو پابند کیا جائے اور کچھ سہ کارى طور پر تعلیم اور حفظانِ صحت کے انتظامات کر کے مزدبست کیا جائے خاندانی زندگی کے اول الذکر دو مقاصد سے تو مساوات کے اصول کی توسیع ہوتی ہے لیکن تیسرے مقصد کے سمجھنے میں ذرا دشواری معلوم ہوتی ہے۔ اس مسئلے پر غور اگر اس نقطہ نگاہ سے کیا جائے کہ بچہ کے حقوق کی نگہداشت مستقبل کے شہری ہونے کی حیثیت سے کی جاتی ہے اور مساوی مواقع کا انھیں اتنا ہی سہ حق سمجھنا چاہئے جتنا کہ موجودہ شہریوں کو اور چونکہ وہ اپنے حقوق کا مطالبہ خود کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے اس لئے ان کے حقوق کی نگرانی قانون اور حکومت کے ذریعہ سے ضروری ہے تو شاید یہ مسئلہ سمجھ میں آجائے اور یہاں بھی آزادی کا مفہوم مساوات قائم کرنا ہو جائے۔

مقامی نسلی اور قومی آزادی | مختصر ترین جامعی ادارے یعنی خاندان کے بعد اب ہم بزرگ ترین ادارے یعنی قوم کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں۔ تحریک آزادی کا ایک بڑا حصہ ان مساعی شتمل ہے جن کے ذریعے اقوام نے بصورتِ مجموعی غیروں کی حکومت سے آزاد ہونے کے لئے جدوجہد کی۔ یورپین کی شہنشاہیت کے خلاف یورپ کی تمام اقوام کی بناوٹ، اٹلی کی آزادی کے لئے کوشش، ترکی کی عیسائی رعایا کی اپنے بیرونی ہم مذہبوں سے املا طلبی، جیٹھی اقوام کی غلامی سے رہائی، آئرلینڈ اور ہندوستان کی قومی تحریک، یہ سب اسی جذبے کے مظاہر ہیں۔ بظاہر یہ مسئلہ بہت سہل معلوم ہوتا ہے، ان تحریکوں کا مقصد عموماً یہ ہوتا ہے کہ کمزور فریق کو طاقتور فریق کی گرفت سے نکال کر اسے خود مختار اور ہم رتبہ بنادیا جائے لیکن اس کی اس سطحی شکل کا جب ذرا گہرائی سے مطالعہ کیا جاتا ہے تو معاملہ اتنا صاف نہیں رہتا۔ قومیت کسے کہتے ہیں اور یہ ریاست سے کس حیثیت سے مختلف ہے؟ کس قسم کا خاص

اتحاد قومیت کے احساس سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے کیا مخصوص حقوق ہیں؟ اگر انٹر لینڈ ایک قوم ہے تو کیا اس طرحی ایک قوم ہے؟ اگر اسٹرکو برطانوی اور پروسٹنٹ کہہ کر برطانیہ کا جزو بنانے کا مطالبہ کیا جاتا تھا تو اسٹرکی نصف کیتھلک آبادی کے حقوق کو پیش نظر رکھا جاتا تھا نہیں؟ ان میں سے بعض مسائل کے علی جوابات تو واقعات تاریخ سے ملتے ہیں مثلاً گنیڈا کی تاریخ کے مطالعے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرانس اور برطانیہ کیسے ہنسے دالے دو مختلف عناصر کس طرح گنیڈا میں ایک ساتھ بسنے اور خود مختار طرز کی حکومت پانے کے بعد عقاید "زبان" معاشرتی تنظیم اور تاریخی روایات کے اختلاف کے باوجود باہم شیعہ و شکر ہو کر ایک قوم بن گئے ہیں جنہی کے ایک قوم ہونے کے دعوے کو بھی تاریخ نے صحیح ثابت کر دیا ہے۔ آسٹریا کے وزیر میٹرک نے اٹلی کے متعلق طنز آمیز طریقہ پر جو یہ فقرہ کہا تھا کہ "اٹلی صرف جغرافیائی اصطلاح ہے" اس کی بھی تاریخ نے تردید کر دی ہے۔ لیکن تاریخ کے نتائج کی پیشین گوئی کس طرح کی جائے۔ ان تمام لوگوں کے مطالبوں کو جو قومی وحدت کی بنا پر خود اختیاری حکومت کا مطالبہ کرتے ہیں کن شہادوں کی بنا پر منظور یا مسترد کیا جائے؟ تکنیک آبادی کا اولین مقصد اس میں شک نہیں قومی خود اختیاری کو تسلیم کرنا ہے لیکن تقسیم اور جرنی تقسیم پر نظر کی جاتی ہے اور فرقوں کے اندر فرقے نظر آتے ہیں تو اس وقت خود اختیاری طرز کی حکومت کے کون سے حدود مقرر کئے جائیں؟ ابن پیچیدہ مسائل کو تاریخ کی زندہ مثالیں اور مدبروں کی علمی بصیرت ہی حل کر سکتی لیکن ایک اصول ہے جسے تجربے کی بنا پر ہر جگہ آزمایا جاسکتا ہے۔ جب ایک کفرور قوم ایک بڑی اور طاقتور قوم کے ساتھ شامل رہ کر ایک ہی قانون کے ماتحت آزادی کے جملہ حقوق سے مستفید ہو سکتی ہو تو ایسے اتحاد کو دونوں فریقوں کے لئے مناسب سمجھنا چاہئے لیکن جہاں یہ انتظام اکام نہیں جہاں حکومت مستقل طور پر ہنگامی اور غیر معمولی قوانین بنانے یا اپنے اداروں کی آزادی ختم کرنے پر مجبور ہو تو ایسی صورت میں اس اتحاد کو جس قدر جلد ممکن ہو ختم کر دینا چاہئے۔ ورنہ اگر یہ صورت جاری رہی تو نہایت آزاد خیال جمہوریت بھی اپنے اصولوں کی بیخ کنی پر مجبور ہو جائے گی اور اپنا اقتدار صرف اپنی آزادی قربان کر ہی کے قائم رکھ سکے گی۔

اسی قسم کے سوالات نسلی آزادی کے متعلق بھی پیدا ہوتے ہیں۔ تجربے سے یہ بات پائیدار ہو چکی ہے کہ محض نسل کا اختلاف کسی شخص کو آزادی کا کم یا زیادہ مستحق نہیں بنا دیتا۔ رنگ کے کالے یا گورے ہونے سے حکومت خود اختیاری کی طبعی اہلیت یا نا اہلیت میں اضافہ نہیں ہو جاتا۔ اس بنیاد پر جو امتیازی حقوق لوگوں کو دئے یا جو فرائض عاید کئے جاتے ہیں انھیں جس قدر جلد مٹایا اور تمام انسانوں کو سادی سطح پر لا کر آزادی کے منافع میں برابر کا شریک کیا جائے اتنا ہی مناسب ہے۔

بین الاقوامی آزادی | بین الاقوامی معاملات کو تحریک آزادی کا مطالبہ یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے عدم مداخلت کے اصول پر عمل کیا جائے اور اس کے لئے تین سلیس پیش کی جاتی ہیں (۱) آزادی کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ طاقت کے استعمال کی جو ظلم کا حشر ہے مخالفت کی جائے (۲) اسلحہ آزادی کی لعنت سے نجات حاصل کی جائے۔ کیونکہ اس سے کبھی تو براہ راست اور کبھی بالواسطہ نہایت ہشیاری اور چالاک کی کے ساتھ آزاد اداروں کو دبایا اور محض سرکاری کے بیشتر حصہ کو فوجی مصارف پر صرف کیا جاتا ہے (۳) جس قدر دنیا آزاد ہو رہی ہے اتنا ہی قوت کا استعمال ہل ہوتا جاتا ہے۔ اگر مقصد دوسری قوم کو فتح کر کے اس کے جائز حقوق پر تصرف کرنا نہیں ہے تو حملہ کرنا سخت خام خیالی ہے۔

سیاسی آزادی اور عوام کا اقتدار علیٰ | مسند جہ بالا تمام آزادیوں کے حصول اور قیام کا طریقہ کیا ہو یہ آخری سوال ہے جس سے اب ہمیں بحث کرنی ہے۔ عام طور پر جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اگر عالمہ اور مقتضہ کو کل جماعت کا جواب دہ بنادیا جائے تو اس مسئلے کا حل ہو جائے گا اور پیش نظر یہ انتظام ہوتا ہے کہ عوام کو اقتدار علیٰ حاصل ہو اور ہمہ گیر حق رائے دہندگی کے ذریعے سے وہ اپنے اس اقتدار سے فائدہ اٹھائیں؛ لیکن اس جواب کے مسئلے کی تمام دشواریوں کا حل نہیں ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ عوام اپنے حقوق کی طرف سے لاپرواہی برتیں اور انتظام کرنے کی اہلیت نہ رکھتے ہوں یا دوسرے مالک کی تسخیر کا نشہ اُن پر سوار ہو جائے یا اُمرا کی جاہلاد کی ضبطی یا اسی قسم کے کسی اور مجموعی ظلم پر آکادہ ہو جائے اس بات کا بھی آسانی سے امکان ہو سکتا ہے کہ وسیع حق رائے دہندگی کے مقابلے میں محدود حق رائے دہندگی سے عام آزادی کی زیادہ ضمانت ہو اور جماعتی ترقی کے زیادہ بہتر نتائج پیدا ہو سکیں۔

ان حالات میں عوام کے اقتدار اعلیٰ کے نظریے کے لئے وجہ جواز کیا ہے اور اُس کی صحت کے کیا دعوے ہیں؟ کیا یہ نظریہ آزادی اور مساوات کے عام اصول پر مبنی ہے یا دوسرے کوئی خیالات اس کی تائید کے لئے موجود ہیں؟ پھر خیالات اور اداروں کے جدید ارتقاء نے پارلیمنٹری حکومت کے مقابلے میں ڈکٹیٹر شپ کو لاکھڑا کیا ہے اور اب ایک نیا سوال یہ پیدا ہونے لگا ہے کہ کیا واقعی ٹائیدگی پر منحصر حکومت کے مقابلے میں عام طور پر مقبول اور پسندیدہ ڈکٹیٹر شپ عوام کے اقتدار اعلیٰ کے اظہار کا زیادہ مناسب، موثر اور مفید ذریعہ ہے؟ ان سوالات کا قطعی طور پر جواب دینا تقریباً ناممکن ہے۔ یہاں اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے جمہوریت کی تائید میں چند دلیلیں پیش کرنے پر اکتفا کی جائے گی۔

آزادی کا مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو بچوں کی طرح دوسروں کے ہاتھ سے کھانا کھلا کر خوش رکھنے کی کوشش کی جائے بلکہ یہ ہے کہ ان میں احساس ذمہ داری پیدا کر دیا جائے۔ ان کی سیرت کی تربیت کی جائے اور ان کی انفرادیت کو ترقی کا موقع دیا جائے۔ اگر انھیں اپنی نجات خود حاصل کرنا ہے تو انھیں مشترکہ زندگی کے انتظام کی ذمہ داری میں شریک ہونا چاہئے۔ انتخاب کے سنگدان کی جہالت یا غیر ذمہ داری کے علاوہ حق رائے دہندگی کو محض دکر ناجائز نہیں ہے کیونکہ مشق ہی سے آدمی کام کرنا سیکھتا ہے۔ لوگوں میں اگر احساس ذمہ داری پیدا کرنا ہے تو ان پر بھروسہ کر کے انھیں ذمہ داری تفویض کرنا چاہئے۔ ایسا کرنے میں خطرات ضرور ہیں لیکن خطرات اُس وقت اور بھی زیادہ ہوتے ہیں اور صورت حال سخت یا اس انگیز ہوتی ہے جب عوام کی اکثریت کو حقوق اور ذمہ داری سے محروم رکھا جاتا ہے۔ ایک شخص واحد کو حاکم مطلق بنانے میں علاوہ مندرجہ بالا اعتراضات کے ایک دوسرا خطرہ ادبھی ہے۔ ایک طرف تو یہ کہ اس کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے اختیار اسکے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے ذاتی اقتدار کے غیر ضروری استحکام میں مدد نہ لے گا۔ دوسری طرف اس کے جانشین کا مسئلہ طلب رہ جاتا ہے اس لئے جمہوری نظام اپنے تمام نقائص کے باوجود بہترین نظام ہے۔ البتہ اس کی جو نمایاں خرابیاں ہیں ان کے ازالے کی کوشش ضروری ہے۔ مثلاً

اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت، عوام کو بعض اہم معاملات میں نمایندے منتخب کرنے کے بعد بھی اپنی رائے کے اظہار کا موقع دینا اور بعض دوسرے معاملات میں اس کے برخلاف ماہرین کی رائے پر زیادہ اعتماد کرنا ایسی باتیں ہیں جن کو اختیار کر کے اصلاح کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

آزادی کو جن جن راہوں سے اور جن جن شکلوں میں مختلف زمانوں میں اور مختلف مقامات پر چل کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں انہیں اب ہم دیکھ چکے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ تحریک آزادی تمام انسانی زندگی پر حاوی ہے۔ اس کا تعلق افراد سے بھی ہے خاندانوں سے بھی اور ریاست تک بھی۔ اس کا اثر صنعت پر بھی پڑتا ہے اور قانون، مذہب اور اخلاقیات پر بھی۔ اگر گنجائش ہوتی تو اس کا جو اثر ادب اور فنون لطیفہ پر ہوتا ہے اس کے دکھلانے کی بھی کوشش کی جاتی کہ کس طرح تحریک آزادی کے زیر اثر قدامت پرستی، تصنع، عدم اخلاص اور مربیوں کے ذوق کی پابندی کے خلاف جنگ اور انفرادیت، واقفیت اور متاع و ادیب کی حقیقی روح کو نمایاں کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ غرض جدید دنیا کی تعمیر میں تحریک آزادی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

دوسری بات جو اس ذیل میں خاص طور پر قابلِ ملاحظہ ہے وہ یہ ہے کہ تحریک آزادی کا کام ختم نہیں ہوا ہے بلکہ جاری ہے اور ترقی پر ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں بیان کیا گیا تھا، جب تک فرد اور جماعت میں وہ ہم آہنگی پیدا نہ ہو جائے جس سے جماعت کی ہر پابندی کو سرور ایک خارجی اور ہتھیدی پابندی نہیں بلکہ اپنے اجتماعی نفس اور ضمیر کی پابندی سے تعبیر کرنے لگے پیلد جاری رہے گا تا آنکہ جماعت کی اطاعت اور آزادی میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا۔

ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل

(پروفیسر محمد مجیب صاحب کا لکچر جو انھوں نے ۱۳ اپریل کو
جامعہ کے کالج کے طلبہ کے جلسے میں دیا تھا۔)

برادرانِ جامعہ !

میں بہت دلوں سے سوچ رہا ہوں کہ آپ سے چند مسائل پر گفتگو کروں جن میں
میراجی لگا رہتا ہے اور جن پر میں سمجھتا ہوں کہ آپ سب کو بھی غور کرتے رہنا چاہئے۔ میرا مقصد
لکچر دینا یا نصیحت کرنا نہیں ہے، میں صرف اپنے خیالات بیان کر کے آپ کی رائے لینا اور
یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہم میں کہاں تک اتفاق ہے اور یہ اتفاق ہم آہنگی اور اتحادِ عمل
پیدا کر سکتا ہے یا نہیں۔ ہماری چھوٹی سی جماعت کو اس کا موقع دیا گیا ہے کہ ایک انتشار زدہ
ملت کے سامنے یک جہتی اور اتحاد کا نمونہ پیش کرے اور اگر ہم سچے دل سے ایسے مسلک کی
تلاش میں لگے رہے جو سب کا مسلک بن سکے تو ہم کو ایک بڑی خدمت انجام دینے کا شرف
ماہل ہوگا۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم آپس میں آنادہی سے اپنے خیالات کا چپ چاکریں۔
اور جو کچھ صحیح سمجھیں اُسے فقط زبان سے تسلیم نہ کریں بلکہ جہاں تک ممکن ہو عمل کے ذریعے اُسے
آزماتے ہی رہیں۔ اتنا ہی ضروری یہ بھی ہے کہ ہم دنیا کی تمام بڑی ذہنی اور معاشرتی تحریکوں کا مطالعہ
کرتے رہیں اور ان میں جو کچھ ہمیں قابلِ قدر معلوم ہو اُسے اپنے ذہنی اور اخلاقی سرمایے میں شامل
کرتے رہیں۔ میں آج آپ کے سامنے اس مسئلے پر بحث کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا کی عام روش کو دیکھتے
ہوئے ہمیں کون سی روش اختیار کرنی چاہئے اور ہم اس دولت کو جو مسلمان اور ہندوستانی
ہونے کے سبب سے ہمیں ملی ہے کس طرح استعمال کر سکتے ہیں کہ ہمیں فائدہ بھی ہو اور ہمارا اصل
سرمایہ بھی بڑھتا رہے۔

اس بحث کو میں اسی سوال سے شروع کروں گا جو باہر کے لوگ جامعہ والوں سے ہمیشہ پوچھتے ہیں کہ جامعہ کے طالب علم فارغ ہو کر کیا کر سکتے ہیں۔ جامعہ کے اساتذہ کے لئے اس کا سب سے آسان جواب یہ ہے کہ تعلیم گاہ کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو نوکریاں دلوائے لیکن اس جواب کے ہماری ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے اور آپ کی شکل آسان نہیں ہوتی۔ ہم نے ایک رسم کو جس کی لوگ ناما قبست اندیشی مگر اطمینان سے پیروی کر رہے تھے غلط اور مضرتہر اگر چھوڑ دیا؟ اب ہمارا فرض ہے کہ اس کی جگہ ایک نیا نظام حیات تجویز کریں جو صحیح اور مفید ہو اور کوئی ایسا طرز عمل اختیار کریں جسے ہم اپنے دینی، اخلاقی اور سیاسی عقائد سے ہم آہنگ ثابت کر سکیں جو ہمارے علم میں جان ڈالے اور ہماری تعلیم گاہ میں سچائی اور مردم دوستی کی رونق پیدا کرے۔ اس سے آپ کو یہ فائدہ ہونا چاہئے کہ تعلیم سے فارغ ہو کر آپ دنیا میں جنبی بن کر نہ داخل ہوں بلکہ ہر لمحہ محسوس کریں کہ یہی دنیا ہے جس کے لئے آپ جامعہ میں تیار کئے گئے ہیں اور اس میں دہی روش کا مایاب ہوگئی جس پر چلنا آپ کو جامعہ میں کھایا گیا تھا۔

لیکن میں محض فرضی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میں یہ بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ نیا راستہ تلاش کرنے سے پہلے ہم کو پورا یقین ہو جائے کہ پُرانا راستہ ہمیں مندرجہ مقصود تک نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ راہ رو کے لئے ثابت قدی مشرط ہے، منزل خواہ دور ہو یا قریب، اور تھوڑی تھوڑی دور چل کر واپس آنا بھٹکنے کی سب سے زیادہ قابلِ افسوس کیفیت ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ جامعہ کے وجود اور یہاں اپنی موجودگی کو دم بھر کے لئے بھول جائیے اور اپنے ملک کی حالت پر غور کر کے سوچئے کہ آپ کے لئے کسب معاش کی کون کون سی صورتیں ہیں، اور اگر کسب معاش کے علاوہ آپ اور کوئی حوصلے رکھتے ہیں تو ان کے پورے ہونے کا کس قدر امکان ہے۔

سب سے پہلی صورت تو یہ ہے کہ آپ ملازمت کے لئے کوشش کریں۔ ملازمت کا میدان بہت وسیع ہے۔ مگر کسی ایک وقت میں دیکھئے تو اس میں گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ اور اس ذرا سی جگہ میں اتنے لگ گھس جانے کو تیار کھڑے مہتے ہیں کہ آپ کی باری خدا جانے

کب آئے۔ اگر آپ کی قابلیت یا آپ کے خاندانی بزرگوں کا اثر، معیشتی خوشامد اور جلد توڑ کام آیا تو خیر ورنہ بہتر تو یہ ہے کہ آپ اس طرف رخ ہی نہ کریں۔

نوکری کے لئے کوشش نہ کرنا بجلی کوئی نئی بات بھی نہیں ہے۔ بہت سے نوجوان دوچار پر ٹھوکریں کھا کر یا ہوشیار ہوئے تو پہلے ہی سے امداد کر لیتے ہیں کہ ہم نوکری نہیں کریں گے۔ وہ تجارت، احباب انویسی یا کبھی کبھی تصنیف و تالیف کو ذریعہ معاش بناتے ہیں۔ بعض اپنی قدرتی استعداد اور طبیعت کی مناسبت سے ان پیشوں میں کامیاب ہوتے ہیں یا کم از کم ٹھکانے سے لگ جاتے ہیں۔ بہت سے ایسے بھی نکلتے ہیں جنہیں چند سال کے تجربے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے پیشے کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ بہر حال نوکری سے آج کل اتنے لوگ مایوس ہو رہے ہیں اور ہماری تعلیم گاہیں اس مایوسی اور مصیبت کو بھگتتے کے لئے اتنے نوجوانوں کو تیار کر رہی ہیں کہ اور پیشوں میں بھی کامیاب ہونا خاصا دشوار ہو گیا ہے اور کپ معاش کی فکر اتنی بڑھ گئی ہے کہ اس نے اور کسی فکر کے لئے جگہ نہیں چھوڑی ہے۔ ہم ایسے سمجھ نہیں میں کہ اس قومی مصیبت کے اسباب سے واقف نہ ہوں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری موجودہ تعلیم ہم میں کوئی خاص استعداد پیدا نہیں کرتی۔ ہم ہر کام کو اناڈیوں کی طرح شروع کرتے ہیں۔ ہمارا تخیل اس قدر کمزور اور پست ہے، ہمارا دل اتنا چھوٹا کہ ہم صرف دوسروں کی نقل کر سکتے ہیں۔ تجربے سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور صبر و بردباری ایک دوسرے کا کام بگاڑتے رہتے ہیں۔ ہم بھی محسوس کرتے ہیں کہ ہماری زندگی میں اصلاح نہ ہوئی تو ہم طرح طرح کی نئی بلاؤں میں گرفتار ہوتے ہیں گئے لیکن اسناد میں اتنی ہمت و مقبالت اندیشی اور قابلیت نہیں ہے کہ وہ عام بدوش کے خلاف صلاح کے خیال سے کوئی نئی وضع اختیار کریں یا کپ معاش کے نئے ذریعے دریافت کریں۔ حکومت کو ہماری ان دشواریوں سے کوئی مطلب نہیں اور ہمارے رہنا اتنے روشن خیال اور دور اندیش نہیں ہیں کہ اصلاح کی ایسی کوئی ہم سر کرنے کا حوصلہ کریں۔

اس لئے آپ حامد میں ہوں یا کہیں اور، اور آپ کو اپنے ذاتی اغراض کے سوا اور کسی مسئلے سے سروکار ہو یا نہ ہو آپ دنیا بھی غور کریں تو صرف اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ آپ کا مستقبل کسی عمت باریک بینی پر

نہیں ہے اور اس وقت کسی طرف سے اس کو بہتر بنانے کی کوشش نہیں کی جا رہی ہے۔ اگر آپ ذاتی اغراض کی حد سے گذر کر ملک کی عام حالت پر نظر ڈالیں تو آپ کو اپنی دشواریاں ایک بڑے پیمانے پر دکھائی دیں گی اور وہی حیرانی جو آپ کو اپنے متعلق سوچنے سے پیدا ہوتی ہے آپ کو قوم کے مستقبل پر غور کرتے وقت سنائے گی۔ سب سے زیادہ تکلیف آپ کو غالباً اس بات کی ہوگی کہ ہم مجبور ہیں یا مجبور بن بیٹھے ہیں۔ تنکے کی طرح ایک دھارے میں بہہ چلے جاتے ہیں۔ ہماری نظریں نہ کوئی سال ہے جہاں ہم اپنے لئے ٹھکانا کرنے کی امید رکھ سکتے ہیں نہ کوئی بے پایاں سمندر میں گم ہو جانا ہم اپنی حیات کی تکمیل قرار دے سکیں۔ اس وقت ہم میں زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ہماری زندگی میں کیسی تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور کیسی ہونی چاہئیں۔ تعلیم یافتہ طبقے کا جو حصہ ملکی معاملات میں پیش پیش رہتا ہے اس کے نزدیک ترقی اس میں ہے کہ ہمیں حکومت کے اختیارات ملیں۔ ملک میں بڑے بڑے کارخانے قائم ہوں جو ہمیں اس لائق بنادیں کہ ہم جاپان، امریکہ، اور انگلستان کی صنعت کا مقابلہ کر سکیں۔ ہماری رہائش میں وہ تمام آسائیاں اور روزمرہ زندگی میں وہ تمام دیکھیں پیدا ہو جائیں جو مختلف آلات اور مشینوں اور فنون لطیفہ کی بدولت یورپ اور امریکہ میں پیدا کر لی گئی ہیں۔

لیکن یورپ اور امریکہ کی اندھی تقلید ہمیں راہ راست پر نہیں لاسکتی۔ جب جماعت میں ربط اور اتحاد نہ ہو، اسنادیں حکم دینے اور حکم سبجالانے کی استعداد اور عادت نہ ہو، وہ اجتماعی مقاصد کو ذاتی مقاصد نہ جانتے ہوں اور ان کے لئے اسٹار کرنے پر تیار نہ رہتے ہوں تو جمہوری حکومت، نعمت ہونے کی بجائے عذاب ہو جاتی ہے۔ ہم میں بے شک وہ اوصاف پیدا کئے جاسکتے ہیں جو جمہوری حکومت کو کامیاب بنانے کے لئے لازمی ہیں۔ لیکن ابھی ہم نے اخلاقی تربیت کی طرف بالکل توجہ نہیں کی ہے۔ صرف حقوق اور امتیازات کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ہم میں بہت سے لوگ اپنے آپ کو قوم پرست کہتے ہیں۔ مگر ہم ابھی تک یہ طے نہیں کر سکے ہیں کہ قوم اور قوم پرستی کا مفہوم کیا ہے۔ ہماری قوم پرستی اب تک ہماری اغراض کے مجوسے کا نام ہے جو اس وقت بالکل منتشر ہو جاتا ہے جب ہم اسے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ اب بھی دیکھ رہے ہیں کہ جوائنٹ

پارلیمنٹری کمیٹی کی تجاویز نامنظور کرنے میں تو خاصا اتفاق ہے۔ کمیونل اور ڈپرٹمنٹ اور سٹند لیڈر بھی گفتگو کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ جب تک کوئی دشواری نہیں پیش آتی ہم خوشی خوشی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں، جب کوئی رکاوٹ دیکھتے ہیں تو بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔

یہی رویہ ہم نے معاشی معاملات میں اختیار کیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ملک کی تجارت اور صنعت بالکل ہمارے ہاتھ میں آ جائے، اور ہمیں آہستہ آہستہ اس میں کامیابی ہو رہی ہے۔ لیکن سرمایہ داری پیدا ہو جانے اور کاروبار کا پیمانہ بڑھ جانے سے افلاس اور بے روزگاری کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، کیونکہ آپ اس وقت دنیا میں ہر طرف بڑے پیمانے کی صنعت اور بے روزگاری کو پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم کو یاد رکھنا چاہئے کہ نظام سرمایہ داری کی لغا اور ہسپودکا اپنا قانون ہوتا ہے، اور ایک مرتبہ اس کے جسم میں جان ڈال دی جائے تو پھر وہ اپنی اغراض اور اپنی سلامتی کے لئے لڑے گا اور ہم ایک اور جنگ میں پھنس جائیں گے۔

برادرانِ جامعہ !

میں یاں مشرب نہیں ہوں، اور آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ ہم دنیا سے نرالے نہیں ہیں۔ ہماری جیسی جماعتیں اور بے پردائی دوسری قوموں نے بھی کی ہے، اور ایسی ہی مصیبتوں میں مبتلا ہو چکی ہیں۔ جماعتوں کا نقطہ نظر، اندر کی ذہنیت، ایک وقت میں نہیں بدلتی، اصلاح کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سب ایک ساتھ سدھر جائیں اور سب ایک ارادے اور ایک طریقے سے کسی اصول پر عمل کریں۔ لیکن جماعتیں ترقی اتنی وقت کرتی ہیں جب ان کے اندر ایسی چھوٹی جماعتیں قائم ہو جائیں جو اپنے اصول اور عمل کو باقی کے لئے ایک مثال بنائیں جن مسائل پر دوسرے غور نہیں کرتے ان پر غور کریں جو خطرے دوسروں کو نظر نہیں آتے ان کو سب کو آگاہ کریں اور اصلاح اور ترقی کی نئی تدبیریں کرتے رہیں۔ میرے خیال میں ہماری چھٹی سی جماعت ر ہندوستانی مسلمانوں کے لئے، اور ہندوستانی مسلمانوں تمام ہندوستانیوں کے لئے یہ خدمت انجام دینے کا ارادہ کرنا چاہئے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم بڑی کا دعویٰ کریں! اپنے آپ کو برگزیدہ ہستیوں سمجھیں۔ جامعہ کی حالت نہایت نازک رہتی ہے مسلمان

انتشار اور پستی کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ ہر میدان سے اُن کے قدم اُکھڑ رہے ہیں۔ اپنی اصل سے جس قدر دور وہ ہیں ہندوستان کی اور کوئی ملت نہیں ہے۔ ہماری سلامتی کی مسیکے خیال میں اب یہی ایک مدرسے کے ہم اپنے حوصلوں کو ایڑ لگائیں اور فوری نقصان اٹھا کر بھی اپنا پورا اخلاقی اور دنیاوی سرمایہ قومی زندگی کی تعمیر میں لگادیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں دنیا اور دنیاوی مفاد کو ٹھکرا کر بالکل اخلاقی اور دینی مقاصد میں غوہو جانا چاہئے۔ ہم دنیا کو سمجھے بغیر دین کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور اس وقت اگر ہم اپنی ملی اور قومی ضروریات اور فرائض کا صحیح اندازہ نہ کر سکے تو ہم دنیا سے بھی جائیں گے اور دین سے بھی ہم کو اس زمانے کی تمام بری تحریکوں اور عالم گیر مسائل کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ اب آمد و رفت کے ذریعہ ایسے ہو گئے ہیں کہ دنیا کا کوئی حصہ خارجی اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ پھر ہمیں دنیا کی عام روش اور دوسرے ملکوں کے تجربات کو سامنے رکھ کر اپنے ملی مسائل پر غور کرنا چاہئے اور یہ سوچنا چاہئے کہ ہمارے اور آئندہ نسلوں کے لئے عزت اور فراغت سے زندگی بسر کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ ہم کس طرح سے دنیا میں اپنا اور اپنی قوم کا اعتبار قائم کر سکتے ہیں اور اپنے آپ کو اس دینی، اخلاقی اور تہذیبی دولت کا جو ہمیں ورثے میں ملی ہے کس طرح مستحق ثابت کر سکتے ہیں۔

برادرانِ جامعہ !

انسانی زندگی میں ہر وقت مختلف قوتیں اور تحریکیں برسرِ پیکار رہتی ہیں، اور اس زمانے میں ایک دورخی جنگ ہے جو دنیا کے ہر گوشے میں جاری ہے اور ہندوستان میں بھی اس کے لئے میدان اختیار ہو رہا ہے۔ ایک طرف انسان اور شین، پلانی تہذیبی حدود اور شین پستی کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ دوسری طرف مذہب اور لا مذہبیت ایک دوسرے سے بھڑے ہوئے ہیں۔ شین پستی اور لا مذہبیت میں پورا اتفاق اور اتحاد اُٹل ہے۔ تہذیب اور مذہب مجبور ہو کر ایک دوسرے سے بٹے ہیں اور ان کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے۔ اگرچہ دونوں کے علمبرداروں نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ اُن میں سے کوئی ایک اکیلا سلامت نہیں رہ سکتا۔ کامیاب ہوں گے تو دونوں، تباہ ہوں گے تو دونوں۔ مشین پستی اور لا مذہبیت کے مرکز امریکہ اور یورپ ہیں، اور انھوں نے پلانی یورپی تہذیب پر قریب قریب فتح حاصل کر لی ہے۔ اب ہم

کسی یورپی قوم کو انسانیت اور مذہب کا سچا حامی نہیں سمجھ سکتے۔ اُن کی بُشت و پناہ صرف استراد اور محدود علقے ہیں۔ مشرقی دنیا پر مشین پرستی اور لامذہبیت کے حملے شروع ہو گئے ہیں اور بہت سی تعلیم گاہوں پر انھوں نے اپنا قبضہ جمالیا ہے۔ لیکن ہم وقت پر ہوشیار ہو جائیں تو اب بھی مقابلے کا بہت اچھا موقع ہے۔

سب سے پہلے تو ہمیں چاہئے کہ اپنے حریت کی خصوصیات کا بخوبی مشاہدہ اور مطالعہ کر لیں۔ مشین کی ابتدا اٹھارہویں صدی کے آخر میں صنعتی انقلاب کے ساتھ ہوئی۔ جب لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ سائنس کی ترقی سے انسان جو ہمیشہ مجبور سمجھا جاتا تھا مادی قوتوں کو اپنے قابو میں کر لے گا اور اصلاح اور ترقی کے لئے عقیدے اور عمل کی درستی سے زیادہ ضروری تھی کلوں کی ایجاد اور کامو بار کی نئی سہولتیں ہیں۔ اس وقت مشین پرستوں کی زندگی کا معیار کارخانے کا معمول ہے۔ اُن کے اخلاق کا معیار چالاک اور کامیاب تاجر کا طرز عمل ہے۔ اُن کے نزدیک حسین وہی چیز ہوتی ہے جو مشین سے بنائی جائے، اور وہی چیز قابل تدار ہے جس کی بدولت بچہ پیدا کیا جاسکے۔ انھیں اس پر افسوس نہیں ہوتا کہ مشین کا دلچیز ہر قسم کے ہنر کے لئے ہلک ہے، کیونکہ وہ انسان کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں کو بددینا اور بھونڈی سمجھتے ہیں اور انھیں کچھ پروا نہیں ہوتی اگر دولت پیدا کرنے کا خیال کسی قوم پر بھرت کی طرح سوار ہو جائے اور اُس کے استراد کے اور تمام حوصلے مرجائیں۔ اُن کے نقطہ نظر سے دنیا کو خوش اور آباد رکھنے کے لئے مشین اور اشتہار کافی ہیں اور جو اُن دونوں کے رموز سے واقف ہو اُسے کوئی اور علم، کوئی اور ہنر، کوئی اور حقیقت درکار نہیں۔ لیکن ہم یاد رکھنا چاہئے کہ مشین پرستی کے مسلک میں چند خوبیاں بھی ہیں جو اُسے نہایت دلکش بنا دیتی ہیں۔ انسان رسم و رواج کا بندہ نہیں رہتا، رہائش میں ہزاروں آسائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، دولت اور سامانِ عیش کی افراط ہوتی ہے اور غریب اور کم ترقی یافتہ قوموں کو معلوم ہوتا ہے کہ مشین پرست ملکوں میں سب خوش، تندرست اور دولت مند ہوتے ہیں۔

مشین پرستی کا دوسرا رخ موجودہ فلسفہ اشتراک ہے۔ جس میں جو اشتراکی نظام ۱۹۱۷ء کے

قائم ہوا اُس کے خاکے بھی صنعتی انقلاب کے زمانے میں بنائے جانے لگے تھے پہلے اُن میں مردم دوستی اور اخلاقی ایمُن کو زیادہ دخل تھا لیکن بعد کو اشتراکیت کا علوم صحیحہ میں شمار ہونے لگا۔ اور کارل مارکس کی تعلیم میں جو اشتراکیت کا سب سے مکمل اور موثر نمونہ ہے علوم صحیحہ کے سوا اور کوئی علم مادّے کے سوا وجود کی کوئی اور شکل، اشتراکیت کے سوا زندگی کا کوئی اور نظام تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اشتراکی فلسفہ حیات میں مذہب کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ اول اس وجہ سے کہ اشتراکیوں کے نزدیک مذہب، سرمایہ داروں کا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار رہا ہے، اور اُس کی بدولت کسان اور مزدور اپنے حق سے محروم اور اپنی غلامی سے مطمئن رکھے گئے ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ انسان کا وجود بالکل انسانی ٹھہرایا گیا ہے اور انسان کے تمام عقائد، حوصلے، خیالات، احساسات اور خواہشیں آدمی اثرات اور خارجی محرکوں کا نتیجہ مانی گئی ہیں۔ ایسے نظریے یورپ میں بھی پیش کئے گئے، اور وہاں وہ مجموعی طور پر دھریٹ کہلاتے تھے۔ روس میں یہ نظریوں کی حد سے گذر کر عقائد بن گئے ہیں، ان کی ہر طرح سے تبلیغ کی جاتی ہے، اور وہ ایک مذہب ہے جو تمام اور مذہبوں کے شانے کی فکر میں ہے۔ چونکہ باقی دنیا کے تعلق اور تہذیب کا انحصار سرمایہ داری اور بڑے پیمانے کی صنعت پر ہے، اور کسان اور مزدور ہر جگہ اپنے حق سے کم دیش محروم رکھے گئے ہیں، روسی اشتراکیت اپنے حریفوں کی جماعت میں بد نظمی اور فساد پیدا کرتی رہتی ہے، اور کوئی تعجب نہیں اگر اُسے آئندہ میں اُن پر فتح حاصل ہو۔

تہذیب انسان کی دلچسپیوں کو اس قدر بڑھا دیتی ہے کہ دولت جمع کرنا زندگی کا واحد مقصد نہیں بن سکتا۔ لیکن دولت کے بغیر تہذیب قائم نہیں رہ سکتی۔ یورپ کی تہذیب قویں امریکی صنعت کا مقابلہ نہیں کر سکی، اس لئے جنگ عظیم کے بعد سے امریکہ کی نقل و حرکت لگی، صنعتی کامیابی پر اور تمام حوصلے قربان کئے جانے لگے۔ دوسری طرف روسی اشتراک کو زور پکڑتے دیکھ کر سرمایہ دار اور خوش حال طبقوں میں فاشسٹ تحریک کی ابتدا ہوئی جس کا اس وقت جرمنی اور اطالیہ میں دور دورہ ہے۔ ان دونوں تحریکوں میں وہ ذہنی اور اخلاقی انگلیں، نوع انسانی اور عقیدے کا وہ احترام جو تہذیب کی جان ہے نظر انداز کیا گیا ہے، انسانوں کو انھوں نے بھی ایک بڑی مشین کے کُل ممبرے

بنا دیا ہے۔ بس مشین کا نام دوسرا رکھ دیا ہے اسی بنا پر میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ یورپی تہذیب مشین پرستی اور لاد مذہبیت کا مقابلہ نہیں کر سکی ہے۔

ہندوستان میں مشین پرستی کے رواج کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمارے یہاں جو رہی سہی صنعتیں ہیں وہ متباہ ہو جائیں گی، ہمارے سرمایے دار اس فکد میں پڑ جائیں گے کہ ہر کام مشین سے کریں، اور اگر وہ اس میں کامیاب ہوئے تو ہمارے مزدوروں پر ہر پانچ دس سال کے بعد فاقہ کشی کی مصیبتیں نازل ہوا کریں گی۔ اگر زمین کی کاشت مشین سے ہونے لگی، اور کسان کو مقابلے سے محفوظ رکھنے کی کوئی تدبیر نہ کی گئی تو اور بھی طوفان برپا ہو گا۔ دوسری طرف روسی اشتراکیت کے رواج کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہم انگلستان کی جگہ روس کے غلام بن جائیں گے، اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو ہماری قوم ممکن ہے برسوں تک ایسے چارہ ساند کا تختہ مشق بنی رہے جو نہ ہماری سیرت کا خیال کریں گے نہ ہماری روایات اور ہمارے مذہب کا پاس رکھیں گے اور جو اپنی پیاس بجھانے کے لئے خون کی ندیاں بہائیں گے۔

ان آفتوں سے بچنے کے لئے ہم کچھ نہیں کر رہے ہیں، کیونکہ جمہوری حکومت اور صنعتی خود مختاری جس کا ہم مطالبہ کر رہے ہیں دونوں ہماری حفاظت کے لئے کام نہ آئیں گی۔

سیاسی آزادی دنیا کے بہت سے ملکوں کو حاصل ہے مگر جمہوری طرز حکومت جو کسی دماغ میں ہر مرض کا علاج سمجھا جاتا تھا، ہر جگہ بے وقت ہو رہا ہے۔ معاشی آزادی بھی بہت سے ملکوں کو حاصل ہے مگر بڑے پیمانے کی صنعت اتنی مدت سے معاشرت اور تخیل پر چھائی ہوئی ہے اور اس نے قوموں کو ایسے الجھیروں میں پھنسا دیا ہے کہ اب معلوم ہوتا ہے وہ سب کو اپنے ساتھ لے ڈوبے گی۔ اشتراکیت کے پہلے مجاہد یہ دعوے کرتے تھے کہ دنیا کی معاشی اور صنعتی کشمکش اشتراکی نظام قائم ہوتے ہی غائب ہو جائے گی۔ مگر روس کی اشتراکی حکومت ہر طرح کے سرمایہ داری نظام کی نقل کر رہی ہے، اور اس میں ایک یہ شیطانی جذبہ اور ہے کہ ساری دنیا کے معاشی نظام کو درہم برہم کر کے ہر جگہ اتنا فساد برپا کرے کہ مزدور اور کسان، نظام حکومت پر قبضہ کر لیں اور سرمایہ داروں کو بے دخل کر دیں۔

ہمارے لئے یہ پورا اور امر کیہ کہ جمہوریت اور سرمایہ داری، روس کی اشتراکیت اور جنگ جونی

مطالعہ کے لائق ہیں، تقلید کے لائق نہیں ہیں ہم کوُن سے سبق لینا ہے اور اُن کی کمی پوری کرنا ہے اپنے ملک میں ہیں ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جو چُست اور مضبوط ہو۔ اپنے اندر ترقی اور نشوونما کی صلاحیت رکھتا ہو اور اپنی بھتا کے لئے کسی دوسرے کو ہلاک کرنے پر مجبور نہ ہو۔ ہمارے ملک میں نئی تہذیب، نئی سیاسی زندگی، نئی صنعت اور نئی معاشرت کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے۔ ہم کسی رستے پر اتنی دور نہیں نکل گئے ہیں کہ واپسی میں بہت زیادہ زحمت ہو۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم ایک مذہب کے پیرو ہیں جو ایک نہیں ہزار تہذیبوں کی مدوح و مدعا ہو سکتا ہے، اسی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارا یقین بخستہ ہو اور حوصلہ بلند تو ہم اس ہم میں کامیاب ہوں گے اور جہاں اس وقت دوسروں کے نقش قدم پر چلتے ہیں وہاں شاید دوسروں کی رہبری کریں گے۔

برادرانِ جامعہ !

ہمارا ایک عام عقیدہ ہے کہ مذہب، زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ اس لئے علم اور مذہب کو جدا کرنا، سیاسیات اور مذہب کو ایک دوسرے سے بے تعلق سمجھنا، معاشرت اور عادات میں مذہبی آئین کا لحاظ نہ رکھنا بالکل غلط ہے لیکن افسوس ہے ہم اس صحیح اور مفید عقیدے سے جو نتیجے نکالتے ہیں اُن سے منطق اور مصلحت دونوں کا خون ہوتا ہے، اور ہماری زندگی میں کوئی مذہبی اور روحانی شان پیدا نہیں ہوتی۔ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کے شوق میں ہم علم دوستی کے آداب بھول جاتے ہیں۔ ہم ہر چھوٹی بڑی اور اچھی بُری معاشرتی رسم کو شرعی حکم ٹھہرا کر اپنی نشوونما کو بدکتے رہتی ہیں لیکن ان مسائل سے یہاں بحث نہیں ہے۔ میں آپ کو خاص طور پر اس نقصان کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو اس عقیدے کی غلط تشریح سے ہماری سیاسی حیثیت کو پہنچا ہے۔ کیونکہ ہم ہر مسئلے پر غور کرتے وقت مسلمانوں کے فرائض کو نظر انداز کر کے صرف ان کی فوری اغراض کا خیال کرتے ہیں اور سیاسی اختلافات کو خواہ مخواہ مذہبی رنگ دے دیتے ہیں۔ ہمیں بے شک سیاسیات اور مذہب کا جدا نہ کرنا چاہئے۔ لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں یکجہی نہ کہنا چاہئے کہ فلاں کام سیاسی ہے، اسے ہم چاہیں کریں یا نہ کریں۔ لیکن فلاں کام دینی ہے اسے ہم ضرور کریں گے ہمارا فرض ہے کہ اگر

سیاسی مفاد کے نام سے اخلاقی قانون کی خلاف ورزی کی جا رہی ہو تو ہم اخلاق کی حمایت کریں، لیکن یکجہڑ بیٹھنا کہ سیاسیات سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں، ہندوستان آنا دھویا نہ ہو ہندوستانی صنعت اور تجارت ترقی کرے یا نہ کرے ہمیں کوئی مطلب نہیں۔ مصلحت اور میرے خیال میں ہماری مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے خلاف ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر ہم اپنے مذہب اور اپنی روایات کی صحیح ترجمانی کریں تو ہم کو قوم پرستوں اور آزادی کے مجاہدوں میں سب سے آگے ہونا چاہئے۔ ہم کو علوم و فنون، صنعت اور تجارت پر اپنا سکہ جانا چاہئے، اور جن حقوق کے لئے ہم اس وقت ایک نہایت مضحک اور مہمل طریقے پر لڑ رہے ہیں انھیں سیاسی زندگی کی باگ اپنے ہاتھ میں لے کر بغیر محبت اور مطالبے کے حاصل کرنا چاہئے۔ لیکن آزادی کے لئے قربانیاں کرنا جمہوری حکومت کا ایک سچا ہوا نظام قائم کرنا، اور اسے خود مختاری اور فرماں برداری، آزادی اور ضبط نفس، خدمت اور آہستہ کی نمایاں مثالیں پیش کر کے مستحکم کرنا دراصل ہمارے فرائض کا صرف ایک حصہ ہے۔ ہمیں ان معاشرتی اصلاحوں کا ذمہ بھی اپنے سہ لینا ہے جس کے بغیر ہماری جماعت بدی اشتراکیت کے حملوں سے محفوظ نہیں رہ سکتی، اور مذہبیت کی تخلیقی قوت کے اوصاف اور کارنامے دنیا پر ظاہر کر کے لائڈ مہمیت کے دنا کو دور کرنا ہے۔

برادرانِ جامعہ! ہر کام کے لئے موقع درکار ہوتا ہے۔ ہر اجتماعی عمل کے لئے ایک میدان چاہئے۔ دنیا کا ہر ملک ہمارا ملک ہے۔ اس لئے کہ وہ ہمارے خانا کا ملک ہے۔ مگر کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم کو ہر جگہ پر دیسی بن کر رہنا چاہئے۔ وہاں کی نعمتوں کو اپنے اوپر حرام کر لینا وہاں کی مشکلوں کو اپنی مشکلیں نہ سمجھنا چاہئے؟ اس وقت ہندوستان، ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں اور ہر جنس میں تقسیم کیا جا رہا ہے، اور سب کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ہندوستان کا وہی حصہ ان کا ہے جس میں ان کی اکثریت ہے، اور سب جو جاہل سمجھیں مسلمان اب تک ہندوستان کو ایک مکمل سیاسی وجود مانتے آئے ہیں اور اس عقیدے سے ان کی اپنی تعداد کا کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ ہم کو شمالی ہندوستان میں ایک متحد مرکزی حکومت قائم کئے ہوئے چند ہی سال گزرے تھے جب تا آدوں نے

اگر عالم اسلامی کو تہ وبالا کر دیا۔ ہماری کمزور نوعمر ریاست اُن کا بڑی جاں فشانی اور استقلال سے مقابلہ کیا، اور ہندوستان کو اُن کے مظالم سے محفوظ رکھا۔ یہ یقیناً جاں بازی اور حسن انتظام کا کرشمہ تھا۔ راجپوتوں کی حکومت کو چند حلوں نے ختم کر دیا۔ مرہٹوں کے حوصلوں کو ایک فیصلہ کن جنگ نے خاک میں ملا دیا۔ انگریز کبھی غذاری اور دغا بازی کا سہارا لئے بغیر میدان میں آنے کی ہمت نہ کر سکے اور انھیں بھی اگر پچھتر برس تک مسلسل تاناروں جیسے بے باک دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تو خدا جانے اُن کا کیا حشر ہوتا۔ ہم ہندوستان کے لئے غیروں سے لرے اور اپنے مذہب دانوں سے لرے، ہم نے اُسے فساد سے بچانے کے لئے اپنوں کا خون کیا! ہندوستان اگر ہمارا ملک نہیں ہے تو کس کا ہے۔ اس کا حق ہم پر نہیں ہے تو کس پر ہے۔ آپ اپنی تاریخ اور روایات پر غور کیجئے اور پھر یہ دیکھئے کہ آج کل آپ اہل ملک اور اہل ملک کے دوسرے باشندوں سے کسی غیریت اور بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ آپ کے اجداد نے کس ہمت اور استقلال سے اندرونی مشکلات اور بیرونی دشمنوں کا سامنا کیا۔ اور اس وقت آپ کس پست ہمتی سے اکثریت اور تحفظ حقوق کا اسرار ڈھونڈتے ہیں ہندوستان بے شک اس اعتبار سے ہمارا ملک نہیں ہو سکتا کہ ہم بغیر کسی کی شرکت کے اس حکومت کریں۔ لیکن اس اعتبار سے وہ ہمیشہ ہمارا ملک رہے گا کہ اس امن و عافیت اور بہبود کے لئے ہم نے اپنا خون بہایا ہے، ہم نے اسے تمام پستی اور تنگ نظری کی قید سے چھڑایا، ہم نے ایسی معاشرت کا نمونہ پیش کیا جس میں ذات اور نسل کا امتیاز نہیں تھا۔ اور ہم نے اُسے ایک آزاد مذہب کا پیغام سنایا۔ گذشتہ اور موجودہ زمانے میں میرے نزدیک ضروری تادمق ہے کہ اب ہمیں اتحادِ عمل کا سبق پڑھنا اور پڑھانا ہے اور یہ ہمارے لئے ہر طرح سے مفید ہو گا۔

بِس وقت ہمارا سیاسی اور دینی فرض یہ ہے کہ ہندوستانی اتحاد کا جھنڈا اُکھڑا کریں۔ اور اتحاد کے ارادے کو اتنی تعویت پہنچائیں کہ وہ ہر ضروری انتظامی تفریق پر غالب ہے۔ دوسرے اگر اس میں کمزوری بھی دکھائیں اور زبان یا نسل یا سلطنت کی آڑ لے کر اپنی اغراض اور اپنی دلچسپیوں، اپنے مقاصد اور حوصلوں کو محدود کرنا چاہیں تب بھی ہمیں اتحاد اور وحدت کے شیدائی بنے رہنا چاہئے۔

سیاسی تفریق زیادہ گہری ہوگئی تو ہمارا سبک بڑا نقصان یہ ہے کہ ہماری ملت میں بھی انتشار پیدا ہو جائے گا۔ ایک خطے کے مسلمان، دوسرے خطے کے مسلمان کو۔ بیگانہ نہ سمجھنے لگیں گے، ہم میں ابھرنے اور ترقی کرنے کا جو مادہ ہے وہ آہستہ آہستہ نازل ہو جائے گا، اور ہم بالکل مقام کے عسکلام ہو جائیں گے۔ مسلمانوں میں کسی قسم کی تفریق مذہب اور روایات کے رو سے مناسب نہیں ہے، اور جب مصلحت اور عاقبت اندیشی کے خلاف ہو تب تو اسے کسی حالت میں گوارا نہ کرنا چاہیے۔ ہندوستان کی دوسری ملتوں کو یگانگی اور اتحاد کا جذبہ جیلا کرنے میں بڑی مشکلیں پیش آرہی ہیں، اس وجہ سے وہ وطن پرستی اور قوم پرستی پر زور دیتی ہیں اور اسے ایک سیاسی مذہب بنانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ہمیں ان کی محسوس کی دیکھ کر ان پر اعتراض نہ کرنا چاہئے۔ وہ بے شک جاہل تو وطن پرستی کے گیت گائیں اور وطن کو دیوی بنا کر اس کی پرستش کریں۔ ہماری خدا پرستی ہمارے لئے کافی ہے۔

اتحاد کے بعد نظام حکومت کا سوال آتا ہے۔ مسلمانوں میں جمہوری حکومت بھی رہی ہے اور خلافت کے نام سے غیر ذمہ دارانہ حکومت بھی ہوئی ہے۔ ہم میں نیک بادشاہ ہوئے ہیں اور نظام بھی ہوئے ہیں۔ لیکن جو طرز حکومت ہمارے دینی اور اخلاقی آئین سے سب سے زیادہ قریب ہے وہ جمہوری حکومت ہے۔ جمہوری حکومت ہزاروں طرح کی ہوتی ہے اور اس کا نظام قوم کی ضرورت اور مصلحت کے مطابق بدلا جاسکتا ہے۔ جمہوریت کی روح یہ ہے کہ قوم کا ہر فرد اپنے آپ کو آزاد اور خود مختار سمجھے، حکومت کے ہر معاملے کو اپنا معاملہ جانے، اس کی کامیابی میں اپنی کامیابی اس کے عیب میں اپنا عیب دیکھے۔ آپ کے سامنے اس دعوے کے ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت ہماری قوم حکومت کو غیروں کی حکومت سمجھتی ہے۔ اس جمہوریت سے جس کے حلال کرنے کی آج کل کوشش کی جا رہی ہے، اس کو کوئی لگاؤ نہیں ہے، اور انگریزوں کے طعنے سن کر بھی ہمارے سیاسی رہنما کوئی دستور اور نظام حکومت متفقہ تجویز کے طور پر پیش نہیں کر سکے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری سیاسی تحریک دراصل بے بنیاد ہے۔ ہم آزادی چاہتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ اسے کیوں لیا کریں گے۔ ہماری سیاسی زندگی میں ارادہ کو اتنا ہی دخل ہے جتنا کہ ہم اس لئے مجھے تسلیم کر۔

اِس سے ہم کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارا طرز عمل سرسبز غلط ہے۔ ہم اپنی زندگی اور اپنے تخیل میں ایک غلو پیدا کرنا چاہتے ہیں جو فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ ہم مرکزی حکومت میں اختیار چاہتے ہیں جب ہمیں گاؤں میں کوئی اختیار نہیں، ہم قوم کے ارادے اور حوصلے کی قسم کھاتے ہیں جب قوم کے بچاؤ کے فی صدی اسناد ہماری باتوں کو سنتے نہیں اور سنتے بھی ہیں تو سمجھتے نہیں۔

ہماری سیاسی تحریک میں جان اُس وقت پڑے گی جب وہ کان اور مزدور کے گھر سے شروع ہو۔ جب اس کے مقاصد قوم کے مشترک مقاصد ہوں اور فقط ایک تعلیم یافتہ طبقے کی اغراض نہ ہوں لیکن سوا چند سر پھرے نوجوانوں کے ہمارے سیاسی رہنما کان اور مزدور بلکہ ہر طرح کے غریب آدمی سے بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اور ان کا یہ خوف بے جا نہیں ہے۔ اول تو حکومت برطانیہ اُسی وقت تک چشم پوشی کرتی ہے جب تک آزادی اور اختیارات حکومت کی بحث تعلیم یافتہ طبقے کی چسپی بنی رہے۔ کیونکہ مزدور اور کان تک بات پہنچ گئی تو اس کا کام بگڑ جائے گا، دوسرے یہ کہ ہمارے رہنما اور آزادی کے مجاہد مزدوروں اور کانوں کی شرکت سے گھبراتے ہیں، اس لئے کہ پھر دھبی اپنا حق مانگیں گے اور انھیں اُن کا حق دینے پر کوئی تیار نہیں ہے۔

لیکن ہم بہت دنوں تک کانوں اور مزدوروں کو اپنی سیاسی معاشرتی تحریکوں سے بے خبر اور بے تعلق رکھ نہیں سکتے۔ ہمیں اُن کے پاس جانا ہوگا اور کچھ سمجھنے لے کر جانا ہوگا۔ آپ جانتے ہیں چند سال ہوئے ایک اشتراکی پارٹی قائم ہوئی تھی جس وقت کچھ کانگریس کے ساتھ ہے۔ کچھ اس سٹیج پر مگر کھوٹے دنوں میں وہ یقیناً ایک جداگانہ حیثیت اختیار کر لے گی اور اس کے بہرہ منیت نہ اسے تو اس کا اثر کانگریس سے کہیں زیادہ ہوگا۔ آج کل ہماری تعلیم گاہوں کا جائزہ لیا جائے تو بیشتر نوجوان خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، اپنے آپ کو اشتراکی بتائیں گے، اور ان میں سے اکثر مذہب، روایات اور پرانی تہذیب کو مٹانا چاہتے ہوں گے۔ ابھی تک اشتراکی پارٹی اور اشتراکیت پسند نوجوان اپنے عقائد کو اُسی طرح سمجھ نہیں سکے ہیں۔ جب کوئی آزمائش کا موقع آئے گا یا وہ خود ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو ان کی بہت بڑی تعداد اشتراکیت سے توبہ کر کے الگ ہو جائے گی، لیکن اس کا بھی امکان ہے کہ ان میں

تھوڑے سے جان باز پیدا ہو جائیں اور انھیں ذرا بھی ہمت مل گئی تو وہ ایسی آگ لگائیں گے جو پھر کسی کے بجھائے نہ بجھے گی۔ اس وقت ہمارے سیاسی رہبر اشتراکی پارٹی سے مصالحت کرنے میں ناکام میاب ہوئے ہیں اور جب تک وہ ہندوستان کے سرمایہ داروں کا سہارا ڈھونڈتے رہیں گے انھیں مصالحت کی امید رکھنی چاہئے۔ اس طرح سے اشتراکی پارٹی اُن لوگوں کے اثر سے آزاد ہوگئی کہ جو کسی قدر محتاط ہیں۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہماری تسلیم گاہ میں نوجوانوں کو کسی ایسے ڈھرتے پر لگانے سے قاصر ہیں جو اشتراکیت کی طرح اُن کے تخیل کو گرویدہ کر سکے، یا جو اُن کے عقائد میں گہرائی پیدا کر سکے۔ معلوم ہوتا ہے جس طرح ہمارے سیاسی حوصلوں کی کشتی بعنبر ناخدا اور بغیر قطبیا کے چکر کھاتی کناؤں سے ٹکراتی چلی جا رہی ہے اور کوئی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں جا کر ٹہرے گی، ویسے ہی ہماری معاشی اور صنعتی اصلاح بد نظمی اور انتشار کا ایک عبرت انگیز نمونہ ہوگی۔

اس وقت بہت سے مسلمان نوجوان ہیں جو اشتراکیت کے بہت جو شیعیلے حافی ہیں، مگر اُن کے خیالات کا اثر ابھی تک ظاہر نہیں ہوا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مجموعی حیثیت سے مسلمان اشتراکیت کے مسئلے سے واقفیت رکھتے ہیں نہ یکپہی، اس معاملے میں اُن کی غفلت اُن کے اور ہندوستان کے لئے اتنی ہی نقصان دہ ہوگی جتنی کہ اتحاد اور جمہوریت کے مسائل میں، کیونکہ اُن کی فطرت سرشت اور عقائد میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ اشتراکیت کی تحریک کو لاندہ بیت، مشین پرستی اور اخلاقی بے لگائی کی آلالیوں سے پاک کر کے مساوات، انصاف اور حقوق و فرائض کی صحیح تقسیم کا حامل بنائیں۔ اشتراکیت کی تحریک ابتدا میں بس اس کی ایک کوشش تھی کہ مزدوروں کو وہ تمام حقوق دیئے جائیں جو جماعت میں انصاف اور مساوات کے نام سے ہر شخص کے ہونے چاہئیں اور کارخانوں میں اُن پر جو مظالم ہوتے تھے وہ بند ہو جائیں۔ لیکن سرمایہ داری کی اصلاح کا یہ طریقہ بے اثر ثابت ہوا، کیونکہ دوسری طرف سرمایہ داروں کو ہر قسم کے دباؤ سے محفوظ رکھنے کی فکر کی جا رہی تھی اور صنعتی کاروبار کا پسیدانہ بڑھایا جا رہا تھا۔ آخر میں سرمایہ داری کا نظام اس قدر مستحکم ہو گیا کہ وہ ریاستوں کے قابو سے بھی باہر ہو گیا، اور اسی زمانے میں ہزیمت خوردہ اشتراکیت ایک نئے اور جامع

فلسفہ حیات کی صورت لے کر کارل مارکس کی تعلیم میں نمودار ہوئی۔ کارل مارکس کے فلسفے میں سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش انسانی زندگی اور تاریخ کا لب لباب ہے۔ اس میں موجودہ عہد کی سرمایہ داری صنعتی ترقی کی مسئلہ مقصود قرار دی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ ساری دنیا کا صنعتی نظام آخر میں چند سرمایہ داروں کے قبضے میں آجائے گا۔ تب مزدوروں کو اس کا موقع ملے گا کہ وہ صنعتی دنیا کے ان چند بادشاہوں کو معزول کر کے ان کی سلطنت پر قبضہ کر لیں اور حکومت جو ان کا حق ہے اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ کارل مارکس کو یقین تھا کہ اگر مذہب اور مذہبی رہنما ملکیت کے حق کو دینی اور اخلاقی قانون بنا کر اہل سرمایہ کی مدد کرتے اور مزدوروں اور کافروں کو جنت اور روحانی تسلیوں کا فریب دے کر تناعت اور بردباری پر آمادہ نہ کر سکتے تو وہ ہزاروں برس کی غلامی پرگز برداشت نہ کرتے۔ اس وجہ سے کارل مارکس نے لائبرٹیت کو اپنی اشتراکیت کی تعلیم کا سنگ بنیاد بنایا اور یہی سبب سے روسی اشتراکیت جو کارل مارکس کی تعلیم کو عین حقیقت مانتے ہیں مذہب کے وجود کو مٹانا چاہتے ہیں۔

کارل مارکس کے تقریباً تمام نظریے غلط ثابت کئے جا چکے ہیں، اور روس میں بھی ان پر برائے نام عمل ہو رہا ہے لیکن اب وہ ایک مذہب بن گئے ہیں جس کی نہایت جوش اور عقیدت کے ساتھ تبلیغ کی جاتی ہے، اور دنیا میں جہاں کہیں بھی افلاس یا بے چینی ہے وہاں یہ مذہب بہت آسانی کے ساتھ پھیل جاتا ہے، ہم اس کا مقابلہ دسیلوں سے نہیں کر سکتے، اگر ہم اس سے نفرت ظاہر کریں گے اور اس کے پیروؤں پر کسی قسم کا جبر کریں گے تو ان کا عقیدہ اور مضبوط ہو جائے گا۔ اس سے ہم رواداری کی بھی نہیں برت سکتے، کیونکہ وہ خود رواداری کو غلط سمجھتا ہے اور جتنے دوس میں مذہب نیست و نابود کر دیا گیا ہے ویسے ہی ہندوستان میں بھی فنا کر دیا جائے گا۔ مذہب اشتراک کا توڑ صرف ایسی ہتھیاریں ہو سکتی ہیں جو ہمارے ملک کے افلاس کو دور کریں اور کسانوں اور مزدوروں کے لئے شکایت کا موقع نہ رکھیں

صحیح اشتراکیت کے معنی یہ ہیں کہ دولت کی قدر انسان کی قدر سے بڑھنے نہ پائے، اور

اُستراڈ کے حق ملکیت کو محفوظ رکھنے کی خاطر جماعت کے بہت بڑے حصے کو فاقہ کرنے اور طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ اُستراڈ کی نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ زمین اور سرمائے اُستراڈ کی جگہ جماعت کی ملک قرار دیا جائے۔ اور جماعت کے ہر فرد کو اس سے مستفید ہونے کا موقع دیا جائے۔ سرمایے کے استعمال کی ترکیب کیا ہوگی؟ یہ ہر جماعت کی معاشی حالت پر منحصر ہے۔ لیکن یہ ہرگز لازمی نہیں ہے کہ اُستراڈ کی اصولوں پر اُسی وقت عمل کیا جائے جب بڑے پیمانے کی صنعت کا مدراج ہو جائے۔

اگر ہم امریکہ کی مشین سہتی اور روسی اُستراڈ کے قریب میں نہ آئے، اگر ہم نے کسان کے سر مالگذا دی، زمیندار اور سود خوار کا بوجھ ہلکا کر دیا اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو فروغ دے سکے، اگر ہم نے شہروں میں وہی صنعتیں رائج کر دیں جنہوں نے کسی زمانے میں ہندوستان کو تمام دنیا میں مشہور کر دیا تھا، اگر ہم نے اپنے تعلیم یا اُستراڈ طبعی کو ذہنی غلامی سے آزاد کر لیا تو ہم ہندوستان میں بھی بہت جلد ایک اُستراڈ کی نظام قائم کر سکتے ہیں، اور ممکن ہے ہم انتظامات کی خوبی میں روسی اُستراڈ سے بازی لے جائیں۔

مشکل صرف یہ ہے کہ اور ملکوں کی طرح ہندوستان کی اصلاح میں ہم اپنے عقیدے اور ملت کے برا اور کسی سے مدد نہیں مانگ سکتے۔

میں نے یہ بحث اس سوال سے شروع کی تھی کہ ہم ان دشواریوں کو جو کسب معاش میں پیدا ہوئی ہیں کس طرح سے دور کر سکتے ہیں۔ یہ شکل صرف چند اُستراڈ کو نہیں پیش آ رہی ہے بلکہ ہمارے ملک کے بیشتر رنج و غم کو، اور ضرورت اپنی تدبیروں کی ہے جو کم از کم چار نسلوں کے لئے فراغت اور عافیت زندگی بسر کرنے کا سامان کر دیں، یہی خیال سے میں نے موجودہ زمانے کی عالمگیر تحریکیں پر جن سے ہندوستان متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا، نظر ڈالی تھی، اور پھر یہ عرض کیا تھا کہ ہماری کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی جب تک ہم ملک کے اندر پورا اُستراڈ حاصل نہ کر لیں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ دنیا کی اور اپنے ملک کی حالت کو سامنے رکھ کر پھر اس مسئلے پر غور کریں۔

اب تک جو غلطی زیادہ تر نوجوان کرتے آئے ہیں وہ یہ ہے کہ سوا اُن ملازمتوں کے چلا ایک خاص ہنر سیکھے بغیر کام نہیں چلتا انھوں نے اپنی اہلیت اور شوق کا بالکل خیال نہیں کیا، اور اِس لئے آپ کو سب سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ آپ کو کس کام کا شوق ہے یا کس کام کو آپ بغیر اپنی طبیعت پر خاص حشر کئے کر سکتے ہیں۔ یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ آدمی کا بہت کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور اس کا تجربہ کے بعد ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا۔ یہ تجربہ آپ کو بھی کرنا ہے، مگر اسے اس وقت نہ شروع کیجئے جب آپ تسلیم سے فارغ ہو جائیں بلکہ طالب علم کے زمانے کو جہاں تک ہو سکے شوق کا زمانہ بنائیے۔ اِس کی سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ آپ اپنی ذاتی اور قومی ضروریات اور فرائض کو پیش نظر رکھتے طرح طرح کے کاموں میں اپنی استعداد کو آزما کر دیکھیں، ان اوصاف کو پیدا کرنے کی کوشش کیجئے جو کامیابی کے لئے ناگزیر ہیں، اور پھر جب آپ دنیا میں قدم رکھیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ آپ کی منزل مقصود کدھر ہے۔

اس وقت آپ کے دین، آپ کی ملت اور قوم کو جس طرح کی خدمت درکار ہے اِس کی نظر میں اشارہ کر چکا ہوں۔ اِس خدمت کو انجام دینے کے لئے آپ کا لیڈر بننا مفید نہیں ہے، اور یہ اور بھی مضر ہو گا کہ آپ جو کچھ کریں اُسے اسٹار یا جہاد کہیں۔ آپ جو کام اپنے ذمے لیں وہ آپ کا ذریعہ معاش آپ کا شوق اور آپ کے وجود کا دنیاوی مقصد ہونا چاہئے، اور ان تینوں نسبتوں سے آپ کو اِس سے لگاؤ ہونا چاہئے۔ آپ کے تعلیم پانے کا ہرگز یہ نتیجہ نہ ہونا چاہئے کہ آپ پیشوں کے مدارج قائم کریں، اور پسند پیشوں کے سوا اور سب کو احتیاد کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھیں، بلکہ آپ کا نقطہ نظر یہ ہونا چاہئے کہ ناکامیاب قومی لیڈر سے کامیاب گھسیارا بہت زیادہ قابلِ عزت ہوتا ہے۔ اپنا پیشہ منتخب کرتے وقت روشن خیالی، ہصلکت، حوصلے سے کام لیجئے۔ جب ایک مرتبہ آپ انتخاب کر لیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی عزت آئندہ کامیابی میں ہے۔

پیشے کا انتخاب کرتے وقت آپ کو قومی مفاد کا ضرور لحاظ رکھنا چاہئے صرف اِس نیت سے نہیں کہ آپ اپنے دل کو مطمئن رکھ سکیں، بلکہ اِس نیت سے بھی کہ اِس میں آپ کا اور آپ جیسے بہت سے

انسداد کا فائدہ ہے۔ آپ ملازمت کریں تو ایسے اداروں کی کیجئے جو نظام حکومت کے کُل کے پُرنے نہ ہوں، مگر جن کا مقصد قوم کی بہبود ہو جیسے تعلیمی ادارے۔ آپ کو کا معیاری زندگی کا شوق ہو تو کوئی ایسا کام پسند کیجئے جس سے ملک کی پختی دولت میں اضافہ ہو تا ہو۔ اس لئے کہ وہ تجارت جس میں مال ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیا جاتا ہے، کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی جاتی مگر مال پہنچانے والا منافع میں حصہ دار ہو جاتا ہے، دراصل نقصان دہ ہوتی ہے اور سرمایہ داری کی سب سے مضر خصوصیتوں میں سے ہے۔ سب سے اچھا حوصلہ آپ کے لئے یہ ہو گا کہ آپ شہری زندگی کو چھوڑ کر گاؤں میں اپنا گھر بنائیں، وہاں اپنی روشن خیالی، خود داری اور تعمیری حوصلوں کا دیا جلائیں۔ اگر آپ کوئی ہنر سیکھ چکے ہوں تو ان صنعتوں میں جان ڈالیں جن پر گاؤں کی خوش حالی کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اگر کاشتکاری کر سکتے ہوں تو اس میں اصلاح اور جدت کر کے دوسروں کو نئی باتیں بتائیں۔ اس سلسلے میں آپ ایک طرف زمینداروں کو اس پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو لگان وصول کرنے کے ٹھیکے دار نہ سمجھیں بلکہ کاشتکار بن کر زمین پر اپنا حق ثابت کریں۔ دوسری طرف آپ دیہاتی آبادی کو سود خوار کے پنجے سے چھڑانے کی کوشش کر سکتے ہیں جو غالباً اس زمانے کا سب سے اہم اصلاحی کام ہے اور جو اُسی وقت انجام دیا جا سکتا ہے جب آپ گاؤں میں اپنے قدم جائیں اور سود خوار کو جرّے اکھاڑنے کا ہتھیار کر لیں۔ اس زمانے میں گاؤں اور شہر کا سیاسی رشتہ بالکل ٹوٹا ہوا ہے اسے دوبارہ قائم کیجئے، جمہوری حکومت کی راہ دوسم سے تقویت اور لگاؤ پیدا کیجئے، اور اپنے ملک کی سیاسی زندگی کو مستحکم کیجئے۔

لیکن آپ گاؤں میں ہوں یا شہر میں؟ آپ کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ آپ اپنی کامیابی کے ذریعے سے ان اخلاقی اوصاف کا چرچا کریں جن پر آپ کی قوم اور ملت کی فلاح کا انحصار ہے۔ اس وقت ہمارے تمام عیب ہماری مملکت مزاجی ہے۔ آپ کو چاہئے کہ صبر، محنت اور استقلال کا مادہ پیدا کریں اور اپنی ذات نہیں بلکہ اپنے کام اور اپنی کارگزاری کی بدولت بڑے بننے کا حوصلہ کریں۔ مملکت مزاجی کی طرح اگر اہم طلبی اور فضول فرقی مملکتوں کی سرشت میں داخل ہوگئی ہے جس کے سبب سادہ زندگی بلکہ سلامت روی خلاف تہذیب سمجھی جانے لگی ہے۔ بہت سے نوجوان تعلیم اسی لئے حاصل کرتے ہیں کہ

ٹھاٹھ سے رہیں، اور یہ غرض پوری نہ ہو تو ان کے لئے زندگی بے معنی اور بے لُفٹ ہو جاتی ہے۔ سب کچھ کی بے روزگاری بڑی حد تک ایسی ٹھاٹھ سے رہنے اور دھوپ اُڑانے کی عیسائی ہے۔ کیونکہ بڑھاپے کا آرام سب کو اچھا لگتا ہے۔ محنت کی جاں فسخہ ستروں کے چاہنے والے بہت کم ہیں۔ ہماری یہ بری عادتیں دراصل اس طرح پڑی ہیں کہ ہمیں ایک زمانے سے ضبط کی تعلیم نہیں دی جا رہی ہے، اور ہم اپنے اوپر بہت کم احتیاط رہ گیا ہے۔ ہمارا تخیل ہمیں ایک طرف کھینچتا ہے، تو عقیدہ دوسری طرف، ہمارا کام، محنت کا تقاضا کرتا ہے تو شوق اور ہر گدی اور گپ شپ کا۔ ایسی کشش میں ہم کو نہ وقت کا خیال رہتا ہے نہ وعدے کا اور وہی کام جو ہم بچے جوش اور بڑی ہمدوں سے شروع کرتے ہیں، ہمیں مایوس اور بیزار ہو کر چھوڑنا پڑتا ہے۔ لیکن استقلال، سلامت روی اور ضبط قدرتی صفتیں نہیں ہیں، وہ تعلیم و تربیت کے ذریعے سے پیدا کی جاتی ہیں اور آپ کا یہ حوصلہ ہونا چاہئے کہ طالب علمی کے زمانے میں اپنی شخصیت کو ان اوصاف سے آراستہ کریں۔

یہی اوصاف ہیں جو آپ کی اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کے علاوہ آپ کو مذہب اور تہذیب کی خاطر مشینیں سچتی اور لاندہ بیت سے لڑنے میں مدد دیں گے۔ وہ قومیں جن کے عقائد اور معیاریں اُردی زندگی، انصاف اور مساوات کی اتنی قدر نہیں ہے جتنی کہ موجودہ زمانے کی مشین پرست اور لاندہ بیت قومیں کرتی ہیں وہ مقابلے میں ضرور شکست کھائیں گی اور ہماری حالت یہی رہی جو اب ہے تو ہم بھی آہستہ آہستہ مشین پرست اور لاندہ بیت ہو جائیں گے، یہی طرح جیسے انگریزی تعلیم اور انگریزی حکومت کے اثر سے ہم یورپ پرست اور لاندہ بیت ہو گئے ہیں۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ایک نئے، اور ستر اکیت اور سرمایے داری، دونوں کے بہترین نظام معاشرت میں مدد بخونک سکتا ہے، وہی ایسا مذہب ہے جس کے سایے میں ایک نئی تہذیب پرورش پاسکتی ہے، کیونکہ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ مشین سچتی کے نظام حیات اور ستر اکیت کے بہترین عنصر جذب کر لے اور علم عقل اور مادی زندگی کا احترام حقیقت میں مذہبیت اور لاندہ بیت کا جوہر ہے مسلمانوں کے لئے کوئی بُری چیز نہیں ہے۔ اسلام کی سب سے قابل قدر صفت یہ ہے کہ وہ موجودہ زمانے کی تمام ذہنی اور معاشرتی تحریکیوں میں توازن اور ہم آہنگی قائم کر سکتا ہے اور ایک معاشرتی انقلاب کو جو اب

ٹالے نہیں مل سکتا، اور جس کا ہنگامہ قیامت سے کم نہ ہوگا، وہ اقلت اور لشو و نما کی صورت
 دے کر فساد اور خون ریزی سے پاک کر سکتا ہے۔ اسلام سے جی اور ملکی زندگی کو یہ فیض پہنچانا
 مسلمانوں کا فرض منصبی ہے، اور آپ کا مستقبل بہت ہی قابل رشک ہوگا۔ اگر آپ یہ خدمت انجام
 دے سکیں :

غزلیاتِ جوشِ عظیم آبادی

(ہندوستانی کتب خانہ پٹنہ سٹی)

جوشِ علی جوشِ عظیم آبادی بارہویں صدی کے آخر میں پٹنہ کے نادۂ موزگار شاعر گزرے ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے اُن کی بلند ہی فکر، ندرتِ تخیل اور ہمارے عروض کی بہت تعریف کی ہے۔ مسیح بن دہلوی لکھتے ہیں:-

”مردیت ساکن عظیم آباد خوش طینت و نیک اعتقاد، شاعر شیریں کلام صاحب دیوان، از خاصانِ آل دیار است کلامش شاعرانہ است شغفے می گفت کہ او در تالیف تذکرہ مشغول است“ (تذکرہ شعرائے اُردو ص ۷۶) گلشنِ بے خار میں ہے:-

”از تازہ خیالانِ عظیم آباد است شورشِ صاف و بے غش، فکرش دلپذیر و دلکش شیوہ گزیدہ اش و طرزِ پسندیدہ اش پسندیدہ در فنِ عروض بسیار ہمارے دل خواہ داشت۔“

جوشِ کے تذکرہ شعرا کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ دیوان بھی بے ہر نایاب ہے۔ خوش قسمتی سے جوشِ کا نایاب دیوان صوبہ بہار کے مشہور شاعر اور محدث علامہ شوقِ نموی کے کتب خانے میں در علامہ مصروف کے والد مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے۔ ہمارے خیال میں اس کے سوا دیوان جو کہ کا کوئی اور نسخہ کسی کتب خانے میں موجود نہیں ہے۔ یہ نسخہ ۱۲۳۸ھ کا لکھا ہوا ہے۔ آخر کا زیادہ حصہ کم خورہ ہے۔ ۲۷۴ صفحات میں تمام ہوا ہے آخر میں چند باحیال بھی ہیں۔ ہندوستانی کتب خانہ پٹنہ سٹی کے زیرِ اہتمام اس کا انتخاب عنقریب شائع ہو گا۔ چند غزلیں ناظرینِ جامعہ کے لئے ہرِ خدمت ہیں:-

غزلیں

تعلقاتِ جہان سے خبر نہیں رکھتا ہزار شکر کہ میں دروِ سر نہیں رکھتا
توں کے دل میں جگہ کی نہ نالہ نے نہ ہزارِ حیمت یہ نالہ اثر نہیں رکھتا
خفاہوں جان کو دل کھول کھول دوتا ہوں تری گلی میں کسی کا میں ڈر نہیں رکھتا
نہے نصیب کہ دلدار سے ہم اس دل کو ہزار کہتے ہیں رکھنے کو پر نہیں رکھتا
دل و جگر کو تو پوچھے ہے کون لے جو شیش

محض اُس کے میں اپنی حسبِ نہیں رکھتا

اگر منظور ہو لے عشق! دل کو پاک کر دینا تو اسبابِ تعلق کو جلا کر خاک کر دینا
جنوں! فہمیدِ معنی میں تجھے گردِ دستِ قدرت ہو گریبانِ تعلق بے تاقل چاک کر دینا
تجلی تیری یارب برقِ عقل دہوش ہے لیکن مجھے تو روشناسِ شعلہٴ ادراک کر دینا
یہ شیشِ اتواں باقی ہے اب لے چشمِ خولِ گریہ اے بھی بحرِ عنم کا تو شُخْشاںِ خاک کر دینا
اگر جو شیش نہ رود تا ہو ترے دردِ محبت سے

ابھی خشک اس کا دیدہٴ غمتِ اک کر دینا

یادِ کر تیرے لب سے گول کا لے جانِ نمک ڈال دیتے ہیں نئے گلِ رنگ میں مستانِ نمک
کیوں نہ گل کو دیکھ کر گلزار میں آوے ہنسی، مدتوں کھایا ہے تیرا لے لبِ خنداںِ نمک
لے جڑے کانِ ملاحظت کر نہ مرہم کی تلاش یہ تودہ دارِ غِ جگر ہے جس کا ہر دماںِ نمک
آتشِ ددِری میں اُس نے خوار کے لے سوئے عشق بھن چکا ہے چاہتا ہے یہ دلِ بریاںِ نمک
یہ تودہ زخمِ جگر ہے آہ جس کو دیکھ کر مرہم زنگارِ حیراں ہووے اور گریاںِ نمک
تیرا لبِ جانِ بخش ہے اور وہ مددگارِ حیات تیرے آگے ب رکھے ہے چشمِ حیوانِ نمک

ہونٹ اب تک چاٹتا ہے دیکھ جو شیشِ زخمِ دل
آہ کیا رکھتا تھا اُس کے تیرے کا پیکاںِ نمک

دل میں بھری ہے آگ اور آنکھوں میں آبیے
 دل سے ترے جو اشک نہ آئے عجب نہیں
 دل کس طرح چمن میں لگے آج باغبان
 غافل کر اُس کی سیر تو عسکر کی چشم سے
 خالی سیہ نہ ہووے یہ رخسارِ یار پر
 عالم خراب ہووے جو وہ بے حجاب ہو
 لذت ہے خاکِ عشق کی پیری میں ہم دہا
 اِس میکدے میں کون ہو ساقی سے ملتی

دیکھا ہے جبے زلف کو شانے کے ہاتھ میں

جوشش ہمارے دل کو عجب پیچ دتا ہے

شیخ کو کبے سے جو مقصود ہے
 میرے جلنے کی کسی کو کیا خبر
 سوزشِ دل آتشِ بے دود ہے
 سنا نہ دل ہی مرا سجد ہے
 خود ایاز اور آپ ہی محمود ہے
 سب میں وہ شاہدِ مرا شہود ہے
 اُس کا جو مخلوق ہر معبود ہے
 آہ ہے یا غنمہ داؤد ہے
 سنگِ داہن کو یہ کرتی ہے گلاز

کس سے آگِ جوشش کہوں میں دردِ دل

میرے اُس کے بولنا مفقود ہے

ریشن ہوا یہ خانہ دل اُس کے نور سے
 آئینِ عاشقی میں ترقی کی آرزو سے
 موٹی ہمیں غرض نہیں کچھ کوہِ طور سے
 رہتی ہر میکہ عجز کو اُس کے غرور سے

اے غافلو یہ زندگی ناپائدار ہے باور نہ ہو تو پوچھ لو اہلِ فتور سے
 نقشِ تصویر اپنے بدن پر ہے پیرہن سجا بیکے دکام نہ مطلبِ سمور سے
 جزوِ اشک کون دھو دے مے نہ کر دغم غربت زدہ ہوں آتا ہوں میں راہِ دور سے
 آپ ہی میں جل بجھوں گا سحر تک بزرگِ شمع بجھ کو اٹھانہ دیکھو اپنے حضور سے
 پھنس جائے گا تو دامِ تعلق میں یک بیک
 جوشش نہ تھی امید یہ تیرے شور سے

اِس آدا کا ہوں تیری دیوانہ دیکھنا مجھ کو اور چھپ جانا
 کیوں نہ صد چاک ہوئے دل میرا ہاتھ ڈالے ہے زلف پر شانہ
 شعلہ ردِ تجھ پہ کیوں نہ ہوں صدفِ شمع پر جل مرے ہے پروانہ
 ہوں وہ دیوانہ ناصحو جس کو ننگ ہے چاک جیبِ سلوانا
 یا رعنیرِ دل سے کس قدر کا ربط اور عاشق کو دیکھ شرمنا
 آج ہے جاں بلبِ ترا جوشش
 جی میں آدے ترے تو احسانا

افکار پریشان

خدا کی سب سے بڑی طاقت سبکِ رُونسیم ہے ،
تیز و متند طوفان نہیں !

آفتاب کا لباس نورِ محض ہے ،
بدلیاں رنگا رنگ پوشاک پہنتی ہیں ۔

اگر ماہتاب کے لئے آنسو بہاتے ہو ،
تو ستاروں کو بھی نہ دیکھ سکو گے !

اُس کا پیارا چہرہ میرے خواب میں اِس طرح آتا ہے
جیسے رات کی بارش !

ہم نے خواب دیکھا کہ ہم اجنبی ہیں !
ہم جاگ اُٹھے اور دیکھا کہ ایک دوسرے کے پیارے ہیں !

عزمِ میرے دل میں اِس طرح آرام سے سو رہا ہے ،
جیسے شام خاموش درختوں میں ۔

اے سمندر تیری گفتگو کیا ہے؟
دائمی سوال۔

اے آسمان تیرا جواب کیا ہے؟
دائمی خاموشی۔

زندگی کو بہار کے پھولوں کی طرح کھلنے دو !
اور موت کو حسنا کی پتیوں کی طرح مڑ جانے دو !

جڑیں شاخیں ہیں، زمین میں پھیلی ہوئی
شاخیں جڑیں ہیں، ہوا میں چھائی ہوئی۔

دنیا آرزو بھرے دل کے تاروں پر دوڑتی ہے،
اور اس سے عزم کے سر نکلتے ہیں۔

پانی میں ٹھپلی خاموش ہے۔
زمین پر حب اور شور کرتے ہیں۔
ہوا میں چٹریاں گاتی ہیں۔
لیکن انسان میں،
سمندر کی خاموشی، زمین کا شور اور ہوا کا غم
سبھی کچھ ہے !

ننھی کلی کھل کر پھول بن جاتی ہے اور چپٹا اٹھتی ہے :
 ”سپاری دُنیا! جلدی سے ختم نہ ہو جانا!“

پانی کی چٹریوں اور موجوں کی طرح
 ہم کچھ دیر ساتھ رہتے ہیں
 چٹریاں اُڑ جاتی ہیں، موجیں بڑھ جاتی ہیں،
 ہم ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں !

پرندے کی متنا ہے کہ وہ بادل ہو جائے !
 بادل کو حسرت ہے کہ پرندہ نہ ہوا۔ !

آج صبح میں کھڑکی میں بیٹھا دیکھ رہا ہوں
 دُنیا مسافر کی طرح آتی ہے
 ردا روی میں سلام کرتی ہے اور چلی جاتی ہے !

مُذا بڑی سلطنتوں سے اُکتا جاتا ہے،
 لیکن ننھے پھولوں سے نہیں !

ہر بگبگ یہ پیغام لے کر آتا ہے کہ :
 ”مُذا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا !“

ہتی پھول ہو جاتی ہے جب محبت کرتی ہے!
پھول پھل ہو جاتا ہے جب عبادت کرتا ہے!

دنیا عاشق کے سامنے لامحدودیت کا نقاب اٹھا دیتی ہے
اور اتنی مختصر رہ جاتی ہے جیسے ایک گیت یا ابدیت کا ایک بوسہ۔

یہ دنیا کے آنسو ہیں جو اُس کے تہن کو رنگین بنائے رکھتے ہیں

میری آرزوئیں نادان ہیں میرے مالک!
وہ تیرے گیت کے بیچ میں نغمہ یاد کرنے لگتی ہیں،
تو گائے جا اور مجھے سُننے دے!

سدا ہم سے پھولوں کا شکر یہ چاہتا ہے،
زمین اور سورج کا نہیں!

روشنی جو ایک ننگے بچے کی طرح خوش خوش سبز پٹیوں میں کھلتی ہے
نہیں جانتی کہ انسان جھوٹ بھی بول سکتا ہے!

حُسن! اپنی حقیقت کو محبت میں تلاش کر!
آئینے کے خوشامدائے عکس میں مت دیکھ!

اے خدا تیرا شکر !
 کہ میں طاقت کی پہیوں میں سے نہیں ،
 بلکہ اس مخلوق میں سے ہوں جو اس سے کچلے جاتے ہیں !

تمہارا بت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر خاک میں مل گیا اور ثابت کر گیا کہ
 خدا کی پیدا کی ہوئی خاک تمہارے بُت سے ارفع ہے !

زندگی ہمیں دی جاتی ہے —
 ہم ہی کو دے کر اسے حاصل کرتے ہیں !

شیشے کا جھاڑ مٹی کے چراغ کو جھڑکتا ہے کہ مجھے بھائی کہہ کر نہ پکار ۔
 چاند نکل آتا ہے اور شیشے کا جھاڑ شرمانی ہوئی مسکراہٹ کی پکار اٹھتا ہے ؛
 میرے پیارے بھائی !

میرے دل ان سرگوشیوں کو سن جن کے ذریعے دنیا تجھ سے اظہارِ محبت
 کر رہی ہے ! ...

حیدر علی

تمہید

اٹھارھویں صدی کا نصف آخر ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک تیرہ و مار
 وقف ہے، اس وقت ہندوستان میں طوالت الملوک کا دور دورہ تھا۔ ہمالیہ سے لے کر
 راس کماری تک لوٹ مار، غارت گری کا حشر برپا تھا، سیاسی بنظیروں، آئے دن کے
 انقلابات اور جنگ و جدل سے ملک سے امن و امان اٹھ گیا تھا۔ فضائے سیاست پر
 حادثات کی سیاہ گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اسلامی ہند کی عظمت و جبروت افسانہ ہو کر
 رہ گئی تھی۔ ہندوستان کا عصاے جہاں بانی ایسے ہاتھوں میں آ گیا تھا جو اس کے بوجھ سے
 کانپ رہے تھے۔ سلطنت کی شمع عبرت پسند حکمرانوں کے محلات میں ٹٹما رہی تھی شیر شاہ
 سوری اور اکبر کے پرشکوہ زمانے داستانِ پارینہ، شاہ جہاں اور عالم گیر کے قرونِ قبائل
 خواب و خیال ہو گئے تھے، سلطنتِ مغلیہ کی نبضیں سُست پڑ گئی تھیں۔ جنگِ صد سالہ میں
 فرانس کی حالت ہر چند بہت سقیم ہو گئی تھی اور عوامِ اناس کا میابی سے بالکل مایوس ہو چکے تھے
 تاہم حکمران طبقے کے دل میں حب وطن کی آتشِ مردہ کا ایک شعلہ رہا تھا، اور بادشاہ کی
 ذات کو آفتابِ امید خیال کیا جاتا تھا۔ برخلاف اس کے سلطنتِ مغلیہ کی تباہی تدریجی ہوئی، مگر
 قطعی ہوئی صرت یہی نہیں تھا کہ بیرونی حملوں کا مقابلہ کرنے والے طبقات بالکل فنا ہو گئے ہوں
 بلکہ یہ صیبت تھی کہ بیرونی حملہ آوروں کے چلے جانے کے بعد جسمِ سیاست کے زخموں کا لہو
 بند کرنے والوں کا وجود بھی نہیں رہا تھا۔ سلطنت کی حالت ایک فرش کی سی تھی۔ ملکوں اور غیر ملکوں
 کی لڑائی، جیل کوئل کی لڑائی تھی جو ایک دوسرے کی نوچ کھسوٹ سے فرصت پاتے ہی اس فرش کی

بوٹیاں نوچنے لگتے تھے۔ یہ نظارہ کیا کم عبرت انگیز اور حسرت خیز نہ تھا کہ ایسی وسیع ادھرہ آفاق سلطنت ایک جسمِ مُردہ کی طرح لٹکے پاؤں پھیلائے پڑی ہو اور چیل کوٹے اُس کی بوٹیاں نوچنے کے لئے لڑتے ہوں۔ گو یہ ضرور ہوتا تھا کہ کبھی کبھی امید کے کچھ آثار پیدا ہو جاتے تھے اور اتفاقاً کسی حکمران کی غیر معمولی استعداد سے کچھ توانائی بھی عود کرتی تھی۔ لیکن ازالہ مرض نہ ہونے کی وجہ سے یہ ہیئتِ مجموعی مستقل حالت دسدھری تھی نہ سدھری۔ دوسری طرف انگریز سوداگر جو آبِ نمک چپ چاپ اپنے بیو پار میں لگے ہوئے تھے جنہیں اہل ہند کے ساتھ نعرہ آزمانی کرنے کی جسارت نہیں ہوتی تھی اپنی تجارتی کوٹھیوں سے نکل نکل کر ممالک ہند میں داخل ہونے لگے اور یا ہی عداوتوں سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کی رہی رہی ریاستوں کو تباہ و برباد کرنا شروع کر دیا۔ برطانویوں میں قسمت نے ہمیشہ انگریزوں کا ساتھ دیا اور آسمند کار دہی چند سوداگر جو تجارت کی اجازت کے لئے معمولی حکام کی دربار داری کیا کرتے تھے کشورِ ہندوستان پر قبضہ جانے کی فکر کرنے لگے۔

ایسے نازک دور میں قدرت نے ہمیں ایک اور سنہری موقع عنایت فرمایا۔ اُس نے ایک اولوالعزم جان باز سپاہی جس کی رگوں میں سپہگداز خون دوڑ رہا تھا اور جس کے دل میں اولوالعزمی اور ناموسی کے جذبات موجبِ محبتِ حق میدان میں لا کھڑا کیا، جنوبی ہندوستان کے بس نامور ہیرو نے جسے آج جنوبی ہند کا بچہ بچہ حیدر علی کے نام سے نہیں بلکہ بہادر کے لقب سے یاد کرتا ہے اپنی بہادری، استقلال، اولوالعزمی اور عزمِ باحزم سے اپنے آپ کو ایک سپاہی کے درجے سے اعلیٰ ترین عہدے تک پہنچا دیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُس نے اپنی زبردست قوتِ لادائی استقلال، جرأت اور لاثانی حکمتِ علی سے تاج و تخت چل کر لیا۔ اُس کی جنگی تدابیر اور اس کی کشمکشِ آبدار نے ایک طرف اگر مرہٹوں کے ملک اور نظامِ حیدرآباد کے قصر شاہی میں زلزلے ڈال دیئے تو دوسری طرف نواب کرناٹک اور انگریزوں کے گھروں میں صفتِ ماتم بکھا دی۔ اس نے جنوبی ہندوستان میں شاہانِ مغلیہ کی حسرت و طحال کی یاد تازہ کر دی، وہ ایسا زبردست اور عالی دماغ حکمران تھا جس کے

مد مقابل تاریخ میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ اس کا بے پناہ عزم و استقلال، اس کے شجاعانہ کارنامے، اس کی مذہبی بے تقصی اور رواداری ایسی صفات ہیں جن کی بدولت اس کا نام دنیا میں اس آب و تاب کے ساتھ قائم رہے گا جیسے عالم بالا پر نجوم روشن ہیں۔ وہ جنوبی ہندوستان کا بیدار مغز، بالغ نظر اور غیور حکمران تھا۔ اس کی فطرت زندگی کے روشن نقوش کے ساتھ ساتھ پلمی تھی اور وہ اس فلسفے کی عملی صورت کا قائل تھا کہ زندگی اور عزت کی زندگی صرف بہادروں کا حق ہے اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جنوبی ہند کے اس نامور ہیرو نے ایسے وقت میں جب ریاست میسور کی آزادی معرض خطر میں تھی اپنے ہم وطنوں کو زندگی کا پیغام دیا۔ حیدر علی مرہٹوں کے خلاف نہ تھا، نظام کی سلطنت اور استدار پر رشک نہیں کرتا تھا، فرانسیزیوں کے لئے خطرناک نہ تھا اور اس کے فلسفہ سیاست میں انگریزوں کے جائز مفاد کے لئے بھی گنجائش تھی۔ اس کا پیغام زندگی کا پیغام تھا اور اس کا مفاد صرف یہ تھا کہ ریاست کے باشندے اپنے گرد و پیش کے حالات کو دیکھیں سمجھتی اور تنظیم کے ساتھ دنیا کو یہ یقین دلا دیں کہ وہ زندہ ہیں، انھیں اپنی ریاست سے محبت ہے۔

حیدر علی کے ابتدائی حالات

حیدر علی ۱۷۲۲ء میں بمقام بودی کوٹ پیدا ہوا، بودی کوٹ ایک چھوٹا سا قریہ ہے جو ضلع کولاریں واقع ہے۔ حیدر علی کے والد شیخ فتح محمد سرائے کے صوبے دار تھے اس لئے اس کا عہد طفلی نہایت آرام و آسائش سے گزرا۔ مگر یکایک زمانے نے پلٹا کھایا اور اس کا ستارہ گردش میں آگیا۔ اس نامور ہیرو کی عمر قریب پانچ ہی سال کی تھی کہ باپ کا سایہ سحر اٹھ گیا جس کی خوش قسمتی کہنے کے مین موقع پر اس کے چچا زاد بھائی حیدر نے اس کی مدد کی اور اس غامدان کو اپنے پاس سرنگا پٹم بلا لیا، حیدر نے اس زمانے کی طرز معاشرت کے مطابق حیدر علی کی تعلیم و تربیت شروع کر دی اور دستور کے مطابق بچائے کسی مدرسے میں بٹھانے کے لئے فنون جنگ کی تعلیم دی جانے لگی اور چند ہی سال میں یہ یتیم بچہ اس وقت کے فن سپہ گری میں خاص ماہر ہو گیا، جس وقت حیدر علی

بڑا ہوا تو حیدر صاحب نے اُس کی ملاقات سندراج وزیر میسور سے کرائی۔ اس نے حیدر علی کو فوج کے ایک چھوٹے سے دستے پر مقرر کر کے سرنگا پٹم ہی میں رکھ لیا۔ سندراج کو اس کی کیا خبر تھی کہ یہ کچھ جوا یک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اپنے عزم و استقلال سے تختِ میسور پر قابض ہو کر کل جنوبی ہندوستان پر حیدری جھنڈا لہرائے گا۔ اور اُس کی شہرت ہندوستان سے کل کفرانس اور انگلستان کی نیشنل فاہرہ تک پہنچے گی اور اس کی تلوار کی جھنکار ہندوستان کی ریاستوں اور سلطنتوں میں تو ایک طرف سات سمندر پار انگلستان کے سر بٹنگ ایوانوں میں زلزلہ ڈال دے گی۔ حیدر علی نے سرنگا پٹم میں وہ سلامت لدی اور حوزہ داری اختیار کی کہ ہر شخص اس کا گردیدہ ہو گیا اور وہ اپنی نمایاں قابلیت کی وجہ سے تھوڑے ہی دنوں بعد باڈی گاڑ کا افسر مقرر ہو گیا اور اس کے بعد سے حیدر علی نے بہت جلد ترقی کی ۱۷۵۷ء میں ریاست میسور کے علاقہ پائیں گھاٹ میں بغاوت ہوئی۔ وزیر سندراج حیدر علی کو ساتھ لے کر اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ ان معرکوں میں حیدر علی سے ایسے ایسے کارنامے عمل میں آئے اور اُس نے اپنی بہادری، استقلال، اولوالعزمی، شجاعت اور جسالت کی دھاک کچھ اس طرح دشمنوں کے دلوں پر بٹھادی کہ وزیر میسور نے اس کو گورنر ڈنڈا بھی مقرر کر دیا اور اس کے منصب کو ترقی دے کر چار ہزار سپاہی اور ڈیڑھ ہزار سواروں کا افسر مقرر کر دیا۔ نیز اس زمانے کے رواج کے مطابق حیدر علی کو اپنی خاص فوج بھرتی کرنے کا حکم بھی ملا۔ اس کے بعد وہ مختلف مقامات پر شورشوں کو منسوخ کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ اُس نے نازک موقعوں پر اپنے راجہ اور محسن و مربی وزیر سندراج کی مدد کی اور آخر کار ان کے دشمنوں کا صفایا کر دیا۔ حیدر علی کے ان کارنامے نمایاں کو دیکھ کر راجہ بہت خوش ہوا۔ ۱۷۵۷ء میں اُس کو سہ سالار افواج میسور کے عہدے پر ترقی ملی گئی اور اُس کو کابل خستیاات دے دئے گئے کہ مرہٹوں سے جس طرح چاہے معاملہ طے کرے۔ اس نے بجائے صلح کرنے کے اُن سے مقابلہ ہی کرنا مناسب سمجھا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں اُس نے اپنے حریفوں پر نمایاں فتح و کامیابی حاصل کر لی۔ راجہ ان کامیابیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس نے حیدر علی کو فتح حیدر شاہ کا خطاب دیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد حیدر علی نے ایک اور اہم کام انجام دیا جس سے راجہ بہت خوش ہوا

اس نے راجہ کے اشارے پر نہایت آسانی اور لطافت اکیل سے متدرج سے استناد وزارت لے کر راجہ کے حوالے کر دی اور اس کا نگہداری کے صلے میں راجہ نے فرزندِ حبیب کا خطاب حیدر علی کو عطا کیا۔ اسی درمیان میں بسالت جنگ نظام حیدر آباد نے میلان پانی پت میں مرہٹوں کی شکست کا حال سن کر صوبہ سرا فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ سراسر اس وقت مرہٹوں کے قبضے میں تھا۔ چنانچہ بسالت جنگ نے قلعہ ہو سکوتہ کا محاصرہ کیا۔ لیکن اس محاصرے نے نہایت طول کھینچا۔ بسالت جنگ نے حیدر علی سے امداد طلب کی۔ چنانچہ حیدر علی اور بسالت جنگ میں ایک معاہدہ ہوا جس میں یہ طے پایا کہ ہو سکوتہ اور اس کے مصنفات حیدر علی کو ملیں گے، بسالت جنگ دربارِ دہلی میں صوبہ داری سرا کے لئے حیدر علی کی سفارش کرے گا۔ قلعہ گرم کنڈہ جو اب تک حیدر آباد کے ماتحت رہا تھا آئندہ حیدر علی کی ملکیت ہوگی۔ چنانچہ حیدر علی کی جزا فوجوں نے چند ہی دنوں میں ہو سکوتہ فتح کر لیا اور بوجہ یہ ہو سکوتہ، اس کے مصنفات اور قلعہ گرم کنڈہ حیدر علی کو ملا، شہنشاہ ہند کا سفیر حیدر علی کے نام فرمان صوبہ داری سرا لے کر آیا اور اس کے ساتھ شہنشاہ کی جانب سے شیشہ مرغ کا، پانچ جواہر نگار اور نقارہ و نشان مع خطاب نواب عنایت ہوئے۔ اس کے بعد حیدر علی نے مرگ سرا، مدگیری ایں نگر اور سرا پر قبضہ کر لیا۔ اور اس طرح تقریباً تمام صوبہ سرا کا مالک ہو گیا۔

سلسلہ میں جب فرانسیسیوں کی مدد کے لئے افواج حیدر علی پانڈیچھی گئی ہوئی تھی کھانڈک ماؤ راجہ اور رانیوں نے سازش کی کہ متدرج کی طرح حیدر علی کو معزول کر دینا چاہئے۔ چنانچہ دربارِ پونا کو ایک خط لکھ کر مدد طلب کی گئی۔ میدانِ خالی پاگرداں سے ایک فوج روانہ ہو گئی۔ حیدر علی کو اس کی مطلق خبر نہ تھی۔ اسے اس وقت معلوم ہوا جب فوج سرنگاپٹن کے قریب آپہنچی۔ حیدر علی نے اپنے دوستوں سے مشورہ کرنے کے بعد رات کو ندر ہونے کا ارادہ کر لیا جس وقت رات زیادہ ہوئی وہ اپنے گھر سے نکلا اور سیدھا دریائے کا دیری پہنچا۔ بہت کر کے دریا میں کود پڑا اور پار نکل گیا اور صرت بس گھٹنے کو عرصے میں بنگلور پہنچ گیا۔ جہاں اس کی فوج کا ایک حصہ موجود تھا۔ ادھر راجہ میسور وزیر کھانڈکے راؤ اور مرہٹہ سرداروں نے بنگلور کی طرف کوچ کیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ یہاں اس کا محاصرہ کر کے ہم اس کو

گرفتار کر لیں گے۔ حیدر علی بھی تیار ہو چکا تھا۔ اس نے قلعہ سے نکل کر ایسا زبردست حملہ کیا کہ راجہ کی فوج سخت نقصان اٹھانے کے بعد منتشر ہو گئی اور جب اس شکست فاش کی خبر سرنگا بٹن سہی تو محل میں کہرام مچ گیا۔ مہلات حیدری میں میدان جنگ کی جو تصویر مصنف حملات حیدری نے کھینچی ہے اس کا ایک حصہ مصنف سلطنتِ خداداد نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے جو کجمنہ نقل کیا جاتا ہے :-

دونوں جہا بھارت دلیں جیسے سادوں بھا دول کے گھنگھور بادل چاروں طرف سے اٹھتے ہیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں۔ پہلے تو دوسرے گولیاں اور گولے اولے کی طرح دونوں طرف سے برسنے لگے۔ جب دونوں فوجیں لڑتے لڑتے نزدیک آئیں تب تو تیغ و تبر، خنجر، جدرہ، پستول، طینچہ، بھالے، برہمی بوجھیاں چلی تھیں اور لہو کی بھوہاریں اٹھتی تھیں۔ ایک لمحہ میں خون کی ندیاں اور نالے بہنے لگے اور ہاتھی گھوڑے، اونٹ، گاؤ، بکھرے کی مانند نظر آتے۔ فیلوں کے سرمباب کی مانند تیرتے پھرتے تھے۔ آخر کار نواب رستم شوکت ہندوستان صولت نے راجہ میسور کے لشکر کو ہزیمت دی،

اس واقعے کی اطلاع جب نند راج کو ہوئی تو اس نے ایسا جی سپہ سالار مرہٹہ فوج کو جو اس وقت سرنگ پٹن میں تھا ایک خط لکھا جس میں راجہ اور کھانڈے راؤ کی سازشوں کا پورا حال درج تھا جو ان دونوں نے نند راج کے ساتھ روکھی تھیں اس خط کو دیکھتے ہی ایسا جی نے حیدر علی کو خط لکھا کہ اگر وہ اخراجات جنگ ادا کرے تو مرہٹہ فوج واپس چلی جائے گی۔ حیدر علی نے روپیہ کے عوض بارہ لاکھ علاقہ انھیں دے دیا اور مرہٹہ فوج واپس چلی گئی۔ اس اثناء میں حیدر علی کی وہ فوج بھی واپس آگئی تھی جو پانڈی چیری گئی ہوئی تھی۔ اس نے اس وقت یہی مناسب سمجھا کہ جس طرح ہو سکے سرنگ پٹن پر قبضہ کر لے چنانچہ اس نے نند راج سے مشورہ کرنے کے بعد سرنگ پٹن پر حملہ کر دیا اور اسے نہایت آسانی سے فتح کر لیا۔ دوسرے دن حیدر علی نے راجہ کی مدد کے لئے چند تالاف بھیجے اور باریابی کی اجازت چاہی۔ بعد ازاں چند منتخب سردار محل کے اندر گئے اور راجہ سے مطالبہ کیا گیا کہ انتظامِ ریاست حیدر علی کو تفویض کر دے۔

چنانچہ حیدر علی نے راجہ کے مصارف کا انتظام کر کے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ وہ آج سے حکمران میسور ہے۔

حیدر علی نے ۱۷۶۳ء میں صوبہ سرائے کے انتظام سے فارغ ہو کر بالا پور خند اور تندی گرھ کی طرف توجہ کی۔ یہاں کے راجہ سے ایک سخت مقابلہ ہوا اور آخر کار راجہ نے اپنے آپ کو حیدر علی کے پرزہ کر دیا اور تندی پر بدر الزمان خان کو بطور قلعہ دار مقرر کر دیا گیا۔ بالا پور اور تندی گرھ کی فتح سے فارغ ہو کر نواب حیدر علی سرائے میں مقیم تھا کہ بدلوں کا ایک جائز وارث آکر طالب داد ہوا اور اس نے نواب سرائے کی کدوہ غاصبوں سے اس کی سلطنت چھین کر جائز وارث کے سپرد کر دی۔ نواب نے اس کی درخواست کو قبول کر لیا اور بدلوں کی فتح کر کے اس کے جائز وارث کے حوالے کر دیا۔ یہاں سے منگھور فتح کرنے کی غرض سے آگے بڑھا اور کچھ عرصے میں اس نے منگھور فتح کر لیا۔ وہاں سے واپس ہوا تھا کہ اس کے مارنے کے لئے بدلوں میں ایک سازش کی گئی مگر نواب کو عین وقت پر اس کی اطلاع ہو گئی اور اس نے رانی اور اس بہن کو جو اس سازش میں شریک تھے گرفتار کر کے قتل کر دیا اور ملک پر نواب کا قبضہ ہو گیا۔ نواب حیدر علی کو یہاں اس قدر خزانہ ملا کہ جس کا اندازہ بارہ کروڑ روپیہ کیا جاتا ہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ راجہ علی امیر البحر کی درخواست پر ملیبار کی طرف روانہ ہوا، ملیبار ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل پر ایک ندرین خطہ تھا یہاں مسلمان عرب تاجر کثرت سے آباد تھے مگر وہ اپنے ہمسایوں کی روز بروز کی لڑائی سے تنگ آ گئے تھے چنانچہ حیدر علی جب ایک چارلشکر کے ساتھ ملیبار پہنچا ہے تو نائروں نے اس کے مقابلے کے لئے ایک فوج جمع کی۔ کنانور کے قریب ایک ندی کے کنارے جنگ ہوئی جس میں حیدر علی کو فتح حاصل ہوئی۔ یہاں سے حیدر علی کالی کٹ روانہ ہوا اور نہایت آسانی سے اس پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے زامن نے اپنے غلہ میں آگ لگا دی اور جل کر مر گیا۔ اس خبیثہ کو سستے ہی نائروں نے کالی کٹ پر حملہ کیا مگر یہاں بھی انھیں شکست ہوئی۔ اسی اشتہار میں باتش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نواب حیدر نے یہ سوچا کہ اگر ملیبار میں مقیم رہیں گے تو فوج کو سخت نقصان پہنچے گا اس لئے وہ کوئٹہ کی طرف روانہ ہو گیا، نائروں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور پھر ایک لشکر جمع کر کے پنپانی کے مقام پر حیدر علی کا مقابلہ کیا۔ یہاں مقابلہ سخت ہوا مگر

ایک شدید جنگ کے بعد نائوں کو فاش شکست نصیب ہوئی۔ اسی اثنا میں مرہٹوں نے بدو پرتھو کر لیا تھا۔ جب حیدر علی کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے ایک فوج اُدھر روانہ کی مگر اس فوج کے پہنچنے سے قبل ہی مرہٹے بارش کی کثرت کی وجہ سے واپس جا چکے تھے۔ جس وقت مرہٹوں نے بدو پرتھو کر لیا تھا تو نواب شاہ نور نے اُن کی مدد کی تھی۔ لہٰذا حیدر علی نے اُن کا صفایا کر دینا ہی مناسب سمجھا۔ چنانچہ اُس نے شاہ نور پر حملہ کیا اور اُن کی افغان فوجوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ وہاں کے نواب نے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی جسے نواب حیدر علی نے منظور کر لیا۔

مرہٹوں کا میسور پر حملہ

ہم پہلے اس کا ذکر کر چکے ہیں کہ نواب حیدر علی نے ایسا جی کو بارہ محل کا علاقہ تفویض کر دیا تھا مگر حبیب ایسا جی بارہ محل پہنچا تو وہاں کے حیدر علی قلعہ داروں نے قلعہ جات حوالہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اُس وقت تو ایسا جی واپس چلا آیا مگر حبیب مادھو راؤ پیشوا ہوا اور اُس نے حیدر علی کے روز افزوں اقتدار کا حال سنا تو اُس نے بارہ محل لینے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ وہ ایک لاکھ سوار۔ ۶۰ ہزار پیادے پچاس ہزار تیراٹاں اور ایک ہزار توپ خانہ لے کر روانہ ہوا۔ راستے میں اُس نے شاہ نور پتلدار گائے سرا امداد گیری کو نہایت آسانی سے فتح کر لیا۔ حیدر علی نے جب یہ خبر سنی تو اُسے فکر ہوئی کہ کس طرح اس کا مقابلہ کیا جائے۔ اس نے سواروں کے ایک دستہ کو حکم دیا کہ وہ صحرائے ماگرہی میں چھپ کر مرہٹی فوج پر شبخیز مارا کریں۔ گری فتح کرنے کے بعد مادھو راؤ قلعہ ماگرہی کی طرف بڑھا یہاں کے حاکم سردار خاں نے نہایت شجاعت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ مگر آخر کار اُس کے تمام سپاہی لڑتے لڑتے مر گئے۔ اور وہ خود زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا۔ اس عرصے میں حیدر علی فوج نے جو جنگ میں چھپی ہوئی تھی کئی مرتبہ شبخیز مارا مگر اس سے کیا ہو سکتا تھا۔ اسے حیدر علی کا ماگرہی پر قبضہ ہو گیا۔ یہاں سے بالا پور، کراپہ، کولار، گرم کندہ پر قبضہ کرتا ہوا، مادھو سرنگاپٹم کی طرف بڑھا اس نے اپنا صدر مقام چیتامنی کو مقرر کر کے ایک بھاری توپ خانہ اور پچاس ہزار فوج سرنگاپٹم کی طرف

روانہ کی۔ ادھر حیدر علی پریشان تھا۔ ایسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت حیدری کوئی دم کی جہان ہے۔ مگر اس نے اپنی خداداد دلیری سے کام لے کر ناگڑی کے جنگل میں اس فوج کا انتظار کیا جس وقت نصف شب گزری تو اس نے اس فوج پر شبخون ملا اور یہ حملہ کچھ اس غضب کا تھا کہ قریب قریب کل مرہٹے کٹ گئے اور جو بچے بھاگ سکے۔ دوسری طرف مرہٹی فوج کا ایک چھوٹا دستہ بار اعل پر چڑھ رہا تھا۔ اس پر بھی حیدری فوج نے شبخون مار کر اس کو واپسی پر مجبور کر دیا۔ مادھوراؤ کو صوبہ ان دونوں شکستوں کی خبر پہنچی تو وہ حیدر ان کا کیا کرے۔ ایک جانب اس کی غیرت قبول نہیں کرتی تھی کہ شکست کھا کر واپس جائے، دوسری طرف فوج کی کمی آگے بڑھنے سے مانع تھی۔ اس موقع سے حیدر علی نے فائدہ اٹھا کر سات لاکھ روپیہ مادھوراؤ کے پاس بھیجے اور پچاس لاکھ دینے کا وعدہ کیا۔ مادھوراؤ نے اسے ایک خداداد فتح خیال کرتے ہوئے پونا کی طرف کوچ کر دیا۔

انوکھا ظلم

(یہ زمانہ حال کے مشہور ترکی النشا پر دان عمر سمیع الدین کا افسانہ ہے جس کا ترجمہ انگریزی میں خالدہ خانم صاحبہ کی ایک عزیزہ بلقیس خانم صاحبہ نے کیا ہے۔ ہم ان دلفریں خواتین کے شکر گزار ہیں کہ ان کی عنایت سے یہ رسالہ جامعہ کو اشاعت کے لئے حاصل ہوا)

نہیں معلوم کیوں شاید یہ سبب ہو کہ میرے باپ دادا پرانے زمانے میں جاگیر دار تھے ، جب کبھی میں بنگاریہ میں گھومتا ہوں تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے آبا و اجداد کے کھیتوں میں گشت لگا رہا ہوں۔ سبز نرسل سے ڈھکی ہوئی چھوٹی نہریں، بے شمار گلاب کے تختے کھیتوں کے گرد کاٹنے دار جھاڑیاں، اوس مکان اور ان کی کٹاواہ برساتیاں، بد وضع گر جاگھر جو بالکل جو کے کھلیان معلوم ہوتے ہیں، خرگھر کسے ہوئے کرایے کے ٹٹو، غور و فکر میں ڈوبے ہوئے خچر، موٹی سفید لطین، غرغملکہ بر چسپہ حتیٰ کہ سیلے کچڑ میں سٹے ہوئے سور۔ سبکے میں خوب مانوس معلوم ہوتا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میں ہمیشہ سے ان موٹی ٹانگوں والی عورتوں سے واقف ہوں جو ندیوں میں کپڑے دھوتی بہتی ہیں، ان بد مزاج لڑکیوں کو جانتا ہوں جو ہر وقت اپنے گھر دل کے سامنے موزے بنتی بہتی ہیں، اور ان دیہاتیوں سے بھی خوب شناسائی رکھتا ہوں جو غروب آفتاب کے وقت جب میدان کی جھاڑیوں کا رنگ گہرا سبز ہو جاتا ہے دفعتاً نمودار ہو کر مجھے سلام کرتے ہیں۔

بنگاریہ میں لیٹنا وہ مقام ہے جسے میں سبک زیادہ پسند کرتا ہوں۔ گزشتہ سال میں وہاں کے چشموں میں غسل کرنے کے لئے گیا ہوا تھا اور میرا دوست کو ششتا آفون میرے ہمراہ تھا شام کے وقت ہم دونوں شہر سے باہر نکل کر ادھر ادھر جبل قدی کیا کرتے تھے اور ان بادلوں کو دیکھتے تھے جو کہ ”کور اودا“ پر کاشن نظر آیا کرتے تھے اور رات کو ہم دینی کو کی سرائے میں شراب

پاک اور تاش کھیل کر گذارتے تھے۔ اسی پرانی سرائے کے زیریں حصے میں ایک قدیم طرز کا بڑا کمرہ تھا ہر اتوار کو مشہور شرابی جو سات سات بوتلیں ایک وقت میں چڑھا جاتے تھے اسی کمرے میں جمع ہو جاتے تھے اور اپنے حقول اور نائج کی آواز سے تمام رات ہم کو سونے نہ دیتے تھے۔ ایک روز اتوار کی شام کو رات کا کھانا کھانے کے بعد میں نے کوششتانوت سے کہا:-

”آج رات کو یہ لوگ ہمیں سونے نہ دیں گے۔ پھر ہم کہیں اور ہی کیوں نہ چلیں“

”کہیں اور کہاں؟“

”مثلاً ڈاکٹر کے ہاں۔ وہ کئی دن سے ہمیں دعوت دے رہے ہیں۔“

”کیسی اور رات کو وہاں چلیں گے“

”لیکن آج رات کو کیوں نہ چلو؟“

”میں نے سنہنتے ہوئے جواب دیا ”آج رات کو میں بہت اراقتار ایک پرانے سیاست دان سے کراؤں گا جو ترکی زبان خوب اچھی بول سکتے ہیں اور جنہوں نے اپنی پنجابی کے زانے میں استنبول میں تعلیم پائی ہے“

”وہ کہاں ہیں؟“

”وہ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ وہ بھی فصل کے لئے آئے ہیں۔ لیکن جس قسم کے وہ آدمی ہیں اس کا تعین پتہ چل جائے گا۔ بالکل بائی کونیو“ ہیں (نادر نویس کانسٹیٹین اسکوکا مشہور سپرو) شام کے کھانے کے بعد کوششتانوت نے سرائے والے سے داوا ت قلم منگوا یا۔ ایک چرب لکھا اور اُسے یہ کہہ کر دیا کہ اسے گوسپوڈ کی پازنی کے پاس لے جاؤ۔

پھر وہ مجھ سے اس شخص کی زندگی کے حالات بیان کرتا رہا۔ ابتدا میں کیپا زین ایک انقلابی تھا بلغاریہ کی آزادی کے بعد وہ وزارت داخلہ میں ایک عہدہ دار کی حیثیت سے مامور ہو گیا۔ پھر نائب وزیر ہوا اور اخیر میں چند مہینوں کے لئے وزیر عدالت ہو گیا۔ اس کی استمبلا ف سے بڑی گہری دوستی تھی۔

اُس نے کہا ”یہ عجیب حضرت ہیں۔ خیر تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔ وہ کسی اور کو بات کرنے
تھوڑا ہی دیتا ہے۔ تمام وقت خود ہی بولتا رہتا ہے۔ یورپ کے جتنے سیاست دان ہیں سب کو ذلیل
سمجھتا ہے۔ بسا رک کا دماغ اس کے نزدیک معزز سے بالکل خالی تھا اور اس بات کی تو وہ مستم
کھاتا ہے کہ روس میں ایک بھی مغول آدمی نہیں ہے“

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سرائے والا آگیا اور کہنے لگا
”گاسپوڈن آپ کو اور آپ کے دوست کو اپنے کمرے پر بلاتے ہیں۔ تمہیں گھٹیا کی
شکایت ہے اور خود نیچے اُتر کر نہیں آ سکتے“
”اُن کے کمرے کا کیا نمبر ہے۔“
”ایک“

”کیا وہ اکیلے ہی ہیں“
”جی ہاں“

کوششتانوف جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور سیرا لہتہ پکڑ کر یہ کہہ کر مجھے ایک پتلے زینے
سے کھینچتا ہوا اوپر لے گیا کہ
”چلو ایک پرانے زمانے کے آدمی کو بھی دیکھ لو۔“

سرائے کے کمرے میں نمبر ایک کا کمرہ شاید سب کمرے میں بہترین تھا۔ یہ کمرہ سڑک کے رُخ
تھا اور اس کے دروازے کے دو پہلو تھے۔ کوششتانوف نے دروازے پر اس طرح دستک دی
جیسے فوجی مارچ میں ٹکی ٹک، ٹکی ٹک، ٹک، ٹک، ٹکی ٹک، ٹکی ٹک، کی آواز
پیدا ہوتی ہے۔

پھر اُس نے دھکا دے کر کواڑ کھولا۔ یہ کمرہ حقیقتاً دوسرے کمرے کے مقابلے میں بہت
زیادہ آراستہ تھا۔ کھڑکیوں پر سبز پردے اور شیڈز لگے ہوئے تھے۔ دیواروں پر بادشاہ
فرڈیننڈ اور بادشاہ بورس کی روحانی تصویر منگنی ہوئی تھیں۔ آئیڈین کی تیز بولہ باری ناک میں گھسی۔

گرمی کے باوجود کھڑکیاں بند تھیں۔ گلاسپوڈن ایک کونے میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی ٹانگیں ایک سُرُخ کبل سے ڈھکی ہوئی اور اُس کے سامنے کچھ ہوئی ایک آرام کرسی پر کھی ہوئی تھیں اُس کے بال اور داڑھی سپید تھی اور اُس کا چہرہ سُرخ تھا۔ جب ہم داخل ہوئے تو وہ ہنسا اور چلا کر کہنے لگا۔

”تم ہو کوشٹانوف۔ تمہارا یہاں کیا کام ہے۔ کیا نول کو دھوکا دینے آئے ہو۔“

”نہیں۔ میں غسل کرنے کے لئے آیا ہوں۔“

”یہ فریب دوسروں کو دینا۔ اگر میں برسرِ اقتدار ہوتا تو میں تمہیں اور تم جیسوں کو سانس

بک نہ لینے دیتا۔ جنسیر بیٹھو۔۔۔۔۔۔“

ہم نے ایک ایک کرسی لے لی اور اُس کے سامنے بیٹھ گئے۔ پھر کوشٹانوف سے مخاطب ہو کر اُس نے کہا:-

”کیا خبریں ہیں۔ کہو؟“

”خبر کیا ہے کچھ بھی نہیں گلاسپوڈن!“

”خبر کیسے نہیں۔ تم جیسے نوآموز کسی بات کو کچھ اہمیت ہی نہیں دیتے۔ کیوں ٹھیک

ہے نا؟“

پھر اُس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اُس کی نیلی آنکھیں بھورے شعلوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

”آپ کون ہیں؟ کیا یہ بھی تمہارے شاگرد ہیں؟“

”نہیں گوسپاڈن یہ بلغاری نہیں ہیں۔“

”پھر یہ کون ہیں“

”ترک“

”ترک؟“

”ہاں“

میرے سر پر کھپکھپاتی تھی۔ اُس سے اُس نے سمجھا کہ کوشٹانوف مذاق کر رہا ہے اور ہنسنے لگا۔
 لیکن پھر بھی اُسے کچھ تامل ہوا اور جب کوشٹانوف نے اُسے یقین دلایا تو اُس نے مان لیا۔
 بھی اُس عرصے میں مسکرا رہا تھا۔

”یہ یہاں کیا کر رہے ہیں“ اُس نے پوچھا

”یہ عمل کے لئے آئے ہیں اور میرے دوست ہیں۔“

”کیا آپ بھی سوشلسٹ ہیں؟“ یہ کہہ کر اُس نے مجھے گھورنا شروع کیا۔

”میں نے کہا نہیں“ اور کوشٹانوف نے بھی میری تائید کی۔

”یہ قوم پرست ہیں گوسپاڈن“ کوشٹانوف نے کہا

”مجھے زیادہ بے وقوف نہ بناؤ۔ ایک ترک سوشلسٹ ہو سکتا ہے قوم پرست۔“

اب وہ برابر ہنس رہا تھا۔ انسان بھی عجیب ہوتا ہے۔ اگر کسی ترک نے یہ بات کہی ہوتی تو مجھے اس کی
 شاید پروا نہ ہوتی۔ لیکن جب ایک بلغاری نے یہ بات کہی تو مجھے بڑی معلوم ہوئی اور اس وجہ سے
 اور بھی کہ اس میں استہزاء کی جھلک تھی۔ میرا چہرہ یقیناً بہت زیادہ سرخ ہو گیا ہوگا۔

”کیوں نہیں ہو سکتے“ میں نے کہا میری طرف دیکھنے میں قوم پرست ہوں۔“

”کیا تم ترک نہیں ہو؟“

”ہاں میں ترک ہوں“

”تو پھر عزیزین تم کچھ بھی نہیں ہو سکتے“

”کیوں نہیں ہو سکتا“

”کیونکہ عزیزین تم ترک ہو۔“

”یہ کیسی عجیب بات ہے“

اب مجھے غصہ آنے لگا تھا۔ کوشٹانوف نے یہ دیکھ کر کہ مجھے برا معلوم ہوا یہ بات کو ٹالنا چاہا۔

”لیکن گاسپوڈن نوجوان ترکوں کے متعلق تم ایسا نہیں کہہ سکتے۔“

مگر بڑھا سیاست دال سہ ہوتا رہا اور اس بات کو اصرار کے ساتھ کہتا رہا۔

”بڑھے ہوں یا جوان ترک ترک ہیں۔ میں انہیں خوب جانتا ہوں۔ دسے زمین پر کوئی شخص ترکوں کو مجھ سے بہتر نہیں کچھ سکتا۔“

کوششاً فوت نے کئی مرتبہ احتجاج کرنا چاہا بعض وقت معقولیت کے ساتھ اور بعض وقت ایسے الفاظ میں جن سے کوئی مفہوم پیدا نہ ہوتا تھا۔ اخیر میں کیا زلیف نے کہا

”ترکوں کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ خیال ہے نہ نصب العین۔ ان کے پاس صرف ایک چیز ہے“

ہم دونوں نے پوچھا

”وہ کیا ہے؟“

”مذہبی دیوانگی“

”.....“

ہاں مذہبی دیوانگی۔ بلغاریہ میں میں نے ان کی مذہبی دیوانگی سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اگر میں

آج برسرِ اقتدار ہوتا تو آج بھی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ استامبول کو اس بات کا یقین تھا کہ میں ایک

غیر معمولی ذکاوت اور ذہانت کا شخص ہوں۔ جب ہماری ریاست کی نئی نئی تنظیم ہو رہی تھی اگر میں نہ ہوتا

تو بلغاریہ کی یہ حالت نہ ہوتی جو آج ہے۔ ترک اس قدر زیادہ تھے ہماری تعداد سو برائیاں

یقیناً نصفانصاف ہوتی اور ایک دن جماعتِ عالمہ میں آدمی تعداد ترکوں کی ہوتی۔ لیکن میں نے.....

لیکن میں نے.....“

اس نے اپنی ٹانگوں کو سمیٹا اور اپنے سینے کو اپنے بال دار لمبھوں سے ٹھوک کر لو کہ شتان

کی طوط اشارہ کر کے کہا

”یہ جاہل ہماری قدر نہیں کرتے۔ لیکن تاریخ سے حقیقت کا اظہار ہو گا۔“

مجھے یہ معلوم کرنے کی جستجو تھی کہ اس نے ترکوں کی مذہبی دیوانگی سے کس طرح فائدہ اٹھایا۔ اس لئے

میں نے پوچھا۔

”جناب گوسپاڈن صاحب کیا آپ ہمیں یہ نہ بتلائیے گا کہ آپ نے ترکوں کی مذہبی دیوانگی سے کس طرح فائدہ اٹھایا“

”کیوں نہیں بڑی خوشی سے“

”شکریہ“ میں نے کہا۔ کوشٹانوف کو بھی اشتیاق تھا۔

’بڑھے آدمی نے کبل کے نیچے ایک پاؤں پر دوسرا پاؤں رکھا۔ منہ بنایا۔ جیب سے ایک سگریٹ کیس نکالا۔ ایک ایک موٹا سگریٹ ہم دونوں کو دیا، اور ایک خود سٹگایا۔ قصہ بیان کرتے وقت وہ سر بازو اور اپنے تمام جسم کو ہلاتا رہا اور کھڑکی تھوڑی دیر کے بعد اپنے گھٹنوں پر ہاتھ مارتا تھا۔

”بچپن میں میری اور استمبولت کی دوستی تھی۔ استنبول میں ہم دونوں ساتھ ہی مدرسے میں داخل ہوئے تھے جب بلغاریہ کو آزادی ملی تو ہم نے کانگریس کو اہتمام کمیٹیوں کو جمع کیا۔ اس وقت بلغاریہ محض برائے نام ایک ریاست تھی۔ کیونکہ آدمی سے زیادہ آبادی ترک تھی اور یہ ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ تھا۔ بے وقوف آدمی قتل عام کی تجویزوں کو سوچتے تھے اور ان پگھلتے ہوئے تھے۔ ایک دن استمبولات نے مجھ سے پوچھا

”ترکوں کے ساتھ ہمیں کیا کرنا چاہئے“

”میں نے کہا یہ تو بہت سہل ہے۔ ہم انھیں ترکی واپس بھیج دیں گے“

”کس طرح؟“ استمبولات نے کہا ”کیا یہ لوگ اپنا گھر بار اور مکان اپنی خوشی سے آپ ہی چھوڑ دیں گے“

میں نے جواب دیا ”ہاں ضرور“ لیکن اُسے یقین نہیں آیا۔ اُس کا بھی یہی خیال تھا کہ قتل عام ہونا چاہئے۔ ”اصل قتل عام کی جن لوگوں کے لئے ضرورت تھی وہ یونانی تھے کیونکہ بلغاریہ سے انھیں نکالنے کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ چنانچہ اخیر میں یہی کرنا پڑا۔ لیکن ترکوں کو قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی میں جانتا تھا کہ ان کا سب سے زیادہ مقدس جذبہ ان کی مذہبی دیوانگی ہے۔ میری پرورش انھیں کے درمیان ہوئی تھی

میرے پڑوسی سب ترک تھے۔ انھیں کسی سے نفرت نہ تھی۔ وہ کسی کو نقصان نہ پہنچاتے تھے حتیٰ کہ روسیوں کو بھی نہیں جو اُن کے دشمن تھے۔ اُن کی تمام زندگی، مذہبی دیوانگی کے سیاہ پردے میں لپٹی ہوئی تھی۔ مثلاً انھیں سوروں سے نفرت تھی۔ سوراپ جاتے ہیں بے مزرہ باور ہے۔ لیکن ترک اُس کے جانی دشمن تھے۔ جب کبھی انھیں سوراپ نظر آجاتا تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے اور اُس سے ایسے بھاگتے گویا کہ شیطان سے بھاگ رہے ہیں۔ جب حکومت اس وقت کے حاکموں کا اپنی ہمارا تفرز کر رہی تھی تو میں نے استمبولات سے کہا

”میں ایسے حصے میں جاؤں گا جہاں بلغاری بالکل ہی نہیں ہیں اور چند دنوں میں میں سب ترکوں کی بلغاریہ سے باہر نکال دوں گا۔“

”لیکن یورپ والوں کا بھی تو خیال کرو۔“ اُس نے کہا اور سسر بلایا۔ اُس کا اب بھی یہی خیال تھا کہ میں ترکوں کا قتل عام کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے اُسے یشین دلا یا کہ کسی کی تکسیر بھی تو نہ بھوٹے گی۔“

”تو پھر تم کیا کر دگے۔“

میں ایک انوکھا ظلم کر دوں گا۔“

”کس طرح۔“

میں نے اُسے نہیں بتلایا۔ میرا ڈپٹی ارمن میں تقرر ہو گیا جہاں اگر دوا کے لئے بھی ضرورت ہوتی تو ایک بھی بلغاری دستیاب نہ ہو سکتا۔ میں نے مقدونیہ کے ایک امان دیئے ہوئے خاندان کو شہر میں بسایا۔ میں نے سرکاری بجٹ میں سے خفیہ خدمت کی مد میں اُسے چار لیویز کی رستم دی اور اُن سے پانچ سوراپ خریدوا دیئے۔ میں نے اُن سے یہ بھی کہہ دیا کہ ان جانوروں کو سڑکوں، باغوں اور کھیتوں میں غذا کی تلاش میں آزاد کھوئے دیں۔

سور تمام شہر میں پھیل گئے۔ اُس وقت ترکوں کی حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ اُن کے بڑے بزرگ میرے پاس آئے اور مجھ سے احتجاج کیا۔

”بلغاریوں کے سور آزادی سے سڑکوں پر گھوم رہے ہیں۔ وہ پانی کے حوضوں کو خراب کر رہے ہیں اور کھیتوں کو سونگھتے پھرتے ہیں، ہم سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا۔“

میں نے آزادی پر ایک لمبی چوڑی تقریر کی اور میں نے کہا کہ جیسے کبریلوں، گایوں، بیوں اور مرغیوں کو آزاد رہنے کا حق حاصل ہے ویسے ہی سوردل کو بھی ہے اور میں نے اس سوال پر معاملے کو ختم کر دیا کہ

”کیا ہمیں تمھاری بھینٹوں پر کوئی اعتراض ہے؟“

وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکے۔ لیکن اس کے بعد سے انھوں نے ان حوضوں سے پانی لینا بند کر دیا جہاں سور پانی پیتے تھے۔ وہ چراگا ہوں میں لنگوٹ باندھ کر پہلے کی طرح نہ ننگے ہو سکتے تھے نہ کشتی لڑ سکتے تھے کیونکہ وہاں بھی سور گھومتے پھرتے تھے۔ چھ سات ہینڈل میں سوروں کا قلیل التعداد گل بڑھا اور ہر گل پھیل گیا۔ جب ترکوں کو یہ معلوم ہوا کہ ان سے نجات کی کوئی صورت نہیں ہے تو ایک ایک کر کے ہجرت کرنے لگے۔ حتیٰ کہ جو بہت امیر تھے انھوں نے بھی اپنے گھر کا سامان باندھنا شروع کیا اور اپنی جائداد اور زمین کو کڑیوں کے بھاؤ فروخت کر ڈالا۔ میں حکومت کے لئے تمام زمین خرید رہا تھا۔ وہ لوگ جو گئے تھے اور جا کر استنبول میں بس گئے تھے وہ واپس آئے اور اپنے عزیز و دستر با کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ کسان بھی ہجرت کرنے لگے اور میں مقدونیہ کے بلغاریوں کو امداد دے کر بلارہا تھا اور ویران شہروں کو ان سے بسا رہا تھا۔

مختصر یہ کہ دو سال کے جنت تمام پر تمام شہر میں ایک ترک بھی باقی نہیں رہا۔ ہاں تمام ترکوں نے اپنے صدیوں کے گھر بار کو اس طرح خیر باد کہا گویا آگ ان کا بیچھا کر رہی تھی۔ حکومت نے میرا طریقہ ان تمام شہروں میں جاری کیا جہاں بلغاری آبادی نہ تھی۔ یعنی بلغاریہ والوں کا ایک خاندان اور سوردل کا ایک گلہ۔ سال کے اندر اندر اس سے ترکوں کی آبادی اپنی اصل تعداد کے مقابلے میں نصف ہو جاتی تھی۔ میری حکمت عملی سے استمبولا ف بہت خوش ہوا اور سب کچھ میری اس سے ملاقات ہوتی وہ کہا کہ تاکہ تم غیر معمولی ذکاوت اور ذہانت کے آدمی ہو۔ تم بسا رک سے بھی بڑھ کر ہو۔

استنبولات مجھ سے صبح بچ بنگلگیر ہوتا تھا اور میرا منہ چومنا تھا۔ ہاں بسمارک اساس لورین کے مسئلے کا ایسا تیر بہدت علاج نہ سوچ سکا۔ زبان کی تعلیم کو روکنا 'درسوں کو بند کرنا ظالمانہ طریقے ہیں میں تو نہیں کہہ سکتا کہ کیا کرنا چاہئے تھا۔ لیکن مجھے اس کا یقین ہے کہ کوئی ایسی بات کی جاسکتی تھی جس سے فرانسیسیوں کو فصد آتا اور ان کی مذہبی دیوانگی برا لگینے کی جاسکتی۔ اگر بسمارک نے اس چیز کو دھونڈ لیا ہوتا تو سال کے اندر اندر اس نے ان صوبوں کو جرمن بنا دیا ہوتا۔

دس سال ہوئے میں سینٹ پیٹرس برگ گیا تھا۔ میں نے سازا نوٹ سے گفتگو کی۔ مجھیں معلوم ہے کہ اس بے وقوف کو لوگ یورپ میں سیاست داں کہتے ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ تم استنبول پر قبضہ کرنا چاہتے ہو۔ کیوں۔ اس نے پلا کسی تال کے جواب دیا

”ہاں“

”یہ کام بہت آسان ہے۔“

”کس طرح“ سازا نوٹ نے پوچھا

”دنیا دی جنگوں کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا تھا را خیال ہے۔ ایک بہت ہی سہل طریقہ ہے؟“

”میں نے دوبارہ پوچھا کس طرح“

”تم ترکوں کو استنبول چھوڑنے پر مجبور کر سکتے ہو اور ان کی جگہ روسی بسا سکتے ہو۔ پچیس سال میں ایک بھی ترک باقی نہ رہے گا اور استنبول روسی شہر ہو جائے گا۔“

”اُس نے تیسری دفعہ پوچھا لیکن یہ کس طرح ممکن ہے۔“

”بہت سہل ہے“ میں نے کہا۔ اور پھر میں نے اسے بتلایا کہ ترکوں میں کوئی سیاسی خیال نہیں ہے۔ انھیں وطن اور ملک سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ وہ نہ ہی دیوانگی کے ماتحت تمام چیسندوں کو سوچتے ہیں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اگر ترکوں کے محلہ میں ایک روسی یا بلغاری خاندان کو مسجدوں کے گلے کے ساتھ بسا دیا جائے گا تو ترک آباد گرد چڑیلوں کی طرح کھجور کر اڑ جائیں گے۔ گدھے کو میری بات کا یقین نہ آیا۔ بے شک وہ گدھا تھا۔ کیونکہ وہ ان لوگوں کی

ذہنیت سے واقف نہ تھا جن کے دارالسلطنت پر وہ قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ میرے طریقے پر سنبھلا۔ اور اُن نے خیال کیا میں مذاق کر رہا ہوں لیکن جب اُسے بعد کو معلوم ہوا کہ میں سنجیدگی کے ساتھ اس بات پر اعتقاد رکھتا ہوں تو اُن نے ہمارے دلچپی سے کہا

”حمو سپوڈن کیسا ذلیف بھی کیسا عجیب آدمی ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں مجھے بنانے لگا۔“
 ”ہاں شیخس ضرور گدھا تھا۔ یورپ میں خصوصاً روس میں ایک متنفس بھی ایسا نہیں ہے جو سیاست سے صحیح طور پر واقفیت رکھتا ہو۔ ہاں سب کے سب گدھے ہیں۔“

عمر رسیدہ سیاست دان ایک کے بعد دوسرا سگریٹ جلاتا رہا اور ہم سے بھی پی کرنا رہا۔ وہ اپنی پرانی کامیابیوں کی داستان کو ختم نہ کر سکا۔ نصف شب گزر چکی تھی۔ میرے لئے یہی بہت تھا اور کشتانوف یہ محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے اُس نے رخصت چاہی اور ہم نے کمرے کو جو سگریٹ کے دھوئیں سے لبریز تھا تیز باد کہا۔ باہر آکر اُس نے مجھ سے کہا

”جو کچھ یہ کہتا ہے اس میں سے ہر بات کا تھیں یقین نہ کرنا چاہئے۔“
 ”کیوں کیا وہ جھوٹ بول رہا تھا“

”نہیں“

”تو بھیسر“

”یہ مبالغے سے کام لیتا ہے۔ اس میں سے پانچ فیصدی نکال دو اور باقی پڑھیں کرلو۔“

میں اپنے کمرے میں گیا کپڑے اُتارے اور بستر پر لیٹ گیا لیکن نیند غائب تھی۔ مجھے بھارت تھا لیکن میرا بدن گرم نہ تھا۔ میرے تمام جسم پر سرد پسینے کی تہ جمی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ ہڑے کمرے میں گانے لودنا پچنے کا شور بلند ہو گیا۔ مرغوں نے آذانیں دیں۔ دن نکلنے لگا۔ میں نے اپنی آنکھیں مضبوطی سے بند کر لیں۔ منہ بستر میں دے لیا اور اونگھنے کی کوشش کی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے بہادر آباؤ اجداد کو اپنے جاں باز بھائیوں کو، اپنے پاک باطن اور سادہ لوح ہم قوموں کو گندے سوردوں کے گھول کے

اُگے اُگے پانکلوں کے ایک نمج کی طرح بھاگتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ اُن کے عمامے ہوا میں اُچھل رہے ہیں۔ اُن کے گھوڑے اور گاڑیاں دلدل میں پھنسی ہوئی ہیں۔ اُن کی توپیں اور بندوقیں، اُن کی بیویاں اور بچے ایک ایک کر کے راستے میں گرتے جا رہے ہیں۔
 یاں اُس رات مجھے بالکل سنیں نہ تھیں آئی ۛ

تنقید و تبصرہ

امہات الاسلام مصنفہ شمس العلماء مولانا حافظ نذیر احمد مرحوم قیمت فی نسخہ عارٹے کا پتہ ساتی بک ڈپو دہلی یہ وہ ہنگامہ خیر کتاب ہر جس کے شائع ہونے پر دہلی کے بعض مولویوں نے شورش برپا کر کے دود و دھوک پھیلایا اور اس کے مصنف پر فساد الحاد کے فتوے لکائے چنانچہ ان کی زندگی ہی میں جب دہلی میں ہندو علماء کا اجلاس ہوا تو مولوی صاحبان نے مجمع ہو کر اس کتاب کی تمام جلدوں کو جو ایک صاحب کے پاس آتا رکھوا دی گئی تھیں لیکر ڈھیر لگایا اور اس پر مسمی کا تیل ڈال کر آگ سے جلادیا اتفاق سے اس کا ایک نسخہ بچا ہوا رہ گیا تھا جسے اس سال دوبارہ مسٹر شاہد احمد نے جو مصنف کے پوتے ہیں شائع کیا ہے اس میں جو باتیں علماء کے نزدیک قابل اعتراض ہیں ان کو ایک مولوی صاحب نے جن کا نام عبدالغنی تھا کشف الغمہ کے نام سے شائع کیا تھا اس کا جواب علامہ احمد حسن محدث دہلوی صاحب احسن التفاسیر نے لکھا تھا یہ دونوں سارے بھی اس کتاب کے ساتھ شامل کر دئے گئے ہیں تاکہ لوگ ان جوابات کو دیکھیں جن کی بنیاد پر کتاب نذر آتش کی گئی تھی۔

یہ کتاب پوری احمد شاہ شائق کی کتاب امہات المؤمنین کے جواب میں لکھی گئی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی پر اعتراضات کئے گئے تھے مولانا نذیر احمد نے ان تمام اعتراضات کے نہایت مستند اور دندان شکن جوابات دئے ہیں میں نے ساری کتاب غور سے پڑھی میرا خیال ہے ہر کہ جس غرض غایت کیلئے یہ لکھی گئی ہے نہایت مشرح اور مکمل ہے بیشک بعض امور میں علمی حیثیت سے اختلاف کی گنجائش ہے لیکن ان اختلافات سے مصنف کا دین و ایمان قطعاً زیر بحث نہیں لایا جاسکتا! انھوں نے جو کچھ لکھا ہے رسول پاک کی مدافعت میں لکھا ہے خلوص نیت سے لکھا ہے علم اور ایمان کی کوششیں میں لکھا ہے کہیں ان کی عقیدت سے فقور کا شاہ نہ نہیں ملتا۔ بیشک چند الفاظ زبان قلم سے ناو لاندہ رنگ کے نکل گئے ہیں جن سے ان کی طبیعت مالوف تھی مگر ان کی بنا پر یہ کتاب سوتیلی نہیں

ہو سکتی اگرچہ ہاری خواہش یہ ضرور ہوتی ہے کہ کاش ان الفاظ سے بھی جو عوام میں بھجان پیدا کر سکتے ہیں یہ پاک ہوتی۔

جن حضرات نے اس کو جلایا یا جلویا میر خیال یہ ہے کہ معاصرانہ عداوت یا کچھ اور جذبات اس کے محرک رہے ہوں گے ورنہ اس کتاب سے تو قطعاً مصنف کا کفر و الحاد ثابت نہیں کیا جاسکتا زیادہ سے زیادہ بعض افغانیے سو را دیکے الزام لگایا جاسکتا ہے وہ بھی بزرع خود کیونکہ مصنف کا رتبہ ادب اربابوں میں نہایت بلند مسلم ہو چکا ہے وہ اگر ان الفاظ یا فقرات کو ادب کے خلاف سمجھتے تو میر الحقین ہے کہ ہرگز نہ ہتھمال کرتے

محمدیہ پاکت بک | مولفہ مفتی محمد عبداللہ صاحب معمار امرتسری تقطیع خورد لکھائی چھپائی اور کاغذ نمائندہ عمدہ ضخامت ۳۶ صفحہ مجلد قیمت پچھلے پڑے کا پتہ شعیب تالیف طبع انجمن المحدث برائے رتھ روڈ لاہور۔

یہ کتاب مرزا نیت کی تردید میں نہایت جامع اور مبسوط لکھی گئی ہے جس میں اس کے تمام اصولی اور فروعی امور زیر بحث لائے گئے ہیں انداز بیان اس قدر معقول اور مدلل ہے کہ سوائے تسلیم کے کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا مرزائیوں نے احمدیہ پاکت بک شائع کر کے مرزا صاحب کی چند پیشین گوئیوں کا وقوع ثابت کیا تھا لیکن چند پیشین گوئیوں کے صحیح ہو جانے سے کوئی شخص بنی نہیں ثابت ہو سکتا تاؤ فیکہ یہ نہ دکھایا جائے کہ اس کی کوئی پیشین گوئی غلط نہیں نکلی اس کتاب میں مولف نے مرزا صاحب کی اکثر پیشینگوئیوں کو جو بڑے ادعا کے ساتھ کی گئی تھیں جھوٹا ثابت کر دیا ہے اور ان کے عدم وقوع کو خود مرزا اور مرزائیوں کی تحریروں سے دکھلادیا ہے ہندوستان کے اس مدعی نبوت کی پیشینگوئیوں کی حقیقت اگر کوئی دیکھنا چاہے تو اس کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے واقعی اس کا مولف فاضل مرزا نیت ہے اگر کوئی یونیورسٹی اس لٹریچر کی مہارت پر ڈگری دیتی تو مفتی عبداللہ کو اس کتاب پر ضروری ایچ ڈی کی ڈگری مل جاتی۔

ضروری کہانیاں | مصنفہ قاضی عبدالصمد صاحب تہذیبی کاپتہ مولوی محمد ادریس صاحب میرٹھی۔ مکتبہ شریفہ، دہلی۔

قاضی صاحب نے اس کتاب میں ہندوستان کے راجاؤں بادشاہوں اور نوابوں کے ایسے واقعات اور قصص فراہم کئے ہیں جن سے ہندوستانی قوموں میں باہم اتحاد و برصے خالغوں نے ہندوؤں کی تاریخ کو جو یہاں کی اقوام میں باہمی منافرت پیدا کرنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے اس قسم کی کتابوں سے ان کے ذہن کا ازالہ ہو سکتا ہے قاضی صاحب کی یہ کوشش ہر باہمی خواد ہندگی نگاہ میں نہایت مفید ہے۔

سودیشی اردو | مصنف قاضی عبدالصمد صاحب فی نسخہ لم ملے کا پتہ مولوی محمد رحیم حسامی شیخ بکتر شرف دہلی اس سال میں قاضی صاحب نے بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی دلچسپ کہانیاں اور باتیں خالص اردو میں لکھی ہیں اس میں عربی و فارسی کے الفاظ نہیں آئے ہیں عبارت رواں اور صاف ہے جو لوگ خالص اردو کو پسند کرتے ہیں ان کے لیے یہ ایک عمدہ تحفہ ہے۔

روزنامہ یا مجلہ کی ڈائری | از جناب قاضی عبدالغفار صاحب قلیطع چھوٹی ضخامت ۱۶۰ صفحات کتابت و طباعت اچھی ہے کتاب لیلیٰ کے خطوط کے ساتھ ہے میں ملتی ہے پتہ کا پتہ دار لاد بنگالہ بروہ خانہ مشرق لاہور دار لاد بنگالہ ایک خاص نوع کا ادب لطیف پیش کرنا شروع کیا ہے جس میں اخلاقی مضامین رسمی اور روایتی قیود سے بے نیاز ہو کر کتاب کے موضوع کا انتخاب کیا جاتا ہے اور دوران تصنیف میں خیال آفرینی پر کسی قسم کی حد بندی یا رکاوٹ عاید کرنا آزادی تحریر کے منافی سمجھا جاتا ہے اس نوع کا ادب عموماً سماج کے اس دور میں پیدا ہوتا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جب امر اور تعلیم یافتہ جماعت میں تشکیک کا غلبہ ہوتا ہے اور ان کے قوائے عمل مفلوج ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی تمام پرانی قدیس اپنا اثر زائل کر دیتی ہیں اور نئی قدیس ذوق و نشاط عمل پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہیں مذہب، اخلاق، قانون، معاشرت، رسم و رواج، سیاسی تحریکیں سب لغو و مہمل نظر آنے لگتی ہیں حتیٰ کہ خود زندگی کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا شراب ہوس پرستی اور موسیقی و تہلیق کائنات اور مدد زندگی بجاتے ہیں خیال کی تنگی اور گہرائی کے اعتبار سے یہ دور چاہے کتنا ہی بے مغز کیوں

نہ ہو لیکن اس کے بعض ادبی شاہکاروں کی لطافت اور پچسپی خراج تحسین وصول کیے بغیر نہیں ہتی۔
 زیر تنقید کتاب اسی قسم کی تصنیف ہر اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے یہ چاہئے جس قدر بھی
 قابل اعتراض ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ ادبی حیثیت سے یہ اسی قدر کامیاب ہو
 ”شرح حال“ کے عنوان سے کتاب کی ابتدا میں قاضی عبدالغفار صاحب نے ایک طویل مقالہ پیش کیا
 کے انداز میں سپرد قلم فرمایا ہر جس میں انھوں نے اپنی تصنیف کی ”معنوی کیفیات“ کو بے نقاب کرنے کی کوشش
 فرمائی ہر اور ان لوگوں کی تعریف کو جو اپنی توجہ اس تصنیف کی محض ادبی غویوں تک محدود رکھنا چاہتے
 ہیں ”تحسین ناشناس“ سے تعبیر کیا ہو لیکن ان کی اس پیش بندی کے باوجود ہم ان کی کتاب کو اس
 زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

”مجوز کی ڈائری“ سے اگر ”شرح حال“ کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہمارا خیال ہر اس سے کسی قسم
 کی اصلاحی یا تعلیمی خدمت نہیں ہوتی بلکہ اس سے غیر متجذد ذہنوں میں جہاں ابھی تک خدا کا ذکر شریعت
 کا احترام اور سماج کے قانون کی عزت باقی ہو ایک طرح کی غیر ذمہ دارانہ آزادی نراجی انتشار اور
 مایوس کن کیفیت بے علمی ادبے زوری پیدا ہونے کا احتمال ہو۔ قاضی صاحب کو اس چیز کا مطالبہ نہ کرنا
 چاہیے جس کے وہ متقی نہیں ہیں ادبی حیثیت سے ہیں اعتراف ہر ان کا کارنامہ بڑی حد تک کامیاب ہو
 لیکن اس دور ابتلا اور آزمائش میں جب کہ ہر نوجوان کے سامنے ایک واضح اور تعین معیار اور مقصد ہونا
 چاہیے ان کی کتاب کی تحریکی سماعی کسی پہنچ سے لائق تامل نہیں ہو سکتی ان کے وسیع تجربہ اور بالغ نظری
 سے بجا طور پر توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ نوجوانوں کے مسائل کو زیادہ پیچیدہ بنانے کی بجائے ان کی زندگی
 کے خطرناک راستہ کو سہل اور سہوار کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔

”شرح کلام“ کے اقتدار پر قاضی صاحب نے امید دلائی ہو کہ داستان ابھی باقی ہو جو اس سلسلہ کی
 آئندہ اقسام میں پیش کی جائے گی۔ ہماری تمنا ہو کہ آئندہ جو داستان پیش کی جائے وہ ایسی ہو کہ اس
 سے زندگی کا ایک صحیح اور تندرست فلسفہ پیدا ہو سکے تاکہ موجودہ دور شک و الحاد اور بے علمی کا خاتمہ ہو
 اگر قاضی صاحب اس خدمت کے کرنے میں کامیاب ہوئے تو ان کی تحریر کے ادبی لغزش کی تعریف

کے ساتھ ساتھ ان کی تعریف کی "معنوی اہمیت" کی بھی ہر طرف سے خاطر خواہ دامن لگی آخر میں ہتم فاضل صاحب موصوف سے درخواست کریں گے کہ وہ نوجوانوں کی اُن ذہنی کیفیات کا جن کا تعلق محض شہوانی جذبہ سے نہیں ہے، ذرا زیادہ گہرا مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں اور اُن "غریب نوجوانوں" کو جنہیں کالجوں میں پیا گھولا اور چھانا جاتا ہے، اپنی دل سوزی ہمدردی اور تعمیری مساعی کا زیادہ مستحق سمجھیں اور ان پرستی قسم کی پھبتیاں چھت کرنے سے جہاں تک ہو سکے اجتناب فرمائیں کیونکہ ان "آئینہ نگینوں" کو ٹھیس لگانا ساج کے لیے سخت مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

پلی کے خطوط | اذقاضی عبدالغفار صاحب، قلع چھوٹی قحطاست ۲۲ صفحہ ۱، کتابت طبعیت اچھی "جنوں کی ڈارمی کے ساتھ ہے میں مل سکتی ہوں کاپتہ دار الادب پنجاب، اردو خانہ اسٹریٹ لاہور" یہ کتاب ایک ذہین تعلیمیافتہ اور شاید فطرتاً نیک، بزاری عورت کے فرضی خطوط ہیں جن کے وسیلے اس کے فلسفہ زندگی اور نفسیاتی کیفیات کے تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ موضوع کتاب یعنی ابتدا میں جوانی کی لغزش، تربیت کرنے والوں کی عدم توجہی اور بعد میں معاشی ضرورت سے مجبور ہو کر طبعی تنفر اور بیزاری کے باوجود پیشہ کو جاری رکھنا، اور مناسب موقع ملنے پر اس سے کنارہ کش ہو جانا ہر چند پامال ہو چکا ہے، لیکن جس جدت خیال اور ندرت بیان کے ساتھ قاضی عبدالغفار صاحب نے کتاب میں اپنی انفرادیت کو چمکانے کی کامیاب کوشش کی ہے وہ یقیناً مستحق ستائش ہے۔ ادب لطیف کے اس دلکش خزانے میں چند جواہر پائے تو واقعی بہت بیش قیمت ہیں مثلاً ایک خط کی ابتدا ایک ایسے مبلغ استعارے سے ہوتی ہے کہ کل کتاب کا حاصل چند مختصر الفاظ میں محدود ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتی ہے:-

"قدرت کے دو بچوں نے کہا آؤ ایک کشتی بنائیں انھوں نے ایک چھوٹی سی کشتی بنائی، محبت سے اس کے تختے جوڑے اس کو اپنے ایک باغ کے خوبصورت تالاب میں ڈال دیا جہاں موسم بہار کی مٹھ مٹھانیں اس ننھے سینے کو پانی کی ہلکی لہروں پر چھو لایا کرتی تھیں وہ کشتی کا غد کی نہ تھی نہ لکڑی کی تھی نہ لوہے کی لیکن کاغذ سے بھی زیادہ نازک تھی مگر اس کے بنانے والے نہ جانتے تھے کہ ایسی کشتیاں

کس قدر نازک ہوتی ہیں شاید انھوں نے یہ سمجھا کہ ایک چھوٹے سے باغ کے چھوٹے سے تالاب کے بے موج اور بے طوفان پانی کے لیے کشتی کو مضبوط بنانے کی ضرورت نہیں وہ بھول گئے کہ تالاب کی کشتی کو بھی کسی دن طوفان خیز سمندروں اور تیز دریاؤں میں جانا پڑتا ہو۔ تالاب بھی دریا اور سمندر بن سکتا ہے۔ وہ خطرات کو بھول گئے۔ مگر بھول جانے سے خطرات کم نہیں ہو سکتے یہ خدا کا نہ بدلنے والا قانون ہے۔

برسات آئی۔ ایسی برسات آئی کہ چاروں طرف سے نالے چشمے اور دریا اُمنڈ آئے پھولوں کی کیاریوں کو پانی کی چادر نے ڈھانک لیا..... جب تک اس ننھے سفینہ میں دم تھا اور دم ہی کتنا تھا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن کوئی سہارا نہ تھا کشتی والے بیخبر تھے انھوں نے کس محنت سے سفینہ بنایا تھا اور کس بے پروائی سے اس کو بھول گئے تالاب پانی اور برسات کی ہواؤں نے یوں گویا کہ دونوں کی سازش تھی ایک دو دن اس شکستہ لنگر کشتی کو ادھر ادھر گھسیٹا اور پھر آخری ٹھکنا دیکر چھوڑ دیا۔ ایک طرف کچھڑیں جہاں مینڈکیں بول رہی ہیں اور جھینگر شور مچا رہے ہیں، درختوں کے گرسے ہوئے پتے سڑ رہے ہیں چند گلے ہوئے تختوں کا انبار بڑا ہوا ہے کچھ کچھڑیں کچھ کچھڑے کے باہر.....

”کوئی ان بے خبر کشتی والوں کو بلائے اگر چاہیں تو ان تختوں میں اب بھی اتنی سکت باقی ہے جو پھر اپنی کشتی بنالیں وہ ایسی مضبوط تو نہ ہوگی جیسی پہلے تھی مگر کسی چھوٹے سے باغیچے کی نہر میں اب بھی پڑی رہ سکتی ہے کہیں کوئی ملاح ہو جو اس ٹوٹی ہوئی کشتی کے تختوں کو جوڑ دے جو اس کشتی کے لیے ایک بادبان اور لنگر کہیں سے لادے؟“

”میرے مہربان! یہ پہلی جو بیان کی گئی آپ بستی ہے.....“

اسی قسم کے اور بہت سے لطیف ادبی شہ پائے ہیں کتاب تحقیق مطالعہ ہے اور بازار ادبی عورت کے شرمناک عہد زندگی کے اختتام اور نئے عہد پاکبازی کے آغاز پر ختم ہوتی ہے آخری خط میں وہ لکھتی ہے ”چند روز اس نئی دنیا میں مجھے دم لینے دو جس کے دروازے میرے بے کھلتے جلتے ہیں۔ ۱۳“

ویرانے کو آباد ہونے دو مجرموں سے میرے انتقام کا وقت وہ آئے گا جب میں بیوی اور ماں بن کر بغاوت کا علم بلند کروں گی۔ ابھی تو میں ایک بازاری عورت ہوں ذلیل حقیر گردن زدنی!“

دیکھنا ہے | از جناب کوثر چاند پوری قلیق چھوٹی ضخامت چار سو صفحات کتابت و طباعت روشن کاغذ متوسط قیمت کا پتہ نسیم اختر بکیم، بکیم گنج بھوپال یا مکتبہ جامعہ قریب دہلی

یہ جناب کوثر چاند پوری کے بچپن مختصر افسانوں کا مجموعہ ہر جو ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں ان میں سے بیشتر سماج کی اصلاح کے مقصد سے لکھے گئے ہیں اور اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہیں کچھ حسن و عشق کے افسانے بھی ہیں جن میں وہ مان پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جناب مصنف کی طبیعت بالذکر کی جانب بھی مائل معلوم ہوتی ہے ”انتقام قدرت“ میں سوچ سنگہ کا کیرکٹر بالآخر ہر سوچ سنگہ کو اس کے مظالم کی سزا قدرت کی طرف سے یہ ملی ہے کہ اس کا گھر سیلاب میں بہ گیا اور وہ خود بیوی بچوں سمیت سیلاب کی نذر ہو گیا مگر یہ صورت تو کم دہشیں گاؤں کے دوسرے رہنے والوں کے ساتھ بھی پیش آئی انھیں کس جرم میں یہ سزا ملی کتاب کے شروع میں جناب مصنف اور جناب قاضی امیر الدین صاحب نے یوان ریاست دنیا کی تصویریں بھی ہیں۔

روز کلام غالب | مرتبہ محمد اسحاق صاحب، حجم ۸۲ صفحات قلیق چھوٹی، کتابت و طباعت متوسط کاغذ معمولی قیمت ۸ روپے کا پتہ منجر صاحب رسالہ ماہ تمام نمبر ۸۲ کو لوٹلہ اسٹریٹ کلکتہ

جناب اسحاق صاحب امرتسری، غالب کے سات اشعار مختلف عنوانات، یا بوسی، قسمت، طاعت، آئینہ، شراب، دین و دنیا، انسان کی دنیا کے تحت میں تعمیر کر کے اُن کی تشریح کی ہے

ہوش کے ناخن | از جناب میر حسن و مخدوم محی الدین صاحبان قلیق چھوٹی حجم ۹ صفحات، کتابت و طباعت متوسط کاغذ اچھا قیمت دس روپے کا پتہ کتاب پر درج نہیں۔ یہ ایک انگریزی ڈرامے کا ترجمہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ انسان طبع زریں کیسا سخت دل اور خود غرض ہو جاتا ہے اور اپنا مطلب نکلانے کے لیے کیسی سی عیاریوں سے کام لیتا ہے اور اگر کوئی ان خرابیوں کی اصلاح کرنا بھی چاہے تو ماحول اور سوسائٹی اسے بالکل بے بس اور مجبور کر دیتی ہے۔ ترجمہ بہت صاف اور ننگفہ ہے اور قابل ترجمہ جس نے اسے بڑی خوبی سے اپنایا ہے

زبان حیدر آباد کی مقامی ہر جس سے ڈراما کا لطف اہل حیدر آباد کے لیے اور بڑھ گیا ہو گا۔ حیدر آباد
دوبارہ کامیابی کے ساتھ ایٹج بھی ہو چکا ہے۔

چالیس حدیثیں | مرتبہ خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی استاد لغیر جامعہ ضخامت ۲۲ صفحے قلع چھوٹی کتابت و طباعت
اور کاغذ عمدہ قیمت ۲ روپے کا پتہ۔ کتبہ جامعہ قزول باغ دہلی
جناب خواجہ صاحب نے اس کتاب میں بچوں کے لیے مختلف عنوانات مثلاً جسم اور کپڑوں کی
صفائی، وقت کی پابندی، استقلال، باپ شہتہ دار وغیرہ عنوانات کے ماتحت قرآن کی آیات
اور احادیث جمع کر دی ہیں ساتھ ہی نہایت آسان زبان اور موثر انداز میں ان کی تشریح بھی کی
ہے یہ کتاب بچوں اور بڑھوں سب کے لیے مفید ہے۔

بچوں کے اسماعیل | از جناب سعید انصاری صاحب بی۔ اے جامعہ ضخامت ۱۰ صفحات کتابت و طباعت
اور کاغذ عمدہ قیمت ۲ روپے کا پتہ کتبہ جامعہ قزول باغ دہلی
جناب سعید انصاری صاحب نے اس چھوٹی سی کتاب میں ہندوستان کے مشہور شاعر
اسماعیل میرٹھی کی ان نظموں کا انتخاب شائع کیا ہے جو انھوں نے بچوں کے لیے لکھی ہیں اور ان کی ریڈیوں
میں چھپ چکی ہیں مولانا اسماعیل میرٹھی کو بچوں کی نظمیں لکھنے میں جو کامیابی ہوئی ہے وہ اب تک بہت کم شاعروں
کو نصیب ہوئی۔ سعید صاحب نے یہ بہت اچھا کام کیا ہے کہ ان نظموں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے جو انھوں نے
اس امر کا التزام کیا ہے کہ سہل اور آسان نظمیں پہلے آئیں اور بعد میں مشکل ہوتی جائیں آخر میں مشکل الفاظ کی
فہم بھی ہے۔

شذرات

خدا کا شکر ہے کہ جامعہ کا وفد جو شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی سرکردگی میں صوبہ متحدہ کے مغربی اضلاع کا دورہ کر رہا ہے جواب تک ہر طرح کامیاب رہا ہے۔ تلفظ مگر سہارن پور بجنور کا کام ختم ہو چکا ہے اور ان تینوں ضلعوں کے باہمت لوگوں نے جس گرجو شش خلوص اور فیاضی سے ہمارے وفد کی آمد کی ہے اس سے ایک طرف تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان مالی مشکلات کے زمانے میں مسلمانوں کا ہاتھ تنگ ہو، مگر دل تنگ نہیں رہا اور دوسری طرف یہ کہ جامعہ ٹیسٹ ہر طبقے اور ہر خیال کے لوگوں کو اپنی تعلیمی تحریک کی طرف متوجہ کر لیا ہے اور اب انشاء اللہ اس کی راہ میں ہوشیاریاں جواب تک تمیں باقی نہیں رہیں گی۔ آئندہ ہفتے میں وفد بریلی شاہجہاں پور، بایوں وغیرہ جگہں کا بھیس یقین ہے کہ رد ہیکلٹنڈ کے حاسیان تعلیم اور عجان مفت اپنے قوی ادائے کی مدد میں سیرت کے باشندوں سے پیچھے نہیں ہیں گے۔ تحفہ یہ ہے کہ تلفظ مگر سہارن پور بجنور کے چندے کی مجموعی رقم اسٹس نصاب ڈیوڑھی ہر جو ان اضلاع کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ دیکھا ہے کہ اور اضلاع صرف اس تناسب کو قائم رکھتے ہیں یا آگے بڑھ جاتے ہیں۔

مجنوز ہے کہ آئندہ سال سے جامعہ میں ابتدائی مدارس کے معلوموں کی ٹریننگ کا انتظام کیا جائے بعض اسلامی انجنوں نے جو ابتدائی مدرسوں کو چلاتی ہیں اور دو ایک میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ جامعہ اپنے بیان معلوموں کی تعلیم کا مدرسہ کھولے، خود جامعہ کے ابتدائی مدرسے سے ہر سال مدرس ٹریننگ کے لیے باہر بھیجے جاتے ہیں اور ان کی تعلیم کا خرچ جامعہ کو برداشت کرنا پڑتا ہے اگر وہ اپنے بیان ٹریننگ کا معمول انتظام کرے تو اس کے مدرسوں اور دوسرے اسلامی مدرسوں کو بڑی جہولت ہو جائے گی اس خیال سے فی الحال ایک سال کیلئے ٹریننگ کا شعبہ انتہا قائم کیا جا رہا ہے اور اس میں بہت تھوڑے سے طلبہ داخل کئے جائیں گے، داخلہ کی مفصل شرائط بہت جلد شائع کر دی جائیں گی۔ غالباً اسلامیات، اردو، انگریزی، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، کم سے کم

ثانوی دوم، ڈیٹل تک جانے کی قید ہوگی، ممکن ہو داخلہ کا کوئی امتحان بھی رکھا جائے طلبہ کو اصول تعلیم نفسیہ اطفال طریق درس، نظم، سہ حفظان صحت وغیرہ کے علاوہ ان مضامین کی مزید تعلیم بھی دی جائے گی جو انھیں ابتدائی دروسوں میں پڑھنے ہوں گے۔

کلچ کے نصاب تعلیم پر بھی دوبارہ غور کیا جا رہا ہے، خیال ہے کہ ثانوی چارہم کے بعد کلچ کی چار سال کی تعلیم کا ایک ہی نصاب بنایا جائے اور ایک ہی سند دی جائے، رکھی جائے ہر سال کے ختم پر امتحان ہوا کرے صرف اس لیے کہ سال بھر کی تعلیم کا نتیجہ معلوم ہو سکے نصاب میں اختیاری مضامین نہ رکھے جائیں بلکہ ہر طالب علم کے لیے ایک ہی نصاب ہو جو انگریزی اور دو کے علاوہ اسلامیات اور اجتماعیات پر حاوی ہو اور جس کے ختم کرنے کے بعد طلبہ صحافت، تعلیمی اور دوسری معاشرتی قومی خدمت انجام دے سکیں۔

بی۔ اے کی سند حاصل کرنے کے بعد ہر طالب علم سے یہ توقع کی جائے گی کہ ان میں سے کسی کام کی عملی تربیت بھی حاصل کرے اور جب تک جامعہ میں اس کا انتظام نہیں ہو اس وقت تک کسی دوسرے ادارے میں جا کر اس کی تکمیل کرے۔

امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری صاحب مدظلہ کے برادر بزرگ نواب ضامن ازبک بہادر نے یکایک بھگوریں انتقال فرمایا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ ہم جامعہ ملیہ کے طلبہ اور اساتذہ اور سالہ جامعہ کے قارئین کرام کی طرف سے ڈاکٹر صاحب قبلہ اور مرحوم کے کل عزیزوں سے اس صدمہ جانکاہ میں قلبی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں، مرحوم اعلیٰ درجہ کے فاضل علم اور مدبر، اعلیٰ حضرت خصوصاً کے معتقد خاص نہایت دیندار خوش خلق اور مہمان نواز بزرگ تھے جامعہ ملیہ سے دلی جھڑپی لکھتے تھے اور اس کی مدد میں ہر طرح کی سعی فرماتے تھے۔

خداوند تعالیٰ ان کی منفعت فرمائے اور انھیں اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے (آمین)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

محمد قاسم ایم۔ اے

قائم مقام ایڈیٹر۔

جلد ۲۴	اگست ۱۹۳۵ء	نمبر
--------	------------	------

فہرست مضامین

۵۷۹	پروفیسر اشتیاق حسین صاحب قریشی ایم۔ اے	۱۔ نیدرلینڈین یاد دہانی
۵۹۲	جناب لیٹ ہدایونی	۲۔ ہندو نامہ شعلی و کھنی
۶۰۰	ہے۔ امیں بی۔ منتر جیوہوی من الدین کھسائی۔ ایک کتاب	۳۔ حکومت نسلان
	ایم۔ آر۔ اے۔ لہیں (لندن) پیرسٹریٹ ۱۱۔	
۶۱۶	ریاض الدین احمدی۔ اے (آئرس) ایم۔ اے	۴۔ برطانوی مزدوروں کی بیداری
۶۲۴	چودھری خیر محمد صاحب بنی ایم ایل اے ایم ایلی	۵۔ جرمی کا سفر نامہ
۶۳۸	حضرت جگر مراد آبادی	۶۔ کلام جگر
۶۴۹	جناب گوگت شا جہاں پوری	۷۔ نیرنگ حیات
۶۵۰	جناب اختر انصاری بی۔ اے (آئرس)	۸۔ غزل اور "نغمہ روح"
		۹۔ دنیا کی رشتہ راز۔
		۱۰۔ (الف) ہاک فیر۔
۶۵۱	(ذ۔ ح)	(۱) حبش
۶۵۶	()	(۲) عقبہ
۶۵۷	()	(۳) ترکی
۶۵۹	()	(۴) عراق و ایران
۶۶۰	()	(۵) روس
		(ب) ہندوستان۔
۶۶۲	(م۔ ع)	(۱) نوجوانوں کی بے روزگاری
۶۶۶	()	(۲) حکومت ہند کا قانون
۶۶۹		۱۰۔ تنقید و تبصرہ
۶۷۵		۱۱۔ شذرات

محمد مجیب بی۔ اے (آئسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

یاد رکھنے کی بات

مشہور مصنفین اردو مثلاً مرزا غالب، فراہہ حالی، علامہ شبلی، مولانا آزاد، مولانا شریتر
علامہ اقبال، منشی پریم چند اور اردو کے جملہ مصنفین کی بلند پایہ تصانیف و تراجم اور لاجور
لکھنؤ، الہ آباد، حیدر آباد، اورنگ آباد، اعظم گڑھ وغیرہ مقامات کی سب کتا میں ہر وقت
ہلے یہاں موجود رہتی ہیں۔ شائقین فہرست طلب فرا کر اپنی پسندیدہ کتا میں منتخب فرمائیں۔

رعایت۔ مطبوعات جامعہ پر محصور ڈاک اور پوسٹنگ بالکل معاف ہو سکتا ہے بشرطیکہ
(الف) فرمائش مبلغ دو روپے سے کم نہ ہو۔
(ب) رقم بذریعہ منی آرڈر یا ٹیکسٹ کی ارسال کی جائے۔

مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسری کتاہوں پر اس شرط کے ساتھ کہ فرمائش
مبلغ (ص) سے کم نہ ہو اور رقم پیشگی پہنچ جائے محصول ڈاک معاف کیا جائے گا۔
البتہ ان کتاہوں پر جو ہمیں بھی کسی خاص رعایت سے نہیں ملتیں یہ ممکن نہ ہو گا۔

مکتبہ جامعہ کے مندرجہ ذیل سائل کو نمونہ طلب کیجئے

”رسالہ جامعہ“ ماہوار با تصویر ”پیام تعلیم“ ماہوار ”کتاب نس“ ماہوار
چند سالانہ (ص) چند سالانہ (د) چند سالانہ (م)

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

فیڈریشن یا وفاق

اگر دو یا دو سے زیادہ ریاستیں اس طرح مل کر ایک نئی ریاست بنائیں کہ ان کا وجود بھی قائم رہے اور ان سے مل کر جو ریاست بنی ہے اُس میں ریاست کے تمام اوصاف موجود ہوں تو اُسے وفاق کہیں گے اس تعریف کو سمجھنے کے لئے سیاسی اتحاد کی بعض اور صورتوں کو سمجھنا ضروری ہے۔

ایک صورت تو دو ریاستوں کے متحد ہونے کی یہ ہے کہ ریاستیں علیحدہ علیحدہ ہوں، لیکن اُن کا بادشاہ ایک ہی ہو۔ مثلاً لاء میں اسکاٹ لینڈ کا بادشاہ جس ششم انگلستان کا بادشاہ بھی ہو گیا، دونوں ریاستوں کا وجود علیحدہ علیحدہ قائم رہا، دونوں کے داخلی قانون میں فرق تھا، صرف بادشاہ کے ایک ہونے کے باعث خارجی حکمت عملی ایک تھی۔ یہ صورت مثلاً عہد تک قائم رہی اُس کے بعد قانون اتحاد کی رو سے دونوں ریاستوں نے اپنی انفرادیت کو چھوڑ دیا اور ایک ریاست متحد ہو گئی۔ مثلاً لاء اور سکاٹ لینڈ کے درمیان انگلستان و اسکاٹ لینڈ کے اتحاد کو شخصی اتحاد کہا جائے گا۔ اسی قسم کا اتحاد ملکہ وکٹوریہ سے قبل موجودہ خاندان کی حکومت میں انگلستان و ہنور کا تھا۔ مثلاً عہد کے بعد انگلستان و اسکاٹ لینڈ کے اتحاد کو حقیقی اتحاد کہتے ہیں، اور اس کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں، مثلاً جنگ میں شکست کے بعد کوئی ملک کسی دوسری سلطنت سے ملحق ہو جائے، تیسری صورت یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ ریاستیں کسی خاص مقصد کے لئے متحد ہو جائیں۔ اُن کی جدا گانہ حیثیت قائم رہے۔ لیکن اُس مشترک مقصد کے لئے وہ مشترک ادارے قائم کر لیں۔ ان اداروں کی تعداد کم ہوتی ہے۔ ریاستوں کی سیادت قائم رہتی ہے، اور اگر وہ چاہیں تو ان مشترک اداروں کو توڑ سکتی ہیں۔ اس اتحاد کو اتحاد جزوی کہیں گے اور یہ وفاق کی ادنیٰ صورت ہے۔ امریکہ میں مثلاً لاء سے سکاٹ لینڈ تک، سوئٹزر لینڈ میں مثلاً لاء تک اور چلی کی ریاستوں میں مثلاً لاء تک

PERSONAL ACT OF UNION FEDERATION
CONFEDERATION REAL UNION UNION

اسی قسم کا اتحاد تھا۔

وفاق اتحاد کی ان تمام صورتوں سے مختلف ہے، وفاق میں شریک ہونے والی ریاستیں اپنی خود مختاری کا ایک بڑا جزو قربان کرتی ہیں۔ داخلی امور میں کسی قدر اختیارات کو محفوظ رکھ کر، باقی تمام اختیارات اُس جدید ادارہ کو سپرد کر دیتی ہیں جو ان کے اتحاد سے پیدا ہوتا ہے اور جسے ان سب پر بلحاظ اختیارات و وسعت فوقیت حاصل ہوتی ہے اور جو ایک ریاست کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی وفاق میں ریاستوں کی انفرادیت کا کچھ حصہ محفوظ رہتا ہے اور کچھ حصہ آپس میں منعم ہو کر ایک اعلیٰ ریاست کو تشکیل دیتا ہے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وفاق کی تشکیل بالکل متضاد طریقہ پر ہو، یعنی ایک مملکت پہلے مختلف حصوں میں منقسم ہو جائے اور پھر وفاق مرتب ہو، مثلاً برطانوی ہندوستان ایک وحدانی ریاست تھا، لیکن اس کے صوبوں کو خاص اختیارات مے کر ماتحت ریاستوں کی صورت دی گئی اور پھر وفاق قائم کیا جا رہا ہے، یہی صورت کناڈا اور جنوبی افریقہ میں پیش آئی۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ فرق کچھ اہم نہیں ہے، نہ اس سے وفاق کی نوعیت پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ اس لئے کہ وفاق کی تشکیل کے بعد ایسے اجزاء کا موجود ہونا ضروری ہے جو بعض امور میں ایسے اختیارات رکھتے ہوں جن میں

مرکزی حکومت با اختیار خود مداخلت نہ کر سکے، اور اس طرح ان کی انفرادی حیثیت قائم ہو، اور ان سے مل کر ایک ایسی ریاست بنے جس کے اختیارات چند دیگر امور میں ان تمام اجزاء کی تمام وسعت میں تسلیم کئے جائیں اور جن سے قانوناً سر تابی ممکن نہ ہو۔ اتحاد جزوی میں شریک ہونے والی ریاستیں مشترک داروں کے احکام سے قانوناً منحرف ہو سکتی ہیں، ان کی حیثیت شخصی حلیف کی ہوتی ہے اور وہ معاہدہ کو منتقل کر سکتی ہیں، اس کے علاوہ اتحاد جزوی میں مشترک مقاصد بہت محدود ہوتے ہیں، مثلاً کشش میں یکجہتی یا فوجی اور دفاعی اتحاد، وفاق میں اس مشترک ادارہ کے اختیارات زیادہ وسیع ہوتے ہیں، عام طور پر کشش لہ میرا عقیدہ ہو کر ریاست ایک ادارہ ہے، لیکن یہاں اس کے فلسفہ پر بحث فضل ہوئے مسودہ قانون حکومت ہند، جبرطانی پانچویں

کے سامنے پیش ہے۔ مسودہ قانون برطانوی شمالی امریکہ مسودہ تجویز مورفہ ورجن مسودہ منظور کردہ کیپ باؤس آف

اسپلی شہ CUSTOMS دے دوبرآمد پر محصول۔

امور خارجہ، دفاع، تجارتی معاہدے، وسائل آمدورفت، ڈاک، تار، اور الکٹرایسے امور جو تمام دفاق سے متعلق ہوں مرکز کی سپرد ہوتے ہیں، اتحاد جزوی میں مرکزی ادارہ کو سیادت حاصل نہیں ہوتی، اور صلیف کو کامل سیادت حاصل ہوتی ہے، دفاق میں سیادت اعلیٰ کا مسئلہ پیچیدہ ہے، لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ مرکزی ادارہ کو، نیز مقامی اجزاء کو ایسے حقوق حاصل ہوتے ہیں جنہیں سیادت کا جزو سمجھا جاسکتا ہو۔ یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ وحدانی ریاستوں میں بھی صوبوں اور مقامی اداروں کو بعض اختیارات حاصل ہوتے ہیں، لیکن ان اختیارات کی وسعت خواہ کسی دفاق کے اجزاء سے زیادہ ہو، تاہم ان کی نوعیت میں فرق نمایاں ہے، دفاق کے اجزاء کو جو اختیارات حاصل ہوئے ہیں وہ ان کا حق ہیں اور ان میں تبدیلی ان کی یا اس اعلیٰ قوت کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتی جو دفاق کی ضمانت ہے، خواہ یہ اعلیٰ قوت قوم ہو، یا کوئی بیرونی طاقت، اس کے مقابلہ میں وحدانی حکومت کو اقتدار کلی حاصل ہوتا ہے، وہ اپنی مرضی کے مطابق ماتحت اجزاء کے اختیارات میں کمی اور اضافہ کر سکتی ہے، اور اسے یہ حق حاصل ہے کہ کسی اختیار کو کلیتہً سلب کر لے۔ حقیقت یہ ہے کہ وحدانی ودفاقی حکومتوں کا فرق قانونی ہے، اور اُسی حد تک واضح ہے جہاں تک قانون کی دسترس ہے، اگر سیادت اعلیٰ حقیقی کے نقطہ نظر سے بحث کی جائے تو امتیازات مستجابتے ہیں، لیکن یہ دلیل درمیان میں لانی مفید نہیں ہے، اس لئے کہ اگرچہ سیادت حقیقی تمام اداروں کی روح ورواں ہے اور انہیں بناتی یا بگاڑتی رہتی ہے، تاہم اُس سے بالکل بچنا محسوس اداروں کے ذریعہ سے ہوتا ہے، جن میں سب سے زیادہ اہم قانون ہے، اور اس لئے دفاقی ودھانی حکومتوں میں امتیاز بہت اہم ہے، اس لئے کہ قانون اساسی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، خواہ اس کی حقیقت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

سیادت حقیقی ناقابل تقسیم ہے، غیر محسوس ہے اور اس کا تعین دشوار ہے، لیکن سیادت قانونی

(UNITARY) ۱۵

(SOVEREIGNTY) ۱۵

LEGAL SOVEREIGNTY ۱۶

REAL SOVEREIGNTY ۱۶

یعنی قانون بنانے کی قوت محسوس بھی ہے، متعین بھی ہے اور قابل تقیم بھی ہے۔ لہذا وحدانی اور وفاقی حکومتوں کا فرق اس طرح واضح کرنا آسان ہو گا کہ وحدانی حکومتوں میں مسیادت قانونی صرف مرکز کو حاصل ہوتی ہے اور وفاق میں مرکز اور اجرائے وفاق پر منقسم ہوتی ہے، خواہ دونوں کے حصوں میں کتنا ہی تفاوت ہو اگر یہ وفاق اور وحدانی حکومت کا اساسی فرق وہی ہے جو مندرجہ بالا سطروں میں مذکور ہے، تاہم دنیا کی تمام وفاقی حکومتوں میں چند خصوصیات ہوتی ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے۔

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وفاق میں آئین اساسی کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ بعض ممالک اب بھی ایسے ہیں جن میں آئین اساسی تحریر کیا ہو نہیں ہے، بلکہ اُس کی بنیاد بعض روایات پر قائم ہے، ان میں چند روایات ایسی ہیں جو تمام قانون کی بنیاد بن گئیں ہیں، مثلاً انگلستان میں آئین اساسی کسی جگہ لکھا ہوا نہیں ہے، تمام کام روایات سے چلتا ہے، صرف قانونی روایت یہ بن گئی ہے کہ پارلیمنٹ کو تمام اقتدار حاصل ہیں، چنانچہ مشہور مقولہ ہے کہ ”پارلیمنٹ عورت کو مرد کو عورت بنانے کے علاوہ تمام کام کر سکتی ہے“ پارلیمنٹ کو خود اپنے حقوق بڑھانے اور گھٹانے کا حق حاصل ہے، اپنی ترکیب میں تبدیلیاں کر سکتی ہے، اور وہ جو قانون بھی منظور کر لے، قانون اس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ پارلیمنٹ میں بادشاہ بھی شامل ہے، اس لئے کہ بادشاہ کی منظوری تمام قوانین کو رائج کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس قسم کے آئین کے مقابلہ میں تحریری آئین ہوتے ہیں، تاکہ وہ تمام امور جو آئین اساسی کا جزو ہیں قلمبند ہو جائیں اور پھر ان کے متعلق چون و چرا کی گنجائش نہ رہے۔ دنیا کے اکثر ممالک میں اب تحریری آئین کا رواج ہے۔

آئین اساسی کی صرف اسی پہنچ پر تقیم نہیں ہوتی، بلکہ ایک اور صورت بھی ہے وہ یہ کہ آئین اساسی میں تبدیلی کی نہ ہو سکتی ہے۔ اگر آئین اساسی میں تبدیلی کا یہ طریقہ جو کسی معمولی قانون بنانے کا ہوتا تو ایسے آئین اساسی کو ترتیم پذیر کہیں گے اور اگر اس میں تبدیلی کسی خاص طریقہ سے ہی ہو سکتی ہے جو

معمولی قانون بنانے کے لئے استعمال نہیں ہوتا تو اسے استتوار کہیں گے ظاہر ہے کہ استتوار سے استتوار آئین بھی ایسا نہیں ہو سکتا جس میں ترمیم نہ ہو سکتی ہو، لیکن فرق صرف طریقہ کا ہے۔ اگرچہ استتوار آئین کو بھی بدلنے کا طریقہ آسان ہو سکتا ہے لیکن بالعموم طریقہ اس طرح وضع کیا جاتا ہے کہ آئین اسی کی تبدیلی کسی فردی جذبہ کے ماتحت عجلت میں نہ ہو سکے۔

وفاق کا آئین مختلف ریاستوں میں سمجھوتہ کا نتیجہ ہوتا ہے، وہ اپنی سیادت قربان کرتی ہیں اُن کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اُن امور کے علاوہ جن کا مرکزی حکومت کے اختیار میں ہونا ناگزیر ہے اُن کے اختیارات قائم رہیں اور ان اختیارات کو اُن کی مرضی کے خلاف کسی عام جوش کے ماتحت نہ پھینکا جائے، لہذا وفاقی حکومتوں کا آئین بالعموم تحریری بھی ہوتا ہے اور استتوار بھی، ممکن ہے کہ آئندہ چل کر اختیارات کے متعلق جھگڑا ہو، ایسے موقع پر تحریری دستاویزیں شک و شبہ کو کم و فل ہوتا ہے ان ہی وجوہ کی بنا پر وفاقی حکومتوں میں آئیں اساسی کو ایک مقدس میثاق کا درجہ حاصل ہوتا ہے، جس میں ترمیم عجلت کے ساتھ نہیں ہو سکتی اور جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر وفاق ایک وصافی ریاست کو تقسیم کرنے کے بعد وجود میں آیا ہے تو بھی تحریری دستتوار آئین کی ضرورت باقی رہتی ہے اس لئے کہ وصافی حکومت کو تو ذکر وفاق اُسی حالت میں قائم کیا جاتا ہے جب ملک میں ایسے اجزائے موجود ہوں جو جداگانہ اختیارات چاہتے ہوں اور انھیں قائم رکھنا مقصود ہو۔

اس کے علاوہ وفاق میں عدالت کو ایک خاص درجہ حاصل ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ وفاقی حکومت کے لئے آزاد عدالت کا وجود ناگزیر ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اگر ملک میں بیک وقت دو حکومتیں قائم ہیں اور ہر شہری دونوں کا ماتحت ہے تو بعض اوقات مشکلات کا پیش آنا ممکن ہے۔ ممکن ہے کہ کسی معاملہ کے متعلق مقامی یا قومی حکومتوں میں اس امر پر نزاع ہو جائے کہ وہ کس کے ماتحت ہے؟ ممکن ہے کہ مرکزی یا مقامی مجلس آئین ساز ایسا قانون مرتب کرے جو دوسرے کے حقوق میں دست اندازی کرتا ہو۔

ان حالات میں ایک ایسے آزاد ادارہ کی ضرورت ہے جو متنازعہ فیہ امور کا قانونی فیصلہ کر سکے۔ یہی سبب ہے کہ وفاقی حکومتوں میں عدالت کو ایک سیاسی اہمیت حاصل ہوتی ہے، عدالت وفاقی حکومتوں میں آئین کی پاسبان ہے، اُس کی دیانت اور آزادی پر حقوق و فرائض کی تفویض کا دار و مدار ہے۔ لہذا اُسے تمام سیاسی اثرات سے آزاد رکھا جاتا ہے اور اُس پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ جب تک ایک طاقتور عدالت قائم نہ ہو، وفاق کا وجود خطرہ میں رہتا ہے۔

تیسری خصوصیت مرکزی حکومت کی تشکیل سے متعلق ہے۔ عام طور پر مجالس آئین ساز کے دو ایوان ہوتے ہیں، ایک میں براہ راست نمائندگی سے قوم کے نمائندے منتخب ہوتے ہیں جو آبادی کے لحاظ سے منتخب کئے جاتے ہیں، دوسرے ایوان میں ریاستوں یا صوبوں کے نمائندے ہوتے ہیں۔

وفاق میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ تقسیم اختیارات کا ہے۔ اس لئے کہ ہر وفاق میں شہریوں کو دو حکومتوں کے ماتحت رہنا پڑتا ہے، ایک تو مقامی حکومت اور دوسری مرکزی حکومت، اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ دونوں حکومتوں کے اختیارات کو قانوناً بالکل واضح کر دیا جائے۔ عام طور پر ان کا تذکرہ آئین اساسی میں ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ بعض اختیارات کی ایسی نوعیت ہے کہ وہ صرف مرکزی حکومت ہی کی سپرد ہو سکتے ہیں ورنہ وفاق بیکار ہے، ان میں سے بعض کا ذکر غیر مناسب نہ ہوگا۔

(۱) امور خارجہ تمام بین الاقوامی معاملات میں وفاق کی حیثیت ایک ریاست کی ہوتی ہے، لہذا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر جزو دہی ریاست اپنے خارجی امور کو علیحدہ علیحدہ طے کرے۔ تاریخ میں کوئی ایسی

ملہ یہاں براہ راست نمائندگی سے مراد ہے کہ قوم نمائندوں کو ملا واسطہ منتخب کرتی ہے۔ اس میں ایوان انتخاب
ELECTORAL
COLLEGE کے طریقہ کو بھی شامل سمجھنا چاہیئے اس لئے کہ عملاً اس طریقے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ
قوم کے نمائندے ہوتے ہیں اداروں کے نہیں بلکہ جزوی ریاست کی اصطلاح اس مضمون میں ان ریاستوں کے لئے استعمال

ہوتی ہے جن سے وفاق مرتب ہوا ہے *

مثال نہیں ہے کہ وفاق کی ریاستیں خارجی امور میں آزاد ہوں، اگر وفاق کلی نہ ہو، بلکہ جزوی ہو، تو یہی متعدد طریق کار کے لئے ضروری ہے کہ اُس کی خارجی حکمت عملی میں اختلاف و انتشار پیدا نہ ہو۔ اس لئے امور خارجہ ہمیشہ مرکزی حکومت کی سپرد ہوتے ہیں۔

(۱۲) امور خارجہ سے ملحق مسئلہ دفاع کا ہے۔ لہذا بحری بری اور ہوائی افواج پر وفاق کو اختیار حاصل ہونا ہے۔ اس کے بغیر نہ ممکن ہے کہ مرکزی حکومت بین الاقوامی امور میں اختیار و اقتدار کے ساتھ نمائندگی کرے، نہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ جزوی ریاستوں پر اپنا اقتدار قائم رکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وفاق کی ہستی ہی اس طرح قائم رہ سکتی ہے کہ مرکزی حکومت افواج پر قادر ہو اور جزوی ریاستوں کو بغاوت سے روکتی ہو اور غیر ممالک سے اگر جنگ کا موقع ہو تو پوری قوت کے ساتھ اُس میں شریک ہوسکے۔

(۱۳) ایسی خدمات جن کا تمام ملک سے تعلق ہے، مثلاً ڈاک، تار، ٹیلیفون وغیرہ ان کو اگر جزوی ریاستوں یا صوبوں کے سپرد کر دیا جائے تو نظم و نسق میں دشواریاں پیدا ہوں گی اور کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ ان کے ذریعے سے مرکزی حکومت کو آمدنی ہوتی ہے جو ضروری کاموں پر خرچ کی جاسکتی ہے +

(۱۴) امور تجارت جو تمام ملک سے متعلق ہوں، تجارتی قوانین، سکہ، اور افران کی یکسانیت سے اتحاد میں قوت پیدا ہوتی ہے اور تجارت میں آسانی، مفاہیم یگانگت قوم کے تمام اجزاء کو ایک دوسرے سے قریب کر دیتی ہے۔ ایک بڑی ریاست منڈیوں کی تلاش، تجارتی مراعات کے حصول، تجارتی حقوق کے تحفظ، صنعت و حرفت کو ترقی دینے اور جدید وسائل پیدا کرنے میں ہمیشہ زیادہ کامیاب ہوتی ہے۔ اگر ان امور کو صوبوں یا جزوی ریاستوں پر چھوڑ دیا جائے تو یہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔

(۱۵) امور تجارت کے ضمن میں بینک، وسائل آمد و رفت، سڑکیں، ریلیں، بحری، بری اور ہوائی راستوں کی نگرانی، اجارے، وغیرہ بھی آتے ہیں۔ اس میں حقوق تصنیف، ایجا وغیرہ کی حفاظت شامل ہے۔

۱۶ غیر ملکیوں کے حقوق کا تعین، شہری بننے کے قواعد۔ اقلیتوں کی حفاظت، آبادی سے

متعلق دوسرے امور بھی عام طور پر مرکزی حکومت کے سپرد ہوتے ہیں۔ اس میں مذہبی رواداری بھی

شامل ہے۔ یہ وہ امور ہیں جو عام طور پر مرکزی حکومت کی اہمیت میں ہوتے ہیں، لیکن یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ نہ ہو سکتی ہے، اس لئے کہ ہر وفاق میں تقسیم کی تفصیلات میں فرق ہوتا ہے یہاں پر چند ایسے امور کا ذکر کیا گیا ہے جو تمام وفاقوں میں مشترک ہیں۔ اولیٰ تامل سے ظاہر ہو جائے گا کہ یہ امور ایسے ہیں جن کا وفاق کے تمام رقبہ سے تعلق ہے۔ جنوی ریاستوں اور صوبوں کے اختیارات کی فہرست بنانی بہت دشوار ہے، اس لئے کہ ان میں بہت تنوع ہوتا ہے۔ عام طور پر ایسے امور ان کی سپرد ہوتے ہیں جو مقامی طور پر ہی بہتر انجام پا سکتے ہیں، ان میں تنوع کا سبب مقامی حالات میں اختلاف اور تاریخی اغراض ہیں۔ اگر وفاق ایسی صورت میں مرتب ہو کہ جزوی ریاستوں کو اپنے حقوق سے دستبرداری گراں گزرتی تھی تو انھیں نے زیادہ سے زیادہ حقوق جو حفاظت کے ساتھ اپنے پاس رکھے جاسکتے تھے اپنے لئے محفوظ کر لئے۔ اگر وفاق کسی اعلیٰ قوت نے مرتب کیا تو صوبوں اور جزوی ریاستوں کے حقوق کو کم کر دیا۔

حقوق کے تعین کے باوجود ایک حلقہ ایسا رہ جاتا ہے جس میں تعین کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ انسان ہمیشہ نئی کرتا رہتا ہے، جس وقت وفاق مرتب ہوتا ہے اس وقت زندگی کے بہت سے شعبے ظہور پذیر نہیں ہوتے اور ہی نمایاں ہوتے ہیں، بہت سی صورتیں ایسی پیش آتی ہیں جو قانون و ضابطہ کے دلوں کے ذہن میں نہیں تھیں، ان کو اختیارات با قیہ کہتے ہیں۔ اکثر وفاق ان اختیارات کو جزوی ریاستوں یا صوبوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ بعض وفاق ایسے بھی ہیں جو انہیں مرکزی حکومت کی نگرانی میں رکھتے ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہے۔ اگرچہ یہ ماننا پسے گا کہ یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں کہ ان سے مسئلہ کا خاطر خواہ تصفیہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ کون تھا کتاب کے آئندہ جو صورت پیش آئے گی اس کی کیا نوعیت ہوگی؟ لیکن اس کا علاج یہ ہے کہ اختیارات کی فہرست میں وقتاً فوقتاً ترمیم ہوتی رہے۔ بعض ممالک میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ مرکزی و مقامی حکومتوں کو بعض متعین اور بعض غیر متعین امور میں یکساں اختیار دے دئے گئے ہیں، وہ اس امید پر کہ جب مناسب ہو گا آئندہ ظہور میں آتا رہے گا۔ اگر کوئی مسئلہ محض مقامی نوعیت رکھتا ہو

تو مرکز اس میں دست اندازی نہیں کرے گا اور اگر اس کی مرکزی حیثیت ہوئی جس کا ملک سے تعلق ہے تو مرکز اس کے تعلق قانون وضع کرنے کا۔ اس صورت میں دستور اساسی میں مذکور ہوتا ہے کہ اگر کسی مسئلہ پر کوئی جزوی ریاست یا صوبہ کوئی قانون بنائے اور اسی مسئلہ پر مرکز بھی کوئی قانون وضع کرے تو مرکزی قانون کو تفوق حاصل ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت درپودہ تمام اختیارات باقیہ مرکز کی سپرد کر دیتی ہے۔

ایک زمانہ میں یہ تصور کیا جاتا تھا کہ وفاق کے لئے ناگزیر ہے کہ حکومت کے عالم مقننہ اور عدالت کے فرائض میں ایسی راسخ اور سخت تقسیم ہو کہ ایک دوسرے کے کام میں مغل نہ ہو سکیں، بظاہر یہ طریقہ ناگزیر اور مناسب معلوم ہوتا ہے، لیکن فی الحقیقت یہ صورت ممکن نہیں ہے، عالم کو ایسے احکام نافذ کرنے پڑتے ہیں جن کی حیثیت اس وقت قانون سے کم نہیں ہوتی۔ بسا اوقات بعض امور کا فیصلہ بھی کرنا پڑتا ہے جو عدالت کی خصوصیت ہے۔ پھر اگرچہ عالم خود قانون بنانے کا اختیار نہ رکھتا ہو، لیکن مقننہ اس کی ہدایت اور مشورہ سے قانون سازی کا کام انجام دیتا ہے۔ مقننہ کے بعض قوانین وقتی امور کے لئے ہوتے ہیں اور عالم کے احکام سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے اور بعض اوقات عدالت کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں، عدالت تو ظاہر ہے کہ ہر وقت قانون بناتی رہتی ہے اور اس کی نظیریں اور قانون کی تفسیر ہر ملک کے قانون میں ایک بہت اہم مرتبہ رکھتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے فرائض میں کئی تقسیم ممکن ہی نہیں ہے۔ ان ٹکڑوں کے اثر کے ماتحت ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں یہ تجربہ کیا گیا تھا۔ اگرچہ قانونی اعتبار سے یہ طریقہ اب تک قائم ہے لیکن علی طور پر ٹوٹ چکا ہے سیاسی جماعتوں کی قوت نے علم اور مقننہ کی جدائی کو زائل کر دیا ہے۔ عدالت کی آزادی قائم ہے۔ لیکن یہ کہنا غلط ہوگا

EXECUTIVE یعنی حال حکومت جہ قانون کو عملی جامہ پہناتے ہیں (LEGISLATURE)

مجلس آئین ساز (JUDGE MADE LAW) MONTESQUIEU

فرانسیسی فلسفی اور ماہر سیاسیات +

کہ اس کی قوت مقننہ دوسرے ممالک سے ذرہ برابر بھی کم ہے۔

وفاق کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے مفید ہو گا کہ اُن امور پر قدرے غور کیا جائے جو اس کے قیام میں معین ہوتے ہیں، اس لئے کہ ان سے اس کی ضرورت اور فائدہ کا بہتر اندازہ ہو سکے گا۔ وفاق کے قیام کو مندرجہ ذیل اسباب سے تقویت پہنچتی ہے۔

(۱) جزوی ریاستوں کا ایک دوسرے سے ملحق ہونا، اگر ریاستیں دور ہوں تو ان میں اتحاد پیدا ہونا دشوار ہوتا ہے۔ اگر سب کی ارضی ایک ہی سلسلہ میں ہو تو اتحاد و یکا نگت کے جذبات اور مفاہک و یکا نگت بہت جلد پیدا ہو جاتی ہے۔ نظم و نسق میں آسانی ہوتی ہے۔ جغرافیائی قربت سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ کشتی و سائل آمد و رفت و خبر رسانی، و فراعہر حیمہ میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض وقات جغرافیائی بُعد وفاق کے بہتہ میں شدید مشکلات پیدا کر دیتا ہے، مثلاً مسلمانوں کی ابتدائی سلطنت کے مختلف آزاد ریاستوں پر تقسیم ہو جائے گا سب کے برا سبب جغرافیائی بُعد تھا۔ سلطنت برطانیہ کی مختلف مستعمرات کا ایک وفاق میں شامل ہونا اسی وجہ سے دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اب تک جتنے وفاق قائم ہوئے ہیں ان میں یہ جغرافیائی قربت موجود رہی ہے۔

(۲) محض جغرافیائی قربت و ریاستوں کو اس پر شکل سے آمادہ کر سکتی ہے کہ وہ اپنی آزادی سے دستبردار ہو جائیں، جب تک کہ وفاق کی اور وجہ بھی موجود نہ ہوں۔ ان میں سے سب سے زیادہ اہم و فراعہ کی ضرورت ہے، مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکہ کو متحد ہونے پر جس چیز نے زیادہ راغب کیا وہ و فراعہ کا مسئلہ تھا۔ جزوی ریاستوں میں اتنی طاقت کہاں ہوتی ہے کہ وہ بڑی سلطنتوں کا مقابلہ کر سکیں۔ لیکن جب وہ مل کر وفاق بنالیتی ہیں تو ایک عظیم الشان سلطنت معرض نظر میں آ جاتی ہے جیسا کہ امریکہ میں ہوا یا کم از کم اُن کی طاقت میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے جیسا کہ سوئٹزر لینڈ میں ہوا۔ ہندوستان میں و فراعہ کی بہت صلاحیت ہوگی اگر وہ متحد رہے، اگر ہر صوبہ خود مختار ہو جائے تو ظاہر ہے کہ یہ صلاحیت باقی نہ رہے گی۔

(۳) و فراعہ کے برابر ہی اہم اقتصادی و معاشی فوائد ہیں، تجارت کے ذیل میں بعض فوائد بیان

ہو چکے ہیں، اگر جزوی ریاستیں علیحدہ علیحدہ رہیں تو سب کو محصول لینا پڑتا ہے لیکن اگر وہ متحد ہو جائیں تو ایک ہی جگہ محصول لیا جاتا ہے اور تجارت کو اس سے ترقی ہوتی ہے، اور بہت سے فوائد جو پہلے مذکور ہو چکے ہیں رونما ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوا ہے کہ محض اقتصادی مفاد جزوی ریاستوں کو ملانے میں کامیاب ہوئے ہیں، جرمنی کی ریاستوں میں پہلے محاصل کے متعلق ہی اتحاد قائم ہوا تھا، یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ مشرقی یورپ میں بہت سی ریاستوں کے قیام نے اقتصادی و معاشی زندگی کو نقصان پہنچایا ہے،

(۴) سیاسی مقاصد جس طرح ریاستوں کے متحد ہونے سے دفاع میں آسانی ہوتی ہو اسی طرح آبادی، رقبہ، آمدنی اور ذرائع کے جمع ہونے سے دفاع کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے، بین الاقوامی امور میں اُس کی آواز کو وقعت حاصل ہوتی ہے، اور دوسری اقوام میں اُس کی عزت بڑھتی ہے۔ یہ صورت جزوی ریاستوں کو حاصل نہیں ہو سکتی۔

(۵) نسلی امتیازات کو وفاق کے قائم کرنے میں کافی اہمیت حاصل ہوتی ہے، مثلاً امریکہ کو اس وجہ سے آسانی ہوئی کہ اُس کی حکمران قوم بیشتر ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی تھی، ایک نسل کی آبادی کی روایات، طبع نظر، طریق زندگی، جذبات اور خصوصیات میں یکسانیت ہوتی ہے، لہذا اگر چند جزوی ریاستوں میں ایک ہی نسل کی آبادی ہو تو وہ اتحاد و وفاق کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے۔

نسلی امتیاز بعض اوقات وحدانی مملکتوں کو وفاق صورت اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے مثلاً کناڈا کی حکومت وحدانی تھی، وہاں کی آبادی میں اینگلو سیکسن نارڈک اور فرانسیسی لاطینی شامل تھے، ان میں بغض و عداوت کے جذبات موجود تھے، جن میں ہر روز ترقی ہوتی جاتی تھی، لہذا کناڈا کو فرانسیسی اور انگریز صوبوں پر تقسیم کر کے وفاق قائم کر دینے سے یہ عداوت کم ہو گئی اور اب ان میں اتحاد کے جذبات ترقی پذیر ہیں۔ اسی طرح جنوبی افریقہ میں دینیوں اور انگریز بنگالہ کی محسوس کرتے تھے، جسے وفاق

نے بہت کم کرویا ہے اور وفاق کی جگہ اتحاد پیدا کر دیا ہے۔

۴، زبان، ادب اور تمدن نسل کا امتیاز اس قدر نمایاں چیز نہیں ہے، لیکن زبان کا فرق بہت اہم ہے، اگر دو آدمیوں کی زبان مختلف ہو تو ان میں بیگانگی قائم رہتی ہے اور بیگانگی کا پیدا ہونا مشکل ہے، اس لئے کہ بیگانگی تو تبادلۂ خیالات و یکسانی جذبات سے پیدا ہوتی ہے اور زبان کے امتیاز سے ان کا پیدا ہونا دشوار ہے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کو اپنی زبان سے ایسی الفت ہوتی ہے کہ وہ اُسے چھوڑنے پر کبھی راضی نہیں ہوتا، اور زبان ہی پر کیا موقوف ہے؟ وہ لطیف چیز ہے تمدن کہتے ہیں ہر انسان کو عزیز ہوتی ہے اور ہر قوم کا تمدن دوسری قوم سے مختلف ہوتا ہے، ادب، فنون لطیفہ، علوم اور رجحانات سے تمدن پیدا ہوتا ہے۔ یہ تمدن ہر قوم کی عمر بھر کی کمائی ہے اور اُسے چھوڑنے پر کوئی قوم تیار نہیں ہو سکتی، اگر وہ تیار ہو جائے تو وہ خود کشی پر آمادہ ہے، لہذا زبان و تمدن کا اختلاف بھی وہی حکم رکھتا ہے جو نسل اختلاف رکھتا ہے۔ یہی سبب ہو کہ جہاں کہیں بھی ایسی اقوام میں وفاق قائم ہوا جہاں مختلف قوموں کی مختلف زبانیں تھیں اور ان کے تمدن میں فرق تھا، وہاں تمام زبانوں کو تسلیم کیا گیا ہے اور ان میں یکساں درجہ دیا گیا ہے مثلاً سوئٹزرلینڈ میں جرمن، فرانسیسی اور اطالوی، کناڈا میں انگریزی و فرانسیسی، جنوبی افریقہ میں دکنیزی اور انگریزی سرکاری زبانیں ہیں۔

۵، مذہب کی بیگانگی سے وفاق کی تعمیر میں بہت مدد ملتی ہے۔ اور مذہب کا اختلاف جڑی ریاستوں کو متحد ہونے سے روکتا ہے۔ اگرچہ مذہب کو موجودہ سیاست میں وہ اہمیت حاصل نہیں ہے جو پہلے تھی، لیکن یہ تصور کرنا غلط ہو گا کہ مذہب کا اثر سیاست سے بالکل زائل ہو چکا ہے، مذہبی اختلاف اب بھی سیاسی اتحاد کے راستے میں حائل ہوتے ہیں، بالخصوص اگر مذہب کے ساتھ ساتھ نسلی، یا زبان و تمدن کی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں تو مشکلات میں اضافہ ہو جاتا ہے، و مدانی سلطنت میں یہ زیادہ نمایاں ہوتی ہیں، لیکن وفاق میں بھی اکثر جغرافیائی بُعد بھی شامل نہ ہو تو وقتوں میں کمی نہیں

واقع ہوتی۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ جہاں اس قسم کی دشواریاں ہوں وہاں وفاق سے ہی مسئلہ کی حد تک حل ہو سکتا ہے، بالخصوص اگر ان اختلافات کو جغرافیائی حدود میں مقید رکھنا ممکن ہو تو کامیابی کی زیادہ امید ہو سکتی ہے۔

۱۸) بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی سلطنت ایسی نوآبادیاں قائم کرے جو ایک دوسرے سے متحد نہ ہوں اور یکساں طور پر اُس سلطنت کی ماتحت ہوں، اگر ان میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ سلطنت کا تفوق کم کرنا ضروری ہے تو اُس کی مخالفت ان کو متحد کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے، جیسا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہوا۔

اختلافات و یکگانیت کی مندرجہ بالا بحث سے معلوم ہوا ہو گا کہ جہاں کامل اتحاد و دشوار ہوا اور وحدانی سلطنت کا قیام یا وجود مشکل ہو، وہاں وفاق سے دشواریاں دور ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وفاق کی بنیاد اکثر اختلاف پر ہوتی ہے، جہاں اتحاد میں فائدہ نظر آتا ہے لیکن اپنے وجود کو قربان کرنا ممکن نہیں ہوتا وہاں وفاق کا طریقہ کار گر ہوتا ہے۔ لیکن تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ وفاق کے قیام کے بعد یکگانیت کی طرف قدم تیزی سے بڑھتا ہے اور ساتھ رہنے اور مشترک مفاد کی حفاظت اور مشترک دشواریوں کو حل کرنے کی ساعی مختلف اجزاء میں اعتماد و محبت پیدا کرتی ہے، باہمی شبہات کا ازالہ ہوتا ہے اور رشتہ موت مضبوط ہونے ہوتے قوم کی ہستی و یکگانیت کو ایک حقیقت بنا دیتا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کو ایک مرکز پر لانا آسان نہ تھا، لیکن آج امریکن قوم کسی طرح بھی وفاق کو توڑنے پر راضی نہ ہوگی اور جزوی ریاستوں کے وجود سے امریکن قوم کے تصویب کسی قسم کا فرق نہیں آتا۔ اس طرح سوئٹزرلینڈ میں مذہب، زبان، اور نسل کے امتیازات مروج ہیں لیکن وفاق نے تمام اجزاء کو قومیت کے مضبوط رشتہ میں منسلک کر دیا ہے اور اب یہ رشتہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ فرانسیسی بولنے والے سوئس فرانس کے تابع ہو کر رہنا پسند نہیں کریں گے، نہ جرمن اور اطالوی اجزاء جرمنی یا اطالیہ کے ماتحت رہنا پسند کریں گے۔ اس وقت تک تو ایسا ہی ہوا ہے کہ وفاق نے ہندو راج قومیت کے احساس کو ترقی دی ہے اور اُسے زیادہ مضبوط بنایا ہے۔

وفاق پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ طریق حکومت کمزور ہے۔ اختیارات کی تقسیم سے حکومت کو وہ مرکزیت و برتری حاصل نہیں رہ سکتی۔ جو وحدانی مملکتوں میں حاصل ہوتی ہے۔ اور اس وجہ سے حکومت کمزور پڑ جاتی ہے۔ اور موثر طریقہ پر کام نہیں کر سکتی۔ یہ الزام درست نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے کہ اگر اس الزام کا منشا یہ ہے کہ قومی وجود خطرہ میں ہوتا ہے اور وفاق کے ٹوٹنے اور جزوی ریاستوں کے آزاد ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسا اب تک نہیں ہوا ہے اور نہ وفاق میں ایسا ہونے کا کوئی امکان حکومت سے زیادہ امکان ہے، اس لئے کہ وہ طاقت جو مملکت کو تخریب سے بچاتی ہے وفاق میں بھی مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ تخریب کا امکان وحدانی حکومت میں زیادہ ہے۔ اس لئے کہ وہاں اگر کسی فریق کو بے اطمینانی ہو تو اسے رفع کرنا زیادہ دشوار ہے۔ وفاق میں اتنا دشوار نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر کمزوری کے یہ معنی ہیں کہ حکومت اپنے فرائض انجام دینے میں قاصر رہتی ہے تو یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ ایسا تو کہیں نہیں ہوتا کہ تمام امور مرکزی حکومت ہی انجام دے۔ وحدانی حکومتیں بھی مقامی اداروں کو اختیارات تفویض کرتی ہیں۔ لہذا اختیارات کے تعین سے کمزوری کا پیدا ہونا قریبن قیاس نہیں ہو سکتا۔



پندنامہ شغلی کھنی

ارو ادب کے بہت کچھ جاہر پارے انجمن ترقی ارو کی بدولت تباہی سے بچ گئے اور اکثر انمول موتی اب بھی ہماری توجہ کے محتاج ہیں، اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ پندنامہ ہے جس کے مصنف نے خود کو شغلی کہا ہے، شغلی کے متعلق اردو شعراء کے تمام تذکرے خاموش ہیں، دکھنی ادبیات کے ذخیرہ کے مطالعہ سے صرف چند اشعار ایسے ملتے ہیں جو شغلی کے بتائے جاتے ہیں، اس پندنامہ میں ۱۱۰۵ اشعار ہیں ابتدا شغلی کے کلام کا مستقل نمونہ کہا جاسکتا ہے، ان ۱۰۵ اشعار میں سے صرف ۱۰۳ ملتے ہیں شاید دو شعر ضائع ہو گئے،

شغلی کے متعلق میں صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ وہ نصرانی کا ہمصر تھا یا فوراً اس کے بعد پیدا ہوا، کیونکہ یہ پندنامہ نصرانی کی مشہور مثنوی گلشن عشق کے ساتھ ہی شامل ہے، گلشن عشق کا قلمی نسخہ (جس کے لئے میں نواب حبیب الرحمن صاحب شردانی (صدر یار جنگ بہادر) کا شکور ہوں) مسئلہ میں تصنیف ہوا اور مسئلہ میں اس کی کتابت ہوئی اس سے یہ امر یقینی ہے کہ یہ مسئلہ سے قبل کی تصنیف ہو، لیکن صحیح تاریخ کا تعین یقین کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا۔

یہ کسی فارسی پندنامہ کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے۔

سواں وجہ تھی فارسی میں کتاب سوشغلی دکھن سال؛ کیتا شتاب

سبب کیا جو کوئی معنی فارسی نہا تا سو پاوے کیا آرسی

لیکن اس کے متعلق باوجود کوشش کے زیادہ معلومات نہ مل سکیں، اس سلسلہ میں پنجاب کے

اکثر کتب خانے دیکھے، رامپور کے کتب خانہ میں بھی معلوم کیا، کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ جامعہ عثمانیہ، کتب خانہ دفتر دیوانی سرکار نظام میں بھی جستجو کی، ان مقامات میں آصفیہ سے تین غیر مطبوعہ قلمی تذکرے ملے ایک تذکرہ دفتر دیوانی سے ملا کسی فرصت میں انشاء اللہ ان پر بھی کچھ روشنی ڈالی جائے گی شغلی کے

تعلق میری کوششیں جاری ہیں، اگر میں نہ کر سکا تو ممکن ہے کہ یہ سعادت کسی دوسرے کے حصہ میں ہو۔
 اس سلسلہ میں ایک "ذات" کا شکریہ ضروری سمجھتا ہوں جس سے مجھے اپنے کام میں بہت
 کچھ مدد مل جاتی ہے، یہ غالباً نہ شکریہ میرا فرض تھا، اس سے زیادہ کی اجانت نہیں مل سکی، بہر حال۔
 ع حساب دوکستان در دل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پندنامہ

کر یک دن محمد علیہ السلام
 تہاں یک شخص آنی کوٹ سلام
 جو میں آیا ہوں تن قدم کن
 تمیں منج نصیحت کے و فضل
 سو بات سن کر نبی یوں کہے
 تو تب وہی ادا اصحاب کی سلام
 جو میرا ارادہ ہے یوں دل سنے
 جو کرتا اچھوٹ بندگی میں سلام

یے اصحاب بیٹھے مدینہ نام
 کیا بتور کہیں لا گیا یوں کلام
 کہ شہر میں تھے نصیحت رکش
 تو تیں چسکم میں کروں کا غسل
 تیرا بول مقصود ہاں لکٹ اٹھے
 نی سٹوں ہوا پھر کے یوں ہم کلام
 جو طاعت کروں رب کی تعظیم
 کدھی بھی نہ طاعت سوں ہوں جدا
 ملاں ہڈیوں سے ملے کسی وقت۔

ملاں ہڈیوں سے اور نہ کہنے لگا
 ملاں ہڈیوں سے پاس سے ویکنے
 ملاں ہڈیوں سے حکم میں مل کر لگا
 ملاں ہڈیوں سے ملاں ہڈیوں سے
 ملاں ہڈیوں سے ملاں ہڈیوں سے
 ملاں ہڈیوں سے ملاں ہڈیوں سے
 ملاں ہڈیوں سے ملاں ہڈیوں سے

کیا بات و اصحاب ائدہات جب
 جو اقل ہو کے پاک وضو توں ساز
 اگر تو امر رب کا سر پر لیا
 او اصحاب نے یوسنیا بات جب
 جو میں ہو بھلا اس خلق میں رہوں
 سو یو بات سن کر نبی یوں کہے
 تو ہوے گا خلق دوست تیرا تمام
 سو یو بات سننی تا چہ سیدم سوال
 کشادہ ہووے دل جو تیرا تنگھے
 سو اسوجہ دشخص کی کتابیان
 جو کچھ بات تیخ دل میں آوے اگر
 تو تب جا تیرا دل ہوے گا کشاد
 سو یو بات سن وین و اصحاب نے
 صدق یا محمد علیہ السلام
 جو یہ مارا وہا ہے یو اس
 سو یو بات سنکر نبی نے شتاب
 ہے سنگتا حضوری توں ہونی اگر
 بہرے سو سوال کیتا نبی کے سنگت
 میں ڈرتا ہوں رب سوں پہوت کل کچ
 نبی یوں کہے تب اے بندہ خدا
 ظاہر ہو۔ باطن خدا یا ذکر
 سو سنکر نبی یوں کہے بات تب
 جماعت سوں پنج وقت کر توں نماز
 گویا کے شب و روز طاعت کیا
 بٹھے و ستر کیا سوال سدھات جب
 کریں سب قبول بات جو میں کہوں
 اگر چہ خدا ترس ہو توں رہے
 انڈیں پھرے گا تو بہو کر امام
 کیا پھر و اصحاب یوں حال
 ہووے عوم سائل جو تیخ سنگھے
 سو اس کے نبی نے کئے یوں نشان
 تو نا بھول ربوں سدا یا ذکر
 بہتس پر بہوت ہوے گا شادنا
 کیا سوال پھر دیں محمد کیلئے
 بڑا ہے جو مقصد و مہمات تمام
 رہوں ہو حضوری خدا کی انگل آئے
 وئے سوال کا اسکوں پس کر جواب
 تو قرآن تلاوت شب و روز کر
 کہ اے یا خدا کے رسول پاک ذات
 سو یو بات کا بے کہو کیا اعلان
 شب و روز کر یا رب کوں سدا
 تو ہووے گا تب دوست مقبول

بیٹہ یہ سوال بنی کے کیستا اگل
 نبی یوں کہے یا ذکر موت کوں
 کیا سوال پھر یوں بنی کے اگل
 سو یہ بات سن کر نبی یوں کہن
 جو ہنس کھہ ہوے گا خلق سات جب
 تو تب تجھ کو ایمان ہووے گا تمام
 ہے یہ سوال کیستہ میں آگناہ
 بنی تب دئے اسکو یوں کر جواب
 کیا سوال پھر یوں سوں اصحاب
 سو اسکو نبی جواب یوں کر دیتے
 اہے سو اُن پر تو ہو ہر بان
 تو تجھ کو اُن کی دعا سوں ثواب
 کہیا او شخص پھر کے لے یا رسول
 دئے جواب یوں خاتم الانبیاء
 سو اس پاس منگت توں ماستجاب
 کیا سوال پھر کر او در حال دین
 جو سن کر اُٹھے یوں محمد نے بول
 کسی کا یہاں میل نا دھوے گا
 کیا سوال پھر یوں بنی کے اگل
 سبب کیا جو ہوے گا برا وقت
 تو اس وقت پر میں عرش کے تبار

جو ہوئوں میں عاقل خلق سوں گل
 تو عاقل ہووے گا ہر خلق سوں
 جو پاؤں میں ایمان یہ سر اگل
 لگے اس شخص کے نشان یوں کرن
 کرے گا گل سوں میٹھی بات تب
 کہ رحمت عطا ہوے گی صبح و شام
 ہوے دن بدن کم لگوں نیکناہ
 جو تو بہ کیا کر سدا بہ حساب
 جو تجھ کوں نہ ہووے قبر کا عذاب
 جو سکیں غریباں فقیراں بچیتے
 نہ آزاروے اُن پر کر آسان سائن
 ہوے گا نہوے؟ قبر کا عذاب
 جو میری دعا ہوئے ہر دم قبول
 جو تجھ کوں اہے جیو جیتنے دیا
 ہوے گا ہر کام تیرا شتاب
 جو ننگا رہوں تا قیامت کہ نہیں؟
 جو توں سو مناسٹا نکو عیب کھول
 قیامت کوں نا پھر ننگا ہوے گا
 قیامت نہ ہو جائے مجھ پر گل
 سو او وقت سب پہ کیلے کا سخت
 رہوں چھاؤں تل پہ نہ دیکھوں تبار
 بیٹے ہوئے عرش کے تبار

سو لو نقل جب او شخص نے کیا
 اگر کوئی دواپ میں کریں جنگ جہل
 یوں کرتا رہے گا صلح تو سدا
 نبی کی زبانی سنیا بات یوں
 جو اعمال نامہ سفید دھائے کر
 نبی نے دئے جواب اسد ہا سول
 تو تب جاوا اعمال نامہ نچھل
 کیا سوال پھر یوں واصحاب نے
 جو دنیا بے ہووے میرا دل سرو
 نبی نے دئے جواب سدھات سول
 تو تب دل دنیا سوس سرو ہو گیا
 کیا سوال پھر کرجو جگلوں اٹال
 دئے جواب یوں کرنی پاک ذات
 جو رانڈاں یتیمیاں، اسیراں، گدا
 تو تب جا شفاعت تجھے ہوئے گا
 یوسنکرا واصحاب نے سوال یوں
 جو آئے روز محشر کوں دیدار مین؟
 سوسن کرنی جواب یوں کر دئے
 جو ہمسایگان پر کرم کی نظر
 تو تب کین قیامت کوں دیدار توں
 کیا سوال پھر یوں کہ لے پاک تن

سو تسکوں دئے جواب یوں نبیاد
 لڑے تو صلح کر خد اسکے بدل
 تو تج عرش تل چھاؤں دیگا خدا
 بہے پھر سوال کیتا نبی سات یوں
 رہے واہ نی؟ بات مع آئے کر
 جو ماور پد رکوں خوشی راکھ توں
 سیدی بات پر آرہے گا سگل
 نبی کے آن کے رو برو سامنے
 بہے تسیر ہیغہ اچھوٹوں پر درد
 سدا دیکھتا اچھوٹا گورستان توں
 بہوت موم دل پر درد ہوئے گا
 جو ہونا شفاعت تمارا کمال
 کہے یوں واصحاب کے سات بات
 ابے سوانن پر جسم کر سوا
 امن کا درد دکھ اگر کھوے گا
 کیا پھر نبی سات در حال ووں
 خدا دیکھے کا امید وار میں
 نصیحت واصحاب کوں یو کئے
 کیا کر توں احسان امن کے اپر
 دیکھے گا اگر پستے بڑا پکار تو
 کہ دونوں جہاں ہیں رہوں میل سن

دئے جواب یوں کر نبی نے بیاں
 اگر بد زبان تلوں - یکے ناپکے
 کیا سوال پھر یوں کہ اسے یا رسول
 نبی نے دئے جوابِ سعادت سنا
 جو توں اپنے نفس پر قہر کر
 نینٹ میں اٹھ لیا کے روزِ ارزار
 کیا سوال پھر یوں کہ اے پاک تن
 نبی یوں کہے پھر واصحاب سوں
 شریک ہوئے گا درویشِ آن کر
 نبی سوں ہوا پھر کے یوں ہم کلام
 دئے جواب پھر کہ نبی تاجِ ادا
 کبھی نابدل توں جھوٹ نقصان ہے
 تو تہ کیں فلق دوست ہو گاتام
 سو یو بات سن کر نبی کے اگل
 جو جھکے دیکھے غضب سوں خدا
 سو یو بات سن کر نبی یوں کہے
 تو طاعتِ عبادت کیا کر سدا
 سو یو بات سن کر کیا دیں سلام
 جو میں آب کوثر کا پیتا رہوں
 کہے یوں محمد علیہ السلام
 تو تہ آب کوثر کا ہوے گا عطا
 جو مت بول، قید کرتوں زباں
 تو ہر دو جہاں میں امن تے رہے
 جو تو پر پڑے رب کینے منیع قبول
 عا میری (جھ)
 کہے یوں واصحاب کے سات بات
 ہمیشہ خدا کے تعالیٰ سوں ڈور
 تو تو قبولِ حج کرے گا غفار
 مآ آ نکھینڈ آنسو لاکر
 جو ہوئے نہ مرنے میں منہ جاں کنڈ
 جو جا پوچھ ہر ایک بیمار کوں
 تو نا ہوے گی جان کنڈن حج اپر
 جو میرا ہونے دوست عالم تمام
 جو بد کام سوں توں ہو پرہیزہ گام
 عمل نیک کر کچھ کہ انسان ہے
 جو ان میں رہے گا تو ہو نیک نام
 کہن لا گیا یوں بیان کر سگل
 رکھے اپنے جسم میں سب سدا
 اگر غضب سوں رب کے ڈرتا ہے
 تجھے غضب ناک کچھ کرے گا خدا
 نبی سوں ہوا پھر کے یوں ہم کلام
 عمر ہوا بد لکٹ میں جیتا رہوں
 دے پیا سے کوں پانی بھوکے کٹ علم
 عمر ہو جسے محاسد ابے خطا

ہے بعد از نبی نے نے یوں جواب
 امت کو محمد علیہ السلام
 سو پند نامہ سننے تو اب
 اگر کوئی دیکھے اسے بھر نظر
 اگر کوئی اس کو پڑے گا تمام
 اگر کوئی اس پر کرے گا عمل
 سو اس وجہی ناری میں کتاب
 سبب کیا جو کوئی معنی ناری
 ہوئے ایک سو پانچ بیتاں تمام

کہ واللہ علم بالصواب
 نصیحت کے پند نامہ تمام
 ہے اتنا جہنم کوئی عذاب
 تو گویا نبی کو آدھکا بشر
 کہ دوزخ کی ہے آتش اس کی تمام
 سواد ہوئے گا خاص بندہ اہل
 سوشلی و کمن سال کیتا کتاب
 نپا تا سو پاوے کیا آری
 ز صدق محمد علیہ السلام

عک صاف - ظاہر

محکمیتِ نسواں

عورتوں کے ساتھ مساوات کے سوال میں ایک بات اور مضمر ہے جس کا میں آسانی کے ساتھ دوسروں کو قائل کر سکتا ہوں۔ میرا قول یہ ہے کہ چونکہ دنیا میں لوگ عورت کو خائنی فضا میں تیار رکھنا چاہتے ہیں اسی لئے اُن کو زندگی کے کسی شعبہ میں قدم رکھنے نہیں دیتے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس زمانہ میں جبکہ سیاسی خیالات اس قدر اشاعت پا رہے ہیں اور معاشیات کا چرچا جزو سیاست ہو رہا ہے، شاید ہی کوئی ایسا ہوتا جو دنیا کی نصف آبادی کو اکثر اقسام کی پیشہ وری اور تقریباً تمامی اعلیٰ معاشرتی فائدوں سے محروم رکھنا گوارا کرتا، اور یہ جائز رکھنا کہ جو کاروبار احمق سے احمق یا ادنیٰ سے ادنیٰ مرد کے لئے ہنر ہو سکتا ہے وہ لایق سے لائق عورت کے لئے عیب قرار دیا جائے، اور مرد کے لئے صرف اس لئے مخصوص کر دیا جائے تاکہ وہ عورت کا حاکم بنا رہے۔ دوسری پیشتر تو عورت کی نااہلیت ثابت کرنے کے لئے صرف یہ کہہ دینا کافی سمجھا جاتا تھا کہ وہ ہمیشہ سے نااہل مانی جاتی رہی ہے۔ کیونکہ اُس وقت تک یہ بات بھی پیش نہیں کی گئی تھی کہ عورت کا ذہن مرد کے ذہن کے برابر نہیں ہے۔ اب بالآخر یہ جیلد پیدا کیا گیا ہے کہ عورت کو مرد کے برابر درجہ دینا سوسائٹی کے مفاد کے خلاف ہے۔ دیابوں کہنے کہ مرد کے مفاد کے خلاف ہے، اور یہ بالکل وہی صورت ہے جیسے حکومت کے بے پایاں اختیارات کے خلاف جب کوئی آواز بلند کی جاتی ہے تو اقتدار پسند اور حکومت پرست لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ایسی تحریک مفادِ سلطنت اور سیاسی مصلحت کے خلاف ہے اور اس طرح حکومت والوں کے لئے شدید سے شدید افعال و اعمال بھی جائز ہو جاتے ہیں۔ یہ زمانہ تو وہ ہے کہ قوت جہاں کہیں کام کرتی ہے بیٹھی چھری بن کر کام کرتی ہے۔ اور جب کبھی اندازِ ظلم اختیار کرتی ہے تو یہی پکار رتی جاتی ہے کہ میں انصاف اور سہجہ و دی کی دیوی ہوں۔ عورت کے لئے جب کوئی چیز حرام قرار دی جاتی ہے تو کہا بھی جاتا ہے کہ اس چیز کو اُس کے لئے جائز کرنا خود اُس کی زندگی تباہ کرنا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو لوگ اس طرزِ تقریر کے عادی ہیں وہ تجربہ کی روشنی

میں کوئی استدلال پیش کریں۔ اگر یہی بات ہے کہ عورتیں فی الجملہ مردوں کے مقابلہ میں ہر کام کے لئے نااہل ثابت ہوئی ہیں تو آئینہ بھی جب مرد کے بالمقابل آئیں گی ناکام رہیں گی۔ اور جس شبہہ زندگی میں ناکام نہیں گی اُس میں قدرِ ثنائی کی تعداد از خود کم ہو جائے گی۔ اس میں سوسائٹی کا کچھ نقصان نہیں ہے۔ اور تجربہ کی رو سے یہ ماننا ہو گا کہ احمق سے احمق اور کمزور سے کمزور مرد ذی فہم اور توانا عورت کے مقابلہ میں سوسائٹی کے مفاد کے لحاظ سے فی الجملہ قابلِ ترجیح نہیں مانا جاسکتا۔ مقابلہ ہی وہ چیز ہے جس میں اہل اور نااہل کی تیز فہم لفظِ نظر سے ہو سکتی ہے۔ جو لوگ عورتوں کی مخالفت کرنے پر تلے ہوئے ہیں اُن کو بھی اس زمانہ میں ماننا پڑے گا کہ خاص کر آج کل عورتوں نے جو بھی کام انجام دے ہیں اُن میں واقعی وہ مردوں سے کسی طرح کم نہیں رہیں۔ گو یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ بعض کاموں میں وہ ماہرین کا مقابلہ نہیں کر سکتیں لیکن ان کی یکی بالعموم کسی ذہنی کمزوری کی وجہ سے نہ تھی۔ یہ بات دوسری ہے کہ انھیں وہ آسانیاں نہ حاصل ہوئی ہوں جو مردوں کے لئے عام طور پر موجود ہیں۔ کیا یہ ظلم نہیں؟ اور کیا خود یہی اہم سوسائٹی کے مفاد کے خلاف نہیں کہ عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں کریدان عمل میں آنے سے طرح طرح سے روکا جاتا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ بہت سے ناکارہ مرد دنیا میں اس وجہ سے منتخب ہو گئے ہیں کہ اُن سے بہتر عورتیں اُن کے مقابلہ میں نہیں آنے دی گئیں؟ سوسائٹی کا کیا اسی میں فائدہ ہے کہ لائق اور نالائق میں تمیز نہ کی جائے؟ کیا نصفانہ مقابلہ اسی کا نام ہے؟ کیا اعلیٰ ذمہ داریوں کو اپنے سر پر لینے کے لئے دنیا میں اتنے مڑکل آئے ہیں کہ لیاقت اور نالائقی کا سوال ہی دنیا سے ناپید ہو رہا ہے؟ کیا مردوں کی صلاحیت پر ہم کو اس قدر عقیدہ رکھنا چاہیے کہ ہم اپنی نصف آبادی کو کار و دنیا انجام دینے میں بالکل فراموش کر دیں اگرچہ اُس نصف آبادی سے ہم کو لایق سے لائق افراد کے ملنے کی توقع ہو سکتی ہے؟ مقتضائے انصاف کیا ہے اور منفعتِ خلق کا امکان کس صورت میں زیادہ ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ کسی گروہ پر یہ پابندیاں عاید کرنا کہ اُس کے افراد مثلاً طبیب نہ بن سکیں یا وکالت نہ کر سکیں یا قانون سازوں میں شامل نہ کئے جائیں یہ فقط اُن ہی کے ساتھ نا انصافی نہیں بلکہ اُن لوگوں کی بھی حق تلفی ہے جنھیں اہلکار یا دیکلوں کی ضرورت ہے اور قانون ساز جماعتوں کے لئے اپنے نائب منتخب کرنا ہیں مقابلہ کو کسی خاص گروہ کے لئے مخصوص

کرنا مقابلہ کے فوائد سے دنیا کو ایک حد تک محروم کرنے کے مرادف ہے۔

عورتوں کا حق انتخاب اپنے استدلال کے ضمن میں میں جرنیات کو صرف اس حد تک شامل کرنا چاہتا ہوں کہ عورت کے سیاسی حقوق کے تعین میں مدولے۔ کیونکہ جب ان حقوق پر روشنی ڈالی جائے گی تو زندگی کے دو شعبوں میں بھی عورتوں کی صلاحیت اور استعداد کا کچھ نہ کچھ اندازہ پہلی ہی نظر میں آسانی سے ہو سکے گا۔ ان حقوق سے میری مراد عورتوں کے حقوق رائے و ہندگی سے ہے جو مینوسپلٹی یا پارلینٹ کے امیدواروں کو منتخب کرنے میں اب تک عورتوں کو حاصل نہیں ہوئے ہیں۔ عورتیں دو طرح سے ان انتخابات میں حصہ لے سکتی ہیں۔ ایک تو خود اس انتخاب میں بطور امیدوار کے مقابلہ کے لئے کھڑی ہو کر اور دوسرے مقابلہ کرنے والوں میں سے کسی امیدوار کے حق میں لئے دے کر ان دونوں صورتوں میں بڑا فرق ہے۔ اپنے لئے اپنے حکمرانوں کے منتخب کرنے کا حق سیاسی دنیا میں ابھی تک صرف مردوں کو حاصل ہے۔ لیکن اصولاً قانون نے اس حق کو عورت کے لئے یوں تسلیم کر رکھا ہے کہ اُسے اپنے دنیاوی آقا یعنی شوہر کے انتخاب کی کامل آزادی دے دی ہے اور قانونی زبان میں کم از کم کہا یونہی جاتا ہے کہ عورت اپنا بڑوٹھونڈھنے کے لئے بالکل آزاد ہے۔ یہ انتخاب درحقیقت اُس شریک زندگی کا انتخاب ہے جو زندگی بھر اُس کا حکمران بنا رہے گا۔ اب جن شرائط اور قیود کے ساتھ مردوں کو حق رائے و ہندگی قانون نے عطا کیا ہے اُن شرائط اور قیود کے ماسوا کوئی پابندی اس حق کے بارے میں عورتوں کے لئے کسی طرح جائز نہ ہونا چاہئے جس طبقہ اور جس حیثیت کے مرد اس حق کے استعمال کے اہل ہیں اسی طبقہ اور حیثیت کی عورتیں کیوں اس حق سے محروم قرار دی جاتی ہیں۔ اُن کو یہ حق اس لئے چاہئے کہ وہ اپنی سیاسی مساوات کی طرف سے مطمئن ہو جائیں۔ اس سے بہتر کوئی ضمانت اُن کے حقوق کی نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ عورتوں کی آزادی کے باب میں مجھ سے اتفاق نہیں رکھتے انھیں کم از کم اس سیاسی مسئلہ میں میری تائید کرنا چاہئے کیونکہ اگر عورت کو واقعی غلامی میں رکھنا ہے تب تو اور بھی ضرورت ہے کہ اُن کی حفاظت کی جائے تاکہ جس قدر اُن کو پسینا منظور ہے اُس سے زیادہ وہ نہ پڑی جائیں۔ غلاموں کے لئے ان کے آقاؤں نے جو حفاظت کے طریقے قانون

میں مقرر کئے ہیں وہ ہمیں معلوم ہیں۔

اہلیت اور ذمہ داری | اس مسئلہ پر کہ عورتیں کس قسم کے پیشہ کی اہلیت رکھتی ہیں، میں پہلے ہی کہ چکا ہوں کہ یہ ایک علمی سوال ہے۔ جب کوئی عورت کسی کام یا منصب کے لئے اپنے کمپوز کرے گی تو امید ان میں اپنا امتحان خود دے گی۔ اگر وہ کامیاب ہوئی تو یہی اُس کی اہلیت کی دلیل ہے۔ خواہ وہ کسی پیشہ میں سربراہ اور وہ بننا چاہے یا کسی انتخاب میں کامیاب ہو لیکن نظام قانون بہر کیف وہ ہونا چاہئے جو نااہل کو ذمہ داری سے دور رکھے۔ جو قوانین عورتوں کے لئے ترقی کی راہ مسدود کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں اگر اس اصول پر مبنی ہیں کہ قابل عورتیں صرف مستثنیات کے طور پر شمار میں آتی ہیں تو ان مستثنیات کے ساتھ نا انصافی کیونکر جائز ہوگی؟ میں تو کہتا ہوں کہ انہی مستثنیات سے یہ یکجہاں باطل ہوتا ہے کہ عورتیں کسی لاپت نہیں۔

عورتوں کی ذہنی کمزوری | اب میں چاہتا ہوں کہ عورت اور مرد میں دماغی قوت اور ذہنی قابلیت کا جوفرق بتایا جاتا ہے اُس کی وجہ بتانے کی کوشش کروں۔ اس ضمن میں عورت کی جو کمزوری دکھائی جاتی ہے اُس سے مجھے فی الجملہ انکار نہیں۔ لیکن جن حالات میں عورتیں اب تک پرورش پاتی رہی ہیں اور ان کی تعلیم سے جو بے توجہی برتی گئی ہے یہ اُس کا نتیجہ ہے کہ اکثر عورتیں ذہانت اور عالی دماغی میں اکثر مردوں سے کم ہیں۔ دونوں جنسوں کا یہ فرق کوئی فطری فرق نہیں نہ ان کی ذہنیت اور سرشت کے متفرق ہونے کا نتیجہ ہے۔ عورت کو جس حال میں ہم پاتے ہیں اُس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ اُس سے آگے ترقی نہیں کر سکتی محض غلط ہے۔ جو کچھ اب تک دنیا میں عورتوں نے کر دکھایا اُس سے تو یہ ضرور ثابت ہوا کہ وہ کس حد تک کس بات کی اہل تھیں۔ لیکن اب تک جو کام ان سے لئے ہی نہیں گئے اور جن باتوں سے وہ برابر روکی جاتی رہی ہیں اگر ان میں وہ پوری نہیں اترتیں تو اُس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ نااہل ہیں درست نہیں۔ یہ سمجھ لینا کہ چونکہ عورتوں میں کوئی بڑی شاعرہ یا فلسفہ دان وغیرہ کبھی نہیں ہوئی اس لئے آئندہ بھی پیدا نہیں ہو سکتی ایک لغو بات ہے۔ نامزد از رائیہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مسئلہ ہنوز غور طلب ہے اور بحث کا محتاج ہے۔ لیکن اس میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے کہ ملک

الزہتہ اور جون آف آرک صنف اناث سے تھیں جو ملک کے انتظام میں یا حریت پرستی میں اپنا اپنا نام لگائیں۔ یہ تو تاریخی بات ہے جس میں خیال اور رائے کو دخل نہیں جس سیاست میں عورتوں نے اپنی قابلیت کا ثبوت دیا ہے اُسی سیاست میں وہ تامل و تاہل اور حقوق سے محروم قرار دی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عورتوں کو شیکسپیر کے ایسے شاعرانہ مضامین قلمبند کرنے میں کوئی قانون حائل نہ تھا اور پھر بھی وہ شیکسپیر کے برابر شاعر اپنی صنف میں نہ پیدا کر سکیں۔ لیکن لایق غور تو یہ ہے کہ ملکہ الزہتہ یا ملکہ وکٹوریہ کو تاج و تخت اگر ورثہ میں نہ ملا ہوتا تو ادنیٰ سے ادنیٰ سیاسی خدمت یا ذمہ داری کا اُن کے سپرد ہونا ہرگز نہ گوارا کیا گیا ہوتا۔ اور نہ اُن دونوں میں سے کسی کو اپنی بے مثل قابلیت کے ثبوت کرنے کا موقعہ ملا ہوتا۔ بلکہ اُن کا شمار بھی دنیا کی درناہل عورتوں میں کیا جاتا۔

عورت کی انتظامی قابلیت | محض تجرہ ہی پر مدار و مدار ہو تو میں یہ کہوں گا کہ دنیا نے عورتوں کو اُسی چیز کی ذمہ داری سے محروم کر رکھا ہے جس کی صلاحیت اُن میں خاس کر موجود ہے۔ زندگی کے وہ شعبے جن میں کامیابی حاصل کرنے سے قانون نے بظاہر اُن کو کبھی نہیں روکا اُن کی جانب توجہ کرنے کے بجائے انھوں نے کسی نہ کسی وجہ سے ہمیشہ انتظامی معاملات میں زیادہ کامیابی حاصل کی۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ دنیا کے فرمان رواؤں میں مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہے لیکن قابلیت سے حکمرانی کرنے والوں میں عورتوں کی تعداد نسبتاً بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے بہت سی ایسی گزری ہیں جنھوں نے نہایت نازک وقت میں اپنے تاج و تخت کو سنبھالا۔ اور ایسے ایسے کار نمایاں کئے جو بالعموم عورتوں کی رواج پسندی اور توہم پرستی کے دیکھتے ہوئے اُن سے بہت بعید تھے۔ انھوں نے قابلیت کے ایسے جوہر دکھائے کہ اُن کی حکومت نہایت ضابطہ اور استحکام کے ساتھ قائم رہی اور اُن کے احکام فرمانت کا بہترین نتیجہ ثابت ہوئے۔ عورت نہ صرف ملکہ یا حکمران کی حیثیت سے کامیاب ہوئی بلکہ جب کبھی اُس کو ولیہ یا متولیہ کا درجہ دیا گیا تو بھی اُس نے اپنی انتظامی قابلیت کے بے مثل جوہر دکھائے۔ یہ امور اس قدر ناقابل انکار ہیں کہ عرصہ ہوا ایک مرتبہ ایک

سلطہ یہ صرف مغربی دنیا ہی میں نہیں بلکہ مشرق کو لے کر مشلاہندوستان کی جن ہندو ریاستوں میں عمدہ نظام (قدیم و جدید)

صاحب جو اس حقیقت کی تردید کرنا چاہتے تھے بے ساختہ کہہ گئے کہ بادشاہ سے تو ملکہ ہی اچھی کیونکہ بادشاہ کی آڑ میں عورتیں حکومت کرتی ہیں لیکن ملکہ کی آڑ میں مرد! میں جانتا ہوں کہ ایسے بے تکے مزاحیہ فکروں پر بحث کرنا ایک بیکار سی بات ہے۔ لیکن ایسی باتوں کا اثر لوگوں کی طبیعت پر ضرور پڑتا ہے۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ یہ غلط ہے کہ بادشاہوں کی آڑ میں عورتیں حکومت کرتی ہیں۔ تشکیلات کی بات اور ہے لیکن کمزور فرمانرواؤں کی کمزوریاں فقط زن مریدی ہی کے باعث نہیں ہوتیں بلکہ خوشامد غرے مردوں کی خوشامد کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ زن مرید بادشاہوں سے اگر زیادہ امیدیں وابستہ نہیں ہو سکتیں۔ لیکن اس کے خلاف شالیں بھی موجود ہیں۔ اور ان صورتوں پر خاص کر نظر کرنا چاہئے جن میں بادشاہوں نے اپنے اختیارات کسی عورت کو تفویض کر دئے ہوں۔ مثلاً چارلس ششم جو اپنے نامور باپ لوئی یازدہم کی وفات کے وقت نوعمر تھا مگر اُس نے باپ کی دوراندیشی نہ وصیت

(بقیہ صفحہ سابقہ) حکومت جاری ہے ظلم و تعدی کے بغیر امن و امان قائم ہے زراعت ترقی پر ہے اور لوگ خوش حال ہیں ان میں ۱۷ ویں صدی آپ ہی پائیں گے کڑاں کوئی عورت برسر اقتدار ہے یہ بات میرے لئے کچھ توقع کے خلاف تھی لیکن ہندو ریاستوں کی بابت میں نے یہ قدرتی معلومات بہت و مناحت کے ساتھ حاصل کی ہے۔ ہندو عورت کو اصولاً بادشاہت نہیں دیتے لیکن ہوتا ہے کہ بعض رؤسا اپنے جودا و عیش پسندی کی وجہ سے عریضی کو پہنچنے سے پہلے ہی اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتے ہیں جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ان کی گدی کسی نابالغ بچہ کو ملتی ہے اور نابالغ کی ماں عموماً اُس تیم کی ولیہ کے طور پر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ چنانچہ جب اس صورت حال پر نظر کیجئے کہ ان عالی خاندان خاتین کو کبھی محل کے باہر کی ہوا بھی نہیں لگی ہے نہ انھیں بجز اپنے خاص عزیزوں کے دنیا کے کسی مرد سے دوہد و گفتگو کا موقع ملا ہے بلکہ وہ ان پڑھ ہوتی ہیں اور اگر لکھ کچھ بھی سکتی ہیں تو ان کی زبان میں وہ کتابیں نہیں ہوتیں جن کے ذریعہ سے وہ سیاسیات کو بطور علم کے حاصل کر سکیں تب حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی کہ ان دشواریوں کے باوجود ان کی قدرتی صلاحیت ان کو انتظامی معاملات میں کس قدر جلد ماہر بنا دیتی ہے۔

بوجب ایک مدت تک اپنی ماں کو سلطنت کا مختار بنائے رکھا۔ فرانس کا ایک بادشاہ سنٹ لوئی تھا جو شہنشاہ
 میگیگی کے بعد سب سے زبردست اور بہترین فرمانروا گذرا ہے۔ ایک عرصہ کے لئے اُس نے اپنی
 بہن کو تمامی اختیارات سلطنت دے رکھے تھے۔ یہ وہ فرمانروا ہیں جو اپنے اپنے زمانہ میں اپنے
 معاصروں میں سب سے بہتر حکمران خیال کئے جاتے تھے اور ان کے زمانہ کا سا زمانہ شکل سے کسی
 ملک کو ملتا ہے۔ اسی طرح شہنشاہ چارلس پنجم کو لیجے جو اپنے وقت کا سب سے بڑا مدبر مانا جاتا ہے۔
 اُس کے دربار میں جتنے لائق و فائق لوگ تھے شاید ہی کسی فرماں روا نے جمع کئے ہوں۔ یہ وہ حکمران تھا
 جس نے شاید کبھی ذاتی نفع کے آگے جذبات کی پروا نہیں کی۔ لیکن اسی شخص نے اپنے خاندان کی دو
 شہزادیوں کو یکے بعد دیگرے ولایت ندرلینڈ دہالینڈ کی گورنری پر مامور رکھا۔ یہاں تک کہ اُس کے
 انتقال کے بعد ایک تیسری شہزادی وہاں پھر اسی عہدہ پر ممتاز ہوئی اور ان سے ایک دشہزادی رگریٹ
 آف آسٹریا تو اپنے زمانہ کی سب سے بڑی سیاست دان بھی جاتی تھی۔ یہاں پر ایک بات تو ختم
 ہوگئی۔ اب یہ قول لیجئے کہ عورتوں کے پردہ میں مرد حکمرانی کرتے ہیں تو فی الجملہ اس پر بھی وہی
 حجت صادق آتی ہے جو پہلی بات کے ضمن میں بیان کی گئی۔ اس قول کا بھی منشا گویا یہی ہے کہ
 عورتیں جب حکمران بنتی ہیں تو ان ہی لوگوں کے ذریعہ سے حکومت کرتی ہیں جو ان کی ذات کے لئے
 راحت رساں ہوتے ہیں۔ لیکن عورتوں کے بارہ میں ایسی مثالیں بہت شاذ ملیں گی۔ اس بارے
 میں سب سے زیادہ بے اصول ملکہ کیتھرین ثانیہ کہی جاسکتی ہے لیکن اُس کے زمانہ میں بھی
 شاذ ہی یہ صورت دیکھی گئی۔ اور اس عورت کی مثال میں بھی یہ بات نہیں پائی گئی کہ اس کی حکومت
 کی جو خوبیاں تھیں وہ کچھ مردوں کی کارگزاری کا نتیجہ کہی جاسکیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ کسی عورت
 کے راج میں انتظام حکومت اگر اچھا ہوتا ہے تو اس لئے کہ سارا انتظام لائق اور منتخب مردوں
 کے ہاتھ میں ہوتا ہے تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ اس جن انتخاب کی داؤد کس کو دیجئے گا؟ پس عورت اگر
 بحیثیت حکمران کے اپنی قابلیت کی بنا پر کامیاب ہو سکتی ہے تو میرے نزدیک وزارت کا عہدہ
 بھی اُس کے لئے نہایت موزوں ہو سکتا ہے، کیونکہ نہ صرف انتظام حکومت بلکہ حکام کو منتخت کرنے کا

کام عموماً وزراء، بلکہ وزیر اعظم کے سپرد ہوا کرتا ہے۔ اور سلطنت کے مختلف صیغوں میں اچھے حکام کا تقرر ہی امور عامہ کی بہتری کی ضمانت ہوا کرتا ہے۔ یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آدمی کی سیرت جس قدر جلد عورت پہچان لیتی ہے مرد نہیں پہچانتا۔ مرد پر عورت کو یہ ایک ایسی فوقیت حاصل ہے کہ اُس کے حسن انتخاب کا یقین دلا سکتی ہے اور یہ وہ بات ہے کہ ملکی انتظام میں اس کا لحاظ سب باتوں سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ تاریخ اس قضیہ کو ثابت کر چکی ہے۔ لیکن یہ بھی تاریخ ہی سے ثابت ہے کہ جن عورتوں نے اپنے طرز حکومت کی خوبی میں نام پیدا کیا اور جن کا شمار با اقتدار فرمانرواؤں میں ہوا وہ وہی تھیں جو عنان حکومت واقعی اپنے ہی ہاتھ میں رکھتی تھیں اور اپنے عائدین کے حسن انتظام کی داد خود لیتی تھیں۔ اور اگر انہوں نے کسی کی اچھی صلاح پر کان دہرے اور عمل کیا تو یہ ثبوت اس بات کا ہو کہ خود ان کی رائے صائب تھی اور اچھی صلاح اور مشورہ کے مطابق قائم ہوا کرتی تھیں۔

اب یہ بالکل قرین عقل ہے کہ جوام ترین سیاسی امور کو انجام دینے کے لائق ہو سکتا ہو وہ بدرجہ اولیٰ چھوٹے چھوٹے سیاسی مسئلوں میں بھی دخل دینے کے لائق ہو سکتا ہے۔ کیا اس کا بھی کوئی وجہ سمجھ میں آ سکتی ہے کہ دنیا کے بادشاہوں کی مائیں اور بہنیں جب اپنے بیٹوں اور بھائیوں کے فرائض انجام دینے میں کامیاب ہوئی ہیں تو دنیا کے بڑے بڑے سیاسی لوگوں، باسیقہ مالکوں، کمپنیوں کے کارکنوں وغیرہ کے گھرانوں کی عورتیں اپنے مردوں کا کام کرنے سے یکسر قاصر رہیں گی؟ اگر ایسا ہو بھی تو اُس کا اصلی سبب ظاہر ہے۔ وہ یہ کہ شاہی خاندانوں کو جو برتری عوام پر حاصل ہوتی ہے اُس کا مقتضا یہ بھی ہوا کرتا ہے کہ اُن میں مردوں اور عورتوں کی تعلیم و تربیت میں نسبتاً زیادہ فرق نہیں ہونے پاتا۔ بلکہ اُن میں عورتوں کو اکثر ان فرائض کے انجام دینے کا موقع ملا کرتا ہے۔ ان کو سیاست سے چنداں دور نہیں رکھا جاتا۔ کیونکہ نہ معلوم کونسا وقت آجائے کہ انہیں اپنے خاندان کی کوئی سیاسی خدمت انجام دینا پڑے یا تخت سلطنت پر ٹنگن ہونے کی دعوت دے دی جائے۔ اور غالباً یہی وہ طبقہ ہے جس میں زن و مرد میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی اور یہی وجہ ہے کہ امور سلطنت میں کسی خاندان کی شہزادیاں شہزادوں سے کم نہیں ثابت ہوتی۔

عورتوں میں دنیا میں جو کچھ تجربہ بتاتا ہے وہ تو یہی ہے، اور یہی صورت اُن کی قائم ہے گی
 کارپردازی کی یا نہیں، یہ میں کچھ نہیں کہتا۔ البتہ یہ ضرور کہتا ہوں اور بار بار کہہ چکا ہوں کہ عورتیں
 صلاحیت جو کچھ اب ہیں یا ہو سکتی ہیں وہ محض اس لئے نہیں کہ ان کی فطرت میں کوئی خاص

کمزوری ہے۔ اب تک تو فی الجملہ اُن کا وجود ایک غیر فطری فضا میں رہا ہے جس سے اُن کی ہر کم کی
 باڑھ مرتی رہی۔ اور میرا خیال یہی ہے کہ اگر اُن پر رسوائے اُن پابندیوں کے جو معاشرت انسانی کے
 حالات کے لحاظ سے بالکل ناگزیر ہیں، پابندیاں عاید نہ ہوں تو جہاں تک عمل کا تعلق ہے فی الجملہ ان میں
 اور مردوں میں کوئی اہم فرق بالآخر نہ پایا جائے گا۔ میں آگے چل کر اس کا کچھ اور ثبوت بھی دوں گا مگر
 میرے نزدیک یہ بھی کافی یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی اقتاد بلع پر نسبت مردوں کے
 زیادہ عاملانہ اور اُن میں کارپردازی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بات صرف روز مرد کے تجربہ سے نہیں بلکہ
 تواریخ سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ کسی ہوشیار عورت کی خصوصیات اور اُس کی دماغی قابلیت پر
 غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ ایسی سب عورتیں بہت کام کی اور بڑی کارپرداز ہوتی ہیں۔ عام لوگ
 جس چیز کو ”عورتوں کا علم غیب“ کہتے ہیں دیکھ کسی بات کا پہلے سے از خود معلوم کر لینا یا
 اندازہ سے پتہ لگا لینا یہ اصل میں عورت کی حاضر دماغی اور قوت فیصلہ کی صحت کا نتیجہ ہوا کرتا ہے
 کیونکہ عورت کی نظر ہمیشہ سامنے کی باتوں پر نسبتاً زیادہ ہا کرتی ہے۔ دنیا میں کسی شخص نے سائنس
 کا کوئی کلیہ اس طریقہ پر تو کبھی نہ معلوم کر لیا۔ نہ کبھی کسی نے فرض شناسی اور دورانہشی کا کوئی قضیہ
 اس طرح سے دریافت کیا۔ یہ تو وہ چیزیں ہیں جو آہستہ آہستہ عام تجربہ اور احتیاط کی بدولت انسان
 پر منکشف ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے عورتوں کا ”علم غیب“ صرف اُن تجربات کا نتیجہ ہوا کرتا ہے جو انہیں
 اپنی ذاتی نظر اور مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر عورتوں کو دوسروں کے تجربوں سے اُسی
 طرح بغیر روک ٹوک کے نفع پہنچنے لگے جیسے مردوں کو پہنچتا ہے تو اُن کی حاضر دماغی اور سامنے کی
 باتوں پر نظر رکھنے کی طینت اُن کو وہ فائدہ پہنچائے جو عموماً مردوں کو بھی میسر نہیں۔ اور یہ چیز اُن کو
 دنیا کے عمل میں واقعی متاثر کر دے۔ مرد جن کی اس قدر تعلیم و تربیت ہو رہی ہے امور حاضرہ پر نظر

رکھنے کے عادی نہیں ہیں۔ اُن کو ہمیشہ دور ہی کی سوچا کرتی ہے اور سامنے کی چیزوں کو یاد کھائی ہی نہیں دیتیں۔ ان کو ہر چیز اُس توقع کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے جو انہیں اُن کے علم و تجربہ کی رو سے قائم ہوئی ہو۔ لیکن عورتیں اس کے بالکل برعکس ہیں۔ اگر وہ علم و تجربہ ہیں مردوں کے برابر ہوں تو پیش بینی میں وہ عموماً مردوں سے بازی لے جاتی ہیں۔ اور ان کی یہی صلاحیت ہے جو ان سے بجائے دور و دراز کے نظریئے قائم کرانے کے انھیں عملی معاملات میں زیادہ کامیاب بناتی ہے۔ کلیات وضع کرنے میں دینے عام باتیں سوچنے میں فکر کی قوت سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور جزئیات پہلیا کو منطبق کرنا دینے عام باتوں کو خاص خاص چیزوں کے مطابق کر کے دیکھنا اور خاص موقعوں کو پہچانا دینے موقع محل ہر بات کا دیکھنا عمل کی صلاحیت پر دلالت کرتا ہے۔ یہ بات بحالات موجودہ عورتوں میں فی الجملہ زیادہ پائی جاتی ہے۔ چنانچہ مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ عمل اُسی وقت ٹھیک ہوتا ہے جب اصول دینے عام باتوں اور قاعدوں، پر صحیح رائے قائم ہوا اور عورتوں کو نظر کی تیزی میں جو خصوصیت حاصل ہے اُسی کی وجہ سے وہ اکثر صرف ذاتی مشاہدہ پر جلد بازی کے ساتھ کوئی سرسری رائے قائم کر کے ایک کلیہ تراش لیا کرتی ہیں۔ اور اُسی جلد بازی کے ساتھ اُس پر عمل بھی کر بیٹھتی ہیں۔ گو ان کا ذاتی مشاہدہ نسبتاً وسیع ہوا کرتا ہے مگر اُن کو اُس پر اکثر ضرورت سے زیادہ بھروسہ ہو جاتا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی علاج ہے یعنی عام معلومات کا بڑھانا۔ عورتوں کی غلطیاں اُسی قسم کی ہوتی ہیں جیسے کسی عالم بے پیر سے سرزد ہوں۔ جس شخص کو اپنی تربیت تمام تر خود ہی کرنا پڑتی ہے اُسے اکثر وہ چیزیں نظر آ جاتی ہیں جو ہوتی ہیں بالکل معمولی مگر بڑے بڑے فاضلوں کی نظر اُن پر نہیں پڑتی۔

عورت کی حقیقت عورت کا فطرتاً حاضر دماغ ہونا اور اصلیت اور واقعیت کی طرف عجلت کے ساتھ پسندی رجوع کرنے کی عادت یہ ایسی باتیں ہیں کہ بجائے خود ان سے غلطی میں پڑنے کا

کافی اندیشہ ہو سکتا ہے تاہم یہی وہ باتیں ہیں جن میں لوگ مدت سے مبتلا ہیں۔ جن لوگوں کو ہمیشہ دور کی سوچا کرتی ہے اور جو منصوبے باندھنے کے عادی ہوتے ہیں وہ اکثر ایسی غلطیاں کر جاتے ہیں کہ گویا انھیں سامنے کی بات بھی نہیں سوجھتی۔ یہاں تک کہ کبھی تو وہ ایسی باتیں سمجھانے لگتے ہیں

کہ جن کی تردید روزمرہ کے واقعات سے کوئی بچہ بھی کر دے۔ اور بعض اوقات ایسی پرکشی اڑاتے ہیں کہ آدمی اُن کا منہ تکتا رہ جائے۔ یہ کوئی سہانہ نہیں۔ نہ یہ فقط ادنیٰ دماغ کے لوگوں کا ذکر ہے۔ بلکہ دنیا کے اُن بڑے بڑے فلسفیوں کی تصانیف میں اس قسم کی عجب و اور بے یکی باتیں مل سکتی ہیں جن کے نظر سے فلسفیانہ خیالات کا اعلیٰ ترین نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ غرض کہ بڑے بڑے وسیع النظر لوگوں کی قوت تخیل سے کام لینے کے ساتھ ساتھ دنیا میں اگر اُن خاص انسانی سے بھی کام لیا جائے لگے جو عورتوں میں اس طرح نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں تو یہ علمی دنیا کے لئے کس قدر مفید ہو، اور فلسفہ اور سائنس میں بچانگت کے آثار کتنی خوبی سے پیدا ہونے لگیں؟ اس نقطہ نظر سے تو فلسفی لوگوں کو چاہئے کہ اپنے خیالات فطرت نوانی کے واقعیت نگار قلم اصلاح کے آگے پیش کریں اور اُس کی تنقیدی قوت سے فائدہ اٹھائیں تاکہ اُن کی پرواز خیال حقیقت اور واقعیت کے دائرہ کے باہر نہ ہونے پائے۔ عورت زیادہ تر باتوں کی طرف نہیں دوڑتی نہ زیادہ اصول اور قاعدوں کی پروا کرتی ہے۔ اُس کا دماغ بہت سی چیزوں کو ایک ساتھ نہیں بلکہ جیسے نہ کو الگ الگ مگر تیزی کے ساتھ قبل کرتا ہے۔ پھر یہ کہ اُسے اس بات کا بڑا احیاء رہتا ہے کہ فلاں بات کا اثر کسی شخص پر فوراً کیا ہوگا اُسے دوسروں کے فوری احساسات کی بڑی جستجو رہتی ہے جس سے وہ اپنے ہر فعل میں مدد لینے کی کوشش کرتی ہے۔ یہی دو باتیں ہیں جن سے وہ ایسے اصول اور عام باتوں پر توجہ نہیں کرنا چاہتی جن میں جزئیات کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو۔ نہ ایسی باتوں سے اسے رغبت ہوتی ہے جن کا اثر بظاہر لوگوں کے جذبات اور احساسات پر نہ ہو اور جو محض تخیل یا فرضی امور پر مبنی ہوں، یعنی جن سے کسی کو نہ نفع پہنچتا ہو نہ نقصان۔ چنانچہ عورتوں کی رائے متخیل مردوں کے خیالات کو واقعیت سے متعلق کرنے میں اُسی حد تک مدد دے سکتی ہے جیسے مردوں کے خیالات عورت کی رائے کو وسعت نظر پر مبنی کرتے ہیں، اور یہ بھی پیش نظر رہے کہ عورتوں کی باتیں جتنی گہری ہوتی ہیں اکثر مرد اُس گہرائی کو پہنچ بھی نہیں سکتے۔

عورت کی صلاحیت عمل اور روفاہی | دوسری بات جو عورتوں کو مردوں پر فوقیت دیتی ہے وہ عورتوں

کی عام زود فہمی ہے۔ جہاں تک عمل کا تعلق ہے یہ انسان کے لئے بہت بڑی خوبی ہے۔ جب کوئی کام آن پڑتا ہے تو یہی چیز کام آتی ہے کہ انسان اُسے انجام دینے کے لئے فوراً آمادہ ہو جائے اور جلد از جلد کام کا طریقہ طے کرے۔ جو شخص خیال آرائیوں کا عادی ہے اُسے تو سوچنے کا کافی موقع ملتا ہے اور اُس کو عجلت کا سوال پریشان نہیں کرتا۔ خواہ وقت نکل ہی کیوں نہ جائے لیکن وہ بغیر ”اگر مگر“ کے نہیں مانتا۔ علی دنیا میں بھی ناکافی مواد کی بنا پر کسی نظریہ کا قیام کر لینا علمی ضروریات کے لئے جائز قرار دیا گیا ہو کیونکہ اکثر اس میں وقت بچ جاتا ہے اور نظریہ کی تصدیق بعد کو ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ جلد کسی نتیجے پر پہنچنا یا عجلت میں رائے قائم کر لینا یہ لاعمالہ کوئی عیب نہیں بلکہ یہ ایک کارآمد طریقہ کار بھی شمار ہو سکتا ہے کیا فلسفہ اور کیا سائنس، سب کہیں یہ طریقہ کسی نہ کسی حد تک رائج ہے۔ اور ارباب فلسفہ کے لئے اگر نہ ہو تو سائنس والوں کے لئے اکثر یہی طریقہ کار آدھ ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ اُن کا مطلب مفروضات اور جزئی واقعات عالم کا عمل کرنا ہوتا ہے اور اُن کو زیادہ ضرورت ہوتی ہے کہ ہر موقع پر عمل کا طریقہ جلد طے کریں اور اپنے خیال کو تیزی کے ساتھ دوڑائیں۔ ان کے یہاں ”اگر مگر“ کی اتنی گنجائش نہیں جتنی فلسفہ والوں کے لئے ہوتی ہے۔ خیال کی تیزی میں ہی ان کی قوت تمیز صرف ہو کر رہ جاتی ہے فلسفی خواہ جیسی بھی تنقید کرے لیکن عمل میں اُس کا قدم اتنا تیز نہیں پڑتا۔ اور فی الجملہ یہی فرق مرد اور عورت کی سرشت میں ہے جو فلسفی اور سائنس دان میں نظر آتا ہے۔ مرد تو مست روی کا اس قدر عادی ہو گیا ہے کہ جن کاموں میں مہارت رکھتا ہے ان میں بھی وہ کچھوے کی چال چلتا چاہتا ہے اور اسے خواہ مخواہ کوئی غریب نہ سمجھنا چاہئے۔

عورت کی تنگ مزاجی | شاید یہ کہا جائے کہ عورت جیسی ذکی الحس ہے ویسی ہی تند خو بھی ہے۔ یہ بات اور اس کا اثر عمل پر | اُس کی عام صلاحیت کا رگ رازی میں حائل خیال کی جائے گی۔ کیونکہ ناگکی معاملات کے علاوہ اُس کی تنگ مزاجی بنا ہی نہیں جاسکتی۔ اور اس عیب کی وجہ سے نہ تو وہ کسی بات پر قائم رہتی ہو نہ موقع عمل دیکھتی ہے۔ بلکہ اپنی برا فروختگی میں عقل کے استعمال سے بھی معذور ہوتی ہے۔ اور بدیں وجہ اُس کو کسی سنجیدہ کا دوبار کے لائق نہ سمجھنا چاہئے۔ میرے خیال میں محدود المزاجی کے یہ دورے جو عورتوں

ہیں دیکھے گئے ہیں وہ زیادہ تر اعصاب کی بے مصرف قوت کے سیلان کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں۔ اگر ان کی قوت کسی معین مقصد کی جانب مرکوز ہو کرے تو یہ کیفیت نہ پیدا ہو آپ نے غور کیا ہوگا کہ پرانے زمانہ میں جو بات بات پر عورتوں کو غش آجایا کرتے تھے اُس کا گویا اب دواج ہی اُٹھ گیا۔ کچھ بات یہ بھی ہے کہ اچھے گھرانوں میں عورتوں کی پرورش اس طرح ہوا کرتی ہے جیسے کسی شیشہ فائبر میں کوئی پودا پرورش کیا جائے۔ انھیں نہ تو صاف ہوا میسر آتی ہے نہ قدرتی حرارت جس سے ان کے قوی فطری طور پر نشوونما پائیں نہ انھیں کسی جسمانی شقت یا کاروبار کا موقع حاصل ہوتا ہے کہ ان کے اعصاب میں قدرتی حرکت پیدا ہو اور ان کا دل و دماغ فکرمیں مبتلا رہے۔ یہ ہے کہ اُن کے جذبات بس اشتعال کے منتظر رہا کرتے ہیں۔ پھر کیا تعجب ہے اگر انھیں وق نہیں ہوجاتی یا اندرونی اور بیرونی اثرات سے اُن کے حواس اتنے برفروختہ رہتے ہیں کہ وہ مسلسل نہ کوئی کام کر سکتی ہیں نہ کسی خیال میں مستقل رہ سکتی ہیں۔ اُن عورتوں کو دیکھیں جنہیں اپنی روزی آپ کمانا ہوتی ہے۔ ان کی سرشت پر اس قسم کے اعتراضات عاید کرنا آسان نہیں۔ کیونکہ اُس طبقہ کی عورتیں اپنے بھائیوں کی سی تربیت پاتی ہیں اور تقریباً یکساں آزاد فضا میں اُن کی پرورش ہوتی ہے۔ چنانچہ فی الجملہ نہ وہ محرور المزاج ہوتی ہیں نہ ان میں کاروبار کی صلاحیت مفقود ہوتی ہے۔ یہ بات ادب سے کہ کسی مرد کی طرح کسی عورت کو اعصاب کی کمزوری کی شکایت پیدائشی ہو جو اکثر موروثی اثرات سے بھی ہوا کرتی ہے لیکن اگر یوں بھی مان لیا جائے کہ لڑکیاں بہ نسبت لڑکوں کے ایسے امراض و رفتاں زیادہ قبول کرتی ہیں تو میں پوچھتا ہوں کہ جو لڑکا کوئی پیدائشی مرض لے کر جان ہوا ہو کیا وہ بھی کسی کاروبار کے لائق نہیں سمجھا جاتا؟ دنیا میں ایسے لوگ ہمیشہ گنائے جاسکتے ہیں جو باوجود اس قسم کے خلقی نقائص کے جن کا اثر اعصاب اور مزاجی کیفیت پر ہوا پنے زمانہ میں امد کا سیلاب ثابت ہوتے ہیں۔ اعصابی ہيجان بھی ایک ایسی چیز ہے جو اکثر لوگوں میں محض وقتی ہوتا ہے جس کا اثر بعد کو مزاج پر بالکل نہیں رہتا۔ نہ کسی طرح کسی نقص یا گھس میں مغل ہوتا ہے۔ بلکہ یہ ہيجان بعض اوقات کام کے جوش و خروش سے تعبیر ہوتا ہے اور یہ وہی جوش ہی جو گھوڑے گھوڑے کو اتنا تیز دوڑا دیتا ہے کہ منزل مقصود پر پہنچے ہی بعض اوقات اُس کا دم ٹوٹ جاتا ہے امدہ مر جاتا ہے یہی وہ چیز ہے جس نے بہت سی نازک ہستیاں کو استقلال کے مقدس ترین مدارج

طے کرادئے اور جس کی بدولت ان کو سخت سے سخت جسمانی اور روحانی تکالیف کی پروا نہ ہوئی۔ یہ خصوصیت اکثر ان لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے جو اپنی علمی خدمات کے ذریعہ سے نوع انسان کے رہنما بننے ہیں۔ اور یہی بات ہے جو بڑے بڑے مقررین اور واعظوں کو اور علمی درس اخلاق دینے والوں کو کامیاب کرتی ہے اگرچہ ان میں وہ خواص نہ بھی ہوں جو کسی رکن وزارت یا کسی حاکم عدالت کے لئے اچھے سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ جن لوگوں کا مزاج زیادہ اشتعال پذیر ہوتا ہے وہ ہر وقت حالت اشتعال میں اپنی جان گھلایا کرتے ہیں۔ پھر یہ بات تو بہت کچھ تربیت پر منحصر ہے نفس پر قابو پیدا کرنا بغیر کسی زبردست جذبہ کسی لاگ اور کسی خاص احساس کے ممکن نہیں، البتہ یہ بات تربیت اور شوق سے حاصل ہوتی ہے۔ پہلوان کبھی تو جذبات سے مغلوب ہو کر پہلوان بن جاتا ہے اور کبھی جذبات کو مغلوب کرنے سے تاریخ اور تجربہ دونوں ثابت کرتے ہیں کہ زبردست جذبات کے لوگوں کو فرض کا احساس سب سے زیادہ ہوتا ہے بشرطیکہ ان کے جذبات کسی وٹھے پر لٹکا دئے گئے ہوں۔ حاکم عدالت اپنا منصفانہ فیصلہ صادر کرتے وقت جب اپنے جذبات بھردی پر فتح حاصل کرتا ہے تو اسی احساس فرض کی بدولت جو بجائے خود ایک جذبہ ہے جس کی تقویت تربیت سے ہوتی ہے یہی وہ صلاحیت ہے جو انسان کو روزمرہ کی زندگی کے ادنیٰ اثرات سے بالاتر بنا کر پھر اسی روزمرہ کی زندگی (یعنی انسان کی سیرت) کو متاثر کرتی ہے۔ یہی وہ جوش ہے جس کے کیف میں انسان اُس مرتبہ کو پہنچ جاتا ہے کہ وہ اپنے اعمال اور محسوسات کو تول سکے اور پہنچ کر دیکھے کہ وہ اُس کے نصب العین اور معیارِ خلق سے گڑے ہوئے تو نہیں ہیں۔ اگرچہ انسان کی جسمانی کیفیات ہمیشہ بدلا کرتی ہیں لیکن اُس کی عادتوں میں جو مقاصد سرایت کئے ہوئے ہیں وہ مستقل ہوتے ہیں اور وہ نتیجہ میں اُسی جوشیلی کیفیت کا جو اُس کے لئے معیارِ عمل قائم کرتی ہے۔ دوسری قوموں کے حالات مطالعہ کرنے سے بھی پتہ چلتا ہے کہ طبیعت کا زیادہ اشتعال پذیر ہونا انسان کو ناکارہ نہیں کر دیتا۔ اور جن لوگوں کو دیر میں اشتعال ہوتا ہے وہ دوسرے لوگوں سے کچھ زیادہ کار پرداز نہیں ثابت ہوتے۔ یورپ کی بعض دیگر اقوام کے مقابلہ میں فرانسیسی اور اطالوی لوگ یقیناً بہت زیادہ محروم و ملالان واقع ہوئے ہیں۔ اور روزمرہ کی زندگی میں وہ انگریزوں کے مقابلہ میں تو بہر کیف نہایت شغفل مزاج

ہیں۔ لیکن کیا وہ سائنس میں یا عام کاروبار میں قانونی اور عدالتی معاملات میں یا سپہ گری میں کسی قوم سے پیچھے ہیں؟ ضرورت سے زیادہ شہادت اس امر کی موجود ہے کہ قدیم یونان والے حال کے یونانیوں کی طرح از حد مشتعل مزاج لوگ تھے۔ لیکن اُن کی مکت مشہور ہے اور دنیا کا کوئی فن نہ تھا جس میں انھوں نے کمال نہ حاصل کیا ہو۔ اہل رومہ بھی اُسی ذریعہ جنوب کے لوگ تھے جو ابتداً ویسایا ہی مزاج رکھتے تھے لیکن اُن کے زبردست قومی نظام نے اُن کو اُن کی ابتدائی حالت کے بالکل برعکس بنا دیا اور وہی چیز جو ابتدا میں اُن کے جوش کی ایک صورت تھی اُس سے اُن کی تربیت نے ان کے لطایف کو ایک برعکس حالت پر کر دیا۔ آئرستان کی سیلٹ قوم بھی اسی تربیت کی ایک مثال پیش کرتی ہے۔ غرض کہ جس طرح فرانسیسی انگریزوں کے مقابلہ میں آئرلینڈ والے سویٹزرلینڈ والوں کے مقابلہ میں یونانی اور اطالوی لوگ جرمن قوم کے مقابلہ میں رکھے جاسکتے تھے اُسی طرح عورتیں مردوں کے مقابلہ میں۔ اور دونوں کی حیثیت عمل میں بالآخر مزاجی کیفیت کی بنا پر کوئی فرق نہ پایا جائے گا بشرطیکہ ان کی تربیت کا کافی لحاظ رکھا جائے۔

عورت کے ذہن کی بخروسی | اگر کہا جائے کہ عورتوں میں کسی ایک کو شش کو برابر جاری رکھنے کے لئے اور دوسری صفحہ | کافی استقلال نہیں ہوتا تو میں کہہ چکا ہوں کہ یہ اُن کی تربیت کی غامی ہو نہ کہ اُن کی فطرت کی۔ تاہم اگر یہ مان بھی لیا جائے تو اس سے ممکن ہے کہ اُن کے کام کی خوبی اُس پایہ کی نہ ہو لیکن یہ کہ وہ کوئی خوبی اپنے کام میں نہ پیدا کر سکیں یہ لائق یقین نہیں ہے۔ دماغ کا کسی کام پر جتنا گام ایک قابل تعریف بات ہے مگر عملی ضروریات کے لئے یہ عادت بعض اوقات مضبوطی ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ میری قطعی رائے یہ ہے کہ کسی اہم مسئلہ میں سلسلہ انہماک اتنا مفید نہیں جس قدر بار بار اس کی طرف دماغ کو رجوع کرنا۔ اور جب آدمی ایک چیز کی طرف خوب متوجہ ہو تو اُس چیز کو دُعا چھوڑ کر دوسری چیز کی طرف اُسی قدر متوجہ ہو سکے تو یہ بڑی بات ہے۔ یہ عادت مردوں کو بہت کم ہوتی ہے لیکن عورتوں کے لئے یہ کچھ دشوار بات نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ اُن کے لئے کوئی فطری بات ہو لیکن اُن کو اس کی مشق تو بہر کیف زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ عورتیں جن کاموں میں مصروف رہا کرتی ہیں اُن میں ہر آن جزئیات پر نظر رکھنا ہوتا ہے۔

جرمنی کا سفر نامہ

برلن | ہدایہ پٹ سے روانہ ہو کر ہم برلن پہنچے جو جرمنی کا دارالخلافہ ہے۔ اور رات کو ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ اگلے دن صبح کو دس بجے ہمیں سرکاری افسر سے ملنا تھا جنہوں نے جرمانی فرما کر ہمارے ادھر ادھر جانے کا اہتمام کیا تھا۔ ناظرین کو تعجب ہو گا کہ جرمنی کی حکومت نے اس قسم کی مدہم کو دنیا کیوں منظور کی؟ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے جو مالک یہ جانتے ہیں کہ دوسرے مالک سے روپیہ اسی وقت کیا یا جاسکتا ہے جبکہ دوسرے مالک کے باشندوں کو خوش رکھا جائے اور جہاں تک ہو سکے ان کو سہولتیں دی جائیں وہ ہی تجارت کی دہ میں آگے نکلتے ہیں۔ دوکاندار کی دوکانداری ہی یہ ہے کہ وہ اپنی اشیاء کے خریدار کی خاطر تواضع کرے۔ ان حکومتوں کے اندر رعوت۔ غرور اور تکبر نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو انسان سے بالاتر نہیں سمجھتے اور نہ یہ خیال کرنے ہیں کہ ہم اعلیٰ افسر ہیں معمولی آدمی کی کیوں فکر کریں۔ ہم نے آتے ہی فرانس۔ جرمنی۔ اور دیگر ممالک کی حکومت کو اپنا منشا لکھ دیا تھا اور خواہش کی تھی کہ وہ ہماری مدد کریں۔ کیونکہ ہم نہ ملک سے واقف ہیں اور نہ ان کے ملک کی زبان جانتے ہیں۔ اسی طرح ہم نے اپنی سرکار کو بھی ولایت میں لکھ دیا تھا کہ وہ ہماری مدد کرے۔ مگر ہماری سرکار کے جواب پہونچنے سے پہلے ہی جرمنی کی سرکار نے ہم کو لکھا کہ ہم کس قدر عرصہ وہاں گزارنا چاہتے ہیں اور کیا کیا دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ پروگرام بنا کر بھیج سکیں۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ وہ اپنا ایک آدمی مفت دیں گے جو ہمیں تمام چیزیں دکھا دے گا۔ ہم نے اپنا منشا لکھ بھیجا اور سرکار نے دن روز کا جرمنی کا پروگرام بنا کر بھیج دیا اور ہم کو لکھا کہ آیا ہم اس میں کوئی ترمیم تو نہیں چاہتے؟ ہماری سرکار کا جواب صرف اس قدر تھا کہ ہم کو چاہئے کہ ہم سرکاری افسر سے جو ہر ملک میں رہتا ہے جا کر ملیں اور اس کی نصیحت پہنچیں کہ وہ ہماری مدد کرے گا۔ ہم نے جب یہ دیکھا کہ جرمنی سرکار نے اس قدر تکلیف ہمارے لئے برداشت کی ہے اور پورا پورا پروگرام ہمارے سفر کا دیدہ بیا ہے تو ہم اپنے مشغول افسر کو تکلیف دینا مناسب نہ معلوم ہوا کیونکہ ممکن ہے ان کی ہدایات اور نصیحتوں پر ہم عمل نہ کر سکیں ممکن ہے وہ ویسی ہی ہدایات اور نصائح

ہوں یہی کہ ہمارے یہ بہرہاں ہندوستان میں دیا کرتے ہیں۔ ہمارے پروگرام میں یہ درج تھا کہ ہم ۱۰ بجے صبح سرکاری دفتر میں جا کر اس محکمہ کے بڑے افسر سے مل کر زبانی گفتگو کریں تاکہ اگر کسی اور ترمیم کی ضرورت ہو تو پروگرام میں کی جاسکے چنانچہ ہم ۱۰ بجے پہنچ گئے اور ہم نے دیکھا کہ یہ اعلیٰ افسر جو ذرا عتیقہ کے سب سے بڑے افسر تھے سچ اپنے چند ماتحتوں کے ہمارا انتظار کر رہے ہیں ہم پہنچے اور انہوں نے بڑی آؤ بھگت سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہم نے ان سب عنایتوں کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا انہوں نے کہا کہ ہم اب دوسرے ملک میں ہیں جہاں کے لوگ شکر یہ کہ لے نہیں بلکہ ہر انسان کی اپنا بھائی بھجھ کر سد کرنا فرض سمجھتے ہیں اور وہ ہر طرح کی مدد ہم کو دینے کو تیار ہیں۔ اگر ہم کو کسی قسم کی اور ضرورت ہو یا تکلیف ہو تو ہم فوراً ان کو آئندہ اطلاع دے سکتے ہیں اور ضروری مدد حاصل کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلی بات جو ہم کو اس جگہ دکھائی دی تھی کہ چیراسی سے لے کر اعلیٰ افسر تک ہر شخص کے اندر بھائی بندی کا برتاؤ تھا۔ یعنی وہ حکومت و وہ رعوب و وہ غائب تھا۔ ہمارے ملک میں اگر ایک اعلیٰ افسر کے سامنے اس کا ماتحت جو خود بھی ایک بڑا افسر ہو پہنچتا ہے تو نہایت عاجزی اور انکساری کا برتاؤ کرتا ہے اور ہر شخص یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہ شخص ماتحت ہو گا مگر یہاں خواہ چیراسی ہی کیوں نہ ہو افسران اپنے ماتحتوں کے ساتھ نہایت خوش خلقی کے ساتھ اس طرح پیش آتے ہیں گویا وہ ان کے گئے بھائی ہیں چھوٹے اور بڑے افسر آپس میں خوب گرم جوشی کے ساتھ باتیں کرتے ہیں وقتاً فوقتاً مذاق کرتے ہیں خوب ہنستے ہیں ہم کو افسوس ہے کہ ہم کو جرین زبان نہیں آتی جو ہم ان کی گفتگو کا پورا پورا الطف لے سکتے۔ مگر ہم نے بعد کو بھی جن جگہ جا کر دیکھا یہ ہی بات نظر آئی۔ ایک افسر جب ایک ماتحت کے کمرے میں یا محض مزدور کے کمرے میں جاتا ہے تو سب کو سلام کرتا ہے۔ مزدوروں کو بار بار اسٹھنے اور جھک جھک کر سلام کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ پیشتر کی طرح اپنے کام میں لگے رہ سکتے ہیں جو ضرورت اس افسر کو ہوگی وہ بیان کر دے گا اور جس شخص کا وہ کام ہوگا وہ افسر کے حکم کی تعمیل کرے گا۔ یہاں تک کہ ایک جگہ ہم نے دیکھا کہ ایک فیکٹری کے مزدور تاش کھیل رہے تھے کچھ گانا بجا کر رہے تھے افسر اس جگہ گیا تو یہ لوگ اپنا کام بہت دور کرتے رہے۔ افسر نے ان کو سلام کیا اور مزدوروں نے خندہ پیشانی سے اس کا جواب دیا جس شخص کا یہ فرض تھا کہ وہ افسر کے حکم کی تعمیل کرے اس نے اس حکم کی تعمیل کی۔ اس طرح ہم نے ایک اور مقام پر دیکھا افسر کے آنے پر مزدور ہلار پنے

کام پر لگے ہیں اور آپس میں باتیں کرتے اور ہنستے کھیلتے ہیں گویا کوئی بڑا افسران کے پاس ہے ہی نہیں۔ یہ بھائی ہندی کا سبق واقعی ایک بڑا دلکش منظر ہے۔ ہم آگے چل کر بتائیں گے واقعی جرمنی کہاں تک ایک تعجب خیز ملک ہے اور اس نے کیوں اور کس طرح اس قدر جلد اپنی بگڑی ہوئی اور تباہ شدہ حالت کو اس قدر خفیل میں درست کر لیا ہے۔

جرمنی کے علاقہ میں داخل ہوتے ہی آپ کو ہر طرف چینیوں کی بہار ملے گی اور ہر طرف کوئی نہ کوئی چیز بنی ہوئی دکھائی دے گی۔ یہ مشکل کیا بلکہ نامکن ہے کہ آپ مختلف قسم کے کارخانوں کو آسانی سے دیکھ سکیں کیونکہ ان کی تعداد بے شمار ہے۔ اس لئے ہم نے صرف چند قسم کے کارخانے اور زراعتی ادارے دیکھنے پر اتفاق کیا اور ہم صرف انہیں کا حال ناظرین کے روبرو پیش کریں گے۔ ناظرین کے لئے غالباً یہ بات دلچسپی کی ہوگی کہ جرمنی ان عجیب ممالک میں سے ہے جہاں ہر چیز سے کچھ نہ کچھ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جو اشیاء ہمارے ملک میں آتی ہیں وہ اکثر ایسی چیزوں سے بنی ہوئی ہیں کہ ان کا خواب و خیال بھی ہم کو نہیں ہو سکتا۔ ایک سرکاری اعلیٰ افسر سے ایک روز گفتگو ہو رہی تھی تو میں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں کوئی ویسی فیکٹری دیکھنا چاہتا ہوں جہاں پر آلودغیرہ ترکیبوں سے بنے جاتے ہیں انہوں نے کہا کہ جرمنی میں ایسی مختلف چیزوں سے اشیاء بنائی جاسکتی ہیں کہ ان کا پتہ لگنا مشکل ہوتا ہے اور باوجود اس کے کہ وہ خود جرمن ہیں ان کو بھی بہت سی اشیاء کے متعلق یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ کس چیز سے بنائی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر خون سے بنے جاتے ہیں اور دیگر مختلف اشیاء بنائی جاتی ہیں۔ پڑیوں سے سینکڑوں قسم کی اشیاء بنتی ہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ کسی ایسی فیکٹری کو دیکھیں جہاں پڑیوں سے کہا دنیا جاتا ہو۔ مگر ہم کو بتایا گیا کہ جرمنی میں بڑی ایسی میٹھی قیمت چیز ہے کہ اس کو کھاد کے کام میں بہت کم لایا جاتا ہے۔ ہم نے ایک فیکٹری کو دور سے دیکھا جو مصنوعی کارک بناتی ہو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ کارک عموماً لکڑیوں کی چھال سے بنائے جاتے ہیں۔ وودہ کے اندر سے ایک چیز نکلتی ہے جس کو انگریزی میں CASEIN کہیں کہیں اس سے ہزاروں نہایت رنگین اور خوشنما اشیاء بنائی جاتی ہیں۔ جرمنی میں یہ کوشش کافی ہے کہ جو چیز قدرت نے پیدا کی ہے اس سے کوئی نہ کوئی کارآمد شے ضرور بالضرور بنائی جاسے اور جرمنی کے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ اپنے ملک کی ضروریات کو مصیبت آئے

ہزاروں قسم کی چیزوں کے بنانے میں ضرور بدل سکیں گے لڑائی کے زمانہ کا اگر ہم حال لکھیں کہ جہنمی میں کون کون اشیا ایسی تھیں جن سے کھانے اور مویشیوں کے چارہ کا کام لیا گیا تھا تو لوگوں کو تعجب ہوگا مگر ہم ان پر تفصیلی بحث کرنا غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

برلن ایک بہت بڑا شہر ہے اور میلوں کے اندر آباد ہے اس میں ہزاروں قسم کی اشیا بنتی ہیں اور قریب قریب ہر حصہ ملک کے اندر جوا شہاد بنتی ہیں ان سب کارخانوں کے دفتر اس شہر میں پائے جاتے ہیں۔ ہمارے لئے سرکار کی طرف سے دو افسر تعینات تھے دونوں ڈاکٹر کی ڈگری لے چکے تھے اور نوجوان تھے ان میں سے ایک زراعتی واقفیت رکھتا تھا مگر انگریزی نہ بول سکتا تھا اور دوسرا افسر انگریزی بہت عمدہ بولتا تھا مگر اس کی زراعتی واقفیت اس قدر زیادہ نہ تھی۔ اسی وجہ سے دو افسروں کے لینے کی ضرورت ہوئی۔ سب سے پہلے ہم نے ایک زراعتی فارم کو دیکھا جہاں پر پودا نش کی کانیں ہیں اور کافی حداد میں سلفیٹ آف پوٹاش اور کلورائیڈ آف پوٹاش جرمنی سے باہر دیگر ممالک کو جاتی ہے۔ جرمنی کی طرف سے قریب قریب سب ممالک کے اندر اس کی ضرورت بتانے کے لئے آدمی رہتے ہیں اور اس جگہ پر مختلف قسم کے پودوں پر پودا نش اور دیگر کھادوں کے تجربات کئے جاتے ہیں کہ کس کھاد کا کس پودہ پر ڈالنے سے کیا اثر ہوگا۔ دنیا بھر کے اندر جس قدر فصل پیدا ہوتی ہے وہ سب کی سب یہاں موجود ہے اور اس پر تجربات کئے جاتے ہیں۔ ہم کو تعجب تھا کہ کس طرح جرمنی کے لوگ ہمارے ملک کے پودوں پر جن کو بہت گرمی کی ضرورت ہو تجربات کرتے ہوں گے افسر زراعت ہم کو یہ دکھانے کے لئے ایک مکان کے اندر لے گئے اور وہاں انہوں نے ایک شین دکھانی جس سے ہر ملک کے پودے کو اس ملک کی آب و ہوا اور ٹیمپریچر کے مطابق سردی گرمی اور طوبت پہنچائی جاسکتی تھی۔ عموماً ہندوستان اور دوسرے ممالک کے اندر اس کام کے لئے جوا تنظیم کیا جاتا ہے وہ یا تو نیچے آگ جلا کر پودوں کو صحت بخشی گرمی پہنچائی جاتی ہے یا ان کو کسی طرح گرم پانی پہنچا کر گرم رکھا جاتا ہے یا سورج کی گرمی زیادہ کر کے مصنوعی گرمی دیتے ہیں مگر اس ذریعہ سے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوتی۔ اس جگہ اس شین کے ذریعہ اب سرد سے سرد اور گرم سے گرم اور خشک سے خشک اور مرطوب سے مرطوب آب و ہوا پیدا کر سکتے ہیں اور اس وجہ سے جو پودے اس جگہ اگائے جاتے اور

جو حجرات ان پر کئے جاتے ہیں وہ زیادہ اعتبار کے قابل کہے جاسکتے ہیں۔ بہت سے عالم اس بلکہ مختلف پودوں کے متعلق حقیقتات کر رہے تھے جن کے ایک ایک اذکار کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ صرف یہ بات معلوم کرنے کے لئے کہ ایک پودوں مثلاً گیہوں کی نالی کے حصہ کے اندر کی کوٹھڑیاں کس قسم کا کھا دوائے جیسے پریاکس کھاوے کہ کم۔ پائے پختی میں ایک نہایت نازک شین بنائی گئی ہے۔ جوانی کو نہایت باریک کاٹ دیتی ہے اور اس کو خوردبین میں تین سولنا بٹھا کر دیکھا جاسکتا ہے اور اس کی صحیح تصویر بن سکتی ہے۔ اب تک بہت ملکوں میں یہ طریقہ ہے کہ خوردبین میں پودہ کو دیکھتے جاتے ہیں اور اس کی تصویر ہاتھ سے بناتے جاتے ہیں جس سے نہ تو اسکیل ٹیکر رہ سکتی ہے اور نہ تفصیل آسکتی ہے مگر اس جگہ ایک آلہ ہے جو کہ اس کی باکل ہو بہو تصویر تین سو گنی بڑا کئے سکتا ہے۔ جو لوگ کام کرتے ہیں اگر ان سے آپ بات کریں تو وہ یہ فرض نہیں سمجھتے کہ ہر وقت جا اور بیجا طور پر پوداش کے کھاوکی تعریف کریں۔ بلکہ جو چیز ان کے نزدیک جیسی ثابت ہوتی ہے وہ اُس کو دیباہی بیان کریں گے۔ جس پودے کے اندر ان کے خیال میں پوداش سے کوئی خاص فائدہ نہیں دیکھا گیا ہے وہ کہیں گے کہ ان کے تجربہ میں ابھی تک کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے۔ پھل دار پودوں کے لئے یہاں خاص تحقیقات جاری تھی کہ کس طرح ہونے سے زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کے خیال میں کسی درخت کو بہت زیادہ بڑھتے رہنے دیا جائے تو پودہ بہت زیادہ خوراک زمین سے حاصل کرتا ہے اور اس پر پھل کم آتے ہیں۔ ان کے خیال میں پودہ کو قلم کر دینا چاہیئے کیونکہ صرف پودوں کے اس حصہ پھل آتے ہیں جس کی کوئلیں نئی پھوٹی ہوں۔ ایسا کرنے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ پودے کے نیچے کوئی چیز پیدا کی جاسکتی ہے اور اس کو سایہ سے نقصان نہیں پہونچتا۔ چنانچہ ہم نے سیب کے درخت پھلوں سے لدے ہوئے دیکھے اور ان کے نیچے مختلف قسم کی ترکاریاں نہایت عمدہ حالت میں آگئی ہوئی تھیں۔ اس انسٹی ٹیوشن کا یہ بھی کام ہے کہ وہ نئی نئی فصلوں کے متعلق تجربات کرے کہ ملک کے اندر کونسی فصل رائج کی جاسکتی ہے۔ غرض ہر طرح سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکے۔

ایک جگہ ہم نے اس فارم کو دیکھا جہاں پر کہ شہر کا تمام گندہ پانی جمع ہوتا ہے اور اُس سے آبپاشی کا کام لیا جاتا ہے۔ برلن بھی یہی دو گنا شہر ہے شاید اس سے بھی زاید ہو۔ اس شہر کا تمام غلیظ پانی ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں

کس قدر زیادہ ہوگا۔ مگر اس کو فضول دریا میں نہیں بہایا جاتا۔ کیونکہ جرمن جانتے ہیں کہ اس سے دریا کے پانی کو گندہ کرنے کے علاوہ جب ہزاروں من اجناس اس سے پیدا کی جاسکتی ہیں تو کیوں اس کو بند نہ کیا جائے بلکہ شہری مہران کی طرح وہ اس پانی کو فضول پھینکنے کے قابل نہیں ہیں۔ چنانچہ تمام شہر کے پانی کو ایک جگہ لاکر بڑے بڑے تالابوں میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ تمام مٹی وغیرہ نیچے بیٹھ جائے اور صرف پانی رہ جائے۔ ایک بہت بڑے رقبہ اراضی کے لئے جس میں پہلے کچھ بھی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس پانی کو بطور آب پاشی استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس سے چارہ وغیرہ دیگر اجناس پیدا کی جاتی ہیں اس رقبہ زمین کو مختلف کاشتکاران کو دے دیا گیا ہے جو کھیتی کرتے ہیں اور نیپٹلنی کو لگان ادا کرتے ہیں۔ زیادہ تر اس جگہ چارہ آلو۔ اور چھند رو یا جاتا ہے۔ کبھی کبھی کئی کی کاشت بھی کی جاتی ہے۔ ہم نے دریافت کیا کہ ترکاریاں آلو چھنداس سے پیدا کرنا صحت کے لئے مضر کیوں نہیں سمجھا جاتا تو ہم کو بتایا گیا کہ یہاں کی اراضی میں جو سبزی پیدا ہوتی ہے اس میں کوئی مضر صحت بات نہیں پائی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ دوسری جگہ پانی جاتی ہو۔

اس کے بعد ہم ایک کسان کا فارم دیکھنے کے لئے گئے اس کے پاس پانچ بیگ اراضی ہوگی۔ اور یہ خاندان اسی جگہ دو سو سال سے کھیتی کرتا ہے۔ سارے گاؤں کا یہ ہی کھیا تھا۔ اس کا مکان ہم نے دیکھا تو ہمارے ہوش باختم ہو گئے۔ نہایت آراستہ و پیراستہ مکان۔ سامان جو مکان کے اندر تھا وہ بہت قیمتی تھا۔ نہایت صاف ستھرا۔ مکان میں کھانا پکانے کے دو کمرے تھے ایک میں گرمی کے موسم کے لئے دوسرا چارہ کے لئے۔ اس وقت کھانا پک رہا تھا۔ ہم اندر گئے تو دیکھا وہوئیں کا نام نہیں ہم کو خیال ہوا کہ کبھی یا گیس سے کھانا بن رہا ہوگا مگر دیکھا کہ کوئلہ اور لکڑی جلائی جا رہی ہے۔ مکان میں ۱۰۰۰ گائیں تین گھوڑے ۵ سو راور مرغیاں تھیں۔ اور ایک بہت بڑا گودام سامان رکھنے کا تھا۔ ترکیٹر چلانے کے لئے موجود تھا اور اس کی اراضی اور دیگر کاشتکاران کی بھی اراضی جو تباہ کٹی کاٹنے کے لئے نشین علیحدہ تھی۔ غرض ہر طرح سے یہ جگہ ایک ٹیس آدمی کی معلوم ہوتی تھی۔ ہم نے مذاقاً دریافت کیا کہ کیا وہ خود ہی ہل چلاتا اور کھیتی باڑی کے دوسرے کام کرتا ہے تو اس نے بتایا کہ وہ سب کام خود کرتا ہے مگر وہ چونکہ اکیلا ہے اور بچے چھوٹے ہیں اس وجہ سے چند

ملازم بھی رہتے ہیں جن کوئی کس تیس روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے اور کھانا اور کپڑا دیا جاتا ہے۔ اس کے مکان میں ایک خاص تعداد میں کتاہوں کا مجموعہ تھا۔ جہانوں کے خیر مقدم کے لئے بہت عمدہ ڈرائنگ روم تھا۔ مکان کے پیچھے ایک چھوٹا سا باغچہ تھا جس میں پھلدار درخت تھے اور سبزبان گھر کے خرچ کے لئے پیدا ہوتی تھیں۔ اگلے روز ہم نے ڈیری دیکھی جو شہر کو دودھ مہیا کرتی تھی۔ شہر میں صرف ۱۰ ڈیریاں تھیں جن سے سارے شہر کو دودھ مہیا ہوتا تھا۔ یہ بہت بڑا مکان تھا جس میں ہزاروں آدمی ملازم ہونگے۔ تمام دودھ مین میں بھر کر کہاں لایا جاتا تھا اور ایک سٹیشنرنگل شین سے چھان کر صاف کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد دودھ کو ایک جگہ جمع کر دیا جاتا تھا۔ اور وہاں اس کو گرم کر کے تمام جراثیم مار دئے جاتے تھے اور پھر اس کو ٹھنڈا کر کے فروخت کرنے کے لئے بوتلوں میں بھر کر باہر بھیجا دیا جاتا تھا۔ جو باقی بچتا تھا اس کا کھن اور کھن کے دودھ کا پیئر بنا یا جاتا تھا۔ یہ جگہ نہایت صاف رکھی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ سب کام ایک کیٹی کرتی ہے مگر اس کی پی کے اندر کافی حصہ داروں کی تعداد دودھ ہم پہنچانے والوں کی تھی۔ نرغ دودھ کا سرکار کی طرف سے مقرر تھا تاکہ کوئی شخص زیادہ روپیہ وصول نہ کر لے۔ تمام جرمنی کے اندر ہر بوتل دودھ کے اوپر یہ تحریر کرنا پڑتا ہے کہ وہ بوتل کس کارخانہ کی ہے اس میں کتنا دودھ ہے اور کس روز وہ بوتل بھری گئی ہے اور یہ بھی لکھنا ہوتا ہے کہ اس میں کوئی پانی وغیرہ کی ملاوٹ نہیں ہے اور اس کے جراثیم ہلاک کیئے گئے مگر اس پر بھی اکتفا نہ کر کے سرکار کی جانب سے کافی نگرانی ہوتی ہے اور اگر کسی شخص کے متعلق کوئی بات معلوم ہوتی ہے تو اس کو کرڈی سزا دی جاتی ہے اور اس کا لائسنس ضبط کر لیا جاتا ہے۔ ایک بات ہم ناظرین کی لچپی کے لئے بتا دینی ضروری سمجھتے ہیں کہ جرمنی کی حکومت اس بات میں یقین نہیں رکھتی کہ قانون کو وضع کرنے کے بعد اس کی تعمیل عدم تعمیل کی پرواہ نہ کی جاوے بلکہ اس کی پابندی اس طرف کی جاتی ہے کہ کوئی شخص اس کی خلاف ورزی نہ کرے نہیں سکتا۔ جرمنی میں لوگوں کے اخلاق کی بندی ایک سرکاری فرض ہے اس لئے ہمیشہ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے جس سے لوگ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے بھائی بندوں کو نقصان پہنچے یا دھوکہ ہو۔ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو اس کو کرڈی سزا دی جاتی ہے تاکہ دیگر لوگوں کو جوت ہو۔ ہم نے ایک شخص سے چند سوالات ایسے کئے جس سے اس کو یہ معلوم ہوا کہ ہم کو یہ شبہ ہے کہ جرمنی میں لوگ آمیزش کرنے کی کوشش کرتے ہوں گے

اور ضرور کچھ نہ کچھ ملاوٹ دودھ وغیرہ میں کرتے ہیں گے اس نے نہایت پُریشانی میں جواب دیا کہ جرنی کے اندر حکومت ہوتی ہے اور کوئی شخص ایسی حکومت میں قانون کی خلاف ورزی کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا ہمارے ملک میں بھی حکومت ہوتی ہے اور آئے دن ہزاروں نوجوان جیل کے اندر بلا مقدمات چلائے ہوئے اور برسوں کے لئے بند کر دئے جاتے ہیں مگر کیا مجال کہ اس قسم کے جرایم کے اسناد کے لئے سرکار کے کانوں پر جوں بھی چل جائے البتہ اگر کوئی میونسپل بورڈ اس کام میں زیادہ دلچسپی لے تو اس کے راستہ میں روڑا اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس کے بعد ہم نے ایک اور سرکاری زراعتی تجربہ کے فارم کو دیکھا جس کے اندر بہت سی باتیں قابل ذکر ہیں مگر ناظرین کی دلچسپی کے لئے صرف ایک بات کا ذکر کر دینا کافی ہے۔ اس فارم میں چند سال سے کامیاب تجربات کئے جا رہے ہیں کہ گیہوں جو بچے کی فصل کو بونے کے بعد ایک ماہ کے جب فصل اُگ آئے تو ان کمیٹوں میں کھاجر۔ رزقہ۔ کلودر وغیرہ کوئی فصل بودی جائے اور جب فصل گیہوں کی کٹ جائے تو پٹنی بوڑے اس کو اچھی طرح نکال کر ٹھیک کر دیا جائے تو اس طرح ایک فصل کی بجائے دو فصلیں آسانی سے لی جاتی ہیں۔ یہ طریقہ نہایت کامیاب ثابت ہوا ہے اور اب چند کاشتکار بھی اس پے ل کر رہے ہیں ناظرین کو یاد رکھنا چاہئے کہ تمام جرنی میں تمام اجناس ہمیشہ قطاروں کے اندر بوئی جاتی ہیں اور اس وجہ سے اس قسم کے تجربات میں آسانی ہوتی ہے۔

پھر ہم نے مذکور خانہ کو دیکھا۔ جہاں سے تمام شہر کو گوشت ہم پہنچایا جاتا ہے۔ اس جگہ پر ڈیرا کھانے۔ پینے۔ سونہ۔ بیٹھ۔ وغیرہ ذبح ہونے کے لئے کاشتکاران لاتے ہیں اور اس خیال سے کہ کاشتکاروں کے ساتھ بے ایمانی نہ ہو سرکاری ملازمین پہلے مویشیوں کی جانچ کر کے کم سے کم قیمت مقرر کر دیتے ہیں۔ اس سے زائد قیمت پر ہی مویشی قصاصوں کو خرید کر لے لیں گے۔ بہت سے قصاب وہاں جمع رہتے ہیں اور اگر یہ لوگ آپس میں مل کر خرید کر نا شروع کر دیں تو ان کو کڑی سزا دی جاتی ہے یعنی اس بات کی پوری کوشش کی جاتی ہے کہ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔ ہر روز کسانوں کی طرف سے ایک ہوشیار کمیا یا زائد آدمی سرکار کی طرف سے اس بات کی دیکھ بھال کے لئے رکھے جاتے ہیں کہ کوئی شخص بے ایمانی کرے یا آپس میں

ن کر کسان کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ ہر موشی کی قیمت کے ساتھ ساتھ اس کے بیہ کی فیس ادا کرنی ہوتی ہے۔ جب جانور فروخت ہو چکا ہے تو اس کا ڈاکٹری معائنہ کیا جاتا ہے اور اگر کوئی جانور ذبح کرنے کے قابل نہ ہو تو اس کی قیمت بیہ گھسیٹی ادا کر دیتی ہے اور اس جانور کو دوسرے کام کے لئے ذبح کیا جاتا ہے۔ ذبح کرنے کا کام شینری سے کیا جاتا ہے جس سے کھال گوشت وغیرہ تمام اجزاء ایک دم الگ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہر ایک تصاب کا گوشت، گوشت کے بازار میں بیچ دیا جاتا ہے جہاں اس کو ہرف کے اندر ٹھنڈا رکھا جاتا ہے اور وہاں سے یہ بازاروں میں جانور فروخت ہوتا ہے۔

اس جگہ ایک بہت بڑا انسٹی ٹیوٹ کھانڈ کے متعلق ہے جہاں شیرہ-کویہ۔ کھانڈ وغیرہ کی تحقیقات ہوتی ہے اس کو بھی ہم نے دیکھا اس کے کارکنان سے بات چیت کی انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے ہماری باتوں کے جوابات دئے اور فرمایا کہ اگر ہم اپنا شیرہ وغیرہ وہاں روانہ کریں گے تو وہ لوگ نہایت خوشی کے ساتھ اس کے متعلق واقفیت بہم پہنچانے کا کام کریں گے۔ جرمنی کے اندر جس قدر شیرہ پیدا ہوتا ہے وہ سب کا بے مختلف اشیاء کے بنانے میں کام آتا ہے۔

شام کو ہم دوبارہ سرکاری افسر سے ملے کیونکہ اگلے دن ہمارے وہاں سے چلے جانے کا پروگرام تھا۔ انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے ہمارے سفر کا حال دریافت کیا اور پھر ہر طرح کی سہولت بہم پہنچانے کے لئے کہا۔ ہم نے خواہش ظاہر کی کہ اگر ممکن ہو تو ہم دور دراز درجن کے اندر رہ کر اپنا دورہ شروع کریں مگر انہوں نے جواب دیا کہ یہ ناممکن ہو گا کیونکہ تمام افسران کو اطلاع دے دی گئی ہے اس لئے وہاں سے ہم اگلے دن لیپزگ اسٹیشن کے لئے روانہ ہو گئے۔

لیپزگ لیپزگ کے اسٹیشن پر ہم ٹھیک وقت پر پہنچ گئے مگر قسمتی سے جن لوگوں سے ہم کو ملنا تھا ان سے ملاقات نہ ہوئی۔ وہ اتفاق سے ہماری تلاش میں رہے اور ہم ان کی تلاش میں۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں آخر ہم نے سوچا کہ ہم غالیش کے دفتر میں جن لوگوں سے پہلے سے خط و کتابت کر رہے تھے۔ انہیں سے ملنا ضروری تھا لیں۔ چنانچہ ہم ایک موٹر سے اس مقام پر گئے۔ لیپزگ ایک بہت بڑا شہر جرمنی میں ہے اور یہاں تمام قسم کی مشنری کی سال میں دوبارہ تلاش ہوا کرتی ہے۔ ٹائٹل کے لئے ہفتہ مکانات اور تمام سامان کی

دوکانیں وغیرہ مستقل طور سے بنی رہتی ہے۔ سب سے بڑی نمائش تو مارچ میں ہوتی ہے۔ دوسری اگست میں۔۔۔ ان لوگوں سے جاگرتے تو دیکھا ایک عالیشان عمارت میں سینکڑوں آدمی یہ ہی کام کر رہے ہیں کہ کس طرح اس نمائش کی زیادہ سے زیادہ شہرت کی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ دوسرے ممالک سے یہاں آکر جرمنی شین کو دیکھیں اور ان کی فروخت میں سہولت ہو۔ اس نمائش کے نظام کو ایشیا کی فروختگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم ان لوگوں کے پاس پہنچے اور ہم نے سب سے پہلے اپنی مصیبت بیان کی۔ انہوں نے فورا دل کو خون کیا کہ ان لوگوں کو تلاش کر کے ہمارے پاس بھیج دیا جاوے۔ ریل واہن نے فوراً تلاش شروع کر دی اور چند منٹ کے اندر اندر ہی ہم کو جواب ملا کہ وہ تشریف لارہے ہیں اور ہم کو کسی تشویش کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات معلوم کر کے ہاں میں جان آئی اور ان لوگوں سے بات چیت شروع ہوئی۔ انہوں نے اس بات پر بشارت دیا کہ ہم کو یہ موقعہ ہاتھ سے نہ کھونا چاہئے کیونکہ اس موقعہ پر تمام جرمنی کے بڑے بڑے شین بنانے والے اپنی شینیں اس جگہ لائے ہیں اور ان کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہماری مطلب براری کا اس سے زیادہ اچھا طریقہ اور کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ ہم نے طے کیا کہ واپسی بھی اسی راستے سے ہو۔

اس عرصہ میں یہ لوگ آگے اور ہم سیدھے اس جگہ کی سب سے بڑی زرعتی ہل بنانے والی فیکٹری میں جس کا نام بوڈوسیک ہے گئے۔ یہ قریب ساٹھ سال کی پرانی فیکٹری ہے اور تمام قسم کے ہل، ہیرو، بکلی، ویٹر اور ٹریکٹر جوٹی کے تیل سے چلتے ہیں بناتی ہے۔ کارخانہ کافی لمبا چوڑا ہے اور سینکڑوں قسم کے ہل اس جگہ بنائے جاتے ہیں۔ کارخانہ کو دیکھ کر واقعی آدمی کی عقل چکرا جاتی ہے۔

اس شہر میں دو سو سینکڑوں اشیاء بنائی جاتی ہیں مگر اس وقت جرن لوگ اس کو شش میں ہیں۔ کہ انگریزی کی کلبی سستی سے سستی قیمت میں نہایت خوبصورت شائع کی جائیں اور ان کو بہت سستی قیمت پر دوسرے ممالک میں فروخت کیا جائے۔ دوپہر بعد ہم اس جگہ سے اسٹنٹ گاؤٹ کے لئے روانہ ہوئے۔ ہم کو بتایا گیا تھا کہ صبح کی گاڑی سے روانہ ہو کر ہم اس جگہ رات کے بجے پہنچ جائیں گے۔ مگر ہم کو راستہ میں معلوم ہوا کہ ہم کو ایک جگہ گاڑی ہلنی ہوگی۔ راستہ میں کوئی آدمی انگریزی جانتے والا نہ ملا مگر کسی نہ کسی طرح سے گاڑی ہل کر نہاں میں جان آئی اب امید ہوئی کہ ہم ضرور اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ مگر

تھوڑی دور چل کر معلوم ہوا کہ یہ گاڑی بھی آگے ایک اور مقام پر پہنچی ہوگی۔ اب بڑی چمکیم میں پڑ گئے۔ اتفاق سے ہماری شکل حل ہونے کے لئے ایک صاحب ہمارے کمرہ میں سوار ہو گئے جو سوئٹزر لینڈ کے رہنے والے تھے اور بڑی اچھی انگریزی جانتے تھے جس غلطی میں ہم مبتلا تھے انہوں نے بھی ٹھیک وہی غلطی کی تھی۔ اور وہ بھی اس جگہ جانے کے لئے اس گاڑی سے سوار ہوئے تھے مگر چونکہ وہ جرمنی جانتے تھے اس لئے انہوں نے گاڑی سے دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ ہم اس گاڑی سے نوین برگ ہاسکیس گئے اور اس کے بعد ہم کو دوسرے روز صبح گاڑی ملے گی۔ اور وہ گاڑی اگلے دن دس بجے ہم کو پہونچائے گی۔ اس جگہ ہم کو بے دوسرے مقامات دیکھنے کے لئے چلا جانا تھا اس لئے بڑی مصیبت کا سامنا معلوم ہوتا تھا۔ اس شریف آدمی نے ہم کو صلاح دی کہ ہم رات کو ایک مقام ڈاں برگ پر جو اسٹیشن کے بہت قریب ہے ٹھہرا لیں اور وہاں سے اسٹنٹ گارٹ کے ہوٹل کو فون کرو دیں تاکہ ہوٹل والا سرکاری افسر دن کو ہمارے وقت کی اطلاع دے دیوے۔ اور وہ بخوشی اس سب کام کو انجام دیوینگے کیونکہ ان کی گاڑی ایک گھنٹہ بعد جائے گی۔ وہ بخوشی ہمارے ساتھ آئے اور انہوں نے اسٹنٹ گارٹ کے ہوٹل کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ ہمیں لینے کے لئے آئے تھے اور اگلے دن پھر، بجے صبح آئیں گے ہم نے سب قصہ ان کو بتا دیا اور اس طرح رات بھر پریشانی میں کٹی۔ اگلے دن صبح کو دس بجے اسٹنٹ گارٹ پہونچے اور خوش قسمتی سے ہم کو یہ لوگ ریل پر مل گئے اور ہم کو مختلف فارموں کے دکھانے کے لئے لے گئے۔ جہاں مختلف فصلوں پر نہایت دلچسپ تجربات کئے جا رہے تھے۔ اور سرکاری دلچسپی زراعت کے کاموں میں بخوبی دکھائی دیتی تھی۔

اس کے بعد ہم ڈیری دیکھنے کے لئے گئے۔ اس شہر کی آبادی تین لاکھ سے زائد ہے مگر دودھ کا انتظام صرف ایک کارخانہ کے سپرد ہے جس میں کچھ بیوٹیلنی کے حصص ہیں اور کچھ حصص کسانوں کے۔ اور کچھ دوسرے لوگوں کے ہیں۔ برلن کی طرح دودھ کا نرخ سرکار مقرر کرتی ہے۔ اس جگہ تمام دودھ مختلف مواضعات سے آتا ہے جن کا فاصلہ ۴۰ میل تک پہونچتا ہے۔ کچھ دودھ ہڈریہ موڈلاری ٹکین کے کنشٹرو میں آتا ہے اور کچھ ہڈریہ ریل آتا ہے۔ اس تمام علاقہ کے دودھ میں کمین کی تعداد زیادہ ہوتی ہے

اور معمولی دودھ کے اندر ۳۶ فیصدی گھی کی مقدار ہوتی ہے ۲۰۰۰۰ میٹر دودھ روزانہ اس جگہ پر اگر اکٹھا ہوتا ہے۔ انتظام کی غرضی اس بات سے ظاہر ہوگی کہ ہا جو داس کے کہ چالیس میل تک سے دودھ لایا جاتا ہے مگر زیادہ سے زیادہ گرمیوں کے دنوں میں صرف دو ہزار میٹر یعنی ایک فیصدی سے بھی کم اکٹھا ہونے پاتا ہے اور جائے کے دنوں میں صرف دوسو میٹر اکٹھا ہوتا ہے۔ کھٹے دودھ کو الگ کھن بنانے کے کام کے لئے رکھ دیا جاتا ہے اور صرف عمدہ دودھ فروخت ہوتا ہے۔ دودھ کے انتظام کے لئے ہر گاؤں کے اندر ایک پنچایت ہے جو شخص کا دودھ دیکھتی ہے اور اس بات پر نظر رکھتی ہے کہ کوئی شخص خراب دودھ فروخت نہ کرے کسی قسم کی ملاوٹ نہ کرے اور نہایت صفائی کے ساتھ دودھ کو دوسرے عمدہ دودھ کی قیمت پر پنچایت پر کھانا ادا کرتی ہے۔ دودھ کا تمام انتظام نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے کسی جگہ ٹی گرو کا نام نہیں۔ ہر ایک جگہ اور ہر ایک برتن مشین وغیرہ نہایت صاف رکھی جاتی ہے۔ سیونسلٹی کی طرف سے اس جگہ ملازمین کے رہنے کے لئے مکانات بنے ہوئے ہیں جو نہایت خوب صورت ہیں اور بہت سستے کرایہ پر ملازمین کو دیدئے جاتے ہیں ان کے کپڑوں کے دھونے کے لئے علیحدہ مشین ہے۔ کھانا پکانے۔ کھانا کھانے کے کمرے علیحدہ ہیں اور طرح طرح کی جگہاں جدا گانہ جو غرضکہ ہر طرح سے مزدوروں کی رہائش کا نہایت عمدہ انتظام کیا گیا ہے مزدوروں کے مکانات۔ ان کے کپڑے۔ رہنے کی جگہ بھی نہایت صاف ستھری رکھی جاتی ہے

تمام دودھ جانڈ ہو کر بھانا جاتا ہے اور اس طرح گرم ٹھنڈا کر کے بوتلوں کے اندر بھر دیا جاتا ہے ہم کو بتایا گیا کہ جو مشین اس جگہ کام کرتی ہے وہ جرمنی میں سب سے نئی قسم کی ہے۔ اور نہایت عمدہ کام کرتی ہے اس کارخانہ میں زیادہ تر کام مشین سے کیا جاتا ہے۔ دودھ اسٹور میں پہنچ جانے کے بعد بوتلوں میں بند ہو جانے تک ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ اس کا کھن بنانے میں ہاتھ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ البتہ کھن کو ہانکا ایک روز رکھ دیا جاتا ہے اور اس کی نگہاں چونکہ دوسرے روز تہی ہیل اس وجہ سے کھن اسٹور میں لیجانے اور لانے کے لئے مزدوروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ کھن کی ٹکیہ بنانے۔ اس کے صحیح وزن کاٹنے اور اس پر کاغذ چپکانے وغیرہ میں بھی ہاتھ نہیں لگتا صرف انسان کی ضرورت یہ ہے کہ کلیوں کو کس میں بند کر دے اور ان کو جہاں لکھا ہو بھیج دے۔ کھن بننے کے بعد دودھ پچتا ہے اس کی

دہی جاکر اسے بورپوں میں دبا دیا جاتا ہے اور اس سے جو ملائم پنیر حاصل ہوتا ہے اس کو پنیر بنانے کی فیکٹریوں میں روانہ کر دیا جاتا ہے اس کو کبھی خشک کر کے فیکٹریوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا ہے اور اس سے ہزاروں قسم کی چیزیں کھلونے، لکھنے کے قلم، چاقو کے دستے، کنگھے وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ اس جگہ دودھ کو سفوف بنانے کا کام بھی ہم نے دیکھا جو نہایت دلچسپ طریقہ پر کیا جاتا ہے۔ دودھ کو خواہ تازہ ہو یا کھن بکلا ہوا ایک جگہ پہلے دیکویم پین کے اندر آلا جاتا ہے تاکہ اس کا دودھائی پانی خشک ہو جا سکے اور اس کے بعد ایک رولر جس کے اندر گرمی پہنچائی جاتی ہے اس کو نہایت ماریک کاغذ کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے اور پھر اس کو شین سے پیس کر فروخت کر دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے یہ مشین جرمنی میں اول قسم کی ہے۔

اس کے بعد ہم نے ایک کھانڈ بنانے کی شین دیکھی۔ جو چتندر کا موسم نہ ہونے کی وجہ سے چتندر سے کھانڈ نہ بنا رہی تھی۔۔۔ اس کارخانہ کے ماتحت بہت سے کارخانے قرب و جوار میں ہیں جو صرف لالہ کھانڈ بنا کر اس کارخانہ کو بھیجتے ہیں اور یہاں اس سے سفید کھانڈ اور چائے میں ڈالنے کی مکیاں بنائی جاتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ بہت زبردست کارخانہ ہے اور کئی سو من کھانڈ کی مکیاں ایک دن میں اس جگہ تیار ہوتی ہیں۔ زیادہ تر کام شین سے ہوتا ہے۔ کھانڈ کی کٹائی اور ڈوبوں کے بنانے کی شین وغیرہ پر تمام عورتیں کام کرتی ہیں جن کی تعداد مسینکڑوں کی ہوگی۔

اس کے بعد ہم نے یہاں کا زراعتی ہائی اسکول دیکھا اس جگہ سب سے عجیب رواج یہ ہے کہ صرف وہ طلباء لائے جاتے ہیں جو باہ سال معمولی مدرسوں میں تعلیم پا چکے ہوں اور اس کے بعد کم سے کم دو سال کمیت پر کھیتی اپنے ہاتھ سے کر چکے ہوں۔ اعلیٰ افسران سے گفتگو کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کا یہ خیال ہے کہ جب تک لڑکے کھیتی کرنے کے بعد اسکول یا کالج میں نہیں آتے ان کو کھیتی کرنے کی طرف رغبت نہیں ہوتی اور ان کا کام صرف کتابی ہوتا ہے جس سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور نہ ہی وہ کسان بننا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ اس خیال کو پسند نہیں کرتے کہ تعلیم ختم کر دینے کے بعد کسان کا کام کرنے کے لئے لڑکوں کو مجبور کیا جائے۔ انھوں نے اپنی یہ رائے تجربہ کی بنا پر قائل کی ہے۔

کہ زراعت کی اعلیٰ تعلیم سے پہلے کمیت پر کام کر لینا ضروری ہے۔ ان لوگوں نے بتایا کہ جب سے یہ طریقہ رائج کیا گیا ہے کافی تعداد ان کے طلباء کی کسان کا کام کرتی ہے۔ اور کسان کے کام میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں ہندوستان کی سرکار کو بھی اس تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہئے تاکہ صرف نوکری کی تلاش کرنے والے طلباء زراعتی کالجوں سے نہ پیدا کئے جائیں فصل اس جگہ نہایت عمدہ تھی اور سینکڑوں قسم کے نئے نئے بیج پیدا کر کے ان پر تجربات کئے جا رہے ہیں۔

اسٹنٹ گارٹ عیب قسم کا شہر ہے۔ چاروں طرف پہاڑیاں ہیں اور بالکل وادی میں واقع ہے۔ شہر نہایت دلکش ہے اور اس کے چاروں طرف گھومنے سے سارا شہر جگہ بہ جگہ نظر آتا ہے اور نہایت دلکش نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ اس شہر میں ایک بہت پرانا قلعہ ہے جو بہت عمدہ جگہ اور پختہ پر واقع ہے۔ اس کے سامنے سے ایک پُرانی ٹرک دوسرے قلعہ کو جاتی ہے جو اب بطور پیل خانہ کے استعمال ہوتا ہے۔ اس قلعہ میں بہت پرانی کرسیاں اور ایک پلنگ موجود ہے۔ جو ڈیڑھ سو سال سے زائد بنا ہوا ہوتا ہے اور اس پر بچھانے کا سامان لٹھی کپڑے کا ہے اور اس پر نہایت خوبصورت زر دوزی کا کام کیا گیا ہے یہاں ابھی تک بالکل نیا معلم ہوتا ہے۔ عمارت میں کئی جگہ نہایت خوبصورت پچے کاری کی تصاویر بنی ہوئی ہیں۔ اور محبت مجموعی عمارت میں ایک خاص شان ہائی ہائی ہوکن کل اس جگہ شام کے وقت لوگ کافی تعداد میں تفریح کے لئے آتے ہیں۔

اسٹنٹ گارٹ میں ایک نہایت عالیشان عمارت تیر کی سکھانے کے لئے بنائی گئی ہے جس میں عیب طرح کی شین لگائی ہے۔ جو پانی کو مختلف درجہ حرارت پر رکھتی ہے۔ اگر پانی میں گندگی ہو تو اس کو صاف کرتی ہے۔ ایک طرف بیسوں مکانات ایک ایک آدمی کے نہانے کے لئے بنے ہوئے ہیں جہاں پر اگر کوئی صاعب چاہیں تو گرم پانی سے نہا سکتے ہیں یا غوارہ سے پانی لے سکتے ہیں۔ ایک بہت بڑے مکان میں دو تالاب نہائے گئے ہیں جن کے بیچ میں صرف اوپر کی طرف ایک پل نما پگ ڈنڈی بنا دی گئی ہے۔ ایک طرف پگ ڈنڈی کے عورتیں تیرتی ہیں اور دوسری طرف مرد تیرنے کا کام سکھانے کے لئے ہر وقت آدمی رہتا ہے اور سینکڑوں آدمیوں کا جھگڑا ہر وقت رہتا ہے۔ اس تالاب کا پانی بہت

ایک طرف سے آتا اور دوسری طرف سے خارج ہوتا رہتا ہے تاکہ پانی خراب نہ ہونے پائے۔ کہا جاتا ہے کہ جرمنی میں یہ چیز صرف اس جگہ ہے۔ یوں تو تیرنے کے تالاب اور بھی بہت سی جگہوں پر ہیں۔ مگر خوبصورتی کے ساتھ ایسی عمارت اور عمدہ انتظام کسی جگہ نہیں ہے۔ انتظام کے لئے افسر رہتے ہیں۔ چھوٹا سا مکان کھانے پینے کی اشیاء بہم پہنچانے کے لئے موجود ہے۔ غرض کہ نہایت تفریح کی اور کارآمد جگہ ہے۔

اس کے بعد ہم کالنزہ کے لئے روانہ ہوئے۔ زراعتی محکمہ کے افسر جو انگریزی بخوبی جانتے تھے۔ ہم کو اسٹیشن پر لے گئے اور ہوٹل میں ہمراہ لے گئے۔ ایک صاحب جرمنی کے رہنے والے ہیں۔ کینیڈا میں کھیتی کرتے تھے وہاں چونکہ نقصان ہوتا شروع ہوا۔ اس لئے سب اراضی فروخت کر کے واپس چلے آئے۔ اور اب سرکاری ملازمت کر لی۔ انہوں نے زراعتی ڈپلوما پہلے ہی حاصل کر لیا تھا جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زراعتی اسکولوں کے طلباء اکثر کھیتی کرتے ہوں گے۔ کالنزہ اگرچہ چھوٹا مگر بہانا شہر ہے۔ رات کو ہم ہوٹل میں ٹھہر گئے اور صبح کو تمباکو کے فارم میں پہنچ گئے۔ وہاں کے افسر نے ہم کو تمام قسم کے تمباکو دکھائے۔ شاید ہی دنیا کے اندر کوئی خطہ ایسا ہوگا جہاں کا تمباکو یہاں موجود نہ ہو۔ پانچ سو سے زائد اقسام تو باہر کے تمباکو کی اس جگہ تھیں اور ہزاروں قسم کے تمباکو انہوں نے خود پیدا کئے تھے جس پر یہ لوگ اپنے شہر بات کر رہے تھے۔ اس اسٹیشن کے ذمہ دار افسر جرمن ہیں جو سن رسیدہ ہیں اور عمدہ تک مصر میں کہاں کی تحقیقات پر کام کرتے رہے ہیں، اور اب اس جگہ کام کرتے ہیں۔ انگریزی نہایت عمدہ بولتے ہیں اور نہایت خوش خلق آدمی ہیں۔ انہوں نے بہت سی کتابیں بھی تمباکو۔ کپاس وغیرہ اجناس پر لکھی ہیں۔ مگر قسمی سے سب جرمنی زبان میں ہیں۔ اس لئے ہم ان سے کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ تمباکو کے تعلق جس قدر طریقہ حرفی کے ہم سمجھ سکتے تھے وہ سب یہاں کئے جا رہے ہیں اور ان کا اثر دیکھا جا رہا ہے۔ تمباکو کے پودوں کے درمیان کتنا فاصلہ ہونا چاہئے۔ کس قسم کی اراضی پر کون سا تمباکو اچھا ہوگا۔ پانی دینے اور نہ دینے کا کیا کیا اثر تمباکو کی مقدار اور خاصیت پر پڑتا ہے۔ کون سا کھاد ڈالنا مفید ہوگا کس موسم میں تمباکو بونا کس علاقہ جرمنی میں ٹھیک ہے۔ تمباکو کے سکھانے اور اس کو پر جانے کا عمدہ طریقہ کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

غرض کہ یہ ایک بہت بڑا فارم ہے اور ہر طریقہ پر تنباکو کی تحقیقات جاری ہے۔ یہ لوگ اس تحقیقات کے پیچھے بالکل سے معلوم ہوتے ہیں۔ ہم نے کئی بار چاہا کہ زیادہ دیر تک وہاں نہ ٹھیس کیونکہ دوسری جگہ جانے کا پہلے سے پروگرام تھا اور ان لوگوں کا انتظار کرنا برا معلوم ہوتا تھا مگر ان لوگوں کی دلچسپ کہانی اور نئے نئے طریقوں کا بیان ہم کو جانے دیتے تھے ناظرین کو تعجب ہو گا کہ ان لوگوں نے ایسا تنباکو پیدا کیا ہے جس میں وہ چیز جس سے نشہ ہوتا ہے یعنی نکوٹین بالکل نہیں ہے اور اس تنباکو کی کاشت چند کاشتکاروں سے ان کو بلا بتائے ہوئے کرائی گئی ہے جس میں بڑی کامیابی ہوئی یعنی پیداوار میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اب اس کے مزید تجربات کرنے کے بعد امید ہے کہ جرمی یہ تنباکو بہت جلد بازار میں بھیج سکے گا۔ اس کی طبی تحقیقات باقی ہے۔ اس کا بیج ہم حاصل کرنا چاہتے تھے مگر انہوں نے کہا کہ چونکہ اجماعی تجربہ ختم نہیں ہوا ہے اس لئے اس کا بیج نہیں مل سکتا۔ اور بہت سی اقسام کے بیج ان لوگوں نے ہم کو دئے جن کے لئے ان کے مشکور ہیں۔ دوسری عجیب چیز جو ہم نے دیکھی وہ یہ تھی کہ ایک کھیت میں برابر سال بہ سال تنباکو کا یا جا رہا ہے۔ سات سال ہو چکے ہیں مگر تنباکو کی ٹہیت اور پیداوار پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے۔ بلکہ پیداوار بڑھ رہی ہے اور قسم عمدہ ہو رہی ہے ہندوستان کے بمبے اگر اس ملک کے اندر ہوتے تو ایسے سب لوگوں کو جو اس قسم کے تجربات کر کے ارضی کھیتیاں اس کر رہے ہیں اور نئی نیو بیاریاں ان کے خیال کے بموجب پیدا کر رہے ہیں جیل خانہ کے اندر ٹونس بیٹے ان کو ایکھ کی کاشت دو سال تک بھی کھیتوں میں کرنا ناگوار گذرتی ہے یہ ہماری بدقسمتی نہیں تو کیا ہو کہ ہمارے ہندوستانی بصر نہ تو فو کچھ کرنا چاہتے ہیں اور نہ دوسرے لوگوں کو کچھ کرنے دیتے ہیں۔ جس ملک کے اندر بچہ سنے کر پڑھ سکے ہیں اپنے ملک کی ترقی کی لگن ہو وہ ملک اگر ترقی نہ کرے گا تو کون کرے گا۔

اس وقت ایک بہت بڑی عمارت نہایت عجلت کے ساتھ تعمیر کی جا رہی ہے جس میں اس سال کی فصل جو ۱۵ روز کے بعد ٹوٹی شروع ہو جائے گی سکھائی جائے گی اس کے اندر جو شین لگائی جا رہی ہے وہ نہایت عجیب قسم کی ہے۔ ہم نے اس کو دیکھا ہے کیونکہ وہ لگائی جا چکی ہے۔ اگر کسی درجہ حرارت یا مدد

رطوبت کو کچھ دلوں تک قائم رکھنا ہو تو یہ طریقہ کام میں لایا جائے گا۔ اس مشین کے ذریعہ ایک بابب چیزیں ٹھیک کر دینے پر بازو فوگری سردی۔ رطوبت اور خشکی ایک درجہ پر رکھی جاسکتی ہیں۔ نہ صرف سارے مکان میں بلکہ ہر ایک کمرہ میں مختلف درجہ حرارت و درجہ رطوبت قائم رکھے جاسکتے ہیں۔ جب کبھی گرمی بڑھ گھٹ جائے گی یا رطوبت میں کمی بیشی ہوگی تو ایک دم ایک چمڑہ اپنی جگہ تبدیل کر کے اس سب کو ٹھیک کر دے گا۔

یہ مشین یہاں کے مبصرین کی نئی ایجاد ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس قسم کی مشین آن تک کسی جگہ نہیں لگائی گئی ہے ہمارے ملک کے مبصر تو مشین نگار اس کا استعمال کرنا بھی نہیں جانتے مگر یہ لوگ ہیں کہ نئی مشینیں اختراع کرنے اور اس سے کام لیتے ہیں صرف اتنا ہی نہیں۔ بلکہ سب سے زیادہ معرکہ کی بات یہ ہے کہ آپ کوئی قسم تبا کو کی ان لوگوں کو دے دیں اور دریافت کریں کہ وہ کس قسم کا تبا کو ہے تو یہ اس کو بلا سونگھے اور چھوئے یعنی انسانی حاس سے بلا کسی قسم کا کام لئے بنا دیں گے کہ وہ پینے میں کیسا بڑا سونگھنے میں کیسا ہے اور اس کی دیگر خاصیتیں کیا ہیں۔ عموماً تین چار قسم کے تبا کو زیادہ تر بوائے جاتے ہیں۔ اول وہ تبا کو جس سے عمدہ گٹ بنائے جاسکیں۔ دویم وہ جو پائپ کے اندر پینے کے لائق ہو۔ سویم ایسے تبا کو جو سگار کے کام آسکیں۔ چہارم وہ جو تینوں یا دونوں باتوں کے لئے کام آد ہو سکیں۔ اس وقت اس بات پر خاص توجہ دی جا رہی ہے کہ تبا کو میں پتوں کی تعداد بڑھائی جائے تاکہ پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہو۔ اس بات میں بڑی کامیابی ہوئی ہے اور ناظرین یہ جان کر تعجب کیس گے کہ ہم نے خود ایسے پیڑ دیکھے ہیں جن پر ساٹھ ساٹھ پتے پائے گئے ہیں وٹھل پر پتوں کے درمیان ہلکے کم کر دی گئی ہے۔ اگرچہ ایسا کرنے سے پتہ کچھوٹا ضرور ہو گیا ہے مگر ان لوگوں کی رائے میں یہ تبا کو سگار کا پائپ کے لئے خصوصیت کے ساتھ عمدہ ہے۔ چونکہ یہ تجربہ بھی ابھی مکمل نہیں ہوا ہے اس لئے ہم کو اس کا بیج نہ مل سکا۔ ہم یقین کرتے ہیں جس وقت یہ تجربات مکمل ہوں گے۔ دنیا میں چکا ہونہ پیدا کریں گے۔ اور لوگوں کی سمجھ میں آجائے گا کہ جو شخص لگن کے ساتھ کام کرتا ہے وہ کیا نہیں کر سکتا؟

مختلف طریقہ پر پتوں کو سکھانے کے تجربات اس جگہ کئے جا رہے ہیں مگر کسادوں کے لئے صرف دو طریقہ یہ لوگ بتاتے ہیں اول طریقہ یہ ہے کہ پتوں کو توڑ کر ان کی اقسام کرنے کے بعد ایک ٹھوس

میں پرو دیا جاے اور ان کو چھت کی کڑیوں میں کیل لگا کر لٹکا دیا جائے تاکہ وہ وہیرے وہیرے سوکھتا رہے اور جب تبا کو کے پتے اس طرح سوکھ جائیں تو ان کو سرکاری کیور کے ہاتھ فروخت کر دیا جاوے جہاں اس کے انتخاب اور بار بار انٹ پلٹ سے اس کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ سرکاری طرف سے تبا کو کی قیمت مقرر ہے اور سوسائٹی کے اس نظام کے کاشتکار بھی ممبران ہیں۔

اس کے بعد ہم نے مشہور و معروف فیکٹری دیکھی مازن مازم کے اندر ہے جہاں ٹیل ڈوگ یا لیٹر قم کے فنی سن کے تیل سے چلنے والے ٹریکٹر بنائے جاتے ہیں۔ یہ فیکٹری میلوں کے اندر واقع ہے اور ساٹھ ستر سال پرانی ہے۔ اس وقت یہ لوگ صرف ٹریکٹر اور بھوسہ اڑانے اور گہانے کی مشینیں زیادہ تر بناتے ہیں۔ ابھی ایک قم کا ٹریکٹر ان لوگوں نے بنا یا ہے جس میں قم کے چال؟ ہوگی اور اس کو نہ صرف کھیتوں کے اندر استعمال کیا جائے گا بلکہ سڑکوں پر بھی عام لاریوں کی طرح، ایل نی گھنٹہ کی رفتار سے سٹن سامان لے کر چل سکے گا۔ جرمنی ان ممالک میں نہیں ہے۔ جہاں پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے حکام باؤگڈ فیلع کے حاکم یہ کہہ سکیں کہ اپنا سٹن سے زیادہ وزن کی لاریاں سڑک خراب کر دیں گی یہاں ایک انجن سے تین تین لاریاں ایک ساتھ ہانکی جاتی ہیں اور دو کا تو عام رواج ہے اور یہ سب لاریاں تین تین اور چار چار بڑے سے بڑے شہروں کے اندر سے جہاں موٹر وغیرہ کی بکثرت آمد و رفت ہے مال سے ٹھساٹھس بھری ہوئی برابر دوڑتی رہتی ہیں۔ نہ یہاں کے ہل خراب ہوتے ہیں اور نہ سڑکیں گھسکتی ہیں دراصل کسی کی تجارت و زراعت کی ترقی کا دار و مدار زیادہ تر اس ملک کی بار برداری کے نظام پر ہے۔ ہمارے یہاں بار برداری کا ذریعہ ریل ہے اور یہ تجارتی سامان سستے داموں پر ڈھونے اور جلد ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے سے قاصر ہے پھر تم ظنی یہ ہے کہ کسی اور قسم کی بار برداری کو بھی ہندوستان میں پنپنے نہیں دیتی ہمارے خیال میں زمانہ آگیا ہے کہ ہمارے بھائیوں کو آسٹریلیا و کانسلوں میں اس بات کی زبردست کوشش کرنی چاہئے کہ ٹری بڑی لاریاں اور دوسری قسم کی بار برداری کی مشینیں ریل کے مقابلہ میں چلائی جاسکیں۔ انگریزوں کا حکمہ اپنی آمدنی کا انتظام کرنا یا خرچ کی پر تال کرنا نہیں جانتا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ کسی اور قسم کی بار برداری کو ہندوستان کے اندر نہ پہنچنے دے۔ غالباً ہمارے تجارت پیشہ لوگ اس بات کی طرف کم توجہ کرتے ہیں اور ہمارے

میران اسمبلی وکائٹل تو اس سے واقفیت حاصل ہی نہیں کر سکتے جب تک وہ اس طرف خاص طور پر متوجہ نہ ہوں زراعت پیشہ لوگ تو بیچارے جاہل ہی ٹھیکے۔ پھر اس میں تبدیلی ہو تو کیسے ہو؟ ہم کو سب سے زیادہ زور اس بات پر دینا واجب ہے کہ معمولی بہانہ سازی سے سرکاری حکام ہم کو سستی قسم کی باربرداری سے باز نہ رکھ سکیں اگر واقعی پل اچھے نہیں ہیں اس کی صحت میں ہم کو شبہ ہے۔ تو ان کو توڑ کر ٹھیک بنایا جائے بجائے اس کے کہ باربرداری کی سستی قسم کو کام کرنے سے روکا جاوے۔ اس طرح لاکھوں آدمیوں کو روزگار مل سکے گا۔ اور سامان و سامانہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کی وجہ سے بازاروں کی حالت عمدہ ہو سکے گی اور تجارت و زراعت کو فروغ ہوگا جس قدر زور اس بات پر دیا جاوے اسی قدر تھوڑا بہت۔ ہم امید کرتے ہیں ہمارے بھائی اس ضرورت کو محسوس کریں گے۔

اس کا نغانہ نے ایک ایسا ٹریکٹر بنایا ہے جس سے بھوسہ اس قسم کا باریک ہو جاتا ہے جیسا کہ ہم لوگ بیلوں کے لئے استعمال کرتے ہیں اور نالاج صاف ہو جاتا ہے۔ بد قسمتی سے اس قسم کا ٹریکٹر اس وقت موجود نہ تھا کیونکہ جرمنی میں یہ فصل کٹنے کے دن ہیں اور ان لوگوں کی تمام توجہ جرمنی کی ضرورت کی شینیں بنانے کی طرف تھی۔ مگر اس قسم کے ٹریکٹر کافی تعداد میں اس وقت اسی کا نغانہ کے بنائے مصر میں کام کر رہے ہیں جہاں کے لوگ بھوسہ کو مویشیوں کے چارہ کے لئے کام میں لاتے ہیں۔

ہم نے اپنے ٹریکٹروں کے متعلق چند شکایات کیں کیونکہ ہم بھی اس کا نغانہ کے ٹریکٹر استعمال کرتے ہیں انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے ہم سے تفصیل دریافت کی اور اس کی خرابی کی وجوہات بتائیں اور کہا کہ ہم چاہے جس وقت ان کو مفصل حالات لکھ کر ان کی رائے دریافت کر سکتے ہیں۔ اور وہ ہمیشہ خوشی سے ہم کو اس کا جواب دیں گے۔

جرمنی میں انگریزی سکہ کی دو قیمتیں ہیں ایک وہ جو معمولی بازار کی قیمت ہے اور اس وقت ۱۱ مارک کے قریب ہے۔ دوسری ان لوگوں کے لئے جو دوسرے مالک سے جرمنی میں آتے ہیں اگر وہ پچھروں سے زائد کے لئے لانا چاہیں تو ان کو پونڈ کے بدلے میں قریب ۱۸ مارک دے دئے جاتے ہیں اور مسافر ان مارکوں کو بھٹا کر اپنا خرچ چلا سکتے ہیں۔ مگر قاعدہ یہ ہے کہ ایک دن میں صرف پچاس مارک خرچ کئے جاسکتے

ہیں اور یہ مارک بھی صرف دو روز کے لئے مل سکتے ہیں اور صرف بنک سے بھنائے جا سکتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص ساٹھ مارک روزانہ خرچ کرے گا تو اس کو پونڈ کے بدلے میں صرف ۱۲ مارک ملیں گے لیکن اگر روزانہ خرچ کے لئے پچاس مارک چاہے گا تو وہ مارک ملیں گے۔ یعنی مسافروں کے لئے مارک کی قیمت دو تہائی کر دی گئی ہے۔ ہم نے بھی بیس دن کے مارک خرید کر لئے تھے۔ جب ہم کاسرو پہنچے تو ہمارے پاس بہت کم مارک رہ گئے تھے اور ہم چاہتے تھے کہ اس دن کے پچاس مارک اور اگلے دن کے پچاس مارک بنک سے لے لیں مگر جب بنک میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس علاقہ میں مسافروں کو صرف پچیس مارک مل سکتے ہیں پچاس نہیں۔ اب ہم بڑی چمیکم میں پڑ گئے کیونکہ ہم کو ہوٹل کے دام ادا کرنے تھے۔ جوائنر ذرا عت کے ہمارے ساتھ تھے انہوں نے کہا کہ یہ معمولی بات ہے ہم ہوٹل کا بل ادا کر دیں گے اور ہیلڈ برگ جہاں ہم کو دوسرے روز جانا تھا اور جہاں پچاس مارک مسافر کو مل سکتے ہیں وہاں ہم مارک بھنا سکتے ہیں۔ مگر معلوم ہوا کہ اس دن جمعہ ہے اور اگلے روز صرف دو پیر تک بنک کے دفتر کھلے رہیں گے اور اس سے اگلے دن اتوار ہونے کی وجہ سے دفتر بالکل بند رہیں گے۔ موجودہ نظام کے بموجب ہم صرف رات کو ہیلڈ برگ پہنچتے تھے۔ اس لئے ہر دو گرام کو تبدیل کرنا پڑا اور میں نے یہ طے کیا کہ ہیلڈ برگ جا کر پہلے روپیہ لے لیا جاوے اور اس کے بعد کوئی جگہ کو دیکھا جاوے۔ چنانچہ ہم ہیلڈ برگ گئے اور ہم نے ڈیڑھ سو مارک تین دن کے لئے لے لئے کیونکہ ایک دن ہمارا پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اب ہم کو تسلی ہوئی اور روپیہ کی فکر دور ہوئی۔

جرمنی کی مشہور و معروف کمپنی بے ڈی شن انیلین سوڈا فیکٹری کا نام ہر تاجر نے سنا ہوگا کیونکہ سب قسم کے رنگ لڑائی سے پہلے بنایا کرتی تھی۔ اب بھی یہ رنگ بناتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے مختلف قسم کے مصنوعی کھاو بنانے شروع کر دیے ہیں۔ ہر دو کا رخانا اب ایک ٹرسٹ کے ماتحت ہیں جو جرمنی کی تمام کارخانوں کی کیمیاوی پیداوار کو فروخت کرنے کا ذمہ دار ہے اور اب اس کا نام بھی بدل دیا گیا ہے۔ لائن ندی کے کنارے پر یہ کارخانہ قریب ۵ میل لمبا ہے۔ اور اس میں بیسیوں چھنیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ سارے کارخانے میں محض چکر لگانے کے لئے ہم کو کئی دن چاہئیں تھے۔ اس لئے ہم نے صرف کہا و بنانے کے حصہ کو دیکھنا چاہا۔ یہ کارخانہ بھی بہت دور تک چلا گیا تھا اور اس کی

کھاد کے بنے ہوئے دھبہ دار خانہ میں چھوٹے چھوٹے پہاڑ معلوم ہوتے تھے عموماً درخانہ میں یہ طریقہ ہے کہ ریل کی دیگن آکر سس کے باہر کھڑی ہو جاتی ہے، اور تمام تیار سالان اس دیگن کے اندر بستر تار بٹاتا ہے جب یہ بھر جاتی ہے تو دوسری اس کی جگہ آجاتی ہے اس وقت میں بھی اسٹور میں کافی مقدار کھاد کی موجود تھی۔ اتنے لمبے کارخانہ کے کاموں کی تفصیل جہاں سینکڑوں قسم کے کھاد اور دوسری چیزیں بنائی جاتی ہوں ناممکن ہے۔ اس لئے ہم صرف چند باتیں بتانے پر اکتفا کریں گے۔ یہ کارخانہ بجلی سے کھادیں بناتا ہے۔ ہندوستانی مبصرین سے گفتگو ہوتی ہے تو وہ بتاتے ہیں کہ ہندوستان میں سستی بجلی نہیں ملتی۔ اس وجہ سے ہوا کی ٹائر جن سے مصنوعی کھاد نہیں بنایا جاسکتا۔

یہ بات بالکل غلط ہے۔ کیونکہ بجلی جرمنی میں بھی سستی نہیں ہے۔ اور ہر کارخانہ ہوا کی ٹائر جن کو کام میں لانے کے لئے بجلی کا استعمال نہیں کرتا۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے مبصرین کسی کام کو کرنا نہ چاہیں یا ان کو واقفیت نہ ہو مگر ان کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ ہمیں گمراہ کریں۔ ناظرین کی واقفیت کے لئے ہم اس طریقہ کو بھی بتا دینا چاہتے ہیں۔ اگرچہ اس کی تفصیل واریسٹری سے متعلق ہماری واقفیت بھی قطعی محدود ہے اور اس قلیل عرصہ میں ہم پوری واقفیت پیدا بھی نہیں کر سکتے۔

پانی کی بھاپ کو جس میں ہائیڈروجن اور آکسیجن آمیز ہوتی ہے کو ٹنڈ پر سے گزارا جاتا ہے تاکہ پانی پھٹ کر اس کی ہائیڈروجن الگ ہو جائے اور اسی طرح ہوا کو جس میں ہائیڈروجن زیادہ مقدار میں ہے گزارا جاتا ہے اور خالص ناٹروجن الگ کر لی جاتی ہے۔ جو بقیہ اجزاء اور پانی سے بچ رہتی ہے وہ دوسری چیزوں کے کام آتی ہے۔ اس طرح ہائیڈروجن اور ناٹروجن دو گیسیں الگ الگ بن کر ایک انجن کے پائپ میں آتی شروع ہوتی ہیں۔ ان میں ہوائی گیسوں پر بہت زیادہ ہوا کا دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ تاکہ ان کے آئندہ ملنے میں سہولت ہو۔ ان ”دبی ہوئی“ گیسوں کی مخلوط چیز کو ایک بہت بڑے اور مضبوط چولھے کے اندر سے گزارا جاتا ہے جس میں ایک قسم کی کیمیکل چیز موجود رہتی ہے جو اس کارخانہ کا عبیدہ ہے۔ جب اس میں سے گزارتے ہیں تو یہ دونوں گیسیں مل کر ایونیا بنا دیتی ہیں جس سے اور دوسری

کھا دیں جن میں نائٹروجن ہوتی ہے بنتی ہیں۔ کئی قسم کی کھاؤ جن میں۔ نائٹروجن ہوتی ہے اس کا رخانہ میں تیار ہوتی ہیں مگر صرف دو مشہور کھاؤں کا ہم ذکر کریں گے۔ کیونکہ بقیہ قسم کے کھاؤ ہندوستان کے اندر انگریزی کا رخانہ اس وقت فروخت کر رہے ہیں۔ اول کھاؤ کی قسم نائٹرو فوس ہے

جس میں نائٹروجن بارہ فیصدی فاسفورس بارہ فیصدی پوناش ۲۱ فیصدی اور چونا ۱۰ فیصدی تک ہوتا ہے۔ یعنی نصف سے زائد اشیاء پودہ کے کام آنے والی ہوتی ہیں۔ یہ کھاؤ سب سے زیادہ کارآمد سمجھا جاتا ہے۔ دوسرا کھاؤ پوریو کہلاتا ہے جس میں ۶ فیصدی نائٹروجن ہوتی ہے۔ یہ

دونوں کھاؤ ہندوستان میں بہت مفید ہوں گے مگر معلوم ہوا ہے کہ تمام دنیا کے کھاؤ بنانے والوں نے یہ طے کر دیا ہے کہ کس ملک کے ہاتھ کون ملک کھاؤ فروخت کرے اس لئے یہ کارخانہ ہم کو نہ بتا سکا کہ آیا ان کا فروخت کرنا ہندوستان میں ممکن ہے یا نہیں برلن سے اس بات کا پتہ لگ سکے گا۔ جو مصنوعی کھاؤ اس وقت ہندوستان کے اندر آتے ہیں ان میں کوئی کھاؤ بھی ایسا نہیں ہے جس میں چاروں جز ایک جگہ پائے جاتے ہوں اور نہ کوئی کھاؤ ایسا ہے جس میں نائٹروجن کی مقدار اس قدر زیادہ ہو۔ ہندوستان میں یہ دونوں کھاؤ استعمال کئے جائیں تو یقین ہے کہ بہت مفید ثابت ہوں گے۔ اس کارخانہ کی ایک بہت بڑی فارم بھی ہے جس میں پودوں پر ان کھاؤں کا تجربہ کیا جاتا ہے ہم بھی اسے دیکھنے گئے۔ نہراوئل قسم کے پودے اوفیسیں اس جگہ موجود ہیں بلکہ دنیا بھر کی سب مشہور مشہور فصلوں پر تجربہ کیا جاتا ہے اول پودوں کو معمولی ریت۔ کے اندر گلیوں میں اگا کر تجربات کئے جاتے ہیں۔ پھر جوبات گلیوں میں صحیح ثابت ہوتی ہے اُس کے تجربات مختلف کھیتوں میں کئے جاتے ہیں۔ بعض بعض جگہوں کی مٹی میٹھا کر اُس میں بھی پودوں کو بویا گیا ہے۔ چاول۔ گنا۔ جو یہاں بالکل نہیں ہوتے وہ بھی نہایت عمدگی کے ساتھ اس جگہ اگے ہوتے تھے۔ البتہ اس مکان کی آب و ہوا کو مصنوعی طور پر بنایا گیا تھا۔

جیسا کہ ہم پیشتر لکھ چکے ہیں جرمنی میں ہر شخص کو جس کی عمر ۲۵ سال سے مائٹریہ پوچھ ماہ کے لئے ایک مرتبہ ضرور مزدوری کا کام کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ کام عموماً مٹی کھودنے شرک بنانے اور نہریں نکال کر زمینوں کو ٹھیک کرنے کا ہوتا ہے ہر وقت اس طرح سینکڑوں کی تعداد میں نوجوان آدمی یہ کام کر رہے

رہتے ہیں انہیں معمولی مزدوری ملتی ہے۔ قیام کا انتظام حکومت کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ یہیں بڑی خواہش تھی کہ ان لوگوں کے کیمپ کو کسی نہ کسی جگہ کام کرنا ہوا دیکھیں۔ چنانچہ راستہ میں ایک جگہ اس قسم کا ایک کیمپ دیکھنے کا موقع ملا بلکڑی کا بنا ہوا ایک نہایت خوش نما کیمپ دوسو پچاس مزدور ناطالہ علوی کے لیے بنایا گیا ہے۔ چاروں طرف سے گہرا ہوا ہے صرف دو دروازے رکھے گئے ہیں۔ بیچ میں ایک لگا ہے۔ دونوں دروازوں پر ان ہی مزدوروں میں سے دو لڑکے چوکیدار کی حیثیت سے پہرا دیتے ہیں۔ ان کے پاس ایک شول مٹی کھودنے کا اور ایک لٹا اور ہرا دینے کے لئے ہے جو اس بات کی نشانی ہے کہ یہ مزدوروں کا کیمپ ہے۔ اور مزدوری کرنا جرمنی میں شان کی بات ہے۔ اس چوکیدار سے اجازت لے کر اندر گئے تو ایک طالب علم جو اس جگہ سار جنٹ کا عہدہ رکھتا تھا ملا۔ اس نے بڑی خندہ پیشانی سے سب چیزیں ہم کو دکھائیں۔ یہ کالج تک پڑھا ہوا تھا۔ قریب ۵ سال کے اسکول میں تعلیم پا چکا تھا۔ عمر لگ بھگ ۲۰ سال کے ہوگی۔ نہایت تندرست و توانا اور نہایت ذہین اور ہوشیار معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت صرف دس بارہ لڑکے اندر موجود تھے جو کھانا پکا رہے تھے اور اسی قسم کے دوسرے کام کر رہے تھے۔ ایک طرف نہایت عمدہ پاورچی خانہ تھا جہاں اگرچہ لکڑی اور کوئلہ جلا یا جا رہا تھا لیکن دھوئیں کا پتہ نہ تھا۔ سب سامان نہایت صاف مگر بہت سادہ تھا۔ اس کے آگے ایک نہانے اور جماعت وغیرہ بنانے کی جگہ تھی۔ اس کے بعد رہنے کے کمرے تھے ہر کمرے میں ٹولہ ٹولہ لڑکے رہتے ہیں۔ چار پلنگ نیچے تھے اور چار ان کے اوپر تھے۔ کمرے نہایت صاف اور میسر قرینہ سے لگے ہوئے۔ پلنگ سب لکڑی کے بنے ہوئے تھے کیس نہایت صاف ستھرا تھا اور اس طرح بنایا گیا تھا کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے منتقل ہو سکتا تھا۔ راستے میں ہم نے اُن لڑکوں کو ایک جھیل کے اندر گرہی نالی کھودتے دیکھا تاکہ جھیل کا پانی نکل جائے اور کھیت قابل کاشت ہو جائیں۔ واقعی دیکھنے کے لائق نظارہ تھا، تعلیم یافتہ نوجوان جن میں کئی دیگر می حاصل کئے ہوئے تھے، کدال، پھاوڑا لے مٹی کھود رہے تھے، اور اپنے ملک کی حالت درست کرنے میں لگے ہوئے تھے، ہماری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے اور ہم نے سوچا کہ کیا ہندوستان میں بھی وہ زمانہ کبھی آئے گا جب اُن میں یہ شریفانہ جذبات بیدار

ہوں گے جب مزدوری کا یہی سبق انہیں سکھایا جاسکے گا، جس ملک کے نوجوان اس طرح سے مزدوری کا سبق اسکولوں میں نہیں بلکہ مٹی کے ساتھ کشتی کر کے اور پسینے پسینے ہو کر پڑھتے ہوں اس ملک کے نوجوانوں میں وطن کی دوستی کا جذبہ، خدمت کا جذبہ، اور مردوروں کی محبت کا جذبہ پیدا نہ ہوگا تو کیا ہمارے نوجوانوں میں ہوگا جن کو زمین سے نیچے پیر رکھنے میں عار ہے آج اگر ہندوستانی نوجوانوں میں یہ احساس پیدا ہو جائے تو ہزاروں نوجوان جوان جو تیاں بچھاتے اور ایک طرف سے دوسری طرف دھکے کھاتے پھرتے ہیں انہیں اس کی خدمت میں لگا کر نوکریاں مانگتے ہیں اور ذلیل ہوتے ہیں ان کی آن میں ملک کی حالت تبدیل کر سکتے ہیں، کیا حکومت کی طرف سے زبردستی لوگوں کو مزدوری کرنے کی تعلیم دینے کا سبق سکھایا جائے گا، آہ ہم کیا کہہ رہے ہیں ہندوستان آخر ہندوستان اور جرمنی جرمنی رسی جل گئی مگر بل نہ گئے، ہماری شان و شوکت کا پچھلا جرمنی کیا مقابلہ کرے گا، ہم لنگوی میں پھاگ کھیلنے والے ٹھیرے اور جرمنی کے باشندے محنت پر یقین رکھنے والے ہمارا ان سے کیا مقابلہ، ایک طرف ملیش اور پون، دوسری طرف جہاتا اور سادھو، ایک طرف دنیا کے پیچھے پڑنے والے دنیاوی شکموں کے لئے جان دینے والے دوسری طرف زندگی سے ہاتھ دھو کر فتنی کی فتنہ کرنے والے آہ! ہندوستانی جو ہمیشہ تلاش ہی بنے رہو گے۔ ہندو اور مسلمان کی تفریق قائم رکھ کر زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہنا۔ اور ہمیشہ بھوکے مزنا تمہیں گوارا ہے اگر تم میں غیرت و احساس کا شائبہ بھی باقی ہے تو برہمن، چمار، عیسائی، مسلمان، ہندو، نوجوان، بوڑھے کمزور کندھے سے کندھا ملا کر ضعیف اور کمزور بھارت و برصغیر کے سر کو اٹھانے کی کوشش کرو۔ جرمنی جیسے ناہموار ملک کو دیکھو آج سونا اگل رہا ہے اور اپنے ریزرئیر ملک کو دیکھو دھل اڑتی ہے، انگلستان کے باشندے اگر کھائے ملک کو خوبصورت نہ بنائیں گے یہ سب کچھ تم ہی کو کرنا ہوگا۔ ملک کی خوشحالی اور بدحالی تمہارے ہاتھ میں ہے نوجوانو! کیا تم ہندو مسلمان کی بیہودہ۔ بے معنی اور مصنوعی تفریق کو چھوڑ کر مزدوری کا سبق پڑھو گے کاش کہ تم خود ہی یہ سبق پڑھنے پر راضی ہو جاؤ، ورنہ زمانہ کی ٹھمکیں دلتیں اور رسوائیاں تمہاری کچی اور گمراہی کو دوڑ کر یں گی۔ آہ! کیا ہمارے غم و غم کے دن ختم نہیں ہوئے ہیں۔ اور کیا اسی ہمارے نصیب میں اور بھی دلتیں دیکھنی ہیں۔

فدا خیال تو کرو یہ وہی جرمنی ہے جسے تباہ کرنے کے لئے دنیا کی تمام طاقتوں نے مل کر محسوس کی اور ہر طرح سے اس کی تباہی پر کمزور دھجی، صلح کی شرائط کیا تھیں، صرف تباہی کے آثار تھے، مگر جس طرح ایک دبی ہوئی لکڑی بوجھ اترتے ہی اچھل کر پانی پر سوار ہو جاتی ہے۔ جرمنی آج پھر اپنی تباہی کے اوپر سوار ہو چکی ہے اس میں وہی پرانی چیل چیل جاری ہے اس کے لوگ ویسے ہی خوش حال آج نظر آتے ہیں اس کی چمنیاں آج پھر چاروں طرف دھواں اُگل رہی ہیں۔ جو لوگ اپنے دلوں میں یقین کی نعمت رکھتے ہیں جنھیں اپنے اوپر بھروسہ برپا کرنے کے لئے قربانی کر سکتے ہیں وہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں دنیا کی کوئی طاقت ان کو نیست و نابود نہیں کر سکتی مگر جو لوگ اپنی تمام امیدوں، حوصلوں اور ارادوں سے منہ موڑ کر نوکری کی مالا چپ رہے ہوں جو دن بھر دوسروں کی فحاشی ہی اپنی آزادی سمجھتے ہوں ان کی زندگی ایک غلام کی زندگی کے سوا اور ہو ہی کیا سکتی ہے۔ ہندوستانی نوجوان آؤ اپنی عقل، اپنی طاقت اپنے علم کو، اپنے ملک کو بہتر بنانے اور اپنے ملک کو اونچا اُٹھانے میں صرف کریں خدا ہماری مدد کرے گا۔ اور ضرور کرے گا۔

گھومتے گھومتے ہم پنڈ بزرگ پہنچے، اور ہم کو ایک پہاڑی اونچی چوٹی پر جو ہینڈ بزرگ سے قریب آٹھ دس میل کے فاصلے پر ہوگی لے جایا گیا، یہاں ایک بڑا زبردست میدان تھا، اور پتھر کی میز حیل تھیں کی شکل میں اوپر نیچے بنی ہوئی تھیں جن پر کم سے کم پندرہ ہزار آدمی بیٹھ سکتے تھے، چاروں طرف لاؤٹسپیکر لگے تھے اور جھنڈے لگائے جا رہے تھے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ تمام سڑک جنگل کو کاٹ کر زمین ہموار کر کے پتھر چھن کر قرینے سے کوٹ کر ان ہی نوجوان مزدوروں نے بنائی جو جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں پتھر کی میز حیل بھی ان ہی نوجوانوں کا کارنامہ ہے مقصد یہ ہے کہ جرمنی کے لوگوں کو تفریح کا سامان ہم پہنچ سکے اور پہاڑ کے کئی آسانی کے ساتھ شہر میں پہنچ سکیں اور اس کی قیمت میں اضافہ ہو سکے، کل اس جگہ رات کو ایک جلسہ ہو گا اس میں تمام طلباء جمع ہوں گے، اور سب لوگ، روسا، امیر و غریب ان کے کام کی داد دینے کے لئے بلا کسی فرشر کے زمین پر بلا کسی امتیاز کے ایک ساتھ بیٹھیں گے آؤ کیا دلکش نظارہ ہو گا، ہم جانتے ہیں کہ ان جوانوں کے دشن کریں جنھوں نے بینک کام کر کے اپنے ملک کی سبھی خدمت کی جو اگر قیمتی سے ہمارا ہر دو گرام ملے ہو چکا تھا اور ہم اچھی رات کو نہ ٹھیر سکتے تھے، مجھ پر اس ملے کی زیارت سے محروم رہے +

کلام جگر

عشق ہے نصف الحقیقت کیوں پریشاں کیجئے
 کب تک آخر - مشکلات شوق آساں کیجئے
 ایک اک ذرے سے حاصل دیر غناں کیجئے
 پھر بنو بنو دی میں کچھ کہی سی آجلی
 اللہ اللہ سنتے ہیں تم ہو رگ جلیں سے قریب
 حن کی رسوائیاں بھی حن سے کچھ کم نہیں
 ہم نے تو دکھلادیا خود بن کے محروم دھال
 سر سے پاتک اک نگاہ بے محابا ڈال کر
 آپ کو شرمائیے کیا؟ آپ کا دامن ہے پاک
 آپ کے دشمن رہیں وقف غلش صرف تمیش
 دل پہ جو گندے سو گندے عشق کی ضد ہے یہی
 یعنی ہم پر رحم کر کے، خود پر احساں کیجئے
 اب محبت کو محبت ہی یہ قرباں کیجئے
 یعنی خود کھو جائیے، ان کو نمایاں کیجئے
 آج پھر برہم مزاج حسن باناں کیجئے
 اب تو ہر نشتر کو پیوست رگ جاں کیجئے
 ہو سکے - تو شل بوئے گل پریشاں کیجئے
 آپ سے ممکن جو ہو ناکام ہجراں کیجئے
 عمر بھر کے واسطے منون احساں کیجئے
 ہم گنہگار محبت ہیں پشیمان کیجئے
 آپ کیوں غمخواری بیمار ہجراں کیجئے
 آج اتنا چھوڑئے اُن کو کہ گریاں کیجئے

شانِ رحمت کو نہیں درکار کوئی پیشکش
 امتیازاً کتاب کفر و ایماں کی کہئے

نیزک حیات

مضطرب ہے ذرہ ذرہ عالم تمسیر کا
 اک حجاب اٹھا تو حائل ہو گئے صدا و حجاب
 بستے آئینے بنے تھے وہ تو پردے ہو گئے
 کھل نہیں سکتا کبھی راز نقوش کائنات
 ہر نفس اک عقدہ لافل ہے اے فوق غلش
 صفحہ ہستی پر آتے ہیں نظر کتے حروف
 زندگی کی ابتدا کیوں کر ہوئی کیسے ہوئی
 ہر نفس پر لغزشیں ہیں ہر قدم پر ٹھو کریں

خواب ہی میں منتظر ہے خواب کی تعمیر کا
 راز افشا ہو سکا کب حسن عالم گہر کا
 دیکھئے اب اور کیا عنوان ہو شہیر کا
 ہے بہت دھندلا پس نظر ہر اک تصویر کا
 بس نہیں چلتا یہاں کچھ ناخن تدبیر کا
 ہے مگر معدوم اب تک مدعا تحریر کا
 سانس کا یہ سلسلہ ٹکڑا ہے کس زنجیر کا
 رویے رذائے کماں تک عقل کی تعمیر کا

دور باش لے صحرای کی کہ ذوق بخودی

احصل ہے عمر بھر کی کاوش تعمیر کا

غزل

کوئی باتوں باتوں میں ”باوفا“ جو کہہ گیا
 مراز خم خوردہ دل دھک سے ہو کے رہ گیا
 ضبط اس لئے کیا تھا کہ راز ہو نہ فاش
 اب میں اس کو کیا کروں دل میں درد رہ گیا
 میری بے زبانیاں کام آگئیں کہ میں
 غم کی ساری داستان اک نظر میں کہہ گیا
 میرے دل کے دلوے آہ بن کے اڑ گئے
 میرا جذبہ جنوں آنسوؤں میں بسہ گیا
 خون کے بہے آنکھوں میں ایک لالی رہ گئی
 دل میں درد کی جگہ ایک داغ رہ گیا

”نغمہ روح“

میں نے شعر و سخن کے ساپنچے میں
 اپنی آہ و فغاں کو ڈھالا ہے
 دوستو! میرے پاس نغمہ کہاں
 ”نغمہ روح“ ایک نالہ ہے

دنیا کی رفتار

(۱) ممالک غیر

جسٹس | قوت کا ظلم ہی مغربندی کے کیا کیا کھیل دکھاتا ہے۔ اس کی تاثیر سے عیب ہر معلوم ہونے لگتا ہے اور ظلم انصاف۔ اور یہی نہیں کہ دوسرے ایسے سمجھنے لگتے ہوں، خود صاحب قوت اس آسیب کے اثر سے اپنی غور و فکر کو مقصد کائنات سے ہم آہنگ جاننے لگتا ہے۔ اگر کوئی سمجھ ہونے سے بچ رہتا ہے تو وہ غصہ یا حیرت کے ساتھ یہ تماشا دیکھتا ہے، مگر اس مجنون کے پاس جانے اور اس کے سرے اس مجبوت کو اتارنے کی ہمت کون کرتا ہے؟

اٹلی اپنے نئے قائد مسولینی کے عہد میں اسی حالت سے گزر رہا ہے۔ اس میں کیا کلام ہے کہ اٹلی میں سیاسی سازشوں کی جگہ ایک متحدہ قومی عزم کی تخلیق اسی کا کارنامہ ہے، اس نے یورپ کی سیاست میں اپنی قوم کے درجہ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے، اندہ ایک کاہل قوم کے دل میں سرداری کا دلولہ پیدا کر دیا ہے۔ مگر یہ پیش کرنا ہے صرف قوت کی۔ توپ اس کا خدا ہے! اور اقبال کا ”غلامِ نادوِ باطل پرست“ میکا ولی اس کا سپریمبر۔ یہ جب اپنے ملک کے غیر آباد علاقوں کو قابل کاشت بنا کر اس میں پہلی مرتبہ اپنے ہاتھ سے گیہوں بوتا ہے تو ہی اس امن کے کام میں اپنی ہر حرکت کا اعلان توپوں کی باڈھ سے کرتا ہے تاکہ معاملات انسانی میں قوت کے تصرفات کو اپنی قوم کے ذہن نشین کر لے۔

اسی قوت کے بھروسہ پر اور دوسری دلوں کی باہمی رقابتوں کے سہارے مسولینی جانتا ہے کہ مشن کے قدیم ملک کو سلطنت اطالوی میں شامل کرے۔ وہ کیا ہے؟ یہ کہ مشن کے سپاہیوں نے ہماری فوج کے ساتھ نیا دتی کی، ایک غیر تمدن قوم کی یہ گستاخی ایک ایسی قوم کے ساتھ جس نے ”تاریخ بنائی ہے“ ناقابل معافی ہے یہی بیہیمان ہے۔ مشن پر اٹلی کا تسلط ہونا چاہئے۔ قوت کی منطق کا یہی انداز ہوتا ہے۔

اب گستاخی کی حقیقت سنئے۔ مشن اور برطانیہ کے نمائندوں پر پرتل ایک کمیشن سرحدی علاقہ میں ہندو

کام کر رہا ہے۔ اس کمیشن کے ساتھ کچھ حبشی سپاہی ہیں۔ ۵ دسمبر ۱۹۴۱ء کو دلول کے کنوئوں کے قریب جو مصدقہ معاہدوں کی رو سے کوئی سوئیل حبش کی سرحد کے اندر ہیں، اطالوی فوج کا سردار کپتان ساروتا ان حبشی سپاہیوں پر ہلکسی اطلاع کے طلبوں دیتا ہے۔ حملہ کی ملک کے لئے ٹینک اور ہوائی جہاز بھی آتے ہیں۔ حملہ کے وقت حبشی سپاہی اپنے خیموں میں بے خبر بیٹھے ہیں۔ گھبرا کر نکلتے ہیں تو فوراً ہی ان کا سردار مارا جاتا ہے، کوئی ۱۰۰ سپاہی کام آتے ہیں، ۴۵ زخمی ہوتے ہیں۔



یہ بیان حکومت حبش کا نہیں ہے۔ واقعہ کے پانچ ہفتانوی شاہد بھی موجود ہیں۔ خود ہفتانوی کنشٹرکشن کلفورڈ کی تصدیق موجود ہے۔ جس اطالوی فوج کے ساتھ گستانی کی پادش میں قریب قریب سارے ملک حبش کو سلطنت رد کا جزد بنانے کی تجویزیں ہیں اگر اس فوج کے مزاج کا اندازہ لگانا ہو تو مذکورہ صدر کپتان ساروتا کی تقریر کا ایک

کہ مغربی مشن کو صرف اس کے قطعہ انزمیں تسلیم کر لیا جائے لیکن فرانس کی مخالفت کے ڈر سے معاملہ مختار ہوا۔ ۱۸۴۲ء میں چربا تہیت شروع ہوئی سلسلہ میں تو انگلستان اور اٹلی میں ایک خفیہ معاہدہ بھی ہو گیا، جس کی خبر فرانس کو لگ گئی۔ اُدھر فرانس بگڑا، اُدھر مشن نے معاملہ کو جمعیت اقوام میں پیش کرنا چاہا۔ تو لندن اور روم کے شاطران سیاست نے جیسے جیسے معاملہ کو دبا دیا اُدھر مشن کو راضی کرنے کے لئے ۱۸۴۲ء میں اٹلی نے اس سے ایک معاہدہ کیا اور اویس ابا با سے عصبہ تک موٹر کی سڑک بنادینے کا وعدہ بھی کیا اور یہ بھی اٹلی کے اس بندرگاہ میں مشن کو آزاد آمد و رفت کا حق حاصل ہو گا۔

غرض جمعیت اقوام کے یہ تینوں متاثر کن جوتی و انصاف کے فحاش بنے ہیں دراصل اپنی اپنی گھلت میں ہیں۔ اور اگر مال کی تقسیم پر آپس میں سمجھوتہ ہو گیا تو معلوم ہے کہ مشن کے حق میں ان کا فیصلہ کیا ہو گا۔ البتہ دوسری قومیں جن کے قدم یاں پہلے سے جھے ہوئے نہیں ہیں وہ بھی اس بانٹ میں حصہ تک ہی ہیں۔ چنانچہ امریکہ نے اپنے ایک نہایت قابل سیاسی کوجو اسکومیں سفیر تھے اب اس پساندہ ملک میں سفیر بنا کر بھیجا ہے۔ جاپان کے تعلقات تو اُدھر بھی زیادہ تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ شہزادہ عاریہ عربہ جوشہ مشن کا ہتھیار ہے خاص مشن پر جاپان گیا تھا۔ وہاں ایک جاپانی امیر زاوی یونی وای کونٹ کرو داک کی بیٹی پر عاشق ہو گیا۔ نیتہ ہونے والا تھا کہ کتے ہیں سولینی نے مداخلت کر کے اسے روکا۔ اُدھر جاپانی ماہرین تجارت جوتی جوتی اس ملک میں پہنچ رہے ہیں۔ ۲۰ لاکھ ایکڑ زمین انھیں روٹی کی کاشت کے لئے دی گئی ہے۔

جاپانی مال نے اٹلی کی تجارت کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ جرمنی اور بلجیئم سے اٹلی پہنچ رہے ہیں۔ کتے ہیں کہ ترکی بھی فوج کی تعلیم کے لئے اپنے اہل بیچ رہا ہے۔ اس لئے جمعیت اقوام کی ملی جگت کے لئے بھی معاملہ کچھ بہت آسان نہیں ہے۔ اور باہر کی ملک سے قطع نظر خود یہ مشن غیر متہد سہی لیکن شجاع ہیں اور آزادی کی قدر جانتے ہیں اور اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں۔ ابھی کوئی ۴۰ ہی سال تو ہوئے ہیں کہ انھوں نے اٹلی کی فوجوں کو شکست فاش دی تھی۔ چار شکرتہ تیج کر ڈالے تھے، ہزاروں قیدی پکڑے تھے۔ روم میں مغرور اٹالوی سپہ سالار کا کورٹ مارشل کر پسی کی وزارت کا ڈنٹا، چار لاکھ پونڈ کا تادان جو متہد رومیوں نے اس غیر متہد ملک کو ادا کیا تھا، ابھی سب کو یاد ہے۔ اس لئے ابھی یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ سولینی کے اس اقدام خاصاً کا حشر کیا ہو گا۔ بہر حال سولینی نے

نے ایک بڑا جو اکھیلا ہے۔ اگر پانسہ بڑ گیا تو وہ اطالوی تاریخ میں چولیس سیز کا ہندش ہو گا اور ناکام رہا تو شاید اطالوی سیاست کا نقشہ کبیر بدل جائے۔ اس کی کامیابی سے حتیٰ کی شکستوں کی طویل فرصت میں ایک اور کا اضافہ ہو گا۔ قوت کے پرستاروں کے لئے تقویت ایمان کے لئے ایک اور مجزہ باقتدا آئے گا۔ لیکن اگر اہل حبش نے اپنی آزادی کی خاطر اپنا خون مردانہ دار بھایا تو ضمیر انسانیت کے لئے ایک اور تازیانہ بھی ہو گا جو کہ بیدار ہونے پر حق تعالیٰ کے اس قرض کو دھڑی دھڑی چکانے کی تدابیر نکال لے گا۔

عقبہ | جہاں تو ہی اس فکر میں ہیں کہ دوسروں کے ملکوں کا انتظام کریں اور غیر تمدن قوموں کو تمدن اور تہذیب کا سبق دینے کے لئے مجبوراً ان کے علاقوں پر قابض ہوں وہاں ایسے کمزور بھی ہیں جو اپنے گھر کا انتظام دوسروں کے سپرد کر دینے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ شرق اردن کے فرمانروا امیر عبداللہ نے برطانوی جنرل اسٹاف کے افسر اعلیٰ سر آرچیلڈ مانگومری کم برگ سے ایک معاہدہ کیا ہے کہ آئندہ ~~تہذیب~~ کے تحفظ کی ذمہ داری برطانوی افواج اور برطانوی پڑیہ کے سپرد ہوگی۔



عقبہ بظاہر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے لیکن یہ نہایت اہم بندرگاہ بن سکتا ہے۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں کرل لانس اور فیصل نے یہیں سے دمشق اور مدینہ والی ٹرک بچلے گئے تھے۔ اور یہی ترکی فوج کے مشرقی بازو اور شلم

کے خلاف فوجی کارروائیوں کا مرکز تھا۔ کہتے ہیں کہ مشرقِ قریب میں اگر فوجی اہمیت کے اعتبار سے دو تین مقامات منتخب کئے جائیں تو ان میں سے ایک یہ بھی ہو گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ امیر عبداللہ سے اس کی حفاظت کا بار گراں نہ اٹھ سکا اور انھوں نے یہ فرض برطانوی افواج کو تفویض فرمادیا!

ترکی | ترکی جو برابر اسلامی رواداری کی روایات کو قائم رکھنے میں کوشاں ہے جس طرح پہلے بارہا مسیحی ملکوں سے نکالے ہوئے یہودیوں کو پناہ دے چکا ہے اب بھی جرمنی کے بہت سے نامور یہودی فاضلوں کو ہلکا کرنا ہی ہر گز ممکن نہیں کام لے رہا ہے۔ اس کے علاوہ ابھی حال میں اس نے جمہیتِ اقوام کی درخواست پر کوئی دودھڑاؤ ردِ سیوں کو جو ردی انقلاب کے باعث اپنے وطن سے ہجرت کر کے ترکی میں آئے تھے شہریت کے پورے پورے حقوق عطا کر دئے ہیں۔ ترکی نے حال میں اپنے کارخانوں اور تجارتی کاروبار سے پریسیوں کو مجبوراً ہٹایا تھا۔ اس کی وجہ سے ان ردی مہاجرین میں سے بھی بہت سے بارود گار ہو گئے تھے۔ مگر چونکہ یہ اپنے وطن کو واپس نہ جاسکتے تھے ترکی نے انھیں اپنایا۔ انھیں ترکوں کے سے حقوق دئے گئے اور ترکوں کے سے فرائض بھی ان پر عائد کئے گئے ہیں۔

آزادی ایسی جنس نہیں کہ ایک دفعہ حاصل کر لی جائے۔ اسے روز حاصل کرنا ہوتا ہے اور وہی اسے رکھ سکتا ہے جو روز اس کے حصول میں ساعی رہے۔ اس لئے آزاد قومیں اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے آنے والی نسلوں کو اس کے برتنے کی مشق کراتی ہیں۔ اکثر ممالک میں یہ کام مدارس میں کیا جاتا ہے۔ ترکی نے پچھلے دنوں ایک نیا تجربہ اس سلسلے میں کیا۔ یعنی ایک ہفتہ کے لئے اپنے تمام بڑے بڑے شہروں اور قصبوں کا انتظام اپنے ابتدائی اور ثانوی مدارس کے بچوں کے سپرد کر دیا تھا۔ بچوں کی عمر دس اور پندرہ سال کے درمیان تھی۔ صرف اتنی نگرانی تھی کہ ان کے احکام متقول ہوں، اعمال کو ان کی بجا آوری کی تائید تھی۔ یہ تجربہ ان بچوں کے لئے مدنیات کے سیکڑوں اسباق سے زیادہ مؤثر ثابت ہوا ہو گا۔

یہ بات تو معلوم ہے کہ ترکی پارلیمنٹ میں بس ایک ہی جماعت ہے یعنی وہ جماعت جسے صدر جمہوریہ کیل اتانرک کی قیادت کا شرف حاصل ہے اس لئے پارلیمنٹ سے باہر اس جماعت کے جو اجلاس ہوتے ہیں ان کی قراردادیں پارلیمنٹ کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اس جماعت نے اپنے گزشتہ سالانہ اجلاس میں اس بات کی کوشش کی کہ اپنے پروگرام کو وضاحت کے ساتھ چند دفعات کی شکل میں پیش کر دے۔ یہ پروگرام کالی پروگرام کہلائے گا یا نہ یہ کمالیت۔ یہ ۶ دفعات ذیل پر مشتمل ہے:-

(۱) آئندہ اعلیٰ پارلیمنٹ کی وساطت سے قوم کو حاصل ہے۔

(۲) طبقات کی تیز نشانی جاتی ہے اور مرد اور عورت کے حقوق مساوی تسلیم کئے جاتے ہیں۔

(۳) فلاح عام کے کاروبار اور مضمتیں جن کا تعلق تحفظ قومی سے ہے حکومت کی ملک میں لگی اور حکومت بقیہ صنعتی کاروبار کی بھی نگرانی رکھے گی اور جب ضرورت سمجھے گی اسے خریدے گی۔

(۴) مذہب افراد کا نجی معاملہ ہے۔ اس میں حکومت مداخلت نہ کرے گی سوائے اس حالت کے کہ مذہب کو رجعت پسندی کا بھانہ بنا کر جمہوریت کے وجود کو خطرہ میں ڈالنے کی کوشش کی جائے۔

(۵) ملکیت شخصی اور حریت شخصی کی ضمانت کی جاتی ہے بشرطیکہ یہ مفاد عامہ سے متصادم نہ ہوں۔

(۶) ملک کے جلد وسائل، انسانی اور مادی، اس کے تحفظ کے لئے کام میں لائے جائیں گے۔

... ..

اسی اجلاس میں یہ تجویز بھی پیش ہوئی کہ ترکی عورتوں کے لئے نقاب کا استعمال قانوناً ممنوع قرار دیا جائے۔ مگر طلبہ نے اس تجویز کو رد کر دیا۔ وجہ یہ بیان کی گئی کہ عورتیں خود ہی نقاب کو ترک کر رہی ہیں، جو اب تک ترک نہیں کر چکی ہیں وہ دوسری بہنوں کی مثال سے متاثر ہو کر خود ترک کر دیں گی۔ اس میں جبر سے کام لینا بے سود ہے۔

... ..

ساری دنیا میں جنگ کی جو فضا پیدا ہو گئی ہے اور مختلف ممالک جس طرح اپنے نوجوانوں میں جنگی روح پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس کی ایک مثال ترکی میں بھی ملتی ہے۔ ترکی وزارت نے طے کیا ہے کہ فوج میں داخل ہونے کی عمر سے پہلے ہی تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو کچھ فوجی تعلیم دینی چاہئے۔ اس کا مفصل نصاب

جزل اشاف تیار کر رہا ہے۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ ہوائی جہازوں کی تعداد دو گنی کر دی جائے۔ تقریباً ۶ کڑور روپیہ سالانہ کم سے کم ۵۰۰ ہوائی جہازوں کے بڑھنے کی خریداری اور مرمت وغیرہ کے لئے صرف کیا جائے گا۔

... ..

اندر (دسمنا) سے ایڈین کو جو ریل انگریزی سرمایہ سے تیار ہوئی تھی اسے ترکی حکومت نے ۵۰ لاکھ ڈالر میں خرید لیا ہے۔

عراق و ایران | عراق اور ایران میں اپنے سرحدی دریا شط العرب کے متعلق جھگڑا ہے۔ معاملہ حبشیہ الاوام کے سامنے پیش تھا۔ ٹائی کے مزدبیرن الواسی ثالث مقرر ہوئے تھے۔ جمعیت کی کونسل کے گذشتہ اجلاس میں انھوں نے یہ اطلاع دی کہ فریقین سمجھوتہ پر رضامند نہیں ہوئے لیکن ان کا خیال ہے کہ دونوں کو براہ راست گفت و شنید پر آمادہ کیا جاسکتا ہے اور چونکہ معاملہ بہت زیادہ اہم نہیں ہے اس لئے زیادہ کشیدگی کا اندیشہ نہیں ہے۔

معاملہ یہ ہے کہ ۱۸۴۸ء کے معاہدہ ارض روم اور ۱۹۱۳ء کے ایک پروٹوکول کی رو سے شط العرب پر اقتدار اصلی تمام تر ترکی کو حاصل تھی۔ جنگ کے بعد چونکہ عراق کو ترکی حکومت کے تمام حقوق وراثت میں ملے اس لئے اب شط العرب پر کامل اقتدار کا دعویدار ہے۔ ایران اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتا اس لئے عراق نے حبشیہ اقوام میں مداخلت کیا ہے کہ میرا اقتدار تسلیم کرایا جائے۔

حکومت عراق کا کہنا یہ ہے کہ علاوہ مذکورہ بالا قانونی حق کے یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ ایران کے پاس تو ہزاروں میل کا سمندری ساحل ہے اور ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔ ہمارے لئے سمندر تک پہنچنے کا راستہ بس اسی شط العرب کے ذریعہ ہے۔ اس لئے ہم اپنے قانونی اقتدار میں کسی کو شریک نہیں بنانا چاہتے۔ ہاں اگر ہمارا قانونی حق تسلیم کر لیا جائے تو ہم ایران سے گفتگو کر کے یہ کر سکتے ہیں کہ اس دیار میں جہاز رانی کی نگرانی کے لئے ایک ایرانی عوامی مشترکہ بورڈ مقرر کر دیں اور کسی غیر جانبدار ثالث کو صدر مقرر کر دیا جائے۔

ایران کی دلیل یہ ہے کہ ۱۸۴۸ء کا معاہدہ اور ۱۹۱۳ء کا پروٹوکول اس ساحل میں اس وجہ سے معتبر نہیں کہ ایرانی مجلس نے ان دونوں کی تصدیق نہیں کی ہے۔ ایرانیوں کو موجودہ انتظامات سے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہے البتہ

وہ چاہتے ہیں کہ اگر قانونی حق اقتدار بھی تسلیم ہو جائے تو اچھا ہے۔ دانشمندی کا یہ بکار لیکن ایران کا مقدمہ مکرر رہے اور گلان غالب یہی ہے کہ عراق کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے گا۔

حصہ ۱ روسی انقلاب کے بانی اسے قومی انقلاب نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک عالمی انقلاب کا آغاز۔ اس گروہ کی ساری ذہنیت پر بین الاقوامی تعاون کا تصور غالب تھا۔ وہ قومیت اور وطنیت کو "بورژوا" سرمایہ داری کا فریب جانتے تھے اور ملکی اور سیاسی حقوق کے مرٹ جانے اور دنیا کے ایک کارخانہ کی طرح منظم ہو جانے پر عقیدہ رکھتے تھے۔ اسی رجحان کی وجہ سے وہ کسان سے گھبراتے تھے اور کھیتی مزبور کو اپنا سب سے بڑا مددگار جانتے تھے۔ اس لئے کہ زراعت پابند مقام ہے، صنعت کے لئے ساری دنیا ایک منڈی ہے؛ یہی وجہ ہے کہ کسان ہر جگہ ملنی اور قومی تحریکوں کا حامل ہے اور مزدور بین الاقوامی تحریکوں کا۔

لیکن روس کا یہ انقلابی ادیبین الاقوامی رجحان واقعات سے دوچار ہو کر رفتہ رفتہ بدل رہا ہے خود لینن کی جدید سماجی سیاست گویا اس تبدیلی کا پہلا قدم تھا۔ لینن نے بروقت پہچان کر دی کہ روسی انقلاب کو کامل ناکامی سے بچانا ہے تو کسان کو ساتھ لینا ہو گا اور ایک حد تک اس کے تعصبات کا پاس کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد سامانی وروں نے روس کو اکثر سرمایہ دار قومیوں سے معاملہ کرنے پر مجبور کیا۔ ایشیا میں جاپان کے ڈر سے اس نے یورپ میں سرمایہ دار ملکوں سے دوستی شروع کی اور ادب رفتہ رفتہ عالمی انقلاب کی جگہ ایک منظم حیات قومی نے لے لی ہے۔ کسان جے مارکس سے لے کر آج تک تمام اشتراکی منکر نہایت تحارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے آئے ہیں اور جیسے جیسے رجعت پسندی کا عنصر سمجھتے رہے ہیں اس منظم حیات قومی کے لئے بے مزہ لڑائی کی ہڈی کے ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ جو بدسلوکی روا رکھی جاتی تھی وہ برابر کم ہو رہی ہے۔ پانے راسخ العقیدہ اشتراکی اس پر ناخوش ہیں مگر معافی سے دست و گریاں نئے اشتراکی عالمی انقلاب کے خیال کو پس پشت ڈال کر قومی زندگی کو کسان کی مدد سے اشتراکی اصولوں پر منظم کرنے کی فکر میں ہیں اور اس کوشش میں اپنے نظری عقائد کا کچھ حصہ چھوڑ کر کسان سے سمجھوتہ کرنا چاہتے ہیں۔

حال میں جو خبریں روس سے آئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ عالمی انقلاب کی جگہ قومی تنظیم نے بڑی حد تک لے لی ہے۔ یکم مئی کو جب تمام مغربی ممالک میں مزدور انقلابی مظاہرے کرتے ہیں۔ جس تاریخ کو روس میں

یوں سمجھے کہ عالمی انقلاب کی آمد کا جشن منایا جاتا تھا، اس مرتبہ ننگ بالکل بدلا ہوا تھا۔ عالمی انقلاب کا تذکرہ بھی نہ تھا۔ نہ مزدوروں کے بین الاقوامی اتحاد کا اتنا چرچا تھا جتنا کہ اس موقع پر پہلے ہوا کرتا تھا۔ اس کی جگہ ایک شدید جذبہ وطن پرستی کا مظاہرہ تھا۔ خاص طور پر اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ دوسرے ملکوں کے جو لوگ موجود تھے ان پر دوسری فوجی قوت کا اثر ڈالا جائے۔ ’کیونٹ انٹرنیشنل‘ کی طرف سے جو پیام اس موقع پر دنیا کے مزدوروں کو جاتا ہے وہ بھی اس مرتبہ بہت روکھا پیکا تھا۔ پہلے کی طرح اس میں سرمایہ داری کے دیوے نبرد آزما کی دعوت نہ تھی۔ بس یہ مشورہ تھا شرح اجرت بڑھانے اور کام کا وقت گھٹانے کی تدبیریں کرنی چاہئیں!

پرائی ریویات انقلابی سے اپنے کو آزاد کرنے کے خیال ہی سے غالباً اسٹالین نے حال ہی میں قدیم بولشوکیوں کی جماعت کو منتشر کرنے کا حکم دلوادیا۔ یہ جماعت ان انٹرا کیوں پشٹل تھی جو ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے پہلے کیونٹ تھے اور اس زمانہ میں جب اس سے زندگی خطہ میں بڑتی تھی ان اصولوں کی حمایت کرتے رہے تھے۔ پہلے تو اسٹالین نے اس جماعت کے متنازرا اکین کو شٹاٹروئسکی، کامینو، زینوویف، توسکی وغیرہم کو ختم کیا اور اب کل جماعت کو منتشر کرادیا۔ ایک طرف قدیم نظموں کی مخالفت کو یوں ختم کیا۔ دوسری طرف کسانوں کی ’رحبت پسند‘ جماعت کے ساتھ پیہم رعایتیں کیں مثلاً اسی سال کے اندر راندہ متحدہ تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ اجناس حاصل کرنے کے جو کارڈ مزدوروں کو ملتا کرتے تھے ادجن سے صنعتی مزدوروں کو دوسرے تمام طبقات آبادی پر خاص فوقیت حاصل تھی ان کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ فروری میں نظام انتخابات کو اس طرح بدلا گیا کہ کسانوں کے غلاف جو باتیں پڑتی تھیں وہ ہٹ گئیں۔ نئے نظام کے ماتحت آئندہ انتخابات میں کسانوں کی رائے کو غلبہ حاصل ہوگا۔ پرانے نظام کی رو سے شہری آبادی کو مقابلہ کسانوں کے اپنی تعداد سے سرچند نیابت کا حق تھا۔ یعنی اب باقی نہیں رہا۔ بالواسطہ انتخاب کے طریقہ سے بھی کسانوں کا اثر گھٹتا تھا، یہ طریقہ بھی انہم کر دیا گیا ہے۔ اب رائے وہی بلا واسطہ ہوگی اور خفیہ۔ ۱۰ برس سے اوپر کا ہر شہری بلاخانہ پیشہ اور سکونت رائے دینے کا حق دار ہوگا۔ کسانوں کی تعداد چونکہ ساڑھے بارہ کروڑ سے اوپر ہے اور شہری آبادی صرف ۸ کروڑ اس لئے ظاہر ہے کہ غلبہ کسانوں کا ہوگا۔

کسانوں کے ساتھ معاشی رعایتیں بھی کی گئی ہیں مثلاً جو کسان مشترکہ کھیتیں میں کام کرتے ہیں انہیں اپنی نجی زمین رکھے کا جو حق تھا اس کے رتبہ میں متدبہ اضافہ کر دیا گیا ہے، اپنی شخصی ملکیت میں جتنے بانور رکھنے کی اجازت

تھی ان کی تعداد بھی بڑھادی گئی ہے۔ ان نجی جانوروں کی خریداری میں حکومت نے امداد کا وعدہ بھی کیا ہے۔ کسان کے ساتھ ان رعایتوں کی بڑی وجہ تو وہی ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یعنی عالمی انقلاب کی جگہ قومی تنظیم کے خیال کی تقویت اور جنگ کے وقت کسانوں کی وفاداری کی ضرورت کا احساس لیکن اگر اس سے کوئی یہ سمجھ کر یہ روسی انقلاب کی ناکامی کے آثار میں تو یہ غلط ہو گا۔ اس کے برعکس اشتراکی حیثیت کی کامیابی ہی نے کسانوں کے ساتھ اس جدید رویہ کا امکان پیدا کیا ہے۔ اب کسان پہلے کی طرح بے قابو نہیں اور شہری آبادی کے لئے غذائی فراہمی کا سلسلہ ہو چکا ہے، اب اس فراہمی کے لئے کسان پر ظلم کرنے کی ضرورت نہیں رہی، صنعت نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اس کا کام چلانے کے لئے، یعنی اس کے لئے پولیس سے کلپس اور سامان خریدنے کے لئے کسانوں کے گاڑھے پسینہ کی کمی کو چھین چھین کر باہر بیچنے کی مجبوری پاتی نہیں رہی، اور خود زراعت میں اشتراکی طریقہ کاشت کو اتنا فروغ ہو گیا ہے کہ اب خاص انفرادی نظام کے دوبارہ رائج ہونے کا اندیشہ پہلے کی طرح پاتی نہیں رہا۔ دنیا میں اکثر ہوا ہے کہ کامیابی کی خاطر اور کامیابی کی وجہ سے ذہنی اور فکری تجاویز میں زمین آسمان کا تغیر ہو جاتا ہے۔ روس میں بھی پہلے لینن نے کامیابی کی خاطر خاص اشتراکی پروگرام میں تبدیلی کی، اب اٹالین اس میں کامیابی کی وجہ سے کسانوں کے ساتھ اور رعایتیں کر رہا ہے اور کر سکتا ہے لیکن اس تغیر نے روسی انقلاب کی بین الاقوامی حیثیت کو بہت بدل دیا ہے۔ خیال ہے کہ روس بھی رفتہ رفتہ قومی اشتراکیت کا نمونہ ہو جائے گا اور دوسری اشتراکی قومیتوں سے تصادم کے بعد شاید بین الاقوامی انقلاب کی باری آئے گی۔

(ب) ہندوستان

نوجوانوں کی بے روزگاری | یونائیٹڈ پریس کے ایک پیغام مورخہ ٹین مارچ ۱۹۴۷ء سے معلوم ہوا کہ پولیس کے سپاہیوں کی سات خالی جگہوں کے لئے تقریباً تین ہزار نوجوان موبہ کے مختلف حصوں سے شہر کی کو تو ملی کے سامنے انٹرویو کے لئے جمع ہوئے۔ یہ امیدوار انتخاب کرنے والے افسر کی نگاہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس درجہ مضطرب تھے کہ ان میں سے ہر شخص دوسرے کو دھکا دے کر افسر کے سامنے آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے جو بڑا انتظامی پیدا ہوئی اس کا سد باب کرنے کے لئے پولیس کانسٹیبلوں کو بلانا پڑا اور انھوں نے اس مجمع کو قوت کا

استعمال کر کے بچے ڈھکیل دیا۔

پولیس کے سپاہیوں کو شاید پندرہ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ ان کے فرائض بڑی جفاکشی، مستعدی اور دلیری کا مطالبہ کرتے ہیں کبھی کبھی انہیں سیاسی اور مذہبی جمعوں پر لاشیاں اور گولیاں چلانا پڑتی ہیں، محکمہ سی آئی ٹی کے خفیہ ہونے کی حیثیت سے بعض وقت نہایت ناخوشگوار بلکہ شرمناک رپوٹیں دینا پڑتی ہیں، مقدموں کی تیاری میں ضمیمہ فروشی سے کام لینا پڑتا ہے لیکن ان تمام مواقع کے باوجود سات سپاہیوں کی جگہوں کے لئے تین ہزار امیدوار دور دراز مقامات سے سفر کر کے پٹنہ میں جمع ہوئے تاکہ پولیس کی استغاثی لاشیوں سے امن و انصاف اور قانون کے علمبرداران کی توقع و مدارات کر سکیں۔

اس منظر کی دردناک برت خیزی کسی تصور کی محتاج نہیں ہے !

یونائیٹڈ پریس کی اس اطلاع سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان لوگوں میں کتنے تعلیم یافتہ نوجوان تھے، کتنے میٹرک اور ایف ایس پاس اور گریجویٹ تھے اور کتنے ایسے تھے جو معمولی طور پر خزانہ تھے لیکن اس کی کمی کی تلافی دوسری اطلاعوں، سرکاری رپورٹوں اور بے روزگاری کے متعلق مختلف صوبوں میں جو تحقیقاتی کمیشیاں بٹھائی گئی تھیں ان کی جمع کی ہوئی معلومات سے ہو جاتی ہے۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں درج ہے کہ ۱۹۱۶ء میں گریجویٹوں کی تعداد ۶۶ ہزار تھی جو ۱۹۳۱ء میں بڑھ کر ۱۱ ہزار ہو گئی۔ اور انڈر گریجویٹوں کی تعداد جو ۱۹۱۶ء میں ۴۴ ہزار تھی ۱۹۳۱ء میں ۶۶ ہزار ہو گئی۔ صوبہ مدراس میں بے روزگاری کا تخمینہ کرنے کے لئے دو جگہوں کے واسطے آنکاشی اشتہار دئے گئے۔ ایک جگہ پی۔ ڈبلو۔ ڈی کے محکمہ میں ایک منشی کی تعیناتی جس کی تنخواہ ۳۵ روپے ماہوار تھی اور دوسری ایک تجارتی فرم میں اتنی ہی تنخواہ کے ایک محرر کی تعیناتی۔ پہلی کی لئے ۶۶۶ اور دوسری کے لئے ۷۷۷ درخواستیں آئیں۔ مدراس میں بیچ کے ایک منشی کی جگہ کے لئے شہر مدراس اور مصافات کے ۷۷۷ وکیلوں نے درخواستیں دیں۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ مدراس میں معمولی پولیس کے سپاہیوں کی جگہ کے لئے بہت سے گریجویٹوں نے درخواستیں دی تھیں۔ اسی قسم کی اطلاعاتیں پنجاب سے بھی موصول ہوئی ہیں۔ سندھ میں ایک گریجویٹ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ جو توں کی مرمت اور پالش کر کے اپنی بقائے حیات کے وسائل فراہم کر رہا ہے۔

بے روزگاری کے متعلق افراد یا کمیٹیوں نے جو اظہار رائے کیا ہے ان کے چند اقتباسات بھی نمونہ

کے لئے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

”ہمارا نظام تعلیم ایک باش کے درخت کے مانند ہے جس کا ہر جوڑ گویا ایک امتحان ہے اور جس کا قطر جڑ سے لے کر پھٹنگ تک تقریباً یکساں رہتا ہے اس کی شاخیں نہیں ہوتیں اور پھٹنگ پر جو بیجوں کی چھتری ہوتی ہے وہ بہت مختصر رقبہ کو ڈھک سکتی ہے۔ ضرورت جس چیز کی ہے وہ ایک پھیلا ہوا درخت ہے جس کی شاخوں کو تنے کے متعدد مقامات سے پھوٹ کر جس قدر زیادہ تنوں میں ممکن ہو پھیلنا چاہئے اور محض پھٹنگ پر اپنا پھیلاؤ محدود نہ رکھنا چاہیئے۔“ (بنگال بے روزگاری کمیٹی کی رپورٹ)

”ہمارے ہائی اسکولوں اور کالجوں کی خرابی یہ نہیں ہے کہ ان میں پیشہ کی تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ بڑی خرابی یہ ہے کہ ایک خاص لیکن بہت زیادہ محدود پیشہ کی تربیت کے لئے پوری توجہ مرکوز کر دی جاتی ہے۔ علی اور افادی پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان میں کوشش یہ کی جاتی ہے کہ طلبہ کو اس طرح تربیت دی جائے کہ وہ فارغ التحصیل ہو کر سرکاری انفراسٹرکچر، ڈاکٹر اور کاروباری عہدوں پر (ایجوکیشن آف انڈیا مصنف نے لکھا ہے)

پنجاب کمیٹی کی تحقیقات کے سلسلہ میں سر جارج انڈرسن ایک میٹرکولیٹ کی تعریف اس طرح کرتا ہے کہ ”یہ ایک لاوارث ہے جو تمام دنیا میں خدائی خوار پھرتا ہے اور جو اس لئے بے روزگار ہوتا ہے کہ اس میں کسی جیلہ سے لگنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔“ سر جارج ہمارے موجودہ طریقہ تعلیم کی مذمت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا خاص مقصد یہ ہے کہ لڑکوں کو خارجی امتحان کے لئے تیار کیا جائے جن میں کامیاب ہونے کے بعد اکثر طالب علم ایک اور دام فریب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ مدرسوں میں لڑکے منشی گیری کے پیشہ کے لئے تیار کئے جاتے ہیں جو اس وقت ضرورت سے زیادہ بھرا ہوا ہے اور ہزاروں آدمیوں کو روزگار میا کرنے سے قاصر ہے۔“

”موجودہ طریقہ تعلیم کے مصنف لاڈل کاکے نے لکھا تھا کہ ”ہمیں موجودہ حالات میں پوری کوشش کرنا چاہئے کہ ایک ایسا طبقہ پیدا ہو جو ہمارے اور کڑور دل کی اس آبادی کے درمیان جس پر ہم حکومت کرتے ہیں ایک مترجم کا کام کرے۔ ایسے اشخاص کا طبقہ جو رنگ اور خون کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں لیکن ذوق، رائے، اخلاق اور ذہن کے لحاظ سے انگریزوں کے۔“ لیکن اس کا دردناک پہلو یہ ہے کہ مترجموں اور مشینوں کے پیدا کرنے کا کام ابھی تک جاری ہے اور مستقبل قریب میں اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ کسی قسم کی تبدیلی سے آئندہ

بہت سے سالوں تک کوئی خوشگوار نتیجہ پیدا ہو سکے گا۔ (جنگال کٹی کی رپورٹ)

اوپر جو کچھ لکھا گیا یہ ہماری تعلیمی کوششوں کا حاصل ہے۔ جن پوروں کو والدین نے اپنے خون سے سینا، ان کا یہ انجام ہے۔ جن کی خاطر بہت کچھ اٹھایا گیا، ہزاروں کلینکس، اٹھائیس سینکڑوں ارمانوں اور حوصلوں کی پرورش کی کہ بڑھاپے میں یہ ہمارا سہارا ثابت ہوں گے ان کے آرام و آسائش اور فارغ البالی سے ہمارے دل کو سکھ اور چین نصیب ہو گا یہ ان کا حشر تاک حشر ہے۔

اس کا کون جو ابدہ ہے۔ کس کی غیر ذمہ دارانہ امید پر وری اس مایوسی کا سبب ہے۔ کیا نوجوانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان لوگوں سے باز پرس کریں جنہوں نے جو مانہ غفلت سے کام لے کر ان کی زندگیوں کو برباد کیا ہے۔ نوجوانوں نے اپنی عمر اور ان کے والدین نے اپنا سرمایہ کالج کی ڈگریاں حاصل کرنے میں کیوں ضائع کیا؟ درگاہوں کے قریب میں وہ کیسے بیٹھے؟ حکومت نے تعلیمی اداروں کی دھوکہ دہی سے ان بے وقوفوں کو کیوں نہیں بچایا؟ کئی گز دوروں، گورنروں اور جماعت عالمہ کے ارکان نے کیوں ایسے اداروں کی امداد اور سرپرستی کی، انہیں تعلیم کی آزادی کے چارٹر دیے جنہیں وہ جلتے تھے یا جن کے متعلق انہیں جاننا چاہئے تھا کہ وہ ملک میں تعلیم یافتہ بے روزگاریوں کی ایک فوج بنا ڈالیں گے؟ تمام دنیا میں حکومتیں بے روزگاری کے اندھا دیکھ کو ذمہ داری قبول کرتی ہیں۔ لوگوں کے معیاریات کی کمی کے الزام کے لئے اپنے آپ کو جوابدہ سمجھتی ہیں اپنی رعایا کی محنت اور اس کے سرمایہ کو بربادی سے محفوظ رکھنے کی سعی کرتی ہیں اور اگر ان کی کوششوں کے باوجود لوگوں میں بے روزگاری پھیلنے لگتی ہے تو ہر قسم کی امداد دینا اپنا فرض منصبی سمجھتی ہیں۔ وہ سر جارج اینڈرسن کی طرح بے گناہ، بے تعلق اور بے درد ہو کر صرف خرابیوں کے مبالغہ آمیز اظہار پر قناعت نہیں کرتیں۔ وہ مل ہو جتی ہیں اور مل نہیں سوچ سکتیں تو انہیں اس کے نتائج اور عواقب کو جھٹکنا پڑتا ہے۔ ہماری غیر ذمہ دار حکومت بے روزگاری کو رونق دینے کے لئے کیا کام کر رہی ہے۔ کیا وہ اس بات پر خوش ہے کہ جو منشی پہلے اُسے دوسو اور ڈھائی سو کی تنخواہ پر رکھنے پڑتے تھے اب بی بی بھیس میں اپنا دین ایمان اس کے ہاتھ پر فروخت کر دینے کے لئے تیار ہیں کیا صورت حال کی یہ روش اس کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ لوگوں کو ذلیل خوار اور خود داری سے محروم دیکھ کر صرف کہیں، خود غرض اور ماسد لوگ خوش ہو سکتے ہیں۔ کیا حکومت کچھ نہیں کر سکتی۔ کیا وہ بالکل بے بس

ہے۔ اگر ایسا ہے تو اسے اعتراف شکست کر کے حکومت سے دست بردار ہو جانا چاہئے کیونکہ دنیا کی دوسری حکومتیں ان مسائل کا حل سوچ رہی ہیں اور ان کے یہاں بے روزگاری میں برابری ہو رہی ہے۔ روس میں بے روزگاری میں نمایاں کمی ہو گئی ہے بلکہ یہ کتنا غلط نہیں ہے کہ وہاں بے روزگاری کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ ورلڈ اکاؤنٹ کے ۱۹۳۳-۳۴ء میں درج ہے "بے روزگاری کسی ایسے ملک میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی جہاں ہر کام کرنے والے کو کوئی نہ کوئی کام کرنا پڑتا ہے۔ جہاں نہ صرف پیدائش دولت بلکہ اجرتیں قیمتیں اور معاشی زندگی کا ہر عامل ایک ایسے پہلے سے سوچے ہوئے منصوبہ کا پابند ہے جو کل قوم کے مشاغل پر بصورت مجموعی حادی ہے۔ امریکہ میں بی بی سیٹ روز لوٹ کی باقاعدہ کوششوں سے گزشتہ سال روزگار کے اعداد کا تناسب بڑھ کر ۵۶ : ۶۷ ہو گیا۔ سلطنت متحدہ برطانیہ میں ۹۲ : ۹۹ ہو گیا اور جرمنی میں ۶۸ : ۸۴ ہو گیا (اعداد انٹرنیشنل لیبر ریویو)۔ ہندوستان کے متعلق اس قسم کے اعداد نہیں دئے گئے ہیں اس لئے صحیح موازنہ ممکن نہیں ہے لیکن اس کے ماننے میں کمی کو اتنا نہیں ہو سکتا کہ یہاں اس قسم کی کوئی منظم کوشش ابھی تک نہیں کی گئی ہے۔ ہندوستان کی قدرتی دولت سے بہت کم فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ یہاں صنعت، زراعت اور تجارت کو ترقی دینے کا ابھی بے انتہا امکان موجود ہے۔ نئے روزگار نہ صرف موجودہ بلکہ اس سے بھی زیادہ آبادی کے لئے فراہم کئے جاسکتے ہیں اور معیاریات بلند سے بلند تر ہو سکتا ہے۔ روس اگر سترہ اٹھارہ سال کے عرصہ میں اپنے ملکی وسائل دولت کو ناقابل یقین حد تک ترقی دے سکتا ہے تو ہندوستان کے لئے بھی یہ ممکن ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ صحیح جذبہ عمل پیدا ہو اور ایمان دار کارکن اس کام کو ہاتھ میں لیں اور کسی خاص دستور العمل کے مطابق کام کیا جائے۔

حکومت ہند کا قانون | ۲ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک منظم نے حکومت ہند کے نئے قانون کو منظور کر لیا یعنی ہندوستان کو سوراج عطا کر دیا گیا۔ خدا ہمارے بادشاہ کو سلامت رکھے! اس طرح رضا و رغبت کے ساتھ اور پراسن طریقہ پر حق حکومت سے دست بردار ہونے کی مثالیں دنیا میں کم نظر آتی ہیں۔ یہ سب کچھ تو ہوا لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ ہندوستان کے لئے والوں کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا زپ وان وگل کی طرح یہ کسی گہرے خواب میں ڈوبے ہوئے ہیں؟ ابھی زیادہ دن نہیں گدھے سوراج کے حصول کے لئے ہندوستان کے ہر شہر و قریہ میں ایک

طوفان بے تیزی برپا تھا یا اب سوراج مل گیا تو وہ سکوت طاری ہے جس سے مردے بھی عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ کس شہ غمخشاں میں ہیں؟ یہ شاید بے کیوں نہیں بجاتے، چراغاں کیوں نہیں کرتے، جشن کیوں نہیں مناتے، ایک دوسرے کو مبارکباد کیوں نہیں دیتے؟ سوراج اب کیا اس قدر بے حقیقت ہو گیا کہ اس کے لئے قوم کے کسی فرد اور طبقہ کے منہ سے تحمیں و مرجا کا لفظ نہیں نکلتا۔ کیا سوراج یوں ہی یا کرتے ہیں اور جب مل جاتا ہے تو ایسے ہی گونگے اور ہرے بنے بیٹھے رہتے ہیں!

آئیے یہی دیکھیں سوراج میں ملاکیا ہے؟ مرکز میں وفاقی مجلس قانون ساز جس کے ایوان اعلیٰ کو ملی اختیارات ایوان ادلیٰ کے سادی حاصل ہوں گے۔ دفاتی بحث دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں منظور ہو کرے گا۔ اس مشترکہ اجلاس کے ۶۰۵ ارکان ہوں گے جن میں سے ۲۲۹ کو ہندوستانی ریاستیں، مذکورہ کے بھیمیں گی اور ۱۵۶ ایوان اعلیٰ کے رکن ہوں گے جن میں امر کی ایک نہایت مختصر اقلیت براہ راست انتخاب کر کے بھیجی گی۔ ان ۶۰۵ ارکان کی جس تعداد سے ترقی پسند ہونے کی توقع وابستہ کی جاسکتی ہے وہ تقریباً ۲۵۰ ہوگی۔ لیکن یہ ۲۵۰ ارکان بھی براہ راست منتخب نہیں ہوں گے بلکہ صوبوں کی مجالس قانون ساز سے منتخب ہو کر آئیں گی۔ صوبوں کی جن مجالس میں قوم پرستوں کی اکثریت ہوگی وہاں سے تو ممکن ہے سب کانگریسی کھنٹے منتخب ہو جائیں ورنہ بعت پسند جماعتوں کے ارکان منتخب ہوں گے۔ بحث کے انشی فی صدی حصہ پراکٹین کو کوئی اختیار نہ ہوگا، صرف پیش فیصدی پرائیسی اختیار حاصل ہوگا اور میاں بھی گورنر جنرل کے اختیارات خصوصی کی پچر موجود رہے گی۔ ریلوے کا انتظام ایک ایسے بورڈ کے ماتحت ہوگا جس پر مجلس قانون ساز کو کوئی اختیار حاصل نہ ہوگا۔ رزرو بینک پر بھی مجلس کا کوئی اختیار نہیں ہوگا یعنی سکہ اور شرح مبادلہ بھی ان کی دسٹر سے باہر ہوگا۔ گویا پیسہ میں دو تالی اور وہ بھی کھوٹی!

صوبوں کو نام کے لئے صوبہ جاتی خود مختاری عطا کی گئی ہے لیکن ثانوی ایوانوں کے قیام سے بعت پسند جماعت کو زیادہ مضبوط کر دیا گیا ہے۔ انڈین سول سروس کے جو سکریٹری و ذرا کو ملیں گے وہ عموماً وزیر اکام اور ان کی نگرانی قبول نہ کریں گے۔ تمام امپیریل سروس میں وزیر اکام کے اقتدار سے باہر ہوں گی۔ ان کی تنخواہ 'رتنی' سزا کسی بات کا دوزیروں کو اختیار نہ ہوگا۔ دور اور اصل اپنے حکم کے ملازموں کے غلام ہوں گے۔ گورنر کے

مالی اختیارات بہت وسیع ہوں گے۔ گورنر اپنے قانون تو مجلس قانون ساز سے آزاد رہ کر بنا سکے گا لیکن مجلس قانون ساز اپنا کوئی قانون گورنر کی مرضی کے بغیر نہ بنا سکے گی۔

حکومت کی طرف سے یقین دلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ تحفظات محض نام کے لئے ہیں اور جب حکومت منتقل کی جاتی ہے تو عارضی طور پر بعض اختیارات کا انتقال ملوئی کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح تجارتی اور فزقہ دارانہ امتیازات بھی ہمیشہ کی رہنے والی چیزیں نہیں ہیں۔ اگر ہندوستانیوں نے نیک نیتی سے دستور کو چلانا چاہا تو ان تحفظات کے استعمال کی کبھی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی اور یہ بے کاری کی وجہ سے آپ ہی آپ فنا ہو جائیں گے۔ لیکن ہندوستانیوں کے گذشتہ تجربے بتلے ہیں۔ وہ اب آسانی سے اس ابلہ نفسیہ کے ہٹکار نہ ہوں گے۔

رسالہ :-

مصطفیٰ مصحف مہاراجہ دیر مسؤل جناب شا کر ناٹھلی۔ تقطیع متوسط۔ ضخامت ۲۵ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ بہتر قیمت سالانہ ۲۰ مقام اشاعت عمر آباد (مداس)

صوبہ مداس کے مسلمانوں کو اردو سے ہمیشہ سے شغف رہا ہے اور اس زبان کے بہت اچھے اچھے شاعر اور ادیب بیان پیدا ہو چکے ہیں۔ اخبارات و رسائل بھی اکثر اسی زبان میں نکلتے رہے ہیں اب جناب شا کر ناٹھلی صاحب عمر آباد نے ایک نیا رسالہ مصحف جاری کیا ہے۔ جو مضامین، ترتیب۔ لکھائی چھپائی غرض ہر حیثیت سے شمالی ہند کے کسی رسالے سے کم نہیں ہے، مضمون نگاروں میں مولانا سید سلیمان ندوی۔ مولانا محوی لکھنوی۔ جناب یاس عظیم آبادی، حضرت احسن مارہروی۔ جناب نصیر ناری حضرت امجد حمید آبادی۔ جناب نصیر الدین ہنسی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ اردو کے تمدن اس کی بیش از بیش قدر دانی فرمائیں گے۔

تنقید و تبصرہ

کتب

نغمہ روح - شکار - خیالات مائیکانہی۔

نغمہ روح | اختر انصاری صاحب کے اشعار کا مجموعہ مع مقدمہ - بڑی سائز، حجم ۹۰ صفحہ، کتابت، طباعت، کاغذ معمولی، قیمت ۴۰/-

ایک مختصر سے مقدمے میں اختر انصاری صاحب نے اپنے اور دوسروں کے چند ملفوظات جن میں آرٹ اور اس کے متعلق شہسوں کی تعریف ہے، جمع کر دئے ہیں۔ ان کا لب لباب یہ ہے کہ آرٹ زندگی سے بے تعلق اور آزاد ہے۔ اس نظریے کے اگر کچھ معنی ہو سکتے ہیں تو یہ ہیں کہ آرٹ کا کام فرد کی شخصیت کا انظار ہے اور اس میں وہ اجتماعی زندگی کے مقاصد کا پابند نہیں۔ دلچسپی کی حیثیت سے یہ صحیح ہے کہ اجتماعی روح کے مرکز پر جانے کی وجہ سے زندگی کے اور شعبوں کی طرح آرٹ کا رشتہ بھی زندگی سے ٹوٹ جاتا ہے۔ مشرق میں یہ حالت عرصے سے ہے اور مغرب میں بھی کچھ دن سے پیدا ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آرٹ نے مغرب کو رو و صورت اختیار کی ہے جواب ہمارے سامنے ہے۔ نیز اس بحث کا یہاں موقع نہیں۔ تصود تو اختر انصاری صاحب کے کلام کی تنقید ہے اور وہ بھی مروجہ معیار کے مطابق۔

اختر صاحب اپنے اکثر مبصروں کی طرح صرف جذبات انسانی، خصوصاً درد و الم یا اس و حرموں کے

مصدور ہیں:-

اپنے زخموں سے کھیتا ہوں میں	تم سمجھتے ہو شکر کتا ہوں
درد اپنا کوئی ناؤں میں کہا کرتا ہے	کوئی زنگوں میں کوئی شرمیں کوئی مٹریں

ان کے انبساط کی مدیہ ہے:-

میرے یابوس دل میں اے اختر اس طرح سے اُمید آتی ہے
 جس طرح اک اداس چہرے پر مسکراہٹ سی کھیل جاتی ہے
 کبھی کبھی فطرت کا مطالعہ کرتے ہیں گردہ بھی انھیں اپنی طرح منوم نظر آتی ہے۔ آپ رواں سے مخاطب
 ہو کر کہتے ہیں۔

کس قیامت کا بھرا ہے سوز تیرے مازیں
 بہت میں اور بار میں انھیں فطرت کے طرب و نشاط کا احساس ہوتا ہے گرا تا نہیں کراں کی دل تنگی
 اور دل گیری کو دور کر دے۔

نزہت فصل باری عیش کی بنیاد ہے
 لیکن اسے دیکھ کر انھیں حسرت ہوتی ہے۔
 میرے دل کی اڑی دنیا میں بھی کجائے بار
 بہت فضا ئے عمران کے دل میں انگ اٹھتی ہے۔
 ابل رہا ہے نشاط و سرور کا دریا رواں بگر سے نظر تک ہے نور کا دریا
 اور اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں :-
 ”نشاط کا تو ایک جام ہے گویا مجھے حیات ابد کا پیام ہے گویا
 ”گویا ہے“ اندازہ کر لیجئے کہ اس انگ کی بے طاقتی ہے۔

اختر صاحب نے فنی کے عاشق ہیں مگر اکثر نے سے زیادہ مغنیہ ان کے دل کو کھینچتی ہے۔

زمرہ سنج مطرب جس دم طرب افزا سروں میں گاتی ہے
 زندگی کی اندھیری راتوں میں ایک بجلی سی کو زندہ جاتی ہے
 ”طاعت“ میں ”سے“ دہکیں ”کی لاگ نہ ہوتی تو اچھا تھا۔

اختر صاحب اگر اپنے موضوع کلام کو اپنے مشاہدے اور احساس کو اس سے زیادہ وسیع نہیں کرنا چاہتے

تو وہ جانیں مگر انہیں الفاظ کی مناسبت اور بندش کی جتنی کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ نئی پود کے اکثر شاعروں کی سہل پھاری شاعری کا خون کر رہی ہے۔ کسی نے شاعر کی تعریف میں کہا ہے۔

برائے پاکی لفظے نبے بروز آورد کہ مرغ دماہی باشد خفتہ او بیدار

ہمارے سموروں کی شب بیداری سینا اور تعمیر تک محدود ہے۔ شعر کہنے کے لئے انہیں اس کی ضرورت نہیں۔ رسالے کے اڈیٹر کا تقاضا صبح کی ڈاک سے آتا ہے سہ پہر کی ڈاک سے غزل یا نظم سانچے میں ڈھل کر چلی جاتی ہے۔

ہم اختر صاحب کے سلیس اور بے لطف اشعار کے نمونے دکھا چکے۔ اب کچھ شائیں ان ہناسب الفاظ، غلط ترکیب اور سست بندشوں کی پیش کرتے ہیں جو اس محبوبے میں کہیں کہیں پائی جاتی ہیں۔

لے دنیوی شکوہ و زرد جاہ کے خیال مجھ سے نہ بول عرش پہ میرا داغ ہے
”مجھ سے نہ بول“ خٹکی کے موقع پر کہنا جاتا ہے ”مجھ کو نہ پھڑ“ کہئے۔

کم زور اور سست تھی کاغذ پہ وہ غزل گائی گئی تو چیز سی کچھ اور مہگئی
الفاظ تیر بن کے دلوں میں اتر گئے نغموں میں روح نغمہ کچھ اس طرح کھو گئی

تیروں میں اترنا نہیں معتاب ہے۔ ”نغموں میں روح نغمہ کچھ اس طرح کھو گئی“ یہ گانے کی تعریف ہے یغزل کی مذمت۔

تیری نازک اور پتلی انگلیاں ساز کے تاروں کو جب کتنی ہریں
کانچنے لگتی ہے زہرہ عرش پر دل پکارا ٹھٹھے ”بس لہند بس“
یہ بھی جو طرح معلوم ہوتی ہے۔ ”کانچنے“ کے لفظ نے یہ خرابی پیدا کی ہے۔

صدتے جاؤں بارساون کے

”بارساون کی ترکیب غلط ہے خواہ حضرت داتا گریہ کی کچھ بھی فرمائیں۔

اب قوم کا تنفس محتاج ہے تپش کا تیری ملن سے اس میں بچا ریاں ہوں بند
تنفس کا لفظ اردو میں دم کے معنی میں نہیں دم چڑھنے کے معنی میں آتا ہے۔ اس شعر کو پڑھ کر ایک

علامہ حصہ کا قول یاد آگیا ” فلاں انہیں میں کیا رکھا ہے چند نفوس بیٹھے اودھکھارتے ہیں !“

مجموعی طور پر انتر صاحب کا کلام بہت اچھا ہے اور وہ نوجوان شاعروں کی صفِ اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ (ع - ح)

شکار | از جناب طب یار جنگ مرحوم اول تعلقہ دار سرکار نظام حرم... صفحات تقطیع بڑی اکتاہت و محبت عمدہ کاغذ نفیس قیمت مجلد ملکہ... لئے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد (دکن)

انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں میں شکار پر اور ہندوستان کی بعض بہترین شکار گاہوں پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ہمارے ملک میں بادجو دیکھ شکار کا ذوق عام ہے اور شکار کی بھی کثرت ہو لیکن تعجب کا مقام یہ کہ دو زبان میں موضوع پر اسی تک کچھ نہیں لکھا گیا تھا۔ اس لئے نوآموز اور انگریزی زبان سے ناواقف شکاریوں کے لئے سولے پرانے اور غلط تسلط تجربات کے کوئی چیز راہ نہ تھی۔ اس کتاب کی تالیف و اشاعت نے اس کی کو بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔

شروع میں انساب کے بعد نواب طب یار جنگ مرحوم کے محققہ حالات زندگی میں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب کو زائد طاہر علی سے ورزش اور شکار کا شوق تھا، تعلیم سے فارغ ہو کر حیدر آباد و ملکہ فوج میں ملازم ہوئے پھر اول تعلقہ دار (ڈپٹی کمشنر) ہو گئے۔ تقریباً اسے اضلاع میں ہوا شکار کا مشہور مرکز میں اس لئے اس شوق کو پورا کرنے کا خوب موقع ملا اور گویا ملازمت کا اکثر حصہ شکاریں گزرا۔

سوانح حیات کے بعد خود مصنف کا طویل مقدمہ ہے۔ اس میں انھوں نے شکار کو دوسرے ورزشی کھیلوں (Sports) سے افضل بتایا ہے۔ چہر شاہ اندازی کا طریقہ بتایا ہے۔ بندوق اور اس کے سامان کے متعلق مفید و قیمتی ہدایات درج کی ہیں۔ شکار کے سامان کی پوری تفصیل لکھی ہے اور یہ بتایا ہے کہ شکاری کے ساتھ کس قسم کے آدمی ہونا چاہئیں۔ اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے اس میں انھوں نے شکار کی قسمیں بتائی ہیں مثلاً پھتے سے ہرن کو شکار کرنا، پھیل کپڑا، جال لگا کر پرندوں کو پکڑنا کسی آلودہ جگہ یا بندوق سے جانوروں کو شکار کرنا وغیرہ۔ انھوں نے بتایا ہے کہ یہ کتاب بندوق کے شکار کے متعلق ہے۔

ہندوؤں کے شکار کی انھوں نے دو قیس کی ہیں، 'اسال گیم' (چھوٹا شکار) اور 'بگ گیم' (بڑا شکار یا بیڑے جانوروں کا شکار)۔ 'اسال گیم' میں انھوں نے سناپ، شیر، ہریل، تیترا، تملیر، کبوتر، مور، آبی پرندوں اور خرگوش کا ذکر کیا ہے۔ 'بگ گیم' میں تمام چرندوں اور درندوں کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے ہرن، پیکارہ، جنگلی بکری، جنگلی میٹھی، چیل، نیل گائے، بارہ نگے اور سانہرے کال لکھائے۔ سانہرے کال کے بیان پر کتاب کا پہلا حصہ ختم ہو جاتا ہے۔

بعد میں درندوں اور ان جانوروں کا حال ہے جو انسان کے لئے درندوں کی طرح خطرناک ہیں مثلاً جنگلی بھینسا، بیل، گینڈا، باقی وغیرہ۔ دوسرے حصہ میں پہلے شیر کا بیان ہے اور ۳۲۲ صفحے پر ختم ہوا ہے اس کے بعد تیندوا یا گھلار، پتے، بھیرٹے، جنگلی کتے، سیاہ گوش سپی، ریچھ، سور، گور، لاما، بٹس، جنگلی بھینسے اور گینڈے اور سب سے آخر میں شیر پر کا حال ہے۔ فاضل مولف نے ان جانوروں کے شکار کے طریقے ہی نہیں بتائے ہیں بلکہ ہر جانور کی پیدائش، زمانہ پیدائش، بچپن، جوانی، بڑھاپا اور عادات و خصوصیات کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔

یہ مواد انھوں نے انگریزی کی مستند تصانیف اور خود اپنے تجربے کی مدد سے فراہم کیا ہے۔ کتاب کی دلچسپی قائم رکھنے اور قفلت باتوں کو سمجھانے کے لئے انھوں نے بیشتر اپنے اور کتر دوسرے شکاریوں کے شکار کے واقعات درج کئے ہیں۔ شیر کے بیان میں انھوں نے خاص طور پر اس کا التہام رکھا ہے۔ یہ واقعات اس قدر دلچسپ اور بعض اوقات اس قدر حیرت انگیز ہیں کہ پڑھنے والا ہمتن محو ہو جاتا ہے۔ یہ موضوع بھائے خود دلچسپ ہے لیکن مولف کے طرز تحریر نے اسے دلچسپ تر بنا دیا ہے۔ روانی بیان، اضافی دسلالت کو دیکھ کر اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مصنف کو سیف و قلم پر یکساں قدرت حاصل ہے۔

یہ کتاب وقت کے بہترین شکاری کے تجربات اور مشورے مستند مغربی مصنفین کی کتابوں کا پتھر ہے۔ اگر اس میں کوئی کمی ہے تو صرف تصویروں کی تصویروں سے کتاب اور بھی دلچسپ اور مفید ہو جاتی۔ ناشر صاحب کا وعدہ ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں وہ تصویروں کا اضافہ کر دیں گے۔

ہمارے خیال میں یہ کتاب تجربہ کار شکاریوں کے لئے بہترین شیر اور نوآموز شائقین کے لئے مستند رہنما کا کام دے گی۔

خیالات مہاتما گاندھی | از پادری سی۔ اف۔ اینڈریوز۔ حجم ہر دو حصہ ۱۲ صفحات، تقطیع چھوٹی، کتابت و طباعت (دو حصہ)
تیسری منزل، مومن پورہ بمبئی نمبر ۱۱۔

اس کتاب میں پادری سی۔ اف۔ اینڈریوز نے مہاتما گاندھی کے اصول و خیالات اور ان کی خود نوشت سوانح حیات کے منتخب حصوں کو جمع کر دیا ہے۔ کتاب کا مقصد خود ان کے الفاظ میں ان بڑے بڑے اصولوں اور خیالات کی جو مہاتما گاندھی کی پُر از واقعات زندگی کا طرہ امتیاز رہے ہیں تحریری شہادت کی امداد سے تشریح کرنا ہے۔ کتاب میں علاوہ خاتے اور نمبروں کے بیس باب ہیں۔ پہلے ۹ بابوں میں مہاتما گاندھی کے اصول اور خیالات ہیں اور دوسرے حصہ میں ان کی سوانح حیات کا انتخاب۔ پادری صاحب کا طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ پہلے تو مہاتما گاندھی کے خیالات و اصول کی اپنے الفاظ میں تشریح کرتے یا اپنے تاثرات ظاہر کرتے ہیں پھر مزید تشریح یا ثبوت کے لئے خود گاندھی جی کی تحریروں کے اقتبالات پیش کرتے ہیں اور یہ طریقہ شروع سے آخر تک رہا ہے۔ مہاتما گاندھی کی زندگی اور ان کے اصول و عقائد پر اب تک بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ یہ کتاب ان میں ایک مفید اضافہ ہے۔ پادری صاحب نے اسے بہت محنت اور سلیقے سے مرتب کیا ہے اور بہت سے اہم مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کا اردو ترجمہ بھی بہت صاف سلیس اور رواں ہے۔

(ع۔ ح)

رسائل۔

کنول (اٹا ہوار) مدیر جناب منظر صدیقی اکبر آبادی۔ تقطیع متوسط۔ حجم ۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر کاغذ اوسط درجے کا قیمت سالانہ ۲۰ روپے ۵ مقام اشاعت آگرہ۔

جناب منظر صدیقی نے یہ رسالہ جاری کیا ہے۔ پہلا پرچہ محنت اور سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے۔ رسالے میں علمی و ادبی مضامین، فلسفے، نظمیں، غزلیں، غرض ہر طرح کا سامان موجود ہے شعرا اور مضمون نگاروں میں بھی بعض اچھے اچھے نام نظر آتے ہیں۔ ہذا کی بھی تین تعادریں ہیں۔ اگر منظر صاحب اسی محنت و لچرپی سے کام کرتے رہے تو رسالہ بہت جلد مقبولیت حاصل کرے گا۔

(ع۔ ح)

شذرات

اپریل کے مہینے میں اندور میں ایک ہندی کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا۔ جانا گاندھی اس کے صدر تھے۔ اس میں ہندی کی ترقی کے لئے بہت سی تجویزیں منظور ہوئیں منجملہ ان کے ایک تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کی زبانوں اور ادبوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش کی جائے اور ہندی زبان کو ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان ہونے کی حیثیت سے ملک کی تمام زبانوں کے ادب کی نمایندگی کا موقع دیا جائے۔ اس غرض کے حصول کے لئے فی الحال تین آدمیوں کی ایک کمیٹی بنادی گئی ہے اور اس کمیٹی کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ارکان کی تعداد میں اضافہ کر سکتی ہے۔ کمیٹی نے اس سمت میں ابتدائی قدم اس طرح اٹھایا ہے کہ ہندی زبان میں ایک رسالہ ”ہنس“ جاری کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور صوبوں کی مختلف زبانوں میں جو مضامین مندرجہ ذیل عنوانات کے ماتحت چھپتے رہتے ہیں ان کا ترجمہ اس رسالہ میں شائع ہوا کرے گا۔

(۱) مختلف صوبوں کے ادبی اور تمدنی واقعات پر مختصر نوٹ۔

(۲) صوبوں کے ادبیات کی تاریخ کا ایک مختصر خاکہ جس میں خاص زور ان کی جدید ترقی اور قومی رجحانات پر دیا گیا ہو۔

(۳) صوبوں کے ادب کی بہترین غزلیں۔

(۴) صوبوں کے ادب کے بہترین افسانے۔

(۵) ایک مسلسل مضمون۔

(۶) مختلف صوبوں کے عوام میں جوابدہ رائج ہو۔

(۷) مختلف زبانوں کے بہترین ڈرامے۔

(۸) صوبوں کے ادبوں میں جن نثر نگاروں اور شاعروں کا درجہ بلند و بالا ہے ان کی سیرۃ نگاری کے نمونے اور ادبی تنقیدیں۔

- (۹) مختلف صوبوں کے متازگوں کی نفعی تصویریں۔
 (۱۰) صوبوں کے ادبوں اور تمدنوں کا باہمی مقابلہ۔
 (۱۱) مختلف زبانوں میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر تبصرہ۔
 (۱۲) مختلف رسالوں میں جو قلمی ادب شائع ہوتا ہے اس کی اشاعت ہندی ترجمہ کے ساتھ۔
 (۱۳) غیر ملکی ادب پر مختصر نوٹ۔
 (۱۴) صوبہ جاتی زبانوں کے بہترین ناولوں کے خلاصے۔
 (۱۵) ہندوستان کے لئے مشترک رقم الخطا پر بحث و مباحثہ۔

اس کمیٹی کے ارکان نے اردو کا شمار بھی صوبہ جاتی زبانوں میں کیا ہے اور ہمارے پاس اشتراک عمل کے لئے اپنا لٹریچر روانہ کیا ہے۔ کیا اردو واقعی ایک فرقہ اور صوبہ کی زبان ہے؟ اس کا جواب باتوں سے نہیں کاموں سے دیا جاسکتا ہے۔ جو کام کرے گا وہ آہستہ آہستہ کموں اور ناکاروں پر مادی موبالے گا۔ کام کی منطق تمام منطقی منطقوں سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔

حضرت جوش ملیح آبادی نے ہمارے پاس ایک اپیل اشاعت کے لئے بھیجی ہے۔ وہ ایک رسالہ "کاف بلند" دہلی سے نکالنا چاہتے ہیں۔ جوش جتنے زبان و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں ان سے اردو وال طبقہ بخوبی واقف ہے۔ اس رسالہ کے ذریعہ سے ان کا ارادہ یہ ہے کہ اپنے میدان عمل کو اور وسیع کریں اور اپنی باقی زندگی ملک میں بیداری پیدا کرنے کے لئے وقف کر دیں۔ ان کا ارادہ نہایت متحسن ہے اور ان کا مطالبہ بھی کچھ بہت زیادہ نہیں۔ چندہ دس روپیہ ہے اور وہ رسالہ کے اجرا سے پہلے چاہتے ہیں کہ ایک ہزار فریڈ اراس چندہ کو پیشگی منی آرڈر کر دیں۔ ہم ان کی اپیل بخیر دوسرے صفحہ پر درج کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے جاب جوش کے قدردان افسر مایوس نہ کریں گے۔

بڑی چھٹیوں کے بعد جاسمہ مکمل گئی ہے۔ داخلہ ابتدائی اور ثانوی جماعتوں میں پچھلے سال سے اچھا ملے۔

نئے دارالافتاء بھی خوب آرام دہ اور وسیع ہیں۔ پڑھائی کا کلم شروع ہو گیا ہے۔

شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کو بنارس کی قومی جامعہ نے تقسیم اسناد کے موقع پر خطبہ پڑھنے کے لئے مدعو کیا تھا۔ صاحب موصوف نے وہاں جو خطبہ پڑھا اُسے ہم جامعہ کی آئندہ اشاعت میں پیش کریں گے۔ مولوی شفیق الرحمن صاحب ناظم سہروردان جامعہ کو ضلع بارہ بنکی میں عمارات جامعہ کے لئے چندہ کی فراہمی میں اچھی کامیابی ہوئی۔ اس ضلع سے تقریباً تیرہ سو روپیہ جمع ہو گیا۔ آج کل وہ ضلع الہ آباد کا دورہ کر رہے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

جلد ۲۴	ماہ اکتوبر ۱۹۳۵ء	نمبر
--------	------------------	------

فہرست مضامین

- ۱۔ حالی
- ۲۔ مولانا حالی کے آبا و اجداد
- ۳۔ مولانا حالی کی ایک غیر مطبوعہ تحریر
- ۴۔ فلسفہ ترقی (نظم)
- ۵۔ کیا مسلمان ترقی کر سکتے ہیں؟
- ۶۔ دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے؟
- ۷۔ ہم جیتے ہیں یا مر گئے؟
- ۸۔ تحفۃ الاخوان (نظم)
- ۹۔ روح مسحور
- ۱۰۔ تفسیر القرآن
- ۱۱۔ علم سیاست اور اجتماعی تباہی
- ۱۲۔ فاشزم
- ۱۳۔ دنیا کی رفتار
- ۷۷۹ ڈاکٹر سید عابدین ایم۔ اے۔ پانی ایچ۔ ڈی
- ۷۹۵ شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی
- ۸۰۰ شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی
- ۸۰۱ شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالی
- ۸۰۶ " " " "
- ۸۱۵ " " " "
- ۸۱۹ " " " "
- ۸۲۷ " " " "
- ۸۳۰ خواجہ غلام السیدین صاحب۔ ایم۔ ایڈ
- ۸۵۲ مولانا اسلم جیو پوری
- ۸۵۹ ذ۔ ح
- ۸۶۵ ذ۔ ح
- ۸۷۱ ذ۔ ح

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

نمبر	جلد	جلد اکتوبر ۱۹۳۵ء
------	-----	------------------

فہرست مضامین

۷۷۹	ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی	۱۔ مولانا حالی
۷۹۵	شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی	۲۔ مولانا حالی کے آباد اجداد
۸۰۰	شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی	۳۔ مولانا حالی کی ایک غیر مطبوعہ تحریر
۸۰۱	شمس العلماء خواجہ الطاف حسین جیسٹا حالی	۴۔ غلط ترقی (نظم)
۸۰۶	" " " "	۵۔ کیا مسلمان ترقی کر سکتے ہیں؟
۸۱۵	" " " "	۶۔ دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے؟
۸۱۹	" " " "	۷۔ ہم جیتے ہیں یا مر گئے؟
۸۲۷	" " " "	۸۔ تحفۃ الاخوان (نظم)
۸۳۰	خواجہ غلام السیدین صاحب۔ ایم۔ ایڈ	۹۔ روحِ سحر
۸۵۲	مولانا اسلم جیراچوری	۱۰۔ تناسیر القرآن
۸۵۹	ذ۔ ح	۱۱۔ علم سیاست اور اجتماعی تباہی
۸۶۵	ذ۔ ح	۱۲۔ فاشیزم
۸۷۱	ذ۔ ح	۱۳۔ دنیا کی رفتار

دہرہ وغیرہ محمد حبیب بی۔ اے۔ اگسٹ پرنٹر و پبلشر نے جامعہ بریلی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا

خط مولانا حالی مرحوم

برخیزد اور - تمہارا خط مٹھا مگر اسکو بھیج کر اسبیت دن پر لکے اسبیت
اپنی اور تعلیق کی خبر کا لکھو جبکہ بارش نہ ہو تو حال میں کو دیکھو اور تو سن
نہ پھر دیکھا اور بارش کا حال نہ لکھو کہ کوئی یا نہیں ہے اور بارش میں مرئی مگر دلی سنا کر
سے بارش کی خبر مر آئی ہے - بمبئی میں موملہ بعد عرفان کا تخت بیمار ہو گئے تھے اور انکی
بیماری ہو گئی تھی اور علم تعلیق ہی اور سبب میں نہ آئے مگر اسبیت انا سے علم تعلیق
انہیں کہ اس بمبئی میں ہے - میں نہایت غم انوقت ہم ہی کہتے رہا اور اور
لکھتے دیکھو نہیں بھیج لکے حق کو دعا اور سار انکی اور ان کو دعا راہم ان کے
سورج ۱۹۹۲ء

حالی

مولانا حالی مرحوم کی زندگی کے حالات یا تو اس مختصر یادداشت میں ملتے ہیں جو انھوں نے خود مرتب کی تھی اور جو مکتوبات حالی اور مقالات حالی کے ساتھ شائع ہوئی، یا اس چھوٹے سے رسالے میں جو محمد امین نیرنگ صاحب نے لکھا ہے۔ امید ہے کہ اس موقع پر جب حالی صدی کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا جا رہا ہے ہمارے اہل قلم میں سے کوئی مولانا حالی کی ایک مبسوط سیرت لکھنے کا ڈول ڈالے گا۔ ہماری آنکھیں مولوی عبدالحق صاحب کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

ہم اس مضمون میں ایک سرسری خاکہ مولانا حالی کی سیرت کا پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک دھندلی سی، ادھوری تصویر ہے جو مولانا کی نظم و نثر کو پڑھ کر اور ان کے حالات ان کے عزیزوں سے سن کر ذہن میں قائم ہو گئی ہے۔

اس تصویر میں ایک معلم، ایک نقاد، ایک مصلح قوم کے خط و خال بھی موجود ہیں لیکن دل کی کیفیت جو آنکھوں سے جھلکتی ہے صاف کہہ رہی ہے کہ یہ ایک شاعر کا چہرہ ہے۔

شاعر کا مفہوم ہمارے ملک میں بہت محدود ہو گیا ہے۔ ہم ایک عرصے سے ایک خاص کینڈے کے شاعر دیکھتے آئے ہیں اور ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ سب شاعر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ شاعر کا ہونے کا ایک ہے مگر تربیت کے فرق سے اس کی صورتیں دو ہو جاتی ہیں۔ وہ جو ہر جو سب شاعروں میں عام ہیں یہ میں تخیل کی تیزی، منظر کی باریکی، حسن اور تناسب کی پرکھ، احساس کی شدت خصوصاً سمیت اور خودی کے جذبات کی فراوانی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شاعر کس زمانے میں پیدا ہوتا ہے اور اسے ان جو ہروں کی تربیت کے لئے کون سا میدان ملتا ہے۔

اگر زمانہ انتشار کا ہے، معاشرت کا شیرازہ کچھ چکا ہے، فرد کا رشتہ جو ست سے ٹوٹ گیا ہے، سب اپنے اپنے حال میں اور اپنی اپنی فکر میں ہیں تو شاعر بھی باہر کی دنیا سے آنکھ بند کر کے اندر کی دنیا میں ڈوب جاتا ہے۔

اس کا تخیل اور اس کا شاہد نفس کے دائرے کو اپنی جولانی کے لئے رنگ پاتا ہے تو اس واردات کو جو قلب پر گزرتی ہے بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے اور اس میں نئی نئی یارکیاں پیدا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ شاہدے کی قیدی ٹوٹ جاتی ہے محض خیال کے جادو سے وہ ایک طلسم حیات باندھتا ہے اور اسی میں گمن رہتا ہے۔ اس کی نظر حسن اور تناسب کو ڈھونڈتی ہیں مگر وہ عالم فطرت اور عالم معاشرت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا بلکہ اپنے مذاق کے مطابق ایک خیالی پیکر حسن تراشتا ہے اور اس کی خفیت سی جھلک کسی انسان میں دیکھ کر اسے اپنا معشوق بنالیتا ہے۔ محبت کا جذبہ جس کی وسعت نامحدود ہے سمٹ کر اسی ایک مرکز پر قائم ہو جاتا ہے اور اس کی شدت بہت بڑھ جاتی ہے۔ وہ اور تمام جذبات کو اپنے رنگ میں رنگا اور شاعری کی ساری زندگی پر بھا جانا چاہتا ہے۔ مگر خودی کا جذبہ جو اس داخلیت کی نصفا میں بھیل کر خود پرستی کی حد تک پہنچتا ہے محبت یا عشق کا حریف متقابل بن جاتا ہے عشق اور خودی کی اس کشمکش سے شاعر کی نفسی زندگی میں ایسے پیچ پڑ جاتے ہیں جو کھولے نہیں کھلتے۔ وہ دارفہ مزاج 'بے چین اور چڑچڑا ہوا' جاتا ہے۔ وہ شدت سے محبت کرتا ہے اور اس سے زیادہ شدت سے شکست کرتا ہے۔ جب معشوق اس پیکر خیال سے مختلف ثابت ہوتا ہے جو اس کے ذہن میں ہے 'جب اصلی زندگی طلسمی زندگی سے ٹکراتی ہے، تو وہ کرتا ہے، چلتا ہے، فزاد کرتا ہے۔ اس کی وضع نفسی کی پیچیدگی، اس کے جذبات کا اشتراک اور شدت، اس کے اسلوب بیان میں پیچیدگی، 'بالغہ اور بے ربطی پیدا کر دیتی ہے۔ اردو شاعری نے اگر پہلے نہیں تو انیسویں صدی کے شروع سے ہی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ جو لوگ اس صدی میں پیدا ہوئے انھوں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو انھیں صرف اسی قسم کی شاعری اور اسی قسم کا شاعر نظر آیا۔ کسی اور طرز کے شاعر کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر زمانہ موافق ہو، روح اجتماعي زندہ ہو، افراد کا رابطہ حیات و کائنات سے قائم ہو، شاعر کی خلقی صفات کو نشوونما کا موقع ملے تو وہ کچھ اور ہی چیز ہو جاتا ہے تخیل کی تیزی شاہدے کی دست کے ساتھ مل کر اسے خدا کی دنیا اور انسان کی زندگی کی حسی جاگتی تصویر دکھاتی ہے اس وسیع جلوہ گاہ میں اسے حسن و تناسب کا حقیقی جلوہ حسن صورت اور حسن معنی کا صحیح امتزاج نظر آتا ہے۔ وہ فطرت کی ہم آہنگی اور معاشرت کے توازن سے آشنا ہوتا ہے تو اس کے جذبات میں بھی ربط و ضبط اور اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔

اس کا جذبہ محبت نوعی سہرہ دی کے ساتھ مل کر اس قدر وسعت حاصل کرتا ہے کہ دوستی، علاوہ، حب وطن، حب انسان سب پر حاوی ہو جاتا ہے اور اگر وہ حب الہی کا حوصلہ کرے تو اسے زیب و تیا ہے۔ شاعر کی خودی کو یہ عالمگیر محبت کا ٹچھاٹ کر سنوارتی ہے۔ انسانیت کے کانٹے نکل جاتے ہیں خود داری، بغیر، اغما، نفس کے پھول باقی رہ جاتے ہیں۔ زندگی اور خیالات کی حقیقت اور ہم آہنگی اسلوب بیان سے سادگی اور سچائی بن کر ٹپکتی ہے۔ یہ شاعر تین، خود مزاج، منکسر اور بردبار ہوتا ہے۔ وہ نفس انسانی، عالم معاشرت، عالم فطرت کے خفا کو سہرہ دی کی نظر سے خود دکھتا ہے اور دوسروں کو دکھاتا ہے۔ درد و سوز اسی کا حصہ ہے اس لئے کہ اسے صرف اپنا ہی غم نہیں مارے جان کا غم ہوتا ہے۔ عاشقی کا دعویٰ اسی کو چھتا ہے اس لئے کہ وہ نیک خودی کا عکس مشوق کی ذات میں نہیں ڈھونڈتا بلکہ مشوق کی حقیقی صفات کو دیکھ کر اس کی طرف کھینچتا ہے زندگی کی لمبیاں اسے بھی چھنی پڑتی ہیں محبت کی کڑیاں اسے بھی جھلنی پڑتی ہیں مگر وہ ضبط اور مناسبت کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ زیادہ بھی کرتا ہے تو سادگی اور سچائی ہے۔

شاعر کے اس تصور کو ذہن میں رکھ کر حالی کی زندگی پر نظر ڈالئے۔ خواجہ الطاف حسین حالیؒ میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ باپ کا سایہ چھٹیں ہی میں سرست اٹھ گیا۔ بھائی سبوں کی سرپرستی میں اس دینیم کی پرورش ہوئی۔ حالی کو شروع سے ”خود بخود تعلیم کا مشوق حد سے زیادہ تھا مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔ پہلے پانی پت کے دستور کے مطابق کلام مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد فارسی کی ابتدائی کتابیں اور عربی صرف و نحو پڑھی۔۔۔ ابرس کی عمر میں حالی کی شادی کر دی گئی اور بن ظاہر ان کی تعلیم کا دروازہ بند ہو گیا۔

مگر علم کی لگن نے چین سے نہ بیٹھے دیا۔ حالی ”گھر والوں سے روپوش ہو کر“ دلی چلے آئے۔ اور ڈیڑھ برس وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی پڑھیں۔ یہاں انہیں غائب کی صحبت میں بیٹھیہ کا موقع ملا۔ مرزا کے فارسی اور اردو شعر جو سمجھ میں نہیں آتے تھے وہ ان سے حل کیا کرتے تھے اور ان کے چند فارسی قصیدے بھی ان سے پڑھے۔ شاعری کا جوہر فطرت نے حالی کی طبیعت میں ودیعت کیا تھا غائب کے فیض تربیت سے ابھرنے لگا۔ ایک آدھ غزل اردو فارسی کی کہہ کر غالب کو دکھائی تو انھوں نے

کہ ”اگرچہ میں کسی کو فکشنر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔“ سترہ اٹھارہ برس کی عمر کے لڑکے سے غالب جیسے جوہر شناس نے یہ بات کچھ دیکھ کر کچھ سمجھ کر کہی ہوگی۔

بزرگوں اور عزیزوں کے جبر سے حالی کو اپنی تعلیم اور صوری چھوڑ کر پانی پت واپس جانا پڑا۔ اھاریں۔ سرکاری ملازمت کے سلسلے میں داخل ہوئے مگر سہ ماہی کی بدامنی میں گھر چلے آئے۔ کوئی چھ برس تک وہیں رہ کر بدبیر کسی تربیت اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ کبھی حدیث کبھی تفسیر پڑھتے رہے۔

۱۸۶۳ء میں نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیعہ رئیس جاگیر آباد نے انھیں طلب کیا اور آٹھ برس تک نہایت شفقت اور محبت سے اپنے پاس رکھا۔ نواب صاحب اردو اور فارسی کے خوش گوشاؤ تھے۔ سحر اور پاکیزہ مذاق سخن رکھتے تھے۔ ہم مذاق مربی کی صحبت سے حالی کی شاعری چمک اٹھی۔ اس عرصہ میں وہ غالب سے اصلاح لیتے رہے مگر اس سے اتنا فائدہ نہیں ہوا جتنا نواب صاحب کی صحبت سے۔ ”وہ بالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور بدمعاشی سادی چچی باتوں کو محض حسن بیان سے ولفریب بنانا اسی کو فتنائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔“

۱۸۶۹ء میں غالب نے وفات پائی۔ حالی نے اپنے شفیق استاد کا جو مرثیہ لکھا وہ ایک طرف ان کے کمال شاعری کا نمونہ ہے تو دوسری طرف ان کی احسان شناسی اور عقیدت مندی کو ظاہر کرتا ہے جو شاعروں کے بیاں بہت نامیاب جنس ہے۔ غالب کی سیرت کا وہ نقشہ کھینچا ہے کہ اس سے بہتر قلمی تصویر ہماری نظم و نثر میں نہیں ملتی۔ یونانیوں کے ذہن میں جو تصور ”انسانیت“ کا تھا اس کی جھلک حالی کو غالب کی ذات میں نظر آئی اور اسے انھوں نے شعر کا جامہ پہنا کر نقلے دوام بخش دی۔

منظر شان جن فطرت تھا معنی لفظ آدمیت تھا

یہ ایک شعر ایک تہیہ سے کم نہیں ہے۔

تھوڑے ہی دن کے بعد نواب شیعہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ حالی کو پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں جگہ مل گئی۔ بیاں ان کے ذمہ یہ کام تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوں ان کی عبارت کو درست کر دیا

کریں۔ لاہور کے اس چار برس کے قیام نے حالی کے مذاق ادب اور مذاق شعر کو بہت کچھ بدلا۔ انگریزی کتبوں کے ترجموں پر نظر ڈالنے سے حالی کی طبع سلیم نے وہ باتیں اخذ کر لیں جو لوگوں کو انگریزی ادب کی تھیل میں عیس کھپانے سے بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ”نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر خاص کر عام بخاری لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی“ اور مولوی محمد حسین آزاد نے ایک شاعرے کی بنیاد ڈالی ”جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس عنوان پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔“

حالی نے اس شاعرے کے لئے چار نظمیں ”برکھارت“ ”نشاط امید“ ”منظرہ رحم والصفات“ اور ”بطن بکھیں۔ ششہ یا ششہ“ میں وہ لاہور سے دہلی ایگلو عوبک اسکول کی مدرسہ پر بدل آئے۔ یہ حالی کی زندگی اور ان کی شاعری کا پہلا دور ہے۔ ان کے اس زمانے کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ ان کے مکتوبات میں جو شائع ہوئے ہیں ششہ سے پہلے کا کوئی خط نہیں۔ ان کی نظم و نثر سے سولے اس کے کہ ان کے جذبات و خیالات کا اندازہ ہو زندگی کے واقعات کا کچھ تپہ نہیں چلتا اس لئے کہ خود سنائی اور خود فروشی ان کا شیوہ نہیں تھا۔ جو کوئی حالی کی سیرت لکھے گا اسے اس دور کے حالات معلوم کرنے میں بڑی کریہ اور تلاش سے کام لینا پڑے گا۔

پھر بھی جو کچھ معلوم ہو سکا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حالی کی آدمی سے زیادہ عمر عمرت اور گم نامی میں کٹی۔ ان کی شادی خوش حال گھرانے میں ہوئی تھی مگر ان کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ گھر کی روٹیاں توڑیں۔ ان کے بزرگوں کو اپنے علم و فضل کی وجہ سے سلطنتِ غلیہ سے مدد و ساس ملتی تھی سلطنت کے زوال کے بعد حالی کے والد کو اور خردان کو انگریزی حکومت کی نوکری کرنی پڑی مگر زمانے کا رنگ بدل چکا تھا مشرقی علوم کی قدر نہیں رہی تھی۔ نئے ٹکڑوں کے ہاں رسوخ حاصل کرنے کے لئے جن صفات کی ضرورت تھی ان سے حالی محروم تھے۔ اس لئے پھوٹے عمدوں سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ مگر اس کے باوجود ان کے احباب میں چھوٹے بڑے سب ان کا احترام کرتے تھے۔

ان کے پاکیزہ اخلاق اور سیدھی سادی خاموش طبیعت میں کس غضب کا وقار ہو گا کہ غالب صیا

شخص اپنے نوجوان شاگرد کے آگے جھکتا تھا۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ حالی نے واعظانہ جوش میں ”ناز چمکانہ کی خدمت پر ایک لبا چڑا کچھ لکھ کر ان کے سامنے پیش کیا جس میں ان سے اس بات کی درخواست کی تھی کہ آپ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا ایسا اشارے سے غرض جس طرح ہو سکے ناز چمکانہ کی پابندی اختیار کریں۔“ غالب کے پاس اس زمانے میں کم نام خط بہت آیا کرتے تھے جس میں لوگ ”ان کے افعال و اعمال پر بہت نازیبا طریقے سے نفیس و ملامت کرتے تھے اور کھلم کھلا گایاں تک لکھتے تھے۔“ حالی کی تحریر پڑھ کر برس پڑے اپنی گہگاری کا اعتراف ایسے دل خراش الفاظ میں کیا جس سے انتہائی رنج و غصہ ظاہر ہوتا تھا۔ دوسرے روز انھوں نے حالی کو ایک غزل لکھ کر بھیجی جس میں ان کی نصیحت گری کا تنکوا تھا۔ حالی نے معذرت کے طور پر ایک قطعہ ان کی خدمت میں روانہ کیا۔ اس کو پڑھ کر غالب نے ایک قطعہ شیفہ کو بھیجا جس کے ساتھ حالی دلی میں مقیم تھے۔ اس سے اندازہ ہو گا کہ غالب اور شیفہ دونوں حالی سے کس قدر محبت رکھتے تھے اور ان کی کتنی عزت کرتے تھے۔

قطعہ

تو نے کہ شیفہ دھرتی لقب داری	ہی بھلف تو خود را امید دار کنم
چو حالی از من آشفته بے سبب بنید	تو گر شفیق نہ گردی بگو چہ کار کنم
دو بارہ عمر و ہندم اگر بغرض محال	براں ہرم کہ در اں عمر ایں و کار کنم
یکے اولے عبادات عمر پیشینہ	و گر یہ پیشگیہ حالی اعتذار کنم

حالی نے پھر انتہائی مذاہمت کے ساتھ معذرت کا قطعہ لکھا۔ آخر غالب نے یہ کہہ کر کہ ”بس بہت بخشی موقوف“ اس قصے کو ختم کیا۔ اس واقعے سے حالی کے مذہبی جوش کا بھی پتہ چلتا ہے جو وہ اس عمر میں رکھتے تھے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نصیحت کی رو میں ادب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جانے کا انھیں کتنا رنج ہوا۔ مگر زمانے کا اثر کس غضب کا ہوتا ہے کہ حالی عیا جواں صالح شاعری کی نفل میں قدم رکھ کر وہی گھبرا راگ گانے لگا جو وہاں چیرا ہوا تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ ہندوستان میں تمدن و معاشرت کے انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ شاعری بھی بستی کی حد کو پہنچ گئی تھی۔ انفرادیت اور داخلیت کا رنگ بس کا ذکر ہم نے اس مضمون کے ابتدا میں کیا ہے پھایا ہوا تھا۔ اور وہ بھی ایسا بگڑا ہوا رنگ جس نے اخلاق کے ساتھ ادب کو بھی بگاڑ دیا۔ ولایت

اور جذبات پرستی اشخاص میں ہو یا قوموں میں جوانی کے ساتھ کھپ جاتی ہے مگر خزاں عمر میں کسی طرح نہیں بچ سکتی۔ سادوں کے اندھے کو ہر اسی ہر اسوجھے تو ایک بات ہے مگر کالمک کا اندھا ہر اسی ہر ادا کھینا چاہتے تو سمجھنا چاہئے کہ عقل کی آنکھوں سے بھی معذور ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا شباب مدت ہوئی رخصت ہو چکا تھا۔ گردش رو بھگرنے ان کی کمر توڑ دی تھی مگر وہ جوان بننے کے شوق میں اکڑتے پھرتے تھے۔ ان کے دلوں میں سرد ہو چکے تھے مگر ٹھنڈی گرمیاں ابھی تک چلی جاتی تھیں۔ جوانی کے نشے میں انسان خود بخود اپنے نفس کی کیفیات میں ڈوب کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے لیکن جوانی کے گزر جانے کے بعد وہ کوشش کر کے یہ بے خبری پیدا کرتی چاہے تو اس کے دوسری طریقے میں یا تو وہ عیش و عشرت کے گرداب میں پھکر کھاتا ہے یا ترک و تجرد کے سراب میں بوٹا کرتا ہے۔ خود پرستی کی یہ دونوں راہیں لوگ اپنے اپنے مذاق کے مطابق اختیار کر رہے تھے۔ اکثر شعرا بات مناں میں ”بگیر و نبوش“ کا شور مچا رہے تھے اور بعض گوشہ خلوت میں ”بگدا رو بگذر“ کا نعرہ لگا رہے تھے۔

حالی کی طبیعت بالقوة الفردیت اور داخلیت سے کوسوں دور تھی، مگر زمانے کے طوفان اور جوانی کے ہیجان نے انہیں بھی اس حکم میں ڈال دیا۔ فنون شباب میں انسان کو پہلے پل خودی اپنی بھلک دکھا کر چھپ جایا کرتی ہے اور وہ اس کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے پھر جب زمانے کی ہوا بھی اسی رخ چل رہی ہو تو اس کی سرنگی کا کیا ٹھکانا! تاہم حالی کی صلاحیت طبع نے اور غالب و ثقیف کے فیض تربیت نے انہیں بہت کچھ سنبھالے رکھا۔ غالب سے انھوں نے صن جمیل، مذرت فکر، شوقی گفتار، سکھی اور شقیۃ سے بیابان کی سادگی اور سلاست کا ذوق حاصل کیا۔ اردو اور فارسی کے قدیم استادوں میں سے یوں تو سبھی کے کلام کا مطالعہ انھوں نے کیا ہو گا مگر تیر، درو اور سب سے زیادہ سہی کا اثر ان کے اشعار میں نظر آتا ہے۔ اسی کی برکت ہے کہ غزل کے اس رنگ میں بھی جو حالی نے محض عارضی محرکات کی بنا پر اختیار کیا تھا اور جس سے انہیں خلقی مناسبت نہیں تھی، ایسے ایسے شعر مل جاتے ہیں۔

فلق اور دل میں سوا ہو گیا دلا سا ٹھہرا بلا ہو گیا
دکھنا پڑے گا بہیں زخمِ دل اگر تیر اس کا خط ہو گیا

کوئی حرم نہیں ملتا جہاں میں مجھے کس نہ کچھ اپنی زباں میں
 قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
 نیا ہے لیجئے جب نام اس کا بہت وسعت ہو میری آساں میں

جودل پر گزرتی ہے کیا تجھ کو خبرِ ناصح کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

اس دور کا شاہکار غالب کا مرثیہ ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ اس کا مقابلہ حالی کی قدیم غزلوں سے کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ رسمی تانیہ بیانی اور سچی شاعری میں کیا فرق ہے۔ جب شاعر کے دل پر چوٹ لگتی ہے اور اسے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے میدان بھی وسیع ملتا ہے تو وہ کیا چیز کہہ جاتا ہے۔

لامہر کے طرز جدید کے شاعر کی نظمیں صاف کہہ رہی ہیں کہ حالی کی طبیعت پرانی شاعری کی کال کو ٹھری سے نکل کر کھلے میدانوں میں جولانی دکھانے کے لئے بے چین تھی۔ بس ایک ذرا سی جھڑکی ضرورت تھی دور نہ جو شخص آدھی عمر نزل گئی میں صرف کر چکا ہو وہ پہلی کوشش میں ”نشاط امید“ اور ”حب وطن“ جیسی نظمیں کہہ نہیں سکتا۔

سنئے اور لطف اٹھائیے :-

لے مری امید میری جاں نواز لے مری دل ہو میری کار ساز

کاٹنے والی غم ایام کی تھانے والی دلِ ناکام کی
 دل پہ پڑا آن کے جب کوئی دکھ تیرے دلا سے سے ملا ہم کو سکھ
 تو نے نہ چھوڑا کبھی غمت میں ساتھ تو نے اٹھایا نہ کبھی سر سے ہاتھ

تو سے ہے محتاج کا دل ہے ہر اس تجھ سے ہی بیا کو بھینے کی آس

خطرِ رنجور کا درماں ہے تو عاشقِ مجبور کا ایساں ہے تو

ہوتی ہے تو پشتِ پیشت کی جیب مشکلیں آساں نظر آتی ہیں سب

غرم کو جب دیتی ہے تو میلِ جت گنبدِ گردوں نظر آتا ہے پشت
تو نے دیا آکے ابھارا جہاں سمجھے کہ ٹھٹی میں ہے سارا جہاں

لے سپہر برس کے سیارو لے نضائے زمیں کے گلزارو
لے پھاڑوں کی دلفریبِ نضا لے لب جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
لے غنادل کے نغمہِ سحری لے شبِ مانتابِ ناروں بھری
لے نسیمِ ہزار کے جھو کو دہرِ تاپا اندار کے دھو کو
یوں تو ہر حال میں مہیں ہو عزیز تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

”حب وطن“ کے آخری حصے سے ظاہر ہوتا ہے کہ عالی کے دل میں دردملت کا جذبہ بیدار ہو چکا ہے۔ ان کا دل اپنے تمدن و معاشرت کی بربادی پر کھٹکتا ہے اور اسکی ترقی کی آرزو رکھتا ہے لیکن ابھی تک اس میں مصلحتہ جوش پیدا نہیں ہوا ہے اور جوش پیدا ہوتا تو کیونکر؟ ملک کی جو حالت وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے وہ اتنا سے زیادہ مایوس کن تھی۔ شہداء کے قہر و غضب کے بعد لوگوں کے دل پر خوف، ہیبت، مایوسی کا سکہ بٹھا ہوا تھا۔ اتنا بے زانہ اکثر نے آقاؤں کی ہواداری میں مصروف تھے۔ پرانے دغا دار پرانی خدمات کے صلے لے رہے تھے اور نئے خیر خواہ نئی خدمات انجام دینے کی فکریں کر رہے تھے۔ افراد کو چھوڑ کر سلطان عام طور پر سہمے ہوئے، مروٹے ہوئے اپنے گھروں میں بیٹھے تھے اور نئی حکومت، نئی تعلیم، نئی تہذیب سے کچھ واسطہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کا انجام کیا ہو گا۔

سے میں دلی آنے کے بعد حالی کے دل پر انتہائی مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ جوانی کی ندی چڑھ کر ازپکی تھی اور طبیعت سکون پر اگر گزری ہوئی زندگی کا جائزہ لے رہی تھی۔ لاہور کے قیام میں حالی کا مذاق شعر بدل چکا تھا۔ اب انھیں اپنی پھیلی شاعری کی نظر آتی تھی اور اتنی عمر کے اکارت جانے کا بے حد قلق تھا۔ پھر یہ مشکل تھی کہ نئی آرزو میں جوان کے دل میں ابھرنے کے لیے یحییٰ تعین مایوسی کے بوجھ سے ابھرنے نہیں پاتی تھیں بلکہ سچ پوچھے تو حالی کو ان کا پوری طرح احساس بھی نہ تھا۔

درد دل ہوئے بہت دندائم کہ کدالم ت

اس یاس و بے دلی سے حالی کو نجات دینے والا وہی شخص تھا جس نے اس نازک وقت میں تمام مسلمانوں کی دستگیری کی۔ سرسید احمد خاں کو اس تدبیر اور حکمت عملی کا سچا کھپا سرمایہ ملا تھا جس کی بدولت مسلمانوں نے سات آٹھ سو برس ہندوستان پر حکومت کی۔ انھوں نے دیکھا کہ سلطنت کے زوال کے بعد مسلمانوں کی زندگی کا اب کوئی مرکز باقی نہیں رہا ہے اور ان کا انتشار انھیں ہلاکت کی طرف لے جا رہا ہے۔ مصلحت شناسی کی نظر سے زمانے کے رنگ کو پہچان کر انھوں نے ایک طرف تو تمدن و معاشرت کے کچھ سے ہوئے اجزا کو ”قوم“ یا ”ملت“ کے شیرازہ میں باندھنے کی کوشش کی اور دوسری طرف حکومت و ملت سے، جہاں تک اس ذلت و افتادگی کی حالت میں ممکن تھا، عزت کے ساتھ مصالحت کرنے کا ڈول ڈالا جسے آج ان کے موافقین و مخالفین دونوں اپنی کم نظری سے ابدی وفاداری کا عہد سمجھتے ہیں۔ سرسید کو یقین تھا کہ مغربی علوم حاصل کرنا اور ایک حد تک مغربی تہذیب اختیار کرنا نہ صرف مسلمانوں کی ترقی کے بلکہ ان کی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ چنانچہ انھوں نے پہلے ایک علی انجمن کی، پھر ایک تعلیم گاہ اور ایک تعلیمی کانفرنس کی بنا ڈالی کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کریں۔

سرسید کی شخصیت اور ان کی تحریک کا حالی پر عجیب و غریب اثر پڑا۔ انھیں وہ رسوا مل گیا، وہ راہ عمل نظر آگئی، وہ مقصد حیات ہاتھ آگیا جسے ان کا دل ڈھونڈ رہا تھا۔ انھوں نے دل میں بٹھان لی کہ اپنی زندگی اور اپنی شاعری کو اس کام میں صرف کریں گے کہ مسلمانوں کے ادب و فنون کے مذاق کو سنواریں، ان کے دل میں جذبہ قومی کو بیدار کریں اور تعلیم و ترقی کا شوق پیدا کریں۔

۱۹۳۷ء میں سرسید کی فرمائش سے حالی نے سدرس مد و جزر اسلام لکھا جس میں ان کی نئی قوت اور نیا جوش پورے شباب پر نظر آتا ہے۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب شاعر اپنا دکھڑا رومنے کے بجائے ایک قوم کے عروج و زوال کی داستان سنانا ہے، خیال آرائی اور مبالغے کو ترک کر کے اصلیت کا نقشہ کھینچتا ہے، لفاظی کو چھوڑ کر سیدھی سادی زبان اختیار کرتا ہے، تو اس کے کلام میں اعجاز کا اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ سدرس ان نظموں میں ہے جو مد و قوموں کو جلا دیتی ہیں۔

سرسید کی بدولت شاعر کو قوم مل گئی اور قوم کو شاعر مل گیا۔ اب حالی کی زندگی قوم کی خدمت کے لئے وقف ہو گئی۔ چند سال تک وہ ملازمت کے سلسلے کو نبھاتے رہے۔ عرک اسکول دہلی سے بدل کر یحیٰں کالج لاہور میں طلبہ کے اتالیق مقرر ہوئے اور تھوڑے دن بعد اپنی جگہ پر واپس آ گئے۔ مگر اس عرصہ میں وہ برابر ایکوشیل کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے اور اپنی نظموں سے حایان تعلیم کے دلوں کو گرماتے رہے۔ ۱۹۳۷ء میں جب سر آسماں جاہ نے دولت اصفیہ کی طرف سے ان کا وظیفہ مقرر کیا تو فکر معاش سے مطمئن ہو کر وہ علمی اور ادبی مشاغل میں مصروف ہو گئے۔

حالی نے جو مقصد اپنی زندگی کے قرار دئے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ ملک کے ادبی مذاق کی اصلاح کریں۔ اس کے دو طریقے ہو سکتے تھے۔ تنقید کے صحیح اصول مقرر کرنا اور عمدہ نمونے پیش کرنا۔ حالی نے ان دونوں طریقوں سے کام لیا۔ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے اپنی قدیم و جدید غزلوں کا مجموعہ ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا جس میں شعر و شاعری کے اصولوں سے عکمانہ بحث کی گئی ہے۔ یہ مقدمہ ان کے حسن فن و وسعت نظر اور حدت خیال کا آئینہ ہے۔ جب کوئی غیر شاعر کی علمی تنقید پر غم آجاتا ہے تو غموں سے غمی بخوں میں ڈکراصل حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ مگر حالی خود شاعر ہیں اس لئے انھوں نے اصولی مسائل کے ساتھ ساتھ فن کی باتیں بھی کر دی ہیں۔ اردو میں حالی سے پہلے شعر کی تنقید کے معنی صرف یہ سمجھے جاتے تھے کہ لفظوں اور ترکیبوں کو اساتذہ کے کلام کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لیں حالی نے پہلے پہل یہ بحث بیھڑی کہ شاعری کی روح کیا ہے اور وہ شعر میں کیوں کر پیدا ہوتی ہے۔

نثر میں تنقید شعر کے علاوہ حالی نے سیرت نگاری کی "سنت" کو اختیار کیا۔ شاعرانہ میں انھوں نے "حیات سعدی"، "۱۹۱۷ء میں" "یادگار غالب" اور "۱۹۱۷ء میں سرسید کی سیرت" حیات جاوید کے نام سے شائع کی۔ یہ تینوں بزرگ وہ ہیں جنھوں نے مختلف جہتوں سے ان کی زندگی پر اثر ڈالا ہے۔ غالب ان کے استاد تھے سعدی جگت استاد ہیں مگر جس حد تک حالی نے ان سے کسب فیض کیا ہندوستان کے کسی شاعر نے نہ کیا ہوگا۔ ان کے کلام میں سعدی کا رنگ اتنا صاف بھلکتا تھا کہ لوگ انھیں "سعدی ہند" کہنے لگے۔ اور سرسید تو ان کی زندگی کے دوسرے دور میں ان کے مرشد ہی تھے۔ حالی کی احسان شناسی کا یہ بھی ایک ثبوت ہے۔ انھوں نے اپنے ادبی اور روحانی رہنماؤں کی سیرت لکھ کر ان کو حیات جاوید بخش دی۔

سیرت نگاری میں بھی حالی نے وہی مجددانہ شان دکھائی جو شعر اور تنقید شعریں دکھائی تھی۔ یہ تینوں کتابیں خصوصاً "حیات جاوید" محض واقعات کی بوٹ اور تعریفوں کا پشتارہ نہیں بلکہ جدید طرز کی سوانح عمری کا نمونہ ہیں جس میں انسان کی پوری زندگی پر اور اس کے عمل پر تبصرہ کیا جاتا ہے، اس کا تعلق اس زمانے سے دکھایا جاتا ہے جس میں وہ پیدا ہوا۔ باوجود اس کے کہ حالی ان تینوں بزرگوں سے جن کی سیرت انھوں نے لکھی خصوصاً سرسید سے انسانی عقیدت رکھتے تھے مگر نہ تو انھوں نے ان کی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر دکھایا ہے اور نہ جان بوجھ کر ان کی برائیوں کو چھپایا ہے۔

حالی کی نثر بھی اپنے رنگ میں ان کی نظم سے کم نہیں۔ اس میں بھی سچائی اور سادگی کی وہی شان پائی جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ سلاست اور روانی میں نثر بھی نظم کا مقابلہ نہیں کر سکتی خصوصاً وہ نثر جس میں علمی مضامین ادا کئے جائیں۔ پھر بھی ان کا اسلوب بیان اتنا صاف اور سلجھا ہوا ہے کہ مشکل سے مشکل مسائل کو پانی کر دیتے ہیں اور لطف یہ کہ علمی متانت و وقار کا واسن ہاتھ سے چھوٹے نہیں پاتا۔

ادب و شعر کی تہذیب تجدید کے علاوہ دوسرا بڑا مقصد حالی کے سامنے یہ تھا کہ مسلمانوں کے دل میں جذبہ ملی اور حمیت قومی پیدا کریں اور ان کے اس جوش سے تعلیم کی ترقی اور اخلاق و معاشرت کی اصلاح کا کام لیں۔ مدرس کے بعد انھوں نے "نقشبہ و انصاف" "حکمت الحق" "مناظرہ و اعطاء و شاعر" "چھوٹ اور

ایکے کا مناظرہ ”شکوہ ہند“ ”نگ خدمت“ کے ذریعے سے مسلمانوں کو ان کے اخلاقی عیوب پر غیبت لائی ان کے بزرگوں کے اوصاف یاد دلانے اور احتساب نفس اور تہذیب نفس کا سبق پڑھایا۔ ”بیوہ کی مناجات“ سے ایک شرمناک معاشرتی ظلم کی طرف متوجہ کیا اور ”ترکیب بند بریدرہ العلوم“ ”مسلمانوں کی تعلیم“ اور اس مہم کی متعدد خطوں سے سرسید کی تعلیمی تحریک کی اہمیت سمجھائی اور اس کی مدد پر آمادہ کیا۔

عام طور پر شائع، چلے وہ اپنے کلام میں مل کی کتنی ہی یقین کرتے ہوں خود عمل کے بیٹے ہوتے ہیں۔ مگر حالی انثناءوں میں سے نہیں تھے۔ انھوں نے جہاں تک ہو سکا سرسید کے کام میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ ان کے ساتھ ڈیویشن میں حیدر آباد گئے۔ اپنی ذاتی کوشش سے پانی پت اور کربال میں چندہ کر کے ایک مقول رقم ان کی نذر کی اور اپنے کنبے کے لڑکوں کو علی گڑھ میں داخل کرا دیا۔ اس کے علاوہ اپنے طور پر تعلیم کی ترویج میں دل و جان سے کوشش کرتے رہتے تھے۔ کوئن وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر انھوں نے پانی پت میں ایک اسکول قائم کرنے کی کوشش کی مگر کافی چندہ نہ ہو سکا جتنی رقم جمع ہوئی تھی اس سے ایک کتب خانے کی عمارت بنوا کر وکٹوریہ لائبریری قائم کر دی جو اب میونسپل کٹی کے انتظام میں ہے۔ آخر عمر میں حالی اسکول اور ایک لڑکیوں کا اسکول قائم کیا جس کی وجہ سے پانی پت اور آس پاس کے علاقے کے مسلمانوں میں تعلیم کا چرچا ہو گیا۔ ان تعلیمی خدمات کے اعتراف میں وہ سنہ ۱۸۹۷ء میں سلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کراچی کے صدر منتخب ہوئے جو خطبہ انھوں نے اس موقع پر پڑھا وہ کانفرنس کے نہایت مفید اور پر مغز خطبات میں سے ہے جن کی تعداد دو چار سے زیادہ نہ ہوگی۔

علی گڑھ کے ٹرسٹی کی حیثیت سے انھوں نے اس کے انتظامی امور میں بہت کچھ مدد دی اور جب کبھی کالج میں کوئی جھگڑا اٹھا انھوں نے نہایت آزادی کے ساتھ انصاف کی حمایت اور زنتی بند جماعت کی مہمبائی کی۔ سرسید کی محبت ان کے دل میں بسی ہوئی تھی مگر حق کی محبت اس سے بھی زیادہ تھی۔ اس لئے لیجنز متوفوں پر انھوں نے کلمہ کھلا سرسید کی مخالفت کی مثلاً ۱۸۹۷ء میں جب یورپین اسٹاف کالج کے معاملات پر حاوی ہو گیا تھا انھوں نے اس کا زور توڑنے میں سرسید کی مخالفت جماعت کا ساتھ دیا اسی طرح مسٹر مارکین اور مسٹر آرجو لڑے جو اختلافات ہوئے اس میں بھی وہ آزاد پارٹی کے ساتھ تھے۔

اب ذرا ایک نظر حالی کی ذاتی زندگی پر بھی ڈالئے۔ ایک سن رسیدہ عالم شائع، حق پرست امنگوں کا صاف دل، پاک باطن، حلیم، منکسر، خود دار، غیر متعصب، محبت کا پتلا، اخلاق کا مجسمہ، دوستوں کا دوست، عزیزوں کا کفیل، غیروں کا سہرو، پانی پت میں رہتا ہے۔ اس کا دل محبت سے معمور ہے، اس کی زندگی خدمت کے لئے وقف ہے کس کی محبت اور خدمت؟ علم و ادب کی، ملک و قوم کی، خاندان کی، ہمایوں کی۔ ادھر تصنیف و تالیف کا شغل جاری ہے، ادھر لوگ اپنی فطرتیں اور کٹنا میں اصلاح کے لئے بھیجتے ہیں، علمی کاموں میں مشورہ طلب کرتے ہیں، ادبی مسائل کا حل چاہتے ہیں۔ شیخ سب کی فرمائشیں پوری کرتا ہے، سب کو جواب دیتا ہے اور اس عجز و انکسار کے ساتھ جیسے ان کے احسان کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔ کوئی تعریف کرے تو شرمندہ ہوتا ہے، بجا اعتراض ہو تسلیم کر لیتا ہے، بجا اغراض ہو چپ ہو رہتا ہے۔ دشمن پھینکیں کہتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں، یہ چشم پوشی سے کام لیتا ہے۔ دوستوں میں سے کوئی جواب دینا چاہے تو اسے منع کر دیتا ہے۔ بعض حمد کے بادل برستے ہیں اور برس کر کھل جاتے ہیں، علم کا دریاب تپتا چلا جاتا ہے۔

کتابت بڑا ہے۔ اپنی اولاد، بھائی بیٹوں کی اولاد، اولاد کی اولاد۔ مگر یہ مرد خدا انسانا بڑا دل رکھتا ہے جس میں ایک ایک کی گنجائش ہے۔ قریب کا عزیز ہو یا دور کا سب کے ساتھ ایک شی شہقت، ایک سا سلوک۔ محبت جب نامحدود ہو تو قریب اور بعید کا فرق باطل ہو جاتا ہے۔ اور اس شخص کی محبت بھی محض وقت طلب نہیں علی محبت ہے۔ وہ سب کے دکھ سکھ میں شریک ہے، مشکلوں میں ہدایت کرتا ہے، ضرورت کے وقت تنگی کرتا ہے، بیماری میں تیار دار ہے، مصیبت میں غمخوار ہے، خاندان بھر کے بچوں کی تعلیم کا کفیل اور تربیت کا نگران ہے اور خاندان کے باہر بھی ہمایوں کے ہونہار لڑکوں کو اپنی قلیل آمدنی میں سے وظیفہ دے کر درس میں پڑھنے بھجواتا ہے، جو پڑھ چکے ہیں ان کی معاش کی فکر کرتا ہے، جو برسر کار ہیں ان کی ترقی میں کوشاں ہیں۔ وہ سچا دین دار ہے، مومن ہے، عابد ہے، زاہد ہے، احکام ظاہر کا پابند ہے، طریقی باطن کا سالک ہے مگر اسے نہ دین کا گھمٹ ہے، نہ ایمان کا، نہ عبادت کا، نہ زہد کا، نہ شریعت کا، نہ طریقت کا۔ وہ اپنی نجات کا ذیلہ و دوچیزوں کو سمجھتا ہے جو اصل میں ایک ہیں۔ محبت اور خدمت۔

حالی کی سیرت کی یہ ایک دھندلی سی تصویر ہے۔ آپ اسے صاف روشنی میں دیکھنا چاہیں تو ان کے

کلام کا مطالعہ کیجئے۔ ہم حالی کے دوسرے دور کے کلام کا تقوڑا سامنہ پیش کر کے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔
طویل بہت ہو چکا ہے۔ تنقید اور تشریح کی گنجائش نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ حالی کا کلام آپ ہی اپنی
تنقید اور آپ ہی اپنی شرح ہے۔

کمال ہے جوازل سے وہ ہے کمال تیرا	باتی ہے جوابد تک وہ ہے جلال تیرا
ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ	ہر دل پہ چھا رہا ہے رعب جال تیرا
کادش میں ہے الٰہی دگدگامیں ہے طبعی	جو حل ہوا نہ ہو گا وہ ہے سوال تیرا
چھوٹے ہوئے ہیں گوجی بردل بچے ہوئے ہیں	لٹنے سے بھی سوا ہے پھٹنا محال تیرا

تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اپناٹ	دل کو یہ کیسی لگا دی تو نے چاٹ
لمتیں رستوں کے ہیں سب ہر پیر	سب جہازوں کا ہے نگر ایک گھاٹ

شکوہ کرنے کی خونہ بھی اپنی	پر طبعیت ہی کچھ بھرائی آج
چور ہے دل میں کچھ نہ کچھ یارو	نیمند پھرات بھر نہ آئی آج

تذکرہ دلی مرحوم کالے دوست نہ پھیر	نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
ڈھونڈتھا ہے دل شوریدہ بدلنے مہرب	درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحتیں اگلی مصور ہیں یا دائیں گی	کوئی دلچسپ موقع نہ دکھانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سیں بہت اسوہیل	دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں جانا ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹنے کے نشان بھی اب تو	لے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر موج ہائل ہے اور ہونا ساز

یا تھیرے ہوا کے لے اُبھرے یا گیا کشکش میں ڈوب جہاز

رہا ہوں زندہ بھی لے شیخ پارسا بھی میں مری نگاہ میں ہے رند پارسا ایک ایک
ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب کرنے دفتر کو ورق جب اس کا اڑے گئی ہوا ایک ایک
ہمارے بھی نہ میل تری بھائی آگ جگر کے پار ہے اب تک تری نوا ایک ایک

آگے بڑھے نہ قصہ عشق تباں سے ہم سب کچھ کہا مگر نہ کھلے راز داں سے ہم
اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو کچھ پاگئے ہیں آپ کے طرزیوں سے ہم

یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگزیناں ہیں میندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
خاور سے باختر تک جن کے نشان تھے برپا کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں
کھینٹوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و سہریلوں کے گرتے ہیں ہوں تو جانیں گریہ نہیں تو بابا بادہ سب کہانیاں ہیں

خواب راحت میں وہ لذت تیرے ایڑی پر جرجرائی میں مزد دیتی تھیں شب بیداریاں

اک غم چاہے کہ گوارا ہو مینش عشق رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں
ہم جس پر مر رہے ہیں وہ بات ہی کچھ اور تجھ سے جہاں میں لاکھ سی نو لکھ کہاں

بیقرار سی تھی سب امید ملاقات کے ساتھ اب وہ اگلی سی درازی شب بھر انیٹیر

جی ڈھونڈتا ہے بزم طرب میں اغنیہ گر وہ گئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں

درغیض حق بند جب تھا نہ اب کچھ قیدیوں کی بھولی میں اب بھی ہر سب کچھ
ہر اک کو نہیں ملتی یاں بھیک و اعطا بہت حاجت لیتے ہیں میتے ہیں تب کچھ
یہ طبل تہی میں جو بنگارتے ہیں جنھیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ

دنا اغیار کی اغیار سے سن مری الفت درو دیوار سے پوچھ
تصور میں کیا کرتے ہیں جو ہم وہ تصویر خیال یا ر سے پوچھ

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چہن کس کا ہر کل تبادے گی خزاں یہ کہ دطن کس کا ہر

یا دایام کہ بے رنگ تھی تصویر جہاں دست مشاطہ نہ تھا محم زلف دوران
گل خود رو سے بساتھا چہن کون و کہاں چار سو حسن خداداد کا کہ تھارداں

وضع عالم میں نہ آیا تھا تغیر اب تک
خط قدرت کی وہی شان تھی اور لوکلک
طفل معصوم کے مانند تھا یہ عالم سپیر تھے ہم اک صفت بے چون و چرا کی تصویر
ملک فطرت میں نہ تھی سلطنت نفس شریر طبع نے ملکوت روح نہ کی تھی تسخیر
خواب غفلت کی گھٹا دل پہ نہ چھائی تھی بہت
دن چھپا تھا ابھی اور رات نہ آئی تھی بہت

اے راست گوئی کیا قرہ ہے تو اے حق کی تلخی کیا زہر ہے تو

ہے ناگواری چپان تیری الحق مدّ ہے شان تیری
یاروں کو کرتی اغیار تو ہے جلو آتی گھر گھر تلوار تو ہے
خونخوار شکر میں ساتھ تیرے رنگیں لمبوں میں ہاتھ تیرے
تیرے جلو میں رسوائیاں ہیں سنگت میں تیری تنہائیاں ہیں
ہوتی ہے جس جا تو جلوہ گستر دفتر بہت سے ہوتے ہیں اُتر
پڑاتی ہے ہلچل ہر محلے میں آتی ہے دنیا اک زلزلے میں

اے راست گوئی اے ابرجت ہے اس چمن میں تیری ہی برکت
گر تو نہ ہوتی یاں سایہ انگن برباد و کب کا ہوتا یہ گلشن
عالم ہے سرسبز تیرے قدم سے آباد یہ گھر ہے تیرے دم سے
تو بے کسوں کی یاد رہی ہے تو گم رہوں کی زبیر رہی ہے
جن بستیوں میں تو چھپائی کھیتی انھیں کی یاں لہلہائی
مشرق میں جب تھی تیری حکومت چھائی ہوئی تھی مغرب میں ظلمت
جب دور تیرا مغرب میں آیا مغرب کو تو نے مشرق بسا یا

وہ مسلمانوں کی ہر بازی میں محبت کیا ہوئی وہ مجازی غیرت اور کی محبت کیا ہوئی
ہم مسلمانوں سے ہے اے مہذنگ اسلام کو نقائب خیر الامم جس کا وہ امت کیا ہوئی
جی کسی کی عزت افزائی سے خوش نہ بنائیں دل گواہی جس پہ دیتا تھا وہ عزت کیا ہوئی
دین و دولت علم و دانش ہم میں کچھ باتی نہیر حق نے پوری کی تھی جو ہم پر نعمت کیا ہوئی
ملک و مال و سلطنت اک آنی جانی چیز تھی جو ہمیشہ رہنے والی تھی وہ دولت کیا ہوئی

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا
تاکہ رہ گیر اور پردہ سی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں
یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور اس لمبے
مگر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھئے
ایک بڑھیا نے سر رہ لاکے روشن کر دیا
راہ سے آساں گزر جائے ہر اک چھوٹا بڑا
روشنی محلوں کے اندر رہی رہی جن کی سدا
ہے اندھیرا گھپ درو دیوار پر چھایا مبرا

سرخِ روافاق میں وہ رہنا مینا رہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بڑے پاؤں

لے مرے زور اور قدرت والے
میں لوٹ پی تیری دکھباری
موت کی خواہاں جان کی دشمن
اپنے پرانے کی دھتکار
سہمہ کے بہت آزار علی ہوں
دل پہ میرے داغ ہیں جتنے
بیابان کے دم پائی تھی نہ لینے
حکمت اور حکومت والے
دردِ ازلے کی تیرے بھکاری
جان پہ اپنی آپ اجیرن
میکے اور سہراں پہ بھاری
دنیا سے بیزار علی ہوں
منہ میں بول نہیں ہیں اتنے
لینے کے یاں پڑ گئے دینے

سیلانی جب باغ میں آئے
پھول کھلے جس وقت چین میں
پیت نہ تھی جب پایا پستم
پھول ابھی تھے کھلنے نہ پائے
جاسوئے سیلانی بن میں
جب موئی پیت گنایا پستم

آنی جانی چیسہ ہیں خوشیاں
منگنی بیابان اور نصت
چلتی پھرتی چھاؤں ہیں اراں
میل ملاپ سہاگ اور نگت

ہیں دودن کے سب بلاؤے آگے چل کر ہیں پھپتاوے
ریت کی سی دیوار ہے دنیا اوچھے کا سا پیار ہے دنیا

مولانا حالی کے آبا و اجداد

میں نے عرصہ دراز کی تلاش و تحقیق اور بہت کچھ محنت و کوشش کے بعد شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی کی ایک مبسوط و واضح عربی تعلیمی کی ہے جو ”تذکرہ حالی“ کے نام سے انشراح و تقریب شائع ہوگی۔ اپنے محترم دوست محمد ماقبل صاحب ایم۔ اے نائب مدیر جامعہ کے ارشاد کی تعمیل میں اس تذکرہ کے اولین ادب میں قارئین جامعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ حالی کے تہذیب و ادب میں کافی موجود ہیں انہیں پس کی کے ساتھ مطالعہ فرمائیں گے۔

(محمد اسماعیل)

باب اوّل

مولانا کا نام و نسب اور خاندان

آج اس بات کو پورے سو برس گزر چکے ہیں جبکہ شمالی ہند کے مشہور تاریخی شہر پانی پت میں مولانا کا شجرہ نسب

والدہ اور والدہ کی طرف سے

نظم ارو کا بہترین تقاضا جدید اور نیچرل شاعری کا بانی اور قومی، اصلاحی اور اخلاقی

تفصیلات کا زبردست مجدد و پیدا ہوا۔ والدین نے الطاف حسین نام رکھا۔ یہی وہ بچہ ہے جو بڑا ہو کر شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کے نام سے دنیا میں مشہور ہوا۔

مولانا والدہ کی طرف سے سید ہیں اور والدہ کی جانب سے انصاریوں کی اس شاخ سے تعلق رکھتے ہیں جو مشہور و جلیل القدر صحابی حضرت ابوالدب انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہیں۔ مولانا کے دونوں شجرے یہاں درج کیے جاتے ہیں جو نہایت تلاش سے فراہم کیے گئے ہیں۔

والدہ کی طرف سے شجرہ نسب

مولانا خواجہ الطاف حسین حالی بن خواجہ ایزد بخش بن خواجہ بوعلی بخش بن خواجہ محمد بخش بن خواجہ غلام محمد بن خواجہ عبد السبحان بن خواجہ عبد الکریم بن خواجہ مسلم بن خواجہ زین الدین احمد بن خواجہ عبد الکاظمی

بن خواجہ ضیاء الدین بن خواجہ ابوراشد بن خواجہ ابو حامد بن خواجہ ابونزاع بن خواجہ نصیر الدین محمود بن قاضی خواجہ
ملک علی بن خواجہ میرک علی شاہ بن خواجہ سود بن خواجہ عمر بن خواجہ ابراہیم بن خواجہ عثمان بن خواجہ ابوطاہر بن خواجہ
غفر بن خواجہ انفع بن شیخ مانع بن خواجہ ملک شرف الدین امیر محمود شاہ ابن الملکب بہ آق خواجہ بن خواجہ عمر
الملقب برامیر شیخ ابوالفتح بن خواجہ فضل اللہ بن خواجہ عبداللہ بن اسعد انصاری بن شیخ محمد (ثانی) بن شیخ نصیر
بن شیخ محمد (اول) بن شیخ الاسلام ابوالحسن خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات بن ابوالقصور محمد بن
ابی سعید انصاری بن محمد انصاری بن احمد انصاری بن علی انصاری بن جعفر انصاری بن ابو منصورت الانصاری
بن حضرت خالد ابویوب انصاری خروجی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

شجرہ نسب والدہ کی

طرت سے

مولانا خواجہ الطاف حسین حالی بن امّہ الرسول (زوجہ خواجہ ایردغش بنت سید محمد شفیع بن
سید محمد امین بن سید عبدالرحمن بن سید عبدالرحیم بن سید ابوالقاسم بن سید علی بن سید منعمو
بن سید محمد بن سید احمد بن سید نعمت اللہ بن سید اخوند بن سید حسام الدین بن سید شمس الدین بن سید مظہر بن سید
مقتضیٰ بن سید نور الدین بن سید منیت بن سید محمد بن سید موسیٰ بن سید ابی تیمس بن سید یحییٰ بن سید ابراہیم بن سید
موسیٰ کمال بن سید ابوجعفر بن حضرت سید اسماعیل شہید بن حضرت سید احمد بن حضرت امام ابوالقاسم اسماعیل
شہد ابوری بن حضرت سید محمد ناطق بن حضرت اسماعیل ناطق بن حضرت امام جعفر صادق بن حضرت امام ابوجعفر
محمد باقر بن حضرت امام علی زین العابدین بن حضرت سیدنا امام حسین بن حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ
عنہا بنت عائشہ الانبیاء افضل الرسل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

باب دوم

آبا و اجداد

حضرت ابویوب انصاری، حضرت ابو منصورت الانصاری، شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری
ملک محمود شاہ ابنجو، خواجہ میرک علی شاہ، قاضی خواجہ ملک علی انصاری۔
جیسا کہ بیان ہو چکا ہے مولانا، حضرت خواجہ ابویوب انصاری کی اولاد سے ہیں۔ آپ کے آبا و اجداد

میں سے اکثر بزرگ نہایت نامور اور مشہور ہوئے ہیں۔ چند کا نہایت ہی مختصر تذکرہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

حضرت ابو ایوب انصاری | آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں۔ جب حضور نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت فرمائی ہے تو یثرب پہنچ کر سب سے اول جس خوش قسمت انسان کو آنحضرت کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا وہ حضرت ابو ایوب ہی تھے۔ جب تک مسجد نبوی اور اہل بیت اطہار کے لئے حجرے نہ بن لیے آنحضرتؐ آپ ہی کے مکان میں قیام پذیر رہے۔ دراصل یہ کوئی تھوڑا شرف نہیں ہے جو تمام انصار کے مقابل میں حضرت ابو ایوب کو حاصل ہوا۔ تمام صحابہ اسی شرف کی وجہ سے آپ کی نہایت تعظیم کرتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے زائد خلافت میں آپ کا وظیفہ پانچ ہزار سے بڑھا کر میں ہزار کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں چالیس غلام ان کا کاروبار کرنے کے لئے ان کو مرحمت فرمائے تھے۔

۲۲ھ میں آپ ایک لشکر میں شامل ہو کر شام میں جہاد کے لئے گئے۔ لشکر کا امیر یزید بن حضرت معاویہؓ تھا۔ مگر کچھ رستے ہی میں تھے کہ آپ ایسے شدید بیمار ہو گئے کہ زندگی کی آس نہ رہی۔ یزید عیادت کے لئے آیا تو آپ نے اسے وصیت کی کہ اگر میں مر جاؤں تو میرے جنازے کو لے کر مع فوج کے روانہ ہونا اور کفار کی سرزمین میں جہاں تک جانا تمہارے لئے ممکن ہو سکے چلے جانا۔ جب دیکھو کہ آگے بڑھنا بالکل نامکن ہے تو وہیں مجھے دفن کر دینا اور لوٹ آنا۔ اس بوڑھے صحابی رسولؐ کی ہمت اور لوالہ المعزی اور ملبند خیالی پر غور کرو کہ کتنی عجیب و غریب ہے۔ اس وصیت سے ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ اس جوش میں فوج برابر لگے برکتی جائے گی اور دشمن کا ملک فتح ہوتا جائے گا۔ کتنا پاک جذبہ اور کتنا بے درائہ خیال تھا۔ سچ ہے ۵

حق کو ہوتا ہے جھیں دنیا میں کرتا سر ملبند

خصلتیں یہ برگزیدہ ان کو ہوتی ہیں عطا

یزید نے اس مقدس وصیت کی پوری پوری تعمیل کی۔ جب اس جلیل القدر صحابی کا انتقال ہو گیا تو یزید نے فوج کو تیار کر کے حکم دیا۔ جنازہ آگے آگے اور فوج پیچھے پیچھے لڑتی بھڑتی روانہ ہوئی۔ یہاں تک کہ بالکل قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے جنازہ پہنچ گیا۔ آگے راستہ کہاں تھا۔ پس یزید نے جنازہ وہیں دفن کر دیا اور شاہ قسطنطنیہ سے کہلا بھیجا کہ ہم نے اپنے ایک محترم بزرگ کو یہاں دفن کیا ہے اگر تم نے دشمنی میں اگر ان کے مزار کی بے حرمتی کا

ارادہ کیا تو یاد رکھا کہ شام میں عیسائیوں کے جس قدر گرجا ہیں فوراً سب کے سب زمین کے برابر کروادوں گا۔
 یہی خوف تھا جس کے باعث حضرت ابو الیوبؓ کا مزار باوجود غیر سلطنت اور دشمن کے ملک میں ہونے
 کے ہمیشہ محفوظ رہا۔ جب ۱۲۵۳ء میں سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو اس نے آپ کے مزار کو پختہ اور
 عظیم الشان بنوایا اور وہ آج تک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ ترکی کے تمام سلاطین عثمانیہ کی رسم تاج پوشی
 آپ ہی کے پرانوار مزار پر عمل میں آتی رہی ہے۔

حضرت ابو منصور
 الانصاری

یہ حضرت ابو الیوبؓ کے لڑکے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت
 میں ایک ہم حضرت احف بن قیس بن مصعبی کی زیر سر دگی خراسان بھی تھی۔ حضرت
 ابو منصور اسی فوج میں شامل ہو کر مدینہ سے گئے تھے۔ خراسان پہنچ کر آپ نے بمقام ہرات مستقل سکونت اختیار
 کر لی اور پھر واپس مدینہ نہ آئے۔ آپ نے اپنی شادی بھی ہرات میں کی تھی اور غالباً یہی تعلق وہاں مستقل
 قیام کا باعث ہوا۔

شیخ الاسلام حضرت علامہ
 عبدالانصاری

حضرت ابو الیوبؓ کی اولاد میں یہ بزرگ نہایت زبردست عالم اور بے عدیل فاضل تھے
 میں تمام متقدمین ان کی بزرگی، علم، زہد و تقویٰ اور پاکیزگی و پرہیزگاری کے قائل
 ہیں۔ فن حدیث کے بہت بڑے امام اور صوفی کامل تھے۔ ان کے فضائل و مناقب سے کتب تصوف و سیر بھری
 پڑی ہیں۔ بہت سی کتب کے مصنف، بڑے ادیب اور اعلیٰ درجے کے خطیب تھے۔ ۷۰ سال کی عمر میں
 وریح الاول ۸۴۵ھ کو ہرات میں وفات پائی، علمائے فرائی محل لکھنؤ آپ کی اولاد سے ہیں۔

ملک شرف الدین محمود

خواجہ ملک شرف الدین امیر محمود شاہ انجو الملقب بہ آق خواجه غزنوی دور میں فارس و
 کرمان اور عراق عجم کا فرماں روا تھا۔ سلطان محمود بن سلطان محمود غزنوی کے ہاتھ سے شکست کھا کر ملک چھوڑنے پر
 مجبور ہوا۔ انجو فارسی میں امیر سامان کو کہتے ہیں اور ترکی میں موتیوں کو۔

میرک سلی شاہ

ہرات کا فرماں روا اور نہایت دلیر شجاع اور عقلمند تھا، علم دوست اور علما کا قدر واد تھا۔
 ۶۷۷ھ میں انتقال کیا۔

خواجہ ملک علی

نہ معلوم کیا وجوہات ہوئیں کہ اپنے باپ میرک سلی شاہ فرماں روا ہرات کے انتقال کے

بعد خواجہ ملک علی ہرات چھوڑ کر ہیشیہ کے لئے ہندوستان چلے گئے۔ مولانا عالی کے آبا و اجداد میں یہ سب سے پہلے شخص ہیں جو ہندوستان گئے ہیں۔ چنانچہ مولانا ان کے متعلق ایک جگہ فرماتے ہیں:-

”ساتویں صدی ہجری اور تیرہویں صدی عیسوی میں جبکہ غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر شکن تھا‘ شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات‘ کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو ظہورِ تعارف میں اپنے عام معاصرین سے ممتاز تھے ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے چونکہ غیاث الدین اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا سلطان محمد علماء و شعراء اور دیگر اہل کمال کا حد سے زیادہ قدرداں تھا اس لئے اکثر اہل علم اور خاندانی لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے۔ اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفرِ ہندوستان پر آمادہ کیا تھا۔ چنانچہ سلطان غیاث الدین نے چند عمدہ اور سیر حاصل دیات پر گنہ پانی پت میں اور مستندہ اراضی سوا دقصبہ پانی پت میں بطور مدد و معاش اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے ان کو عنایت کی۔ اور منصب قضاء و صدارت و تنفیصِ نرخ بازار اور تولیت مزارات اللہ جو سوا دقصبہ پانی پت میں واقع ہیں اور خطابتِ عیدین ان کے متعلق کر دی۔ پانی پت میں جواب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انھی بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے۔“

خواجہ ملک علی انصاری رحمۃ اللہ علیہ مطابق ۱۲۶۶ھ میں مع اپنے دو بیٹوں خواجہ محمد سمود اور خواجہ محمد نصیر الدین کے پانی پت میں وارد ہوئے تھے۔ اُس وقت پانی پت علماء اور فضلا کا مرکز بنا ہوا تھا اور علم و تصوف کے دریا بہاں لہریں مار رہے تھے۔ خواجہ ملک علی نے جو یہ علمی معتبتیں اور مذہبی چرچے دیکھے تو یہیں رہ پڑے اور ایسے رہے کہ آپ کی اولاد آج تک یہاں آباد ہے اور بڑے بڑے معزز اور نامور بزرگ ان میں ہو چکے ہیں۔

مولانا حالی کی ایک غیر مطبوعہ تحریر

شمس العلماء مولانا حالی کے پانی پت کے استادوں میں سے ایک بزرگ مولوی خواجہ ابراہیم حسین انصاری بھی تھے جن کا تذکرہ حضرت شمس العلماء نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں کیا ہے۔ مولوی خواجہ ابراہیم حسین صاحب کا جب ۱۲۹۱ھ میں پانی پت میں انتقال ہوا تو ان کی قبر کا کتبہ لکھنے کے لئے لایق اور قابل شاگرد سے زیادہ اور کون شخص موزوں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مولانا نے اپنے واجب العظیم استاد کی قبر کے کتبے کی جو عبارت لکھی وہ میں آج ۴۴ برس کے بعد بذکرہ شائع کر رہا ہوں۔ اس سے وہاں آج پہلی مرتبہ مولانا کی ایک غیر مطبوعہ تحریر پبلک میں آ رہی ہے وہاں مولانا کے ایک ایسے استاد کے حالات زندگی پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے جن کے حالات اس وقت تک نامعلوم پر معلوم نہیں تھے۔ مولوی خواجہ ابراہیم صاحب کی تبرع گاہ پانی پت کے بالکل سامنے بجانب شمال واقع ہے اور تقریباً مندرجہ ذیل عبارت کا کتبہ لگا ہوا ہے۔ مولوی ابراہیم حسین صاحب کے نزدیک مولوی جناب مولوی محمد علی حیدر صاحب نے میرے دریافت کرنے پر فرمایا کہ یہ عبارت مولانا حالی نے لکھی تھی۔ اس کے علاوہ یہ تحریر مولانا کے اپنے ہاتھ کی تحریر کو ہیں نے خود ان کے مسودات میں دیکھی ہے۔ (محمد اسماعیل پانی پتی)

مفت خواجہ ابراہیم حسین انصاری

ولادت ایشان در ماہِ رجب ۱۲۳۵ھ در پانی پت واقع شدہ۔ بعد از تعلیم ضروریات دین و آغاز شباب برائے تکمیل علم ترک وطن اختیار کردند و از مولانا فضل حق خیر آبادی درسارنپور و از مولانا واجد علی در کھنڈ معلوم غفیلہ نمودند۔ باز از مید میرن صاحب تقلید کتب و نیاات از فقہ و لغت و کلام پر و افتد و ہفت سالہ در کھنڈ اقامت داشتہ سند اجناس و امانت ندہب آٹا عنقریب از جناب مجتہد العصر سید محمد صاحب لکھنوی غفرلہ حاصل کردہ۔ پانی پت مراجعت فرمودند و پنجاہ سال در درس و تدریس و وعظ و تہذیر مرجع انام و متبیل خاص و عام ماندہ۔ چار و ہم رجب ۱۳۲۵ھ داعی اصل را البیک اباحت گفتند۔ انانہ و انالہ را بحون۔

فلسفہ ترقی

غل ہے کیا نوع بشر میں کچھ تمھیں بھی ہو خبر
ہو رہی ہے جس سے شان کبریا فی جلوہ گر
طاہر و ہم و تصور کے جہاں جلتے ہیں پر
ابر و برق و باد سے تاج و تہ و دست و در
مے رہے ہیں اس خلافت پر گواہی بخبر
ہونگے تقویم پارینہ وہ سب علم و ہنر
بڑھ رہا ہے و مہم یوں آج کل علم بشر
شام کی ایجاد ہو جاتی ہے باسی تا سحر
کوڑیوں کے مول بکتے پھرتے ہیں وہ دہر
عصہ آفاق میں ہوگی قیامت جلوہ گر
آ رہی ہے روشنی مغرب سے اک لٹکتی نظر
اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و بر
علم و حکمت کی پرانی بتیاں کرتی کھنڈر

ہو شیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی

غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

جو میں ناقابل اب ان کا کھٹنے والا ہر ہم
کیسی کے حق میں امت ہو کسی کے حق میں ہم
کرو یا زیر و زبر اس نے جہاں رکھا قدم

اے عزیزو! تم بھی ہو آخر تہی نوع بشر
کر رہا ہے خاک کا تیلہ وہ جو ہر آشکار
رفتہ رفتہ یہ غبارِ ناتواں پہنچا ہے داں
اس نے ان کمزور ہاتھوں سے سخر کر لیا
حق نے آدم کو خلافت اپنی جو کی تھی عطا
نصا ارسطو اور فلاطوں کو بہت کچھ جن پہ ناز
کل کی تحقیقات نظروں سے اتر جاتی ہر آج
قوت ایجاد نے اب یاں ملک کیڑا زور
ساز و سامان جو نہ تھے کل بادشاہوں کو نصیب
کتے ہیں مغرب جب ہو گا برا آمد آفتاب
دوستو! شاید وہ نازک وقت آئینہ قریب
رہو ترقی کی جلی آتی ہے موجیں مارتی
دشہ کاری کو شاتی، صنقوں کو روندتی

ہند میں بھی یارو! آہنچا ہے اس کو کا قدم
ہے ترقی پر تزل بھی ہو اس کے ساتھ ساتھ
پست کو بالا یہ کردیتی ہے اور بالا کو پست

گل کھلایا اس نے جو اٹھلے شرق میں ابھی
چین جو دست میں کم اکبہ اعظم سے نہ تھا
دکھینا پیچھے نہ ہم چشموں سے رہ جانا کہیں
جانتے ہوئے عزیز واپس نہزل چیز کیا؟
گو کہ ہے افراد کے حق میں یہ صلت کی کیا
تن پہ تھا فاروقی اعظم کے پٹا کرتا، مگر
بیتے ہیں وہ دنیا میں کیڑے کوڑوں کی طرح
جس طرح موری کا کیڑا خوش ہونے کا حال میر
پر زمانہ کہہ رہا ہے یہ بہ آواز بلند
اس کے نکلنے وقت باتوں میں لڑتے ہیں نلم
اک جزیرہ کی لپٹ نے کر دیا اس کو ہسم
حق میں ہمایہ کے ہمایہ کا بڑھتا ہے ستم
اس پہ کر لینا فاعتل گیا جو بیش و کم
حق میں لیکن قوم کے یار وہی نھلتے ہسم
قوم کی خاطر بھری نیت نہ لے کر ملک جم
جن کو بڑھنے کی تن اور نہ کچھ گھٹنے کا غم
گڈے جو حالت اسی میں بس گنہ گار ہیں ہم
یا قدم آگے بڑھاؤ ورنہ لوراہ عدم

بے ترقی ملک میں جینا ہے دشوار آجکل

دشمنوں کی موت ہے شائستہ قوموں کا عمل

ہونہ ہمدردی کا عنصر قوم میں یار و جاں
راس بیڑے کو ترقی کے نہیں کوئی ہوا
قوم تھی یونان کی دنیا میں اک معدود قوم
ایک کو کچھ ایک کی پروا نہ ہو جب قوم میں
قوم کس گنتی میں ہو وہ دل نہ ہوں جس کے ٹے
مکڑے ٹکڑے ہوئے ہیں جن کے دل وہ قوم کیا؟
یاد رکھو ٹیگٹی جس ملک یا ملت میں بھوٹ
غزنوی، غوری، تغل سادات، لودھی اور غلام
دن بڑے جب گئے اور یا ہم لگے سر بھوڑنے
دین کہتے ہیں جے وہ خیر خواہی کا ہر نام
واں ترقی کے لئے سب کوششیں ہیں انکاں
جوش ہمدردی سے ہوتا ہو جہاز اس کا رواں
ہو گئی حب وطن سے فخر اقوام جہاں
ہے حماقت قوم کی کثرت پہ ہونا شادماں
گو کہ وہ کثرت سے اپنی گھیرے سارا جہاں
ہے وہ اک قتل لموروتا ہے جس پر آسماں
ہیں وہ اس سماں سرزمین کی نئی کئی سیماں
رہ گئے نوبت بہ نوبت ہند پر جو حکمران
صفحہ رستی سے ان کا مٹ گیا نام و نشان
ہے مسلمانو! یہ ارشاد رسول انس و جاں

ہیں نمازیں اور روزے اور حج بے کار سب
جس کا تم بھرتے ہو کلمہ جس پہ ٹپختے ہو درود
بیعتی امت کی کو دل کو رہی اس کے لگی
بھائی بھائی ہو گئے ہو دین کی برکت سے تم
کھول کر دیکھو کتاب اللہ کی کتنی ہے کیا؟
سوزامت کی نہ بچکاری ہو گروں میں نہاں
نام پر جس کے عزیزو تم نذا کرتے ہو جاں
وقت آخر امت امت اس کے تھا درو باں
ہو غضب گر بھائیوں پر ہوں نہ بھائی مہرباں
”کلمہ پڑھ لینے سے کچھ حاصل نہیں بے امتہاں

دین کا دعویٰ اور امت کی خبر لیتے نہیں

چاہتے ہو تم سند اور امتہاں دیتے نہیں

ان سے کدو ہے مسلمان کا جن کو آدھا
وہ بھی خدمت یہی منصب ہے جس کے واسطے
قوم کی خدمت میں کر دیں اپنی جب عمر تمام
وہ رسول ہاشمیؐ وہ رحمتہ اللعالمینؐ
جانتے ہو قوم سے تھا اپنی کیا اس کا سلوک
کوئی تکلیف تھی جو قوم نے اس کو نہ دی
جب اُحد میں ہو گیا دندانِ پاک اس کا شہید
”کہ ہدایت قوم کو یارب! کہ میں معذور یہ“
قوم کے حملے رہے جب تک کہ اس کی ذات پر
پر لگی جب قوم سب مل کر مٹانے نام حق
غیرت حق نے نہ دی پھر ملت صبر مشکب
شکر حق سے مگر جب ہو گئی منسوب قوم
نہی ہی وہ قوم جس کے حق میں فرماتے تھے آپ
تم ہی وہ قوم تھا جس کے لئے ارشاد یہ

قوم کی خدمت میں پوشیدہ ہی بھید اسلام کا
آئے ہیں دنیا میں سب نوبت بنو بت انبیاء
تب فرائض سے نوبت کے ہوئے عہدہ برآ
پیر دی کا جس کی دم بھرتے ہو تم جمع و سا
اس طرف سے تھی جہاں اور اس سے تھی دعا
پر کبھی چاہا نہ اس نے قوم کا اپنی بُرا
قوم کے حق میں نہ نکلا نہ سے کچھ اس کے سوا
”ان کی عقلوں پر ہے پر وہ جمل و غفلت کا پڑا“
خندہ پیشانی سے سب ان کے سے جو رجحان
اور خدا کا پوجنا بندوں کو مشکل ہو گیا
دین کی آخر حمایت پر کھڑا ہونا پڑا
پھر وہی شفقت وہی رحمت وہی احسان تھا
”ہے عرب کی دوستی جز دین اور ایمان کا“
”قوم کا خادم ہے آقا سب کے بے چون و چرا“

قوم کے خادم رہے اور دستِ جنگِ مل دیں
دین اور دنیا میں بول اسلام کا بالا رہا
پرئے خود غرضیوں نے جبکہ مل ایک اکے پھاڑ
حکم جو مالک کا تھا بندوں کو وہ پورا ہوا
سکھ تھا اس کا کہ بھگڑوں سے رہو تم بیکار
ورنہ کھو بیٹھو گے سب اپنا وقار اور اعتبار

سچ کسی دانا نے تھا یہ قوم سے اپنی کہا
دیکھ لو ممتاز دنیا میں وہی قومیں ہیں آج
یاں ملک پھیلا ہوا اب قوموں میں تویت کا درد
ملک سارا چھین کر بھی ان کو چین آتا نہیں
اختلافِ دین و مذہب گھل رہا تھا جس میں ہر
و مہدم وہ اختلاف اب بن رہا ہے اتفاق
کر رہا ہے جو رش مہمردی کی صورت میں ظور
دیتے ہیں وہ اپنے ذاتی فائدوں پر غلٹال
وہ مہلثن کی جواں مردی سنی ہوگی کہ جب
قوم پر قربان کر دیں اپنی امیدیں تمام
ہے اسی حب وطن کا اس کی یہ سار اظہور
ایک ماما جس کو دس تھے ہیں ہفتہ میں شلنگ
جائے دے آتی ہے خوش خوش ایک ہفتہ کی طلب
ہر غرض چندہ کی کیا؟ اس سخیں کچھ اس کام
حق کو ہوتا ہے جنہیں دنیا میں کرنا سر بلند
ان کے مفلس قوم کی خاطر وہ کھاتے ہیں کام
ہے انہیں مہمردیوں کا ان کی یہ شمرہ لاج

”جو کہ حامی قوم کے ہیں ان کا حامی ہے خدا“
قوم پر قربان ہے جن کا ہر اک چھوٹا بڑا
اپنے ایک اک فرد پر قوموں کی جانیں ہیں فدا
اپنے اک تھقل کاسب مانگتے ہیں خوں بہا
جس نے ملکوں میں بے تھے خون کے دریا بہا
زہر ہیں ہونے کو ہے پیدا اثر تریاق کا
وہ تعجب جس نے یاپوں سے کئے بیٹے جُدا
اپنے جب نقصان میں ہو قوم کا ان کی بھلا
ہو گئی فرخ سیر کو با تھ سے اس کے شفا
آپ کچھ لینا نہ چاہا اپنی خدمت کا صلا
ہند پر ہے آج جو برطانیہ فرماں روا
جس کے کنبے کا سب اس خواہ پر ہے آسرا
قوم کی خاطر کہیں سنتی ہے جب چندہ کھلا
قوم کا نام آیا اور قابو سے دل باہر ہوا
خصلتیں یہ برگزیدہ ان کو ہوتی ہیں عطا
پست قوموں میں نہیں کر سکتے جو کام اغیا
اس کرہ کے گرد ہیں چھائی ہوئی شل ہوا

لوہا تنقہ طیس کی جانب دیکھتا جس طرح

اس طرف کھینچتی چلی جاتی ہو دنیا اس طرح

ہے یہ قوموں کی ترقی اور تزلزل سے عیاں
ایک کا ہے جو تزلزل دوسرے کا ہے عروج
کوئی یاں بتا نہیں جب تک نہ بگڑے دوسرا
ہوتے ہوتے خشک جب مریا میں خاک اڑنے لگی
چھپے مرغ چمن کو تب ہوئے جا کر نصیب
جان لو قسمت کسی کی جاگنے والی ہے اب
آسمان سے بن کے خواں آسمانیں اقبال کا
بیزباں کی دھکتی ہے آنکھ جب بدلی ہوئی
جانے والا ہو مقرران کا گھر غیروں کے پاس
تقصیر وادواں ہوں مبارک تم کو اے محنت کشو
یاد رکھو ہوں گے اب حقداران کے جانشین
ہوں گے مزدور اور دیکیرے ان کب قائم مقام
اے مسلمانو! فلک کی گردنوں سے غافلوا
دیکھو جب غیروں کو تم پر ہتھا کر واپس نہ ناز
مت کرو شکوہ و شیت کا خدا ظالم نہیں
ہے یہ قانون الہی جو کبھی ٹلنا نہیں

چھٹی جائیں گی وہ قومیں جو بگڑتی جائیں گی

نہیں جو کبھی جائیں گی بگڑتی جائیں گی

مستقل اور میلان نظم حالی
ترجمہ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی

کیا مسلمان ترقی کر سکتے ہیں؟

جو قوم ترقی کے بعد منزل کے درجے پر پہنچ جاتی ہے وہ ایک ایسی اترہ حالت میں ہوتی ہے کہ اس کے دوبارہ ترقی کرنے سے اکثر لوگ مایوس ہو جاتے ہیں 'یا یوں کہو کہ اس کی قابلیت کا جو ہر نظروں سے چھپ جاتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ ترقی کرنے کا ارادہ کرتی ہے تو اس کی سعی ایک حرکت مذہب کی بھی جاتی ہے اور اگر وہ ہنسنے لگتی ہے تو اس پر ہنسنے کا گمان کیا جاتا ہے۔ یہی حال آج کل ہماری قوم کا ہے۔

اگرچہ بعض مومن مسلمان جو کبھی اپنی نسبت براگمان نہیں کرتے مسلمانوں کی قوم کو اب بھی اعلیٰ درجے کی ترقی کے قابل سمجھتے ہیں لیکن امید ہے کہ وہ جس قدر زمانے کے حالات سے واقف ہو کر دنیا کی ترقیات کا اندازہ کریں گے اور جس قدر اپنی ترقی کے مواقع پر غور فرمائیں گے اسی قدر ان کی رلے کی غلطی ان پر ظاہر ہوتی جائے گی۔

البتہ جو لوگ مسلمانوں کی بسبودی سے بالکل مایوس ہیں اور اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ "ان میں کسی قسم کی ترقی کا مادہ باقی نہیں رہا اور ان کی اصلاح میں کوشش کرنے والے ایک محال بات کے پیچھے پڑے ہیں" ان کی رلے نہایت غور اور توجہ کے لائق ہے کیونکہ جن لوگوں کی یہ رلے ہے وہ ہماری قوم میں اعلیٰ درجے کے لائق آدمی ہیں اور ہماری موجودہ حالت جس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہو سکتی سراسر انہیں کی رلے کی تائید کرتی ہے یعنی وہ ایک ایسا دعویٰ کرتے ہیں جس کا ثبوت خود ان کے دعوے ہی میں موجود ہے ایک ایسے بیمار کی نسبت جس کی طاقت روز بروز زائل ہوتی جا رہی ہو جس کی غذا بالکل مفقود ہو جو علاج معالجے سے سوسو کوں جگا نہ ہو یہ کہنا کہ "وہ چند روز کا سامان ہے" ایک ایسا دعویٰ ہے کہ آپ ہی اپنی دلیل ہو سکتا ہے۔

وہ خیالات جو مسلمانوں کے ترقی نہ کر سکنے کے متعلق عام طور پر پیش کئے جاتے ہیں

۱۔ پہلا خیال :- مذہب مانع ترقی ہے

وہ لوگ (جن کی رائے اور بیان کی گئی) مسلمانوں کی موجودہ حالت کی شہادت کے سوا اور بھی دلیل پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ :-

”مسلمانوں کی مذہبی تعلیم ہی دنیوی ترقی کے لئے مانع ہے۔ پس تا وقتیکہ مسلمان

مذہب سے دست بردار نہ ہوں دنیوی ترقی نہیں کر سکتے۔ لیکن اس صورت میں وہ

مسلمانوں کی ترقی نہ ہوگی بلکہ ایک ایسی ترقی ہوگی جس سے اسلام کا کچھ تعلق نہ ہو۔

ہمارے نزدیک یہ ایک دلچسپ فقرہ ہے جو مسلمانوں کی ترقی و تہذیب کی بحث کے وقت ہمیشہ

استعمال کیا جاتا ہے۔

دنیا میں کوئی قوم شائستہ یا ناشائستہ ایسی نہیں ہے جس کی مذہبی تعلیم اب یا کسی وقت دنیوی

ترقیات کی مانع نہ خیال کی گئی ہو۔

اور سب قوموں کو جانے دو۔ عیسائی تو ہیں جو اس وقت دنیوی ترقیات میں تمام دنیا سے فائق ہیں

اور جو علم و دولت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کو بھی ترقی دے رہی ہیں ان کا مذہب ہمارے مردود مذہب سے

بھی زیادہ دنیوی ترقی کا مافی السحاب سمجھا جاتا تھا۔ جس وقت یورپ میں علم و حکمت کا ستارہ چمکا اور مذہبی خیالات اس

کی روشنی میں مضمحل ہونے لگے اس وقت مذہبی پیشواؤں اور خود گورنمنٹ کی طرف سے کونسی مزاحمت تھی جو نہیں

ہوئی۔ جن لوگوں نے مذہب کو خشو و زوائد سے پاک کرنا چاہا اور آزادانہ تحریر و تقریر کی شریعت کی اس وقت

ان کو کیسے کیسے سخت عذاب دے گئے۔ ہزاروں آدمی جلّے گئے اور ہزاروں نہایت حکیمیں اور اذیتیں

پہنچا کر ہلاک کئے گئے۔

۱۳۹۴ء میں وکلف جو عیسائی مذہب کا مصلح تھا اور جس نے کتب مقدسہ کو انگلستان کی زبان مرجم

میں ترجمہ کیا تھا اس کے متقدموں پر سخت عذاب کیا گیا۔

۱۴۱۳ء میں آزادی مذہب کی بیخ کنی کے واسطے قانون جاری کئے گئے۔

۱۴۳۹ء میں اسکاٹ لینڈ میں مسلمان مذہب پر انواع و اقسام کے ظلم کئے گئے اور ساتھ آدمی بدعت

کے الزام پر ملتی آگ میں جلانے گئے۔

۱۵۵۵ء میں کئی رفاہ برعقی ہونے کے الزام میں جلانے گئے اور تمام قید خانے اس قسم کے پتھروں سے بھر گئے۔

۱۶۴۱ء میں جبکہ آرلینڈ میں بناوت ہوئی تو چالیس ہزار پرنٹس قتل کئے گئے۔

سترہویں صدی عیسوی کے اڈیٹرک ارسطو کی محبتوں نے تمام یورپ کے مدارس کو ایسا جکڑ بند کر رکھا تھا کہ وہ مذہب کی رکن رکن بھی جاتی تھیں اور یہ تمام بندشیں اس وقت تک نہ ٹوٹیں جب تک کہ لارڈ میکین نے نہایت زور آور تحریروں سے ان کو نہ توڑا۔

کو پرنٹس نے بس وقت سیارات کی نسبت اپنی تحقیقات ظاہر کی تو تمام کھلیانے ایک زبان ہو کر اس کو مردود ٹھیرایا۔

۱۶۷۹ء میں دو مینس بنائیں اور سیارات کے متعلق بہت سے حالات شاہدہ کے مگر اس کو انعام یہ ملا کہ تید کیا گیا۔ اگرچہ ہر چند اس نے بہت زبردست اور صاف دلیوں سے سمجھایا کہ یہ باتیں دین یا کتب مقدس سے کچھ منافات نہیں رکھتیں مگر کسی نے التفات نہ کیا۔

غلامی کے موقوف کرنے میں یورپ کو بے شمار مزاحمتیں پیش آئیں۔

لوٹھر کی کتاب جو پوپ لیو دہم کے برخلاف لکھی گئی تھی ۱۵۲۰ء میں جلانی گئی۔ اسی طرح کے اور ہتھیار واقعات پیش آئے جن کے بیان کرنے کا یہ مل نہیں ہے۔

آخر تعلیم نے تمام اعلیٰ و عادت اور قصبات کو دبا لیا اور عیسائی مذہب بہ قدر ضرورت وقتاً فوقتاً حق و زوائد سے پاک ہوتا رہا۔ اب وہی عیسائی قومیں ہیں کہ جس طرح دنیوی ترقیات میں تمام دنیا سے بہت لے گئی ہیں اسی طرح اپنے مذہب کی اشاعت اور حمایت میں تمام عالم کی قوموں سے زیادہ سرگرم ہیں۔

پس یہ خیال کہ مسلمان جب تک اپنے مذہب سے دست بردار نہ ہوں دنیوی ترقی نہیں کر سکتے، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

اصل یہ ہے کہ ہر مذہب ایک مدت کے بعد اپنی اصلیت سے متجاوز ہوتے ہوئے ایک طویل الذیل

ہو جاتا ہے اور جب تک کوئی سخت ضرورت داعی نہیں ہوتی وہ برابر بڑھتا چلا جاتا ہے لیکن جب زمانے کی ضرورتیں اہل مذہب کو شکستیں کھینچتی ہیں تو وہ مذہب کی اہلیت دریافت کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور بہت سے ملکی قوانین اور بہت سے قصے کہانیاں بہت سے رسم و رواج، بہت سے یہا تعصبات اور بہت سے غلوں و اوہام جو امتدادِ ایام کے سبب مذہب کے عناصر و ارکان بن جاتے ہیں ان سے دست بردار ہو کر اصل مذہب پر تفاعلت کرتے ہیں۔ وہ خود ایسا نہیں کرتے بلکہ زمانہ کی ضرورتیں ان کو ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہیں مثلاً ہندوستان کا ایک شریعت مسلمان جو عورت کے گھر سے باہر نکلنے کو خلاف شرافت ہی نہیں بلکہ خلاف شریعت بھی جانتا ہے جب اہل و عیال کے ساتھ سفر حج کرتا ہے تو اس کو مجبوراً پرندہ نشینی کے دو قاعدے توڑنے پڑتے ہیں جن کو وطن میں لازمہ اسلام خیال کرتا تھا۔ ایک شیعہ مسلمان جو شکر کمین کے دودھ دہی اور ٹھٹھی وغیرہ سے پرہیز کرتا ہے جب کوئی لمبا سفر کرتا ہے تو اس کو لالچا رب کچھ گوارا کرنا پڑتا ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں جب محمود ثانی سلطان روم نے فوج کو فرنگستانی قواعد سکھانے کی نہایت سخت ضرورت سمجھی اور انگریزی فرتنے نے جن کی فوج شجاعت اور استقلال میں بے مثل اور شمار میں ایک لاکھ سے زیادہ تھی کافوں کی قواعد سمجھ کر اس کے سیکھنے سے انکار کیا اور کسی طرح وہ اپنی سرکشی سے باز نہ آئی تو آخر مجبور ہو کر اس فرتنے کے ایک ایک شخص کو قتل کرنا پڑا۔ اگرچہ اس فوج کے قتل ہونے سے سلطنت کو سخت صدمہ پہنچا لیکن زمانے کی ضرورتوں نے سلطان کو ایسے قتل عام پر مجبور کر دیا۔ اور اس دن سے فرنگستانی قواعد روم میں جا رہی ہو گئی۔ بیشک انگریزی فرتنے کی یہ بنیاد دس کشتی جہزی خیالات کا نتیجہ تھی لیکن چونکہ حقیقت میں اس کی بنیاد محض تعصب پر تھی لہذا اصول مذہب پر اور زمانے کی ضرورتیں بھی مجبور کر رہی تھیں کہ بغیر نئے آلات جنگ سے مسلح ہوئے اور موجودہ طرزِ زندگی و آرائی سے واقف ہوئے بغیر چارہ نہیں اس لئے تمام علماء نے متفق اللفظ ہو کر ایک لاکھ بہادر اور کارآمد فوج کے قتل کا فتویٰ دے دیا۔

الغرض مذہبی توہمات جب ہی تک مانع ترقی رہتے ہیں جب تک زمانے کی ضرورتیں اہل مذہب کو مجبور نہیں کرتیں۔

آج سے تیس برس پہلے ہندوستان میں ایک مسلمان بھی ایسا نہ ہو گا جو انگریزی زبان سیکھنے کو سمجھتا

نہ جانتا ہو لیکن اب بظلمات اس کے ایک مسلمان بھی ایسا نہ ہو گا جو انگریزی سیکھنے کو ضروری نہ سمجھتا ہو۔

کیا وہ پہلا خیال ایک مذہبی خیال نہ تھا؟ اور کیا اس خیال کے بدل جانے سے مسلمان اسلام سے دست بردار ہو گئے؟ عا شائتم عا شائتم۔

پس یہ خیال بالکل غلط ہے کہ جب تک مسلمان اسلام سے دست بردار نہ ہوں وہی ترقی ہرگز نہیں کر سکتے۔ البتہ جب تک کوئی ہم کو یہ نہ بتائے کہ کیا ضرورتیں درپیش ہیں تب تک نہ مذہبی توہمات ہمارے دل سے دور ہو سکتے ہیں اور نہ ترقی کا خیال ہمارے دل میں پیدا ہو سکتا ہے اور وہ جسے تعلیم ہے جس کے پھیلنے میں پسند بہت لوگ کوشش کر رہے ہیں۔ اگرچہ قوم ان کی چغ و پکار سے بیدار نہیں ہوتی لیکن انج المؤمنین (زمانہ) ان کو بسد ہوشیار کر دے گا۔

۲۔ دوسرا خیال: ایک بار تنزل کے بعد دوبارہ ترقی نہیں ہو سکتی

دوسری دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں بنی گئی جس نے ایک بار تنزل کے درجہ کو پہنچ کر دوبارہ ترقی کی ہو۔

لیکن ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ دوبارہ ترقی کرنے سے کیا مطلب ہے؟ اگر دوبارہ مملکت حاصل کرنا مراد ہے تو ہم تسلیم کرتے ہیں بلکہ ہمارے نزدیک اگر دنیا واقعی عالم اسباب ہے تو ممکن نہیں کہ جو قوم زمانہ موجودہ کے فنون و کائنات کی دشواریوں میں اپنے بنی نوع سے پیچھے رہ گئی ہیں ان کو کبھی مملکت اور حکومت میں استقلال کا درجہ حاصل ہو سکے یا جو مستقل نظر آتی ہیں ان کا استقلال قائم رہ سکے۔

زمانہ قدیم اور دور متوسط میں جبکہ جنگی طاقتیں تمام قوموں کی تقریباً یکساں تھیں اس وقت ہر قوم مملکت اور حکومت حاصل کرنے کی قابلیت رکھتی تھی اور خاص خاص اسباب سے کبھی یہ قوم اس قوم پر اور کبھی وہ قوم اس قوم پر غالب آجاتی تھی۔

لیکن زمانہ حال میں تو اعدائے جنگ و آلات حرب کے لحاظ سے دنیا کی حالت دگرگوں ہے۔ ایک قوم آسمان پر ہے تو دوسری قوم تختِ التری میں ہے۔ اور جو قومیں ترقی کر چکی ہیں ان کا فرض ہے کہ مغلوب قوموں کو کبھی ان وسائل میں اپنے برابر نہ ہونے دیں جن کے سبب سے ان کو غلبہ حاصل ہوا ہے۔ پس ضرور ہے کہ ترقی یافتہ

قوموں کا غلبہ اور عجب و اب روز بروز بڑھتا جائے اور جن قوموں نے اپنی حد سے آگے قدم نہیں بڑھایا وہ نوبت بہ نوبت بھٹکتے ہوئے جائیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لئے کوشش کرنا محض فضول ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

ہر قوم بلکہ ہر شخص کی ترقی کی ایک جداگانہ حد ہے اور اس حد تک پہنچنا اس کا ضروری فرض ہے۔ ایک شخص جس کے تمام اعضاء جسمانی درست اور مضبوط ہیں اور ذہن و حافظہ بھی عمدہ ہے بے شک ہر علم و ہنر میں ترقی کر سکتا ہے۔ وہ جس طرح ایک اعلیٰ درجے کا فاضل ہو سکتا ہے ویسا ہی ایک اعلیٰ درجے کا سپاہی بھی ہو سکتا ہے لیکن ایک درجہ اعلیٰ درجہ کا فاضل ہو سکتا ہے مگر ایک ہاتھ سے بالکل پانچ ہے وہ اگرچہ ایک عمدہ سپاہی نہیں بن سکتا لیکن ایک اعلیٰ درجے کا فاضل ضرور ہو سکتا ہے اور اس لئے اس کا نہایت ضروری فرض ہے کہ اعلیٰ ترقیات میں جہانتک ہو سکے کوشش کرے۔

اگر دوبارہ ترقی کرنے سے یہ مراد نہیں ہے جو اوپر ذکر کی گئی تو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ کسی قوم نے منزل کے بعد ترقی نہیں کی۔

اور ملکوں کو جانے دو۔ ہندوستان ہی میں ایسی قومیں موجود ہیں جو نہایت پست ہو کر دوبارہ بلند ہوئی ہیں مثلاً گجرات میں پارسی یا بنگالہ میں سندھو۔ ان دونوں قوموں کا حال جو دو سو برس پہلے تھا اور ان کی موجودہ حالت دونوں کا متغایہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ انھوں نے کس قدر ترقی کی ہے۔

اس کے سوا کوئی روشن اور صاف دلیل اس بات کی نہیں ہے کہ جب گورنمنٹ کی طرف سے ہماری تعلیم ہماری تجارت اور ہماری صنعت و حرفت میں کوئی صریح مزاحمت نہ ہو تو بھی ہم ان شاخوں میں ترقی نہیں کر سکتے۔ یہودیوں پر جب تک یورپ میں ظلم و ستم ہوتا رہا اور وہ غلامی کی حالت میں رہے تب تک ان کی ترقیات جس قدر وہ رعیت ہونے کی حالت میں کر سکتے تھے رکی رہیں لیکن جب سے یورپ میں آزادی پھیلی اور ان کو رعیت کے پورے پورے حق دئے گئے تب سے ان کی حالت پہلے کی نسبت نہایت بہتر ہے بعض ملکوں میں تو انھوں نے حکمرانوں کے برابر حقوق حاصل کئے ہیں۔ عموماً ہر ملک میں ان کی حالت اچھی ہے۔ ان کی تجارت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور ان کی دولت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ بعض دولت مند ان میں ایسے

ایسے ہیں کہ یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں ان کی قرضدار ہیں۔
۳۔ تیسرا خیال۔ موجودہ تعلیمی کوششوں کا نتیجہ کچھ نہ نکلتے گا لہذا کوشش بے سود ہے
جو لوگ مسلمانوں کی ترقی سے بالکل مایوس ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:-

”اس کوشش کا نتیجہ جو کہ مسلمانوں کے بسن خیر خواہ کر رہے ہیں اس کے سوا کچھ نہیں
ہو سکتا کہ چند آدمی کسی قدر امتیاز حاصل کر لیں۔ کیونکہ آج تک جتنے آدمیوں کو ترقی کا خیال
ہوا ہے وہ اس قدر تھوڑے ہیں کہ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ پس اگر سو دو سو برس میں
ہزار دو ہزار مسلمان ممتاز ہو گئے تو اس کو قومی ترقی نہیں کہہ سکتے۔“

لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ مسلمانوں کو کسے دن سے ترقی کا خیال پیدا ہوا ہے؟ اگر انصاف سے دیکھا جائے
تو اس خیال کی عمر اور پرچہ تہذیب الاخلاق کی عمر برابر نکلتے گی۔ پس جو کچھ اس تیل عرصے میں ہوا وہ ترقی کی سمیٹی پال
سے بہت زیادہ ہے۔ اس کے سوا ترقی کی رفتار ابتدا میں ہمیشہ سست ہوتی ہے لیکن وہ جس قدر بڑھتی جاتی ہے
اسی قدر تیز ہوتی جاتی ہے۔ جو بیچارہ روز بروز گنہگار بن جاتا ہے اس کا ادنیٰ افادہ بھی نہایت تسلی بخش ہوتا ہے اور اگر
پھر کوئی غلطی نہیں ہوتی تو اس کی صحت اور طاقت روز بروز ترقی کرتی ہے اور یہ ترقی بھی یونانیوں یا مجتبیٰ جی جی
۴۔ چوتھا خیال۔ پہلے سے ترقی کن قوموں کے برابر چونکہ ہم نہیں ہو سکتے لہذا ترقی بے فائدہ ہے

بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ”جو قومیں پہلے سے ترقی کر رہی ہیں ان کے برابر ایک ایسی قوم ہرگز
نہیں ہو سکتی جس کو سب سے پیچھے ترقی کا خیال پیدا ہوا ہو۔ پس اگر بالفرض مسلمانوں نے اب ترقی کرنے کا پختہ
ارادہ بھی کیا تو کچھ فائدہ نہیں ہے کیونکہ ایسی حالت میں ہم ان ترقی یافتہ قوموں سے ہمیشہ پیچھے ہی رہیں گے۔“
بے شک یہ بات صحیح ہے لیکن ہماری کوشش صرف اس بات میں ہونی چاہئے کہ ہم اپنی مہم
قوموں سے جنہوں نے ہم سے بہت پہلے قدم آگے بڑھایا ہے کسی چیز میں کم نہ رہیں اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ
ہم اس کوشش میں کامیاب ہو سکتے ہیں بلکہ قوموں کی ترقی ہمیشہ ایک خاص حد پر جا کر پھکی ہو جاتی ہے جس
سے آگے بڑھے مگر مکمل ان کے لئے باقی نہیں رہتا۔ پس اگر ان میں سے ایک قوم آگے بڑھ گئی ہے اور
دوسری قوم پیچھے رہ گئی ہے تو پس ماندہ قوم کو مایوس نہ ہو جانا چاہئے کیونکہ اگر راہ میں نہیں تو اخیر منزل پر جا کر

دونوں مل جائیں گی۔ اور یہ بھی نامکن نہیں ہے کہ راہ ہی میں پھلتا قافلہ اگلے قافلہ سے جا ملے کیونکہ بعض اوقات ایسی اضطراری حالتیں پیش آتی ہیں کہ پھیلوں کو معمولی رفتار سے کسی قدر زیادہ جلد قدم اٹھانا پڑتا ہے یا تنگ کہ وہ راہ ہی میں اگلوں سے جا ملتے ہیں۔

اصل مانع ترقی مایوسی اور ناامیدی ہے

بہر حال یہ تمام موانع جو اوپر ذکر کئے گئے ہم کو ترقی سے مایوس کرنے والے نہیں ہیں البتہ صرف ایک بات ایسی ہے جو تمام مضموں اور ارادوں کو خاک میں ملا دیتی ہے اور وہ ترقی کی طرف سے مایوسی اور ناامیدی ہے۔ جنوم عام تعصب اور جہالت میں مبتلا ہوتی ہے وہ ہمیشہ چند ایسے روشن ضمیر آدمیوں کی ہمت اور کوشش سے رد براہ ہوتی ہے جو تعلیم کی بدولت تعصب اور جہالت کی اندھیری کو ٹھری سے باہر نکل آتے ہیں اور قوم کی اتر حالات دیکھ کر ان کے دل میں بے اختیار ایک دلولہ اٹھتا ہے اور قومی اصلاح و ترقی کی طرف دل و جان سے متوجہ ہو جاتے ہیں۔

اسی بنا پر ہم کو یہ امید تھی کہ جو نوجوان ہماری قوم میں اعلیٰ درجے کی تعلیم پائیں گے وہ اس کام کے ذمہ دار ہوں گے۔ مگر خلافت اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جس قدر ایجوکیشن اور سولیزیشن (تعلیم و تہذیب) ہیں اعلیٰ درجہ حاصل کرتے ہیں اسی قدر قوم کی ترقی سے مایوس نظر آتے ہیں یہاں تک کہ وہ جن نفوس مقدسہ کو قومی ترقی کے خیال میں سرگرم پاتے ہیں ان پر تعجب کرتے ہیں کہ یہ کیوں کوشش کر رہے ہیں؟ اور کیوں کر رہے ہیں؟

ہائی ایجوکیشن (اعلیٰ تعلیم) کی بدولت ان کی مثال ایسے شخص کی مانند ہے جو اندھیری رات میں ایک نہایت روشن کمرے سے باہر نکلتا ہے اور باہر اگر اس کو درو دیہ کیچہ نظر نہیں آتا۔ وہ باہر چلنے پھرنے والوں کے پاؤں کی آہٹ سن کر تعجب کرتا ہے کہ یہ لوگ کیوں کر اس اندھیرے میں چل پھر رہے ہیں اور آخر گھبرا کر پھر اسی روشن کمرے میں گھس جاتا ہے۔ وہ اتنا توقع نہیں کرنا کہ روشنی کی چکا چوند جس نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رکھا ہے کہ یہ بائے اوتار کی ہیں اس کو بھی روشنی محسوس ہونے لگے اور وہ بھی اوروں کی طرح چل پھر سکے۔

اسی طرح ہماری قوم کے نوجوان ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ) جنہوں نے یورپ کی سولیزیشن (تہذیب) کو اپنی

آکھ سے دیکھا ہے یا تعلیم کے ذریعے سے اس کا اندازہ کیا ہے وہ جب مغربی قوموں کی حالت کو اپنی قوم کی موجودہ حالت سے مقابلہ کرتے ہیں تو دونوں حالتوں میں وہ نسبت پاتے ہیں جو محض نور اور محض ظلمت میں ہے اور بیشک بادی النظر میں ایسی ہی نسبت معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں ایسا حال نہیں بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اندھیرے میں کچھ اجالا بھی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دو چار شخصوں کی کوشش سے چند روز میں وہ نتائج پیدا ہوئے ہیں جن کی کسی طرح توقع نہ تھی۔ پس اگر درس میں بایاقت آدمی توجہ اور کوشش کریں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ صرف دو چیزیں ہیں جن پر دنیا کی کامیابی اور ناکامی کا مدار رکھا گیا ہے۔

(۱) امید۔

(۲) ناامیدی۔

ہزاروں دشوار کام جو بالیقین محال بلکہ نامکن سمجھے گئے تھے امید کی بدولت اور کوشش کے ذریعے نہ صرف ممکن بلکہ سرانجام پائے ہیں اور ہزاروں سہل اور آسان کام ناامیدی اور ہمت ہار دینے کی وجہ سے ناتمام اور اُدھوٹے رہے ہیں۔ دیکھو کلبس نے صرف امید ہی کے بھر دے پر ایک ایسا کام سرانجام کیا جس کو تمام عالم محال سمجھتا تھا۔ مکالمونے صرف امید ہی کے سہارے پلاسی میں وہ فتح حاصل کی جس کے نتائج کسی کے دہم و گمان میں بھی

نہ تھے ۵

بجز امید نہ بیاں عشق کیشاں است کے مذا و تسلی دل ز لیغا را

”منقول از مقالات عالی“

شائع کردہ انجمن ترقی اردو

دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے؟

یہاں علم سے ہماری مراد مجرد علم ہے جو عمل سے بالکل خالی ہو۔ اور عمل سے مراد محض عمل ہے جس میں علم کو کچھ دخل نہ ہو۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے؟

اگر ہم کو یہ بات دریافت کرنا ہو کہ چراغ کی تہی کا اشتعال اویسجن سے قائم رہتا ہے یا ہائیڈروجن سے یا دونوں سے، تو ہم کو چاہئے کہ ایک دفعہ تہی کو محض اویسجن میں اور دوسری دفعہ محض ہائیڈروجن میں لکھ کر دیکھیں۔ اگر دونوں میں بجھ جائے تو سمجھنا چاہئے کہ ہوا کے دونوں جزوں کو اس کے اشتعال میں دخل ہے اور اگر ہائیڈروجن میں بجھ جائے اور اویسجن میں نہ بجے تو جاننا چاہئے کہ اس کے اشتعال کا باعث محض اویسجن ہی نہ ہائیڈروجن۔

اسی طرح اگر ہم یہ دیکھنا چاہیں کہ دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے تو ہم کو چاہئے کہ اول ایک ایسا ملک فرض کریں جس میں اہل علم و اہل نظر کے سوا کوئی کام کرنے والا اور ہاتھ پاؤں ہلانے والا نہ ہو اور پھر دیکھیں کہ وہ ملک کتنے دن آباد رہتا ہے۔ پھر ایک دوسرا ملک فرض کریں جس میں اُن پڑھتی مزدوروں کے سوا اہل علم کا نام و نشان نہ ہو اور پھر دیکھیں کہ وہ ملک آباد رہتا ہے یا نہیں۔

ہم اول ایک ایسا خطہ فرض کرتے ہیں جس کے باشندے جھڑاں عالم 'فلسفی' ریاضی دان 'مصنف' اوریٹر (Orator) شاعر اور بڑے بڑے فاضل ہیں مگر ان میں کوئی خدا کا بندہ ایسا نظر نہیں آتا جو ان واجب تعظیم اپاہجوں کے کھانے پینے اور بھنے، رہنے سننے اور لکھنے پڑھنے وغیرہ کا سامان مہیا کئے۔ اول تو کسی ملک میں بغیر کارکن جماعتوں کے ایسی آبادی کا وجود میں آنا ہی ناممکن ہے لیکن اگر بغیر محال کسی خطہ میں ایسی ناشدنی کو لونی و آبادی (چند روز کے لئے آباد ہو جائے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ ممکن ہے کہ بعض کو مطالعہ کے ذوق و شوق میں ایک آدھ روز بھوک پیاس نہ لگے، بعض کو کسی شکل مسئلے کے حل ہو جانے کی خوشی میں ایک دو وقت کھانے کی کچھ پروا نہ رہے یا بعض کو کسی مضمون کی دھن میں کچھ دیر تک غور و نویش کا کچھ خیال نہ آئے مگر

بست جلد وہ آپ کو ایک ایسی مخلوق پائیں گے جو صوبہ کی ہے مگر کوئی اس کا راز ق نہیں منگی ہے مگر کوئی اس کا ستار نہیں، حاجتمند ہے مگر کوئی اس کا قاضی الحاجات نہیں۔ اب یا تو انھیں خود اپنے اعلیٰ اور انترف ہاتھوں سے وہ تمام خفیہ اور ذلیل کام سرانجام کرنے پڑیں گے جو عوام کا لانا نام کو کرنے چاہئیں یا فوراً اس ملک سے ہجرت کر کے کسی ایسے خطہ میں جا کر رہنا پڑے گا جہاں ان کے لئے فرمانبردار بندے یا بندہ پرورد خدا موجود ہوں۔ دونوں حالتوں میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ ”دنیا کی کل محض علم سے نہیں چل سکتی“

اس کے بعد ہم ایک دوسرا ملک فرض کرتے ہیں جس کے تمام باشندے اُن ٹیڑھے اور بے علم ہیں مگر غنّی، جنّا کش اور اپنی ضروریات زندگی کے میا کرنے میں نہایت سرگرم ہیں۔ گوانھوں نے زراعت یا تجارت یا صنعت و دستکاری کے اصول کتابوں میں نہیں پڑھے مگر وہ اپنی تمام ضروریات جن پر انسان کی زندگی موقوف ہے خود میا کرتے ہیں۔ قدرتی خواہشیں اور نیچول ضرورتیں ان کو جس طرح سکھائی گئیں اور متواتر تجربوں سے جس قدر ان کی سمجھ بوجھ بڑھتی گئی، وہ اپنے تمام کام برابر سرانجام کرتے رہے۔ بونا، جتنا، بیو، ارضیت اور دستکاری غرض کہ تمام اہم اور ضروری کام رفتہ رفتہ ضرورت انجام دینے لگے۔ اب ان کی کوئی ضرورت بند نہیں رہتی اور کوئی کام اُن کا نہیں رہتا۔ ایک اناج پیدا کر کے لاتا ہے، دوسرا پیتا ہے، تیسرا اچکا تا ہے اور بیوں مل کر کھاتے ہیں۔ ایک کپاس بوتا ہے، دوسرا اُسے کاٹتا ہے، تیسرا بٹاتا ہے، چوتھا سینتا ہے اور چاروں مل کر پٹتے ہیں اُن کو چوری یا ڈکیتی کا مطلق خوف نہیں کیونکہ ان کے پاس اپنے ہاتھ پاؤں کی محنت کے سوا کوئی دولت نہیں۔ ان کو غنیم کے حکم کا کچھ ڈرن نہیں کیونکہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے چوکس اور غنیم کے محتاج کے لئے مستند اور تیار ہیں ان میں کوئی بیکار اور بدین نہیں کیونکہ ان کو اپنے کام دھندوں میں بیکاری اور بدینی کی فرصت ہی نہیں۔ ان میں کوئی روگی اور بیمار نہیں کیونکہ ان میں کوئی طبیب اور ڈاکٹر نہیں۔ ان میں کوئی مذہبی تکرار نہیں کیونکہ ان میں کوئی واعظ یا ملا نہیں۔ ان میں کوئی پولشکل اختلاف نہیں کیونکہ وہ سب کنسرویٹو (Conservative) ہیں۔

ان میں کوئی عدالتی جھگڑا نہیں کیونکہ ان میں کوئی اور یہ سٹر نہیں۔ ان میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ وہ سویٹائزڈ (مذہب تعلیم یافتہ) نہیں۔ اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا کی کل عمل سے چلتی ہے یہ علم سے۔

اب فرض کر دو کہ اس ملک کے باشندوں کا میل جول کسی ایسے ملک والوں سے ہو گیا جس کے تمام کام

علمی اصولوں پر مبنی ہیں۔ انھوں نے زراعت، تجارت، صنعت و دستکاری اور تمام جنگی اور ملکی مہمات میں علم ہی کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ کیا معمار اور کیا مہم جوئی، کیا لوہار اور کیا کھار کیا درزی اور کیا کفش و دروغہ مکہ تمام مشینہ و محض علم کی ہدایت سے اپنے تمام کام سر انجام کرتے ہیں۔

اس قسم کی با علم و عمل قوم کے میل جول اور لین دین نے اس آباد ملک کے ان بڑھ باشندوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ ان کی تجارت نے ان کے اخراجات زندگی حد سے زیادہ بڑھا دیئے، ان کی صنعت کے مقابلے میں ان کی صنعت ماند ہو گئی۔ ان کی دستکاری نے ان کی دستکاری کو ایندہ کر دیا مگر ایک مدت تک ان کو اس بات کی مطلق خبر نہ ہوئی کہ ہمارے پیشہ وریوں بے کار ہو گئے؟ ہماری کمائیوں میں کیوں برکت نہ رہی؟ ہمارے اخراجات روز بروز کیوں بڑھتے جاتے ہیں؟ اور ہماری آمدنی ہمارے اخراجات کو کیوں کٹتی نہیں ہوتی؟

لیکن اس غیر قوم سے جوں جوں میل جول بڑھ گیا ان کو ان کی اور ان کو ان کی زبان سیکھنے کی ضرورت زیادہ ہوتی گئی۔ انھوں نے اول ان کی زبان سیکھی پھر رفتہ رفتہ ان کے علم بھی سیکھنے لگے جن علموں کے ذریعے سے انھوں نے ہنرمیں ترقی کی تھی وہ علم بھی انھوں نے حاصل کئے مگر سولے رٹ لینے کے کوئی علمی فائدہ ان کے علموں سے نہ اٹھایا۔ وہ علم کو عمل کی غرض سے سیکھتے تھے، انھوں نے علم کو محض علم کے واسطے سیکھا۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ علم آدمی کے لئے بنائے مگر یہ شکل ابھی یہیں تک پہنچے تھے کہ آدمی علم کے لئے بنا ہے۔ وہ علم سے خود بھی لذت اور فائدہ اٹھاتے تھے اور اپنے ملک اور قوم کو بھی اس کے فوائد پہنچاتے تھے۔ انھوں نے گونگے کی طرح گڑ بکھایا اور کسی نے نہ جانا کہ کھٹا ہے یا میٹھا۔ وہ دنیا کی مختلف زبانیں اس لئے سیکھتے تھے کہ تمام عالم میں بھرتے تھے، غیر ملکوں کے آدمیوں سے ملتے تھے، مختلف قوموں کے علوم و فنون سے آگاہی حاصل کرتے تھے اور ان کو اپنی زبان میں منتقل کرتے تھے۔ انھوں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی غیر ملکوں کی زبانیں اور غیر قوموں کی بولیاں سیکھیں مگر اس لئے کہ غیر ملکوں میں سفر کریں اور غیر قوموں کے علوم و فنون اپنی زبان میں منتقل کریں بلکہ اس لئے کہ طوطے کی طرح کہیں ”حق اللہ پاک ذات اللہ“ اور کہیں ”ست گوردت واما“ بولیں۔ وہ لیمپ روشن کرنے کے لئے، میز لکھنے کے لئے، کرسی بیٹھنے کے لئے، گھنٹہ وقت دیکھنے کے لئے، اور فریش بچانے کے لئے خریدتے تھے۔ انھوں نے ان کی ریس سے یہ سب چیزیں فراہم تو کیں مگر نہ لیمپ کو جلایا، نہ میز پر لکھا، نہ کرسی پر بیٹھے، نہ گھنٹے میں وقت دیکھا

اور نہ فریض کو بچھایا بلکہ کباڑی کی طرح سارا گھرا سباب سے بھر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ علم کے ذوق و شوق میں انھوں نے ہاتھ پاؤں لانے بالکل چھوڑ دئے اور علم کا ادب ان کو دنیا کے ذلیل کلموں میں ہاتھ ڈالنے سے مانع ہوا۔ اب تا وقتیکہ وہ علم کو عمل کی غرض سے نہ پڑھیں اور اس سے عملی فائدے نہ اٹھائیں تب تک ممکن نہیں کہ ان کی حالت درست ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا کی کل علم سے نہیں چلتی بلکہ عمل سے چلتی ہے۔

اس نقیض سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم کو علم کی ضرورت نہیں بلکہ ہم کو اس وقت علم کی نہایت ضرورت ہے اور ایسی ضرورت ہے جیسے پیاسے کو ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جس طرح ٹھنڈے پانی کی کھیاں کرنے سے پیاس نہیں بجھتی بلکہ اور زیادہ بھڑک اٹھتی ہے اسی طرح طبیبوں کی مانند کتابوں کے الفاظ اور علوم کی اصطلاحات یاد کرنے سے اور طوطے کی طرح علمی مسائل اور قواعد اذکر کرنے سے کوئی شخص نہ آپ کو اور نہ ملک کو کوئی اصلی فائدہ نہیں پہنچا سکتا بلکہ اندیشہ ہے کہ ایسے لوگ ملک کے حق میں مضرت ثابت ہوں جس علم کی ہم کو ضرورت ہے وہ وہ علم ہے جو ہماری ساکن اور پرہیزگار قوموں کو متحرک اور لگھتہ و شاداب کرے نہ کہ وہ علم جو ہمارے متحرک اور لگھتہ قومی کو بھی ساکن اور پرہیزگار کر دے۔ ایسے علم سے بے علمی سو درجے بہتر ہے بقول شخصیکہ ”بخشوبی ملی چو ہالند و را ہی بجے گا“

”منقول از مقالات عالی“

شائع کردہ انجمن ترقی اُردو

ہم جیتے ہیں یا مر گئے؟

عربی میں ایک مشہور مقولہ ہے کہ

یعنی کام کرنا زندوں کو نمایاں ہے اور بے کار رہنا مردوں کو۔ اس قول کے موافق ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہماری قوم میں کچھ جان باقی ہے یا نہیں؟ سچ یہ ہے کہ اگر تشنگی شاوول سے قطع نظر کی جائے تو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری قوم میں کچھ جان باقی نہیں رہی اور بے اختیار یہ شعر زبان پر آتا ہے۔

ایتمہا النفس اجلی جزاء ان الذی یخذلہ قد دھما

اس بات کے بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے کہ ہر قوم کی ترقی کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ کس کے افراد میں عموماً مستعدی، محنت اور استقلال کے ساتھ کام کرنے کی عادت پائی جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی خاندان بلکہ کسی قوم میں اگر ایک شخص بھی ایسا پیدا ہو جاتا ہے جس میں یہ صفات موجود ہوں تو اس کی ذات سے تمام خاندان بلکہ تمام قوم کو فائدہ پہنچتا ہے پس جس قوم کے افراد میں عموماً یہ خصلتیں پائی جائیں گی ممکن نہیں کہ وہ قوم اپنی بساط کے موافق ترقی میں کوئی متاثرہ درجہ حاصل نہ کرے لیکن جہاں تک کہ ہم اپنی قوم کی حالت پر غور کرتے ہیں اس میں چاروں طرف ہم کو ایک سناٹا نظر آتا ہے اور وہ اسلام جو بحر تلزم کی طرح مومنین کو ماسوا اٹھا تھا آج بحر خمد کی طرح ساکن اور بے حس و حرکت معلوم ہوتا ہے۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم اب ہوئے خاک، انتہا ہے یہ

ترقی کی پہلی طیر بھی اپنے منزل کا یقین ہے اور امن و آراہی ترقی کے دو بڑے معاون ہیں۔

ہم کو اپنے منزل کا پورا یقین ہو گیا ہے۔

امن و آراہی جو برٹش حکومت کی بدولت ہم کو اس زمانے میں حاصل ہے وہ کسی عداوت کی دور

لے یعنی اسے دل اپنی بے قراری کو کم کر دیکو کم، جس بات کا تجھ کو ڈر تھا وہ تو ہو چکی۔

میں ہندوستان کو نصیب نہیں ہوئی۔

ترقی کے نمونے بھی اپنے ہم وطنوں میں رات دن اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔
ترقی کی قابلیت بھی ہم میں اُسی قدر ہے یا سوئی چاہے جس قدر کہ ہندوستان کی اعلیٰ سے اعلیٰ قوم کو
قدرت نے عطا کی ہے۔

باجوہان تمام باتوں کے ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی کی روح ہم میں اب تک پیدا نہیں ہوئی۔
ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا چاہئے لیکن کچھ کرتے نہیں۔
ہم کو بھوک شدت سے لگی ہوئی ہے مگر چاہتے ہیں کہ کہیں سے پکا پکایا ہاتھ لگ جائے تو کھالیں۔
ہم بیاس کے مارے مرے جاتے ہیں مگر متظر ہیں کہ کوئی خدا کا بندہ ہمارے حلق میں آکر پانی چھائے۔
ہم توکل کو اس لئے ضروری نہیں سمجھتے کہ اس میں خدا پر بھروسہ کرنا تو ماہے بلکہ اس لئے کہ توکل
کی بدولت ہم کو ہاتھ پاؤں ہلانے نہیں پڑتے۔
ہم تدبیر کو اس لئے بے سود خیال نہیں کرتے کہ وہ تقدیر الہی کا مقابلہ نہیں کر سکتی بلکہ اس لئے کہ تقدیر
کے حیلے سے ہم کو کچھ کرنا نہیں پڑتا۔

ہم دنیا اور دنیا کے کاموں کو اکثر فانی اور حقیر بتاتے ہیں مگر نہ اس لئے کہ فی الحقیقت ہم دنیا کو ایسا ہی
سمجھتے ہیں بلکہ صرف اس لئے کہ ہم کو اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے نہ پڑیں۔

ہم اس جیلہ جو لوٹری کی طرح انگور کے خوشوں سے اس لئے تاک نہیں چھوڑتے کہ ان کو کھٹا سمجھتے
ہیں بلکہ اس لئے کہ ان کے توڑنے میں ہم کو وقت معلوم ہوتی ہے۔

ہم کہتے سب کچھ ہیں مگر کرتے کچھ نہیں ہماری حالت ہم کو بھٹلاتی ہے اور ہمارے افعال ہمارے قول
کی تکذیب کرتے ہیں۔

ہم تقریباً اور جبریرہ دونوں فرقوں کو گمراہ بتاتے ہیں مگر ہم خود تدری بھی ہیں اور جبریری
بھی۔ ہمارے دعوے قدریوں کے سے ہیں اور ہمارے کام جبریوں جیسے۔ ہماری زبان قدری ہے اور
ہمارا دل جبری۔

مسلمانوں میں قوت علمی کا فقدان اور اس کی چند مثالیں

اگرچہ ہم میں لائق آدمیوں کا قحط ہے تاہم کم و بیش مصنف، لکچرار اور شاعر ہم میں موجود ہیں۔ ہائے مصنفین کو یہ شکایت ہے کہ پڑھنے والوں میں قوت منفعلہ نہیں اور پڑھنے والوں کو یہ شکایت ہے کہ مصنفوں میں قوت فاعلہ نہیں۔ ہمارے اسپیکر اور لکچرار جب کچھ بولتے ہیں تو بعض اوقات ان میں قومی جوش کی طرح کم نہیں معلوم ہوتا، ہمارے شاعر جب کچھ پڑھتے ہیں تو قومی سہر دی ان کے ایک ایک لفظ سے ٹپکی ہے مگر فی الحقیقت ان کے کلام میں اور فوٹو گراف کی آدائیں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ گویا ایک ہوا بھری ہوئی تھی جب وہ نکل گئی تو اب بالکل خالی ہیں۔

ہماری قوم میں انگریزی تعلیم [جو پیکٹیکل آدمی (عملی کام کرنے والے اشخاص) پیدا کرنے کا دعویٰ کرتی ہے] چشم بدور روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور تعلیم یافتہ اصحاب کی تعداد میں ہر سال مقبول اضافہ ہوتا رہتا ہے مگر افسوس ہے کہ مستثنیٰ صورتوں کے سوا علمی قوت اور سلیف ہیلپ (اپنی مدد آپ کرنے کا مادہ ان میں تعلیم کے بعد اتنا بھی باقی نہیں رہتا جتنا کہ مدرسہ میں داخل ہوتے وقت وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔

ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جس کی بڑی دوڑ تھی۔ اے یا ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد یہ ہے کہ ڈل پاس کے ہوئے طلبہ کی طرح سرکاری نوکری کے لئے ادھر ادھر سلسلہ جھپٹا کر پھرے اور ذریعوں اور سفارشوں کی تلاش میں ایک مدت تک سرگردان و پریشان رہے۔ ان کو اپنے دست و بازو پر اتنا بھی بھروسہ نہیں ہوتا جتنا کہ چندوں اور پرندوں کو اپنی قوت لامیوت کی تلاش میں ہوتا ہے۔ وہ وجہ معاش کو غلامی یعنی نوکری سی پڑھ جانتے ہیں۔ ان میں اور ایک غریب اور ٹیل اسکالر (عالم عربی یا فارسی) میں صرف اتنا ہی فرق ہوتا ہے کہ انھوں نے زمانے کی ضرورت کے مطابق باقاعدہ غلامی کا پیشہ سیکھا ہے اور اس بیچارہ نے نہیں سیکھا۔ ان میں سے جن کو سرکاری نوکری مل جاتی ہے ان کو جازنا چار کتاب بالائے طاق رکھنی پڑتی ہے اور لکھنے پڑھنے سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ ان کی مثال بمعینہ اس قیمت عربی گھوڑے کی سی ہے جس کو گھوڑ دوڑ کے لئے تیار کیا گیا ہو اور پھر بجائے گھوڑ دوڑ کے چھکڑے یا ہل میں جو نایا گیا ہو۔

مگر وہ غلامی ہمت گریجویت جو نوکری کو پسند نہیں کرتے یا نوکری ان کو پسند نہیں کرتی ان کا حال ہلپوں

سے بھی گیا گندرا ہے۔ اگر وہ پھکڑے یا ہل میں جوت دے جاتے تو کچھ کام بھی آتے، لیکن اب وہ کسی کام کے نہیں۔ ان کی کوششیں اکثر بے مصرت ہوتی ہیں جن سے نہ ان کو اور نہ کسی اور کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے۔ ان کو روٹن ایسپا ر (سلطنت روم) کی تمام سہڑی اور اس کے تترل کے اسباب ازبہ ہوتے ہیں مگر اپنی ہستی کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔ وہ یورپ کے مصنفوں، موجدوں اور رفاہوں کے کام نہایت فخر کے ساتھ بیان کرتے ہیں لیکن مولے اس کے کہ ان کے کارنامے بیان کر کے اپنی واقعیت کی داد چاہیں خود کچھ نہیں کرتے اور نہ کر سکتے ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کے حقوق جو گورنمنٹ کے ذمہ ہیں کمال ادب سے بیان کرتے ہیں مگر ان کے، ان کے خاندان کے اور ان کی قوم کے حقوق جو خود ان کے ذمہ ہیں ان پر کبھی غور نہیں کرتے۔ وہ گورنمنٹ کے انتظام پر کتہہ مہینے کرنے میں آندھی ہیں مگر اپنے گھر کے انتظام سے محض بے پروا۔

ہمارے بہت سے نوجوان ولایت سے تعلیم پا کر آئے ہیں اور اس پارس کی پتھری کو چھو گئے ہیں جو بس کو طلا کر دیتی ہے۔ وہ اپنی عمر کا ایک عمدہ حصہ اس قوم میں بسر کر آئے ہیں جو بت وطن اور قومی سہدوی کو اپنا دین و ایمان سمجھتی ہے۔ انھوں نے برسوں اس ملک کی مہاکھائی ہے جہاں انسان علم و عمل کے سایہ میں پروش پاتا ہے مگر جب وہ مع الحیر ہندوستان میں پہنچے ہیں تو اکثر کی حالت بعینہ اس شہر کی مصداق ہوتی ہے۔

مکڑ گیا، مدینہ گیا، کر بلا گیا جیسا گیا تھا وہاں یہاں چل پھر کے آگیا

جب وطن اور قومی سہدوی ان میں اتنی بھیجی تھی جتنی کہ وہ یہاں سے اپنے ساتھ لے کر جہاز میں سوار ہوئے تھے، قوم سے ان کو نفرت ہو جاتی ہے اور ہندوستانی سوسائٹی میں شریک ہونے سے ان کو شرم آنے لگتی ہے جس عقارت سے کہ انگریز ہندوستانیوں کو دیکھتے ہیں وہ ان سے بھی زیادہ عقارت کی نگاہ سے اپنے ہم وطنوں کو دیکھنے لگتے ہیں۔ انگریز ان کو ہان سولائزڈ (نیم وحشی) کہتے ہیں تو وہ ان کو ان سولائزڈ (جتنی مطلق) کا خطاب دیتے ہیں۔ وہ اپنی قوم کو ترقی اور اصلاح کے ناقابل بتاتے ہیں اور اس لئے ان کی بھلائی کے لئے مطلق کوشش نہیں کرتے بلکہ جو لوگ ایسے کاموں میں کوشش کرتے ہیں ان کی کوششوں پر ہنستے ہیں اور ان کو بے سود خیال کرتے ہیں۔ یہ تمام شہادتیں اس بات کی ہیں کہ ہماری قوم میں عملی قوت باقی نہیں رہی۔

کبھی کبھی ہمارے بھائیوں کے دل میں ایک غیر معمولی جوش و دودھ کے ابال سے بھی زیادہ خود بخود اٹھتا
 کبھی وہ اپنے چند خیال آدمیوں کو متفق کر کے ایک انجمن قوم کی بھلائی کے لئے منعقد کرتے ہیں۔
 کبھی مسلمانوں کی تعلیم کے لئے کوئی اسلامی یا انگریزی مدرسہ قائم کرتے ہیں۔
 کبھی کوئی رسالہ یا اخبار محض قوم کے فائدے کی غرض سے جاری کرتے ہیں۔

اسی طرح کبھی ایک تدبیر کبھی دوسری تدبیر خاص قوم کی بھلائی کے لئے کرتے ہیں اور اکثر ان تدبیروں
 کے محرک جانتا کہ ہم کو معلوم ہے فی الواقع نہایت غلو صاف اور صدق دل سے ان کاموں کو شروع کرتے ہیں اور
 ان کا یہ دلی ارادہ ہوتا ہے کہ تا دم واپس ان کاموں میں کوشش کریں گے اور ان کو ترقی دیں گے مگر حقیقت
 ان کی حرکت ایک حرکت مذہبی ہوتی ہے۔ وہ ایک ہی وجہ کے بعد بالکل ٹھٹھکے پڑ جاتے ہیں۔ ان کا
 کوئی مضبوط (الاشارا لہ) پورا نہیں ہوتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں وہ نہیں کر سکتے۔
 جس کے معنی ہیں کہ ہم میں قوتِ علمی باقی نہیں رہی۔

ہم میں ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے سمجھدار آدمی موجود ہیں جو پرانی ہیودہ رسموں کو براہانتے ہیں شادی
 اور غمی میں جو بے دریغ روپیہ صرف ہوتا ہے اس کو محض فضول اور لغو بلکہ گناہ اور مصیبت سمجھتے ہیں۔ جو لوگ ایسے
 موقعوں پر سووی روپیہ قرض لے کر خرچ کرتے ہیں ان پر نہایت افسوس کے ساتھ ہاتھ ملتے ہیں مگر جب دیا ہی
 موقع خود ان کو پیش آتا ہے تو انہیں بند کر کے اسی اندھے کنوئیں میں آپ بھی کود پڑتے ہیں جس میں اور دل کو گتے
 دیکھ کر افسوس کرتے تھے۔ اکثر لوگ لڑکیوں کی تعلیم کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں اور دل سے اس بات کے خواہاں
 ہیں کہ ان کی تعلیم کا کسی مناسب اور قابل اطمینان طریقے سے رستہ نکلے۔ اس باب میں لوگوں کی ترقیب اور تحریس
 کے لئے کتابیں اور رسالے تصنیف کرتے اور اخباروں میں مضامین لکھتے ہیں مگر علی طور پر کوئی کارروائی ان
 سے نہیں ہو سکتی اور زبانی جمع خرچ کے سوا وہ کوئی عملی کرشمہ نہیں دکھا سکتے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ علمی
 قوت ہم میں باقی نہیں رہی۔

ہم میں ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے ہیں جو نگلی معاش کے سبب نہایت حیران و پریشان ہیں اور چاہتے
 ہیں کہ جس جیلے سے روٹی میرے لئے وہ طریقہ اختیار کریں۔

بعضے بیوپار کرتے یا دوکان کھول کر بیٹھے ہیں، اگر اپنے پاس کافی سرمایہ نہیں ہوتا تو چند اور اشخاص کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیتے ہیں لیکن سوا ان لوگوں کے جو قدیم سے تجارت پیشہ رہے ہیں باقی سب ہیشہ نقصان اٹھاتے ہیں، دلالہ کالتے ہیں، مقروض ہوتے ہیں اور کچھ کبھی بھول کر بیوپار یا دوکان کا نام نہیں لیتے۔ بعضے کمپنی میں قسمت آزمائی کرتے ہیں۔ بعضے صنایع و تعمیرات سرکاری میں ٹھیکے لیتے ہیں۔ بعضے پریس جاری کرتے ہیں۔ بعضے اخبار نکالتے ہیں۔ مگر جہاں دیکھیے اخیر میں ہمیشہ ناکامی، خسارہ اور مایوسی ہوتی ہے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عملی قوت ہماری قوم میں باقی نہیں رہی۔

اگر کسی خاندان میں حسن اتفاق سے ایک کماؤ پیدا ہو جاتا ہے تو تمام خاندان اس کے سہارے پر فسر کر معاش سے فارغ البال ہو جاتا ہے۔ ایک کماتا ہے اور میں کھاتے ہیں۔ ایک ننگاری ہے اور میں اس کے فضلہ خوار ہیں۔ وہ کماتے کماتے تھک جاتا ہے مگر یہ کھاتے کھاتے نہیں ٹھکتے۔ کماتے ہیں اور غالتے ہیں۔ معنی اپنی جان سے جاتی ہے اور کھانے والوں کو مرنہ نہیں آتا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ ہم میں قوت عمل باقی نہیں رہی۔

آٹھ برس سے محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس مختلف شہروں میں صرف اس لئے ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کی جو تدبیر کسی کے ذہن میں آئے وہ اس کو مجمع عام میں پیش کرے اور جو تجویز بعد بحث و مباحثہ کے اتفاق یا اکثریت رائے سے صاحب اور مقبول قرار پائے اس سے عام مسلمانوں کو مطلع کیا جائے تاکہ جو باتیں ان کے کرنے کی ہوں ان کو عمل میں لائیں لیکن آج تک کانفرنس کی ایک صلاح پر بھی غائب کسی نے عمل نہیں کیا بلکہ بجائے اس کے کہ خود اپنے دل میں شرمندہ ہوں اپنے کانفرنس کی کارروائیوں پر نفیس کرتے ہیں اور اس کو محض لغو اور بے سود بتاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس طرح ان میں قوت عمل باقی نہیں اسی طرح وہ اپنے فرائض کو بھی نہیں سمجھ سکتے اور مثل جادات کے اپنے آپ کو کسی تکلیف کا سھلک نہیں جانتے۔

ہماری قوم میں جو اس قابل ہیں کہ ترقی و تہذیب کے مفہوم کو سمجھتے ہیں اور اپنے میں اور دوسری ترقی یافتہ اقوام میں ان کو کم و بیش فرق محسوس ہوتا ہے وہ دو حال سے غالی نہیں یا اپنے خیال دلے ہیں یا نئے خیال دلے۔ جو پرانے خیالات رکھتے ہیں اور قومی تہذیب کے ایضاً تاج کا بخوبی اندازہ نہیں کر سکتے وہ اس جیلے سے سی و کوشش کو بے سود بتاتے ہیں کہ دیوی تہذیب اور دیوی ترقی سب بیزج ہے۔ انجام دونوں کا فاسد ہے۔ ہم کو صرف وہاں

کی فکر کرنی چاہئے جہاں ہمیشہ رہنا ہے اور بس۔

نئے خیال والے جو ترقی و تنزل کی ماہیت اور اس کے نتائج سے بخوبی واقف ہیں اور دیگر اقوام کی ترقی اور اپنے تنزل میں جو نسبت ہے اس کو سمجھ گئے ہیں ان میں اکثر کا قطعی فیصلہ ہے کہ مسلمانوں کی قوم ہرگز ابھرنے والی نہیں۔ اس کا ضعف کسی ایسے مرض کے سبب سے نہیں ہے جو رذاتِ ماوہ سے عارض ہوا ہو تاکہ اس کو قابلِ علاج سمجھا جائے بلکہ اس سبب سے ہے کہ اس میں حرارتِ غریزی باقی نہیں رہی اور اس لئے اس کو سنبھالنے کی کوشش کرنی محض بے فائدہ ہے۔

الفرض کیا پرانے خیال والے اور کینے خیال والے دونوں عموماً کسی وکوشش کو عبث اور رائیگاں خیال کرتے ہیں۔ پہلے اس لئے کہ ترقی ضروری نہیں اور پچھلے اس لئے کہ ترقی ممکن نہیں۔ اسی طرح ہمارے بعضے گروہ کچھ نہیں کر سکتے اور بعض کچھ کرتے نہیں اور یہ بہت بڑا ثبوت اس بات کا ہے کہ ہماری قوم میں عملی قوت باقی نہیں ہے۔ عملی قوت والوں سے وہ لوگ مراد نہیں ہیں جو محنت مزدوری اور پیٹنے یا حرنے کے ذریعے سے بُری بھلی طرح اپنا پیٹ پال لیتے ہیں۔ ایسے لوگ تو مردہ سے مردہ قوم میں بھی جب تک کہ اس قوم کے قوتِ مبت افراد دنیا میں موجود ہیں ضرور ہے کہ پائے جائیں کیونکہ ۵

اس شکم بے ہنر تیج تیج صبر نثار و کہ بساز و یہ تیج

نہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو زمانے کی رفتار کے موافق نہ صرف باتوں سے بلکہ کاموں سے قوم کے لئے خود نمونہ بن کر اس کو ترقی کی طرف مائل کریں مثلاً مسابقت میں جو فرامین ان کو نظر آئیں صرف ان کی برائی اور مذمت کرنے ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ خود ان کو ترک کر کے قوم کے لئے ایک مثال قائم کریں۔ مسابقت کے وہ جائز ذریعے جو قوم کی اکثر جماعتوں میں میوب گئے جاتے ہیں جیسے دوکانداری یا صنعت و دستکاری، ان کو خود اختیار کر کے ان جماعتوں کی جھبک دوڑ کریں۔ تجارت کے وہ اصول جن کے ذریعے سے کم مقدار آدمی بھی بڑی بڑی تجارتیں کر سکتے ہیں ان پر خود کار بند ہو کر قوم میں تجارت کا چرچا پھیلایں۔ اسی طرح ترقی کی ہر شاخ میں خود کچھ کر کے دکھائیں تاکہ اور لوگ بھی ان کی دیکھا دیکھی وہی رستہ اختیار کریں تعلیم جو ترقی کی جڑ ہے اُس کی اشاعت میں دم سے، قدم سے، دم سے، اقل سے غرض ہر طرح کوشش کریں۔

فقر یہ ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان جن کو ترقی کا مقدمہ ہمیشہ کٹنا چاہئے وہ اپنی قابلیت اور اپنے اپنے مذاق کے موافق ایسے کام اختیار کریں جو اولاً خود ان کے حق میں اور ثانیاً قوم اور ملک دونوں کے حق میں مفید ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ ایسے آدمی قوم میں نایاب ہیں اور اسی لئے ہم کو اس میں تسک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے قولے متحرکہ باطل معطل اور بے کار ہو گئے ہیں۔ ہماری جرأت اور دلیری مفقود ہو گئی ہے۔ ہم میں ہمت اور اولوالعزمی کا نام و نشان نہیں رہا۔ ہم کئے کو انسان ہیں لیکن جمادات سے بدتر۔ ہم نہ ظاہر زندہ ہیں لیکن حقیقت میں مردہ۔

پس ہماری قوم میں جن بزرگوں کو ترقی کا خیال ہے ان کو غور کرنا چاہئے کہ یہ عام خاموشی اور سستائیاں جو ہماری قوم میں ہر طرف نظر آتا ہے اور یہ مردنی جو ہمارے تمام طبقوں پر چھائی ہوئی ہے آیا یہ محض ایک اتفاقی بات ہے جس کا کچھ ٹکرنیں کرنا چاہئے بلکہ ایک دوسرے اتفاق کا منظر رہنا چاہئے جس سے تمام قوم کی حالت خود بخود بدل جائے؟ یا ایسا نہیں ہے بلکہ یہ دبائے عام نہایت زبردست اور قوی اسباب سے تمام قوم میں پھیلی ہے اور جب تک کہ نہایت زبردست تدبیروں سے اس کا تدارک نہ کیا جائے گا اور آئندہ نسلوں کی تعلیم میں عملی تربیت کی روح نہ پھونکی جائے گی اس وقت تک مسلمانوں میں قومی زندگی پیدا ہونی دشوار ہے۔

”منقول از مقالات حالی“

شائع کردہ انجمن ترقی اردو

تحفۃ الاخوان

(اقتباسات)

نہ غفلت کی ہے سراسر مسلط قوم پر
مصر کی نمایاں ہیں سب گویا نینس جن حیات
خاندانوں کو رہا ہے میٹ دور روزگار
پر نگاہ بدلی جو زد میں نہیں آئے ابھی
بیڑیا نوبت بہ نوبت گوسفندوں کو شکار
ہم جو بنے بھی ہیں تو اکثر بگڑنے کے لئے
قوم کو اپنے منزل سے ابھرنے کی امید
اہل دولت کا ہے اس عالم سے اک عالم جدا
جن دعاؤں کی پہنچ ہے عالمِ بالا تک
اب رہے عالم، سواتنا سوقا ان کو کہاں
کون جا کر چین میں چر دین کی دعوت کہے؟
نجات حق کون لندن میں کرے جا کر تمام؟
کون ہے ان کے سوا اسلام کے فرقوں کو جو
ان کی غفلت کا وہ عالم، ان کی فرصت کا خیال

سب کی آنکھیں یہ مٹی سستے ہیں لیکن بخیر
گو کہ بیتے جاگتے آتے ہیں غلام میں نظر
آج بگڑا یہ گمراہ، اور کل اجڑا وہ گمراہ
جانے ہیں دور گردوں کا نہیں تم گمراہ
کر رہا ہے، اور نہیں کچھ گوسفندوں کو خبر
گرتے ہیں بانسوں اُبھرتے ہیں اگر بالشت بھر
اہل علم و اہل دولت سے بہت کچھ تھی، مگر
عالمِ بالا سے بھی ہے بوکئی منزل اُدھر
ان دعاؤں کا نہیں ڈیوڑھی تلک ان کی گند
دین کا پھر کون ہے دنیا میں وہ ابھیں اگر
کون گمراہوں کی لے جاپان میں جا کر خبر؟
کون برلن میں کرے تبلیغ قرآن و خبر؟
مل کے آپس میں نہ ہونے کے کبھی شیر و شکر
ہو یہ بیڑا کیوں نہ پھر منجھدار میں زیر و زبر

ہیں یہی گروم کے ساتھ آج بے پڑائیاں

تو یہ سن لو غافل و کل ہیں کٹڑی روئائیاں

ایسے کچھ بیٹھے ہیں فارغ یا رب کھولے کمر
جو ہم درمیش تھی وہ کرچکے گویا کرسمس

ہو گیا وہ بیچ جو بویا تھا خسل بارور
باندھ کر اٹھے تھے جس منزل سے احرام سفر
سب یہ مگنو کے سے چکارے ہیں اے اہل نظر
اس اندھیرے ہی میں آتے ہیں یہ سب طبع نظر
اس اندھیرے سے ذرا نکھو ابلے میں اگر
اس سے آگے کچھ قدم ہم نے بڑھایا ہے مگر
اور بڑھتے ہیں گزروں، ٹپھتے ہیں ہم گرا نچھ بھر
اتے ہی یاں گھٹ رہے ہیں بڑھ رہے ہیں حجب
خاک ہے وہ لگو کہ ہے پہنچا ہوا اظلاک پر
کیا تجارت کیا صنعت، اور کیا علم دہنر
جن کے مالک ہیں وطن کے اہل ہمت سرسبر
جن میں امیدیں ہیں شل روز روشن جلوہ گر
شام کو قلیوں کی اک فوج آئے گی تم کو نظر

کون سا پستی کا حصاب ہے اس کے بعد؟

یہ وہ پستی ہے کہ بس تحت الشراہ اس کے بعد

بھاگوں ایسے بھی ہیں اس قوم میں پر خال خال
ساتھ ملین میں جو وہ ان بھاگوں کی مثال
ان کو کیا راحت ہے جن کی قوم ہر خستہ حال
ہے ہزاروں مغسوں میں ایک اگر آسودہ حال
ہوں ہزاروں گدڑیاں اور ایک کے کانڈھے پر مثال
دی جو دنیا و اخوت اس نے کل امت میں مثال

قوم میں تعلیم پیلانی تھی سو سپہ سلاچکے
پر جو بیچ پوچھو تو ہم اب تک اسی منزل میں ہیں
روشنی تعلیم کی کچھ کچھ جو یاں پاتے ہو تم
ہے جمالت کا اندھیرا ہم پہ جو چھایا سوا
سایے ہو جاتے ہیں چمکائے ابھی کا فوریہ
ہم نے یہ مانا کہ تھے ہم جو زمیں کپڑے پہنے
دیکھنا یہ ہے کہ اوروں سے ہو کیا نسبت ہیں؟
جبکہ ٹھیری ہم میں اور اوروں میں نیست تو ہم
پست ہے ہمسرے جو اپنے، یہ سمجھا دو اسے
اپنی پستی کے نشاں پاتے ہیں ہر منزل میں ہم
کھل رہے ہیں جو کلوں کے کارخانے ملکین
جو کہ ہیں ملکی ترقی کے لئے اک فال نیک
قوم کا حصہ نہ واں پاؤ گے تم اس کے سوا

ہم نے مانا ہے موافق جن سے دور راہ وصال
چند جانیں بیچ رہی تھیں جو کہ قوم نوح میں
ان کی کیا عزت ہو یا رو؟ قوم و جن کی ٹیل
ہے وہ ایسا غول میں قلیوں کے جیسے ایک سیٹ
مثال گدڑی سے جو واں سو مرتبہ بدرجہاں
یا درکھو! ہے فراخ اسلام کا دامن بہت

ہیں اسی امت میں جو دھوٹے ہیں نہ بھر ٹوکری
 ہیں انھیں میں جن کے سپنے میں نہیں آیا سماں
 جسے آنکھ ان کی کھلی دکھیا گھر میں اپنے کال
 سامنے ایک ایک کے پھیلاتے ہیں ست و آل
 نام لیں فرست سے اسلام کی اپنا نکال
 ان کی ذلت میں انھیں غتے رہنا ہر محال
 غیر قوموں میں نہیں حاصل اُسے جز انفعال
 یہ وہی کو اہے، لیکن سنہس کی چلتا ہر چال
 وہ ہی خطہ ہر جس کے ڈر سے مال مجاہد
 کر رہے ہیں اپنی اپنی قوم پر قربان سب

”منقول از کلیات نظم حالی“

ترتیب شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی

روح مسحور

فرانس کے شہرہ آفاق نثر نگار رماں رولاں کی تازہ ترین تصنیف ایک مسلسل ناول ہے جو جتنے جتنے چھ جلدوں میں *The Soul Enchanted* ("روح مسحور") کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس معرکہ الآرا ناول کی جان ایک عورت اینٹ ریویر کی سیرت کشی ہے جس میں فطرت انسانی کے اس رمز شناس نے اپنے آرٹ کا پورا اعجاز دکھا دیا ہے۔ اینٹ کا بچپن اور عہد شباب گھر کی محفوظ چار دیواری میں بسر نہیں ہوا بلکہ بہت سی شورشوں، طغیانوں اور طوفانوں میں سے گزرا ہے۔ اگر وہ معمولی مٹی کی بنی ہوئی ہوتی تو اس بچہ پر آشوب ہیں اس کی شخصیت تنکے کی طرح بہ جاتی لیکن اس کو فطرت نے یہ صلاحیت بخشی ہے کہ وہ ہر تجربے سے خواہ وہ کتنا ہی تلخ اور ناگوار کیوں نہ ہو اپنی سیرت کی تعمیر کرتی ہے۔ اس کی نظر زیادہ وسیع، اس کا دل زیادہ حساس، اس کا دماغ زیادہ روشن ہوتا جاتا ہے، اپنی نغزشوں اور کمزوریوں کی بدولت اس کی نظر فطرت انسانی میں زیادہ گہری ہو جاتی ہے اور اس کی نگاہ ان پردوں کو چیرتی ہوئی چلی جاتی ہے جن میں ہم اپنی روح کی واردات کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں اس کا عمل اس اصول پر ہے کہ

دراں زرد و سار اگر خستہ تن شوی

خوگر بہ غار شو کہ سراپا چمن شوی

اس ارتقائے سیم کا نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ زندگی کے نصف النہار سے گزر کر شام کی طرف مائل ہوتی ہے تو ہم اس کے دل اور دماغ کو ان غیر معمولی خوبیوں سے مالا مال پاتے ہیں جو عافیت کی زندگی کا غم نہیں ہوتیں بلکہ دنیا کے گرم و سرد اور تلخ و شیریں تجربات کو بھیلنے سے پیدا ہوتی ہیں اس کے دل میں اتنی وسعت ہے کہ سارے جہان کا دکھ درد اس میں سما جائے۔ اس کی روح میں انسانی آزادی کے لئے ٹپ ہے جس کی وجہ سے وہ تمام عمر ایک مجاہدانہ زندگی بسر کرتی ہے اور

ن تمام قوموں اور شخصوں کے خلاف جنگ کرتی ہے جو موجودہ یورپ میں انسانی ضمیر کی آزادی کا
 دن کر رہی ہیں اور حق پرستوں اور افضاء دوستوں کے لئے عرصہ حیات کو تنگ کر رہی ہیں۔ مگر
 اس کی سیرت کی سب سے زبردست خصوصیت اس کی بے پناہ اثر آفرینی ہے۔ جو شخص 'مرد'
 عورت، جوان، بوڑھا اس کے اثر میں آجاتا ہے اس کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ وہ نہ صرف
 سونے کو کندن بنا دیتی ہے بلکہ کچے لوہے کو بھی فولاد میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اس سے ٹکرا کر پتھر
 سے شرابے پھٹنے لگتے ہیں۔ اس کے خالق مجازی نے اس کی محبوب سیرت میں انسانیت اور
 قیادت کے بہترین جوہر جمع کر دئے ہیں :-

نگہ بست، سخن دل نواز، جاں پُر سوز

یہی ہے رخت سفر میر کا ررداں کے لئے

شاہراہ زندگی پر اس کو جو دوست اور عزیز ملتے ہیں وہ ان کی فطرت پر اپنی آزاد روح کے
 آتشیں نشان ثبت کرتی چلی جاتی ہے۔ انہیں میں سے ایک دوست ایک نامور سائنس داں
 جو تین ہے جس کی سیرت کا ارتقا فقہ طور پر ذیل کے ترجمے میں دکھایا گیا ہے تیس سال قبل
 اس کی نسبت ایٹم سے قرابائی تھی لیکن اس وقت تک اس کا دل و دماغ سماجی بندشوں
 اور تحصیلات کا غلام تھا۔ اس نے اپنی خوش نصیبی کو نہ پہچانا اور سوسائٹی کے اعتراضات اور
 ناراضگی کے خوف سے ایٹم کو ہاتھ سے کھو دیا۔ لیکن ایٹم کے اس اثر کو کیا کرتا جو نہایت
 خاموشی کے ساتھ دن کی پھلتی ہوئی روشنی کی طرح، بغیر اس کے علم کے، اس کی روح کے اندر
 سرایت کر گیا تھا۔ چونکہ زمین سنگلاخ تھی اور اس پر بہت کچھ خس و خاشاک اور اینٹوں پتھروں کا
 انبار تھا اس لئے ان بے باک بچوں کو پھوٹنے اور اگلنے میں حوصلہ لگا جو ایٹم نے اس کی طبیعت
 میں بوئے تھے لیکن وہ رفتہ رفتہ ظاہر ہو کر رہے۔ مندرجہ ذیل صفحات سے کچھ اندازہ ہو گا کہ
 کس طرح یہ قدامت پرست، روایت پسند، کمزور دل کا سائنس داں اپنے زمانے کی ایک
 متحرک اور حرکت آفریں قوت بن گیا -

جن حضرات نے رومانِ رولان کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے انہیں اندازہ ہو گا کہ اس کی تحریر میں ایک خاص اندازِ گریز ہے جس کی وجہ سے ترجمہ میں بہت وقت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جذبات، خیالات اور واقعات کی طرف نہایت لطیف اور ضعیف اشارے کرتا ہو گا گزر جاتا ہے اور اکثر خیالات کے منطقی تسلسل کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ لہذا اس ترجمے کی خرابیوں اور نقائص کی ذمہ داری زیادہ تر تو میری ذاتی ناقابلیت پر ہے لیکن ایک حد تک اس کا سبب مصنف کا مخصوص اندازِ تحریر بھی ہے جس میں ایک شانِ دل آویزی ضرور ہے لیکن اس میں وضاحت سے زیادہ طائر خیال کی سبک رفتاری اور بظاہر بے راہ روی کا اظہار ہوتا ہے۔

یہ ترجمہ ”روحِ سمور“ کی پانچویں جلد Combat (جنگ) میں سے کیا گیا ہے۔

خواجہ غلام السیدین

جوآین نے کبھی آرام نہیں لیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں آرام لینا آتا ہی نہیں کام کے بغیر اس کا جینا محال تھا۔ روزی کمانے کے لئے نہیں بلکہ اپنی ذہنی زندگی کی تشفی کے لئے اس کو کام کرنا لازم تھا۔ اس شدید باغی محنت نے اس پر دوسرے خیالات کی راہیں بند کر دی تھیں مگر ابھی طرح بند نہ کی تھیں کیونکہ کبھی کبھی دروازہ کھل جاتا اور ہوا کے جھونکے اندر آ جاتے اور جوآین ابھی طرح گرم نہ ہو پاتا تھا۔

لیکن اب وہ اپنے پرانے مکان میں آگ کے سامنے بیٹھا سردی سے نہیں کانپتا تھا جیسا اس زمانے میں اس کا حال تھا جب اس کی اینٹ سے راہِ درمِ قحطی۔ وہ ماضی کے گھر سے باہر نکل آیا تھا اور اس نے طبقہ متوسط کے تمام تعصبات کو بھاری کپڑوں کی طرح تار کر پھینک دیا تھا۔ اینٹ نے اس کی کتابوں کو چڑھا تھا اور اس کی حقیقت شناس آنکھوں کے سامنے اپنے اس پرانے دوست کی فطرت بے نقاب ہو گئی تھی۔

پینتیس سال کی عمر میں اس متوسط طبقہ کے فرانسیسی کے لئے جو فطر تاؤڈر لوک اور بزدل تھا جس کے بچپن پر اس کی سخت گیر اور مطلق العنان ماں کی حکومت مسلط رہی تھی جس کے خوش عقیدہ، قدامت پرست مہربی خاندان کے صدیوں پرانے اخلاقی اور روحانی عقیدوں نے پرانے لباس کی طرح اس کے دماغ کو جکڑ دیا تھا۔

اپنے نفس کا اس قدر مکمل اور تدبیر کی محاسبہ کرنا بڑی جرأت کا کام تھا۔ مگر اس نے بغیر اپنے نفس کو دھوکا دے ایک ایک کر کے ان تمام چیزوں کو اتار پھینکا تھا جن پر اس کو پہلے عقیدہ تھا لیکن وہ اس امتحان میں باطل ثابت ہوئی تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس حرکت کے بعد انسان کو اپنی عیانی کا شدید احساس ہوتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ خود کو کس طرح ان لوگوں کو دکھائے جنہوں نے اسے انہیں جھوٹوں میں بلوس دیکھا ہے جن میں وہ اپنی عیانی کو ڈھانپنے ہتے ہیں جو ساری دنیا کی عیانی دیکھنے کو تیار نہیں ہوتے جو اپنی روح کی اصلی صداقت کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں اور اسے شغل پوشیدہ اھنسا کے انجیر کے پتے سے ڈھانک لیتے ہیں۔

جولین کی حالت اس وجہ سے زیادہ نازک تھی کہ وہ ان کم مائیہ تارکین مذہب میں سے نہیں تھا جو ایک عقیدہ کو آسانی سے ترک کر کے دوسرے کو آسانی سے اختیار کر لیتے ہیں اور آزاد خیالی اور لائبرلزم کے جذبات کی خدمت کرنے لگتے ہیں۔ وہ بازار میں تنہا کھڑا تھا اور سردی کے جھونکوں میں اس کا جسم عریاں تھا۔ یہ بڑی کٹھن آزمائش تھی لیکن شخص باوجود اپنی طبیعت کی کمزوری کے اپنے راستے سے نہیں ہٹا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے گھر والے ایسے تھے جنہیں اس کی ذہنی تنگدستی کوئی دلچسپی نہیں ہوئی۔ یہ بڑی عروسی ہے کہ کسی شخص کو کوئی ایسا ذوق نہ ملے جس سے وہ متش دان کے سامنے بیٹھ کر تبادلہ خیال کر سکے لیکن اس میں آسودگی بھی ہے کہ کمال اس شخص کا کیا حال ہو گا جس کو اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں ایسے شخص کے ساتھ بننا پڑے جو اس کے خیالات اور عقائد سے دشمنی رکھتا ہو؟ اس کی ماں نے اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے اس کی شادی ایک تندرست ”سلیم“ متعل ”عورت سے کر دی تھی جو صاحب جائد تھی، خاصی خوبصورت تھی، گھر کا انتظام اچھا کرتی تھی لیکن تپش ناز آتش امی اور باتنی ہر اعتبار سے ناقابل! اور اس کا دماغ ہر قسم کی کاوش اور جستجو سے اس درجہ بے نیاز تھا جو اس کی قسم کی عورتوں کے لئے بھی غیر معمولی بات تھی۔ وہ کبھی کتاب کو کھول کر نہ دیکھتی تھی۔ شادی سے پہلے جو بانی کے زمانے میں اس نے خانقاہ کے مدرسے میں بہت سی کتابوں کو مجبوراً پڑھا تھا اور ان کو ٹپتے ہوئے بارہا جابجائیاں لی تھیں۔ اب وہ ان سے اس درجہ اکتا گئی تھی کہ اس کے خیال میں شادی کا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ اطمینان کے ساتھ انہیں متفصل کر سکتی تھی۔ اسے یہ سکایت نہ تھی کہ اس کا شوہر اپنی زندگی کا غدوں اور کتابوں میں بسر کرتا ہے۔ مردوں کے اپنے کاروبار ہوتے ہی ہیں اسے ان میں کوئی دلچسپی تھی۔

اسے نہ اپنے شوہر سے بہت محبت تھی نہ نفرت۔ اسے روز کھانے کی میز پر اور شب خوابی کے وقت اس کی صحبت ناگوار معلوم نہ ہوتی تھی لیکن خدا نخواستہ زیادہ باعث مسرت بھی نہ تھی۔ وہ طبعا کافی جریں تھی اور جولین میں حرص کا مادہ نہ تھا۔ مختصر یہ کہ اسے اپنے شوہر سے معمولی محبت تھی لیکن اتنی نہیں کہ اسے یہ کرید پیدا ہو کہ اس کے دل و دماغ پر کیا وارداتیں گذر رہی ہیں۔ اس کے غامگی فرائض میں یہ چیز شامل نہ تھی کہ وہ اس بند ساری کی جھاڑ پونچھ بھی کرے۔

اے شہید اس روحانی زلزلے کی مطلق خبر نہ ہوتی جس نے اس کے شوہر کو پچیس سال کی عمر میں اُس قناعت شعار جو دوسرے مجسمہ جوڑ کر بیدار کر دیا تھا جو ”معتولیت پسند“ لوگوں کے بنائے ہوئے نظام معاشرت و مذہب کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتا ہے لیکن اس کے نیک نیت دوستوں اور اس پادری نے جو اس کا اعتراف سنا کرتا تھا اس کو واضح طور پر یہ بتایا تھا کہ ایک نیک عیسائی بیوی کا کیا فرض ہونا چاہیے اگر اس کا شوہر اپنی مثال اور عمل سے اپنی جماعت کی روحانی رسوائی کا باعث ہو۔ اب بیوی نے میاں کے سامنے رقت و زاری اور بحث و احتجاج شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کھڑکھڑاہن تو برباد ہو گیا لیکن نظام اخلاق کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچا کیونکہ ظاہر ہے کہ بیچاری نیک نیت کا فائس مطلق یہ سمجھتی تھی کہ اس کے شوہر کا جرم کیا ہے۔ لہذا اس کی گفتگو کے ذریعے اس کی اصلاح ہونا ناممکن تھا۔ وہ لوگوں سے ان تمام معاملات میں بہت ڈرتی سے پیش آتا تھا جن کا تعلق اس کی آزاد خیالی سے ہو۔ اور اس عنوان پر اس کی بیوی کی حماقت اس قدر صراحت کے ساتھ ظاہر ہوتی تھی کہ وہ اس کی پردہ پوشی کرنے سے قاصر تھا۔ اسے خود بھی کبھی کبھی اپنی حماقت کا وہند لاسا احساس ہوتا تھا لیکن اور سب جو توفوں کی طرح اس کی حماقت نے اس کی ضد میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ خدا جانے اس معاملے کا کیا حشر ہوتا اگر اس کے پادری نے جو اس سے زیادہ مصلحت شناس تھا اُسے خاموشی کی ہدایت نہ کر دی ہوتی۔ کیوں کہ اسے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں ان عاقبت شناس طریقہ پر مذہب کی حمایت کر کے وہ کوئی قسبہ رسوائی پیدا نہ کرے۔ وہ اپنے جہر میں بیٹھا اس مصیبت زدہ بیوی کی رقت اور پریشاں بیانی کو سنتا تھا اور اس کی بے ریاض کایات اور اندیشہ تک نیک نیتی کو روکنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس عورت کو مجھے جس میں پہلی دفعہ حوادثِ فتنہ فکری کی جنت سے نکال دیا تھا وہاں دوبارہ واپس پہنچنا ضروری تھا۔ اسے اس مقصد کی تکمیل میں زیادہ مشکل نہیں ہوئی کیونکہ اس نے

گرمی رہتی لیکن اپنے خیالات کے بارے میں لپٹ کر وہ اپنا کام بغیر کسی دخل اندازی کے انجام دے سکتا تھا۔ اسے زندگی سے زیادہ توقعات رکھنے کا کوئی حق نہ تھا کیونکہ اس نے اپنی زندگی کو تباہ کر دیا تھا بے شک تباہ کر دیا تھا۔ یہ بات اس کی ذہن کی گہرائیوں میں ایک بہم عقیدہ کی طرح مسلط تھی۔ وہ اس بات کی اعلیٰ طاقت تھا کہ اس جذبے کی تیر کو نہ ٹوٹے۔ اب کیا فائدہ؟ اسے ایک موقع نصیب ہوا تھا مگر اس نے یہی نہیں کہ اسے ہاتھ سے کھو دیا ہو بلکہ اس کو صریحاً مسترد کر دیا تھا۔ اس نے خود کو اس عورت سے چھڑا لیا تھا جس میں اس کی سچی رفیق حیات بننے کی صلاحیت تھی۔ سولہ برس تک اس کی داخلی زندگی جس پر اس غیر موجود دوست کی عمرانی تھی، لوگوں کی نظر سے پوشیدہ اس کی خارجی زندگی، اس کی ازدواجی اور خانگی زندگی سے باہر دیا اس کے اندر (بہر ہوئی تھی)۔ یہ محض اینٹ کے چہرے کی یاد دیا اس کا جہانی تصور نہ تھا (وہ بھی ضرور تھا لیکن یہ ذی فہم شخص دل کے معاملات میں کم نظر واقع ہوا تھا اور دوست کی جہانی تصویر مدہم پڑ گئی تھی) جو اس کے دل و دماغ پر عادی تھا بلکہ وہ آتشیں نشان جو اس نے اس کے دماغ کی تہ میں چھوڑا تھا۔ جولین کی اندرونی زندگی میں اس کی وجہ سے انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔ ایک مدت گزرنے کے بعد یعنی ۱۹۵۷ء سے آج تک اس کی اینٹ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن اینٹ کا اثر اس کی روح میں کارفرما تھا۔ حسرت و افسوس نے اندر ہی اندر اس کی روح کو اس سانچے میں ڈھال دیا تھا جو وہ اس کے لئے پسند کرتی تھی یا جو لین کا اپنا خیال تھا کہ وہ اس کے لئے پسند کرتی۔

لہذا اپنی زندگی کی اس عظیم الشان جدوجہد اور اپنی آزاد خیالی کے لئے وہ اینٹ کا مرمون منت تھا۔ اس پوشیدہ خمیر نے پانی کو شراب بنادیا اور اس دماغ کے اندر جو گھر کی چار دیواری میں محدود تھا سائے عالم کائنات کے بے باک بیج بوئے۔ ان کو زمین سے پھوٹ نکلنے میں کافی عرصہ لگا لیکن وہ خود اپنے دوستوں و عزیزوں اور ساتھیوں سے بہت پیشتر محسوس کرنے لگا تھا کہ آزادی کے بیج اس کی روح میں کمین ہیں۔ اسے ان کی نقاب کشائی کرنے کی جلدی نہ تھی۔ اس ابتدائی زمانے میں اس نے جس قدر کتابیں لکھیں سب سائنس کے مضامین پر تھیں۔ ان سے اس کے اجتہاد و فکر کا ضرور پتہ لگتا تھا لیکن وہ تمام تر اصلاحی مسائل تک محدود تھیں۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ مصلحت شناسی اور احتیاط؟ یا اپنے دوستوں اور عزیزوں

کالعدم جن کو یقیناً اس کے بے باکانہ نظار خیال سے تکلیف ہوگی؟ یا اعلان جنگ کے لئے آمادہ نہ ہونا؟ یا اس کی فطری محبک جو اس کو اپنی خودی کے پوشیدہ ترین رازوں کے متعلق اجازت گفتار نہ دیتی تھی؟ یا ممکن ہے کہ ان سب سے بڑھ کر اس کا باعث وہ رازداری کا جذبہ ہو جس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے دل کے تمام گہرے اور بیش بہا معاملات کو جو اس کے اور اس کی روحانی زندگی کی خیالی شاہدینی اس کی غیر موجود اینٹ کے درمیان مشترک تھے احتیاط کے ساتھ پردہ خفائیں رکھے؟

مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس نے اس درمیان میں اصلی اینٹ سے لٹنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ اس کا پتہ لگاتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ اور یہ کوئی بڑی مردانگی کی بات نہ تھی یا اپنی پریشانی کے اندیشہ سے اس نے یہ بھی معلوم نہیں کیا کہ اینٹ کو کسی مصیبت یا متحاجی کی وجہ سے امداد کی ضرورت تو نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسی بات تھی جیسے بعض ”بہت کمزور دل کے لوگ“ کسی جانور کو زخمی یا کھلا ہوا دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں کیونکہ وہ نظارہ ان کے لئے بہت تکلیف دہ ہوتا ہے یا ممکن ہے تکلیف دہ ثابت ہو اور اسی سبب سے وہ اس کے زخم کی مرہم پٹی کرنے کی کوشش نہیں کرتے؟ ہم ایسے بے ہمت لوگوں کو خوب سمجھتے ہیں اداہ خود کو اس بات پر بہت ملامت بھی کرتا تھا کہ اس کا شمار ایسے لوگوں میں ہے۔ حالانکہ اُسے اپنی اس کمزوری کا مسلم ہے۔ اُسے اپنی ان پرانی کمزوریوں کو دور کرنے میں کافی مدت لگی بلکہ درحقیقت وہ کبھی بھی ان پر پوری طرح قابو نہ پاسکا۔ گلدان کی تہ میں ذرا سا زنگ باقی رہ گیا تھا اور اس کے ناخن برابر اس کو کھرچتے رہتے تھے۔

زنگ ہر کسی میں ہوتا ہے اینٹ میں بھی تھا۔ لیکن روح کی نجات دراصل اس میں ہے کہ پانی بتنا رہے اور زندگی کی نمایاں بندہ ہونے پائیں۔ تازہ پانی ہو، نیا پانی ہو..... بدترین روحانی فساد وہ ہے جو تالاب کے بند پانی کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ جتنی ہوئی ندی تو اپنے برتن کو دھو کھان کر دیتی ہے۔ اینٹ کی ندی ہمیشہ جتی رہی تھی۔ اس نے جولین کو جھوڑ کر اس کے محبوبانہ جمود سے نکالا تھا اور اس روحانی جہنم سے نجات دلائی تھی جس میں وہ فحاشی کے ساتھ پناہ گزین ہو گیا تھا اور جس میں ہزاروں انسانی کیڑے کوڑے نباتات کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس نے خود دکھا اٹھا کہ اپنے جذبات کی شدت اور جوش سے اور اپنے تاریکی میں چپکتے ہوئے شعلے کے اثر سے اس میں حرکت پیدا کر دی تھی اور زندگی کے راز

اس پر کھول دئے تھے۔

علاوہ اس کے (یہ بات قابلِ افسوس ضرور ہے لیکن سچ ہے)، اس کا روحانی ارتقا بہت کچھ اس صدمہ کی بدولت ہوا تھا جو اس کی ذات سے اینٹ کو پہنچا تھا جب ہم اپنے محبوب کو بے جا دکھ پہنچاتے ہیں اور ہم میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ اس کو شدت کے ساتھ محسوس کریں تو یہ علم ہماری روح کے لئے ایک پیغامِ بیداری بن جاتا ہے۔ اس تجربے کے طفیل اور اپنی ندامت کی وجہ سے فطرتِ انسانی کو سمجھنے میں جہلین کی نظر زیادہ گہری ہو گئی تھی، انصاف کا احساس قوی تر ہو گیا تھا۔ اس کی فطرت کا ہر وقت یہ تقاضا تھا کہ اس نے ایک کو جو تخلیقِ پہنچائی تھی اس کی تلافی دوسروں کی خدمت کے ذریعہ کرے۔ اینٹ نے اس کی طرف سے قرضہ ادا کیا تھا۔ (اب اسے اینٹ کا قرضہ ادا کرنا تھا۔)

جولین کا تعلق فرانس کے قدیم متوسط طبقے سے تھا جس میں بہت سی پرانی خرابیاں بڑکچک گئی ہیں جو جمع کی ہوئی دولت کو بہت سختی کے ساتھ اپنی گرفت میں رکھتے ہیں لیکن یہی لوگ اولے قرض کو اپنا فریضہ نہ سہی سمجھتے ہیں اور انھیں ہر وقت یہ فکر و امن گیر رہتی ہے کہ مرنے سے پہلے اسے ادا کر جائیں جب وہ اپنے کھیتوں میں چلے پھرتے ہیں تو پرندوں کے گیت ان کو موسمِ بہار اور کیفِ محبت کی یادیں دلاتے۔ انھیں تو بشر کی آواز بھی یہی کہتی سنائی دیتی ہے:

”اپنے قرضے ادا کر دو، اپنے قرضے ادا کر دو۔“

جولین نے اپنا قرضہ ادا کر دیا۔

کون اس کا یقین کر سکتا تھا؟ شاید اسے خود بھی اس کا علم نہ ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ انھیں قرضوں کو ادا کرنے کی وجہ سے اس نے خود کو جنگِ عظیم کے زمانے میں اپنی مرضی کے خلاف اس معاشرتی تشکیش میں گھرا ہوا پایا جس کے خیال سے بھی اس کا جسم اور روح دونوں گریز کرتے تھے۔ اس تہلکہ سے پیشتر جب اس کی غیر منتوح روح اپنی خودی میں محصور اپنی قوتوں کو مجتمع کئے آزادی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہی تھی تو اینٹ منظرِ پوشیدہ، ہر وقت اس کے ساتھ تھی۔ اس کو لبِ ہلانے کی ضرورت نہ تھی۔ اسے یہ دکھائی دیتا تھا کہ وہ اس کے سامنے چلی جا رہی ہے اور وہ کبھی خود سے یہ سوال نہ کرتا تھا کہ

یہ راستہ اسے کہاں لے جائے گا۔ راستہ صرف ایک ہی تھا، وہ راستہ جس پر اس کے قریب ہی اینٹ کے سبک زنا قدم اٹھ رہے تھے۔

اس کی تصانیف کا رجحان رفتہ رفتہ سائنس کی تاریخ اور فلسفہ کی طرف ہوتا جاتا تھا اور عمل اور عمل کے تسلسل سے اس کا دماغ ایک طرف تو خود کو دین سمجھنے کی ان پیچیدہ داریوں سے راہ کر رہا تھا جو اس کی نقل و حرکت کو روکتی تھیں اور دوسری طرف اسے خیالات کے ایک ایسے جنگل میں لے جاتا تھا جو نہ صرف مذہب کی حدود سے آگے نکل گیا تھا بلکہ اس کے زمانے کی سائنس اور عقلیت کی حدود سے بھی پرے تھا۔ یہ سفر ایسا ہی معرکہ خیز تھا جیسے واسکو ڈے گاما کا سفر اور اس کے لئے بھی طوفان کی راس کا طوفان کرنا ضروری تھا۔ ایک دفعہ لنگر اٹھانے کے بعد قیام کے لئے کوئی بندرگاہ نہ تھی بھڑا باد اور موجوں کے جرم پر بھر دوسرے تھا خشکی کو خیر باد کہنے کے بعد انسان کا وطن یا تو سمندر کی سطح ہے یا اس کی تہ! کتھولک مذہب کا لاطینی پیرو ایک دفعہ اپنے عقیدوں کو ترک کرنے کے بعد شک کے سمندر میں کبھی لنگر نہیں ڈالتا۔ وہ ان جرموں اور انگریزوں کی طرح ایک جگہ پر قائم نہیں ہوتا جو محض احتجاج کرتے ہیں یا جنھوں نے مدت ہوئی پرائسٹن بن کر احتجاج کیا تھا۔ وہ توبہ دہا تہ کو پہنچنا چاہتا ہے اور تہ ہوتی ہی نہیں! وہ پانی کے نیچے اپنے لئے کوئی لکڑی کا ٹپل نہیں بناتا جو تاریک گہرائیوں کے اوپر معلق ہو مشکل ”مصلحوں“ کے جو ہمیشہ آدھے کو مسترد کرتے ہیں اور آدھے کو قبول کر لیتے ہیں! وہ تنہا ہوتا ہے اور عیاں اوڈ تیرا چلا جاتا ہے۔ اس کو پانی پر سہارنے کے لئے صرف اس کے ہاتھ پاؤں ہوتے ہیں۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ٹوہنے کا وقت آنے والا ہے لیکن وہ بچاؤ کے لئے کسی کا سہارا نہیں تکتا۔.....

جولین نے خود کو عقل کی سخت گیر اور حقیقت شناس راہبری کے سپرد کر دیا تھا جو ناحق سے کوئی مضاہمت کرنے کو تیار نہیں ہوتی بلکہ ان لوگوں کے جو مروجہ عقائد اور سوسائٹی کی عائد کی ہوئی تمام مذہبی اور قیود کے سامنے اپنا تسلیم ختم کر دینے کے بعد ان سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ اسے دونوں سے ایسی شدید مخالفت پیدا ہو گئی تھی جو انصاف کی حدود سے بھی متجاوز تھی۔ وہ اس بات کو نو بھی سمجھتا تھا لیکن اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ اس انتقام سے دست بردار ہو جائے۔ وہ خود کو کلامت کے طور پر ”مرد جولین“ کہتا تھا۔

اور اس آرزوئے انتقام میں جو جلد اس کی تحریروں میں ظاہر ہونے لگی وہ دراصل خود کو سزا دے رہا تھا یعنی اس شخص کو جو وہ پہلے تھا۔

یہ بات پہلی مرتبہ اس کے فلسفیانہ مضامین میں رونما ہوئی۔ مذہبی گروہ نے یہ محسوس کیا کہ ان میں مذہب پر حملہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے اس کے خلاف بہت شور و غوغا کیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ چوٹ کاری لگی ہے۔ اس نے اور زیادہ چوٹیں کیں مگر چند تلخ اور شدید مغالوبوں کے بعد ان لوگوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ مصلحت پسائی اور خاموشی میں ہے (اس معاملے میں تمام ”صحیح الخیال“ اخباروں نے حیرت انگیز اتحاد عمل ظاہر کیا اور جولین کی تصانیف کا ذکر کرنا بھی چھوڑ دیا) مگر جولین اور اس کے قدیم ساتھیوں میں صاف صاف تفرقہ پڑ گیا تھا۔ پرانے ملاقاتیوں سے سلام علیک اب بھی ہوتی تھی لیکن وہ کھلم کھلا ظاہر داری تھی۔ اس سے کسی کو دھوکا نہیں ہو سکتا تھا۔ پیشین گوئی کرنے والے کہا کرتے ہیں کہ ”نوجوں کی تیاری جنگ نہیں ہے“ لیکن وہ اس وقت ایک دوسرے کو دیکھ کر اطمینان کے ساتھ مسکراتے نہیں۔ جنگ ہونے والی ہے، جنگ اسپینچی، گھنٹہ بجنے کی دیر ہے۔.....

جولین کے مخالفوں نے غالباً خود جولین سے زیادہ واضح طور پر صورت حال کو سمجھ لیا تھا کیونکہ خود اسے ابھی پوری طرح اس انقلابی روح کا احساس نہیں ہوا تھا جو اس میں پوشیدہ تھی۔ جب موٹر کاریں ہر وقت سڑک کے کنارے کی عمارتوں کے بیچ میں سے شور مچاتی ہوئی گذرتی رہتی ہیں تو بناوت کی ”خودکلامی“ پر خواب کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جیسے سڑکوں کی تکلیف دہ پھڑک۔ وہاں چیزیں کیا ہے جیسا کہ انسان اپنے دانت جمانے، لیکن یہ سکون فریب دہ ہے۔ جولین کو معلوم تھا کہ اس کی بے پناہ تنقید اس کے مردہ عقائد کی سطح کو توڑ کر سوسائٹی کے سڑے ہوئے خول تک پہنچ گئی ہے۔ اب اس کا فرض تھا کہ وہ اپنے نشتر سے اس پیپ سے بھرے ہوئے زخم کو اند تک ٹٹولے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اس بات کو ثابت کرنے میں تاخیر کی کہ تمام نظام معاشرت اور اس کے بنیادی اخلاقی اصول بگڑ چکے ہیں اور تباہ ہونے والے ہیں مگر وہ ایسا کرتا تو اسے اپنے لئے کوئی دوسرا مکان تلاش کرنا پڑتا اور چالیس سال تک ایک گھر کے اندر زندگی گزارنے کی وجہ سے اس کو نفل مکان کے خیال سے وحشت ہوتی تھی لیکن وہ

یہی جانتا تھا کہ اسے پرانے مکان کو چھوڑنے کا نوٹس مل چکا ہے لیکن وہ تن بہ تقدیر اس صلت کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا جب اسے مجبوراً وہاں سے جانا پڑے گا۔۔۔۔۔ علاوہ بریں ماضی کی اس کارواں سرائے میں ایک بہت بڑا بازار ایسا بھی تھا جس کی کچی دالیں کرنے کو اس کا دل نہ مانتا تھا مگر وہ اس کو کھول کر دیکھنے کے لئے اندر بھی نہ جاتا تھا۔ وہاں صدیوں سے خاک جمی ہوئی تھی اور اس نے اس خاک آلود مکان کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی تھیں۔ اس میں دن کی روشنی لانا اور جھاڑو دینا کساں کی مصلحت ہے! وہ بڑا بازار وطن کا بازار تھا۔ ۱۹۱۴ء سے پہلے فرانسیسیوں کا صرف یہی ایک دیوتا تھا جس کے آگے سب سر جھکاتے تھے اور تمام دیوتاؤں پر زندگی کے عام قانون کی مگرانی تھی؛ یعنی مجموعی اور انفرادی موت کی بڑھاپے کی بیماری کی، کیرٹے کٹوروں کی جو منبر کو کھا جاتے ہیں۔ بسولے وطن کے اور کوئی دیوتا ایسا نہ رہا تھا جس پر جلد یہ کیا گیا ہو۔ مگر اس بارے میں مذہبی لوگ اور آزاد خیال سب ہی متفق تھے بالخصوص آزاد خیال لوگ کیونکہ اس کے علاوہ ان بچاروں کو کہیں قدم جانے کی جگہ تک نہ تھی کیسی دردناک اور قابلِ رحم تھی یونیورسٹی کے استاد اعظم بوڑھے لیویس کی یہ فریاد: ”اگر تم میرا وطن مجھے چھین لو تو میرے پاس کیا رہ جائے گا؟ پھر میں کاہے کے واسطے زندہ رہوں گا؟“

انفس ان بوڑھے آدمیوں پر جو آخری دن تک اپنی پھاڑیوں کی پُرکون مگرتنگ فضا میں بند رہے! ان کے لئے ضروری تھا کہ یہ زمین جس میں ان کے تمام مردے پندرہ سو برس سے گڑے ہوئے تھے، ان کے قدموں کے نیچے ہو۔ ذرا ان کے ”وطن“ کو ہلاؤ اور انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ روئے زمین پر ہلکے پڑ گیا۔ جن لوگوں کو کبھی زلزلے کا تجربہ ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ ایسے وقت میں تمام جانداروں پر کیسا عجیب اور ناقابلِ بیان کرب طاری ہو جاتا ہے۔ صرف ایک ہی اٹل نقطہ ہے جس پر انسان نے سب کچھ بنایا ہے۔ جب وہی ہٹ جائے یا ہل جائے تو باقی کیا رہا؟ چونکہ جو لین کی حس غیر معمولی طرز پر تیز تھی اس نے زمین کی خوفناک گڑگڑاہٹ کو قبل از وقت محسوس کیا اور اس کی روح کو جس کا پرانا آسرا عرضِ خط میں تھا ایک خاص قسم کا مہم سادہ محسوس ہوا ہے وہ اچھی طرح نہ سمجھ سکتا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے ادھر سے اپنی نظریں اور زیادہ مٹالیں۔ وہ خاموش کھڑا اندر ہی اندر کھڑا تھا اور اپنے آخری بت کو جو باقی لگیا

تھا ہاتھ لگاتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ لیکن جن لوگوں سے اس نے قطع تعلق کر لیا تھا ان میں سے بعض ایسے تھے جو پادروں کی طرح ضمیر انسانی کو سمجھنے میں مہارت رکھتے تھے۔ انہیں میں اس کا مرشد روحانی بھی تھا جو ایک مہیار اور مشفق تھا جس کے ہونٹ والیہ کی طرح پتلے تھے (لیکن اس کی آنکھوں میں برطانوی والیہ کے طنز کے لئے گنجائش نہ تھی۔ وہ روح کے گھر میں کسی جیل سے یا ڈاکہ زنی کر کے گھس آتی تھیں۔) انہوں نے اس کی بغاوت کی اٹھان ہی سے سمجھ لیا تھا کہ اس خود مر باغی میں اتنی مصلحت شناسی نہیں ہے کہ مناسب اور غیر مناسب میں تمیز کر سکے اور وہ ضرور اس سب سے بڑے بت پر بھی ہاتھ ڈالے گا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو اپنی لابی آستینوں میں ڈالے صبر کے ساتھ اس حادثہ کا انتظار کر رہے تھے مگر وہ عطائی اتنے سمجھدار نہ تھے جنہوں نے جولین کو بھی اپنا سا ایک قابل اعتبار آواز دیا خیال سمجھا جس نے ان کے خیال میں ”عبادت خانے“ کے ساتھ محض ”جلسہ گاہ“ کی خاطر دعا کی تھی اور خود کو روایتی قوم پرست وینا دار واجب التعلیل اور متوسط طبقہ کی ذہنیت کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا۔ انہوں نے اس کے لئے مدرستہ العلوم فرانس کے دروازے کھول دئے اور اس کو ”علوم اخلاقی اور سیاسی کی اکیڈمی“ کا ممبر بنا لیا اور وہ اس کے لئے صرف اسی ایک چیز کے منتظر تھے جو سب سے بڑھ کر ہے اور انسان کو ”غیر فانی“ بنا دیتی ہے (یعنی فرانسیسی اکیڈمی کی ممبری) اس اعزاز کے لئے بعض فی اثر ممبران اکیڈمی کی نظر انتخاب اس پر پڑ چکی تھی اور اس کے پرانے استاد نے بھی جس کا درناک اور طفلانہ مقولہ ہم نے اوپر نقل کیا ہے اُسے یقین دلایا تھا کہ دو تین سال کے اندر اندر اس کا انتخاب یقینی ہے۔ وہ اس بات کے لئے ذاتی طور پر کوشاں تھا۔ یہ معلوم کیوں اس بوڑھے آدمی کو جولین سے بہت محبت ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی جماعت میں اس کا بچپن کا زمانہ دیکھا تھا پھر اُسے یونیورسٹی کے طالب علم کی حیثیت میں بھی دیکھا تھا۔ بغیر اس کے خیالات کی گہرائیوں کو ٹٹولے ہوئے اُسے جولین کے چہرے سے انس پیدا ہو گیا تھا۔ جب وہ لکچر دیتا ہوتا تو اس کی آنکھوں کو یہ چہرہ جس میں نوجوانی کی سنجیدگی اور فداواری جھلکتی تھی جھلا معلوم ہوتا تھا۔ استاد اور شاگرد کی آنکھوں میں جو ایک دوسرے پر سکراتی رہتی تھیں اس طویل رفاقت کے دوران میں ایسی محبت کے مراسم پیدا ہو گئے تھے جیسی باپ بیٹے میں ہوتی ہے۔ بوڑھے استاد کو یقین تھا کہ جولین کی ذات میں اسے اپنا روحانی وارث مل گیا ہے اور جولین نے جو اس کا احترام کرتا تھا اور اس کا شکر گزار تھا کبھی

خود سے یہ سوال نہیں پوچھا تھا کہ وہ اپنے استاد کی توقعات پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔

جب جنگ شروع ہوئی تو ملک کے اہل علم یعنی یونیورسٹی کے سربراہ اور وہ اراکین نے خود کو بھڑاؤ و غبت اپنے ملک کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ دوسری ذہانت کے ہر اہل یعنی یونیورسٹی کے افسر اعلیٰ نے اپنے مخصوص شاگرد کے لئے اس نئے نظام مدافعت میں جس کو وہ ترتیب دے رہا تھا ایک نمایاں جگہ تجویز کی۔ یعنی اہل علم کی ذہنی قوت جس کو پہلی مرتبہ فوجی لباس پہنایا جا رہا تھا اور جس کو عقلی گولہ بارود کے کارخانوں میں استعمال کرنا مقصود تھا۔ تاریخ سائنس قوت تقریب چیزیں اس کام میں مفید تھیں۔ اگر وہ جولین کو اسی معاملہ میں پس پشت ہی پڑا رہے دیتا تو زیادہ قرین مصلحت تھا۔ وہ از خود محاذ جنگ پر نہ آتا اور غالباً اپنے بزرگوں، ہم چشمیوں اور معاصرین سے ان تمام نتائج پر بحث و مباحثہ نہ کرتا جو پڑھنے اور دیکھنے کرنے کے لئے وہ اس کے سامنے پیش کرتے۔ لیکن یہ کس قدر دور اندیشی کے خلاف تھا کہ اس سے یہ کہا جائے کہ تم ان سب دلائل اور نتائج کو گھڑنے میں شرکت کرو! یہ سچ ہے کہ وہ اپنے طور پر ایمانداری کا ثبوت دے رہے تھے ان لوگوں کے جذبات قومیت اس قدر شدید اور مستحکم تھے اور انھیں اس قدر کامل یقین تھا کہ یہ جذبات حق کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں کہ اگر کبھی حق کا تقاضا یہ ہو تا کہ ان کے جذبات کی تردید کرے تو وہ بلا تامل حق کا گلا گھونٹ دیتے یا اس سے وہی کھلو لیتے جو وہ چاہتے تھے۔ ضرورت صرف اتنی ہی تھی کہ تسکین پر کس کس کے اعضا کو ذرا کھینچ دیا جائے (اس بات کا کچھ تاثر نہ ہونا چاہئے کہ سوربون یونیورسٹی کے قائم کرنے والوں میں ایسے ماہرین علوم و فنون بھی تھے جو ان لوگوں پر سوالوں کی بوچھاڑ کرتے تھے جن سے انھیں سچی بات قبول کرانی ہوتی تھی!) جولین اس فن کا ماہر نہ تھا۔ وہ سچ کی آواز سنتا تھا اور یہ نہ جانتا تھا کہ اس پر ”جرح“ کرنے کے کیا معنی ہیں۔ اس نے جرمنی کے جنگی مراسلات کا مطالعہ کر کے نہایت سادگی سے وہی رپورٹ کھلی جو ان سے مستنبط ہوتی تھی۔ بحث شروع ہوئی اور جب معلوم ہوا کہ اس کی رپورٹ اس کے ساتھیوں کے نتائج مختلف ہے تو ان کا باہمی اختلاف ظاہر ہو گیا۔ یہ اختلافات بہت صاف اور اچانک اور شدید تھا جب بے اعتیاضی سے کسی دماغی کام کرنے والے کی کوئی لمبی مہر رگ پھیر دی جائے تو اسے غصہ میں سرخ نہیں بلکہ سفید نظر آتا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب حرارت زیادہ بڑھ جاتی ہے تو آگ سرخ سے سفید ہو جاتی ہے۔ جب

جولین نے جنگ کے متعلق اپنے ایک دوست کے بیان کو سنا تو وہ جوتوں تک سفید چرگیا۔ اس نے اپنا ہاتھ زور سے میز پر مارا اور چلا کر کہا ”مگر یہ تو میرا سر جھوٹا ہے۔“

اس پر کیسا زبردست ہنگامہ برپا ہوا! اس نے جس شخص کی تہک کی تھی وہ اس کا ایک عزیز اور مہتمم دوست تھا۔ پیشیت پر دغیر کے اس کی بڑی شہرت تھی۔ لوگ اس کی علمی قابلیت اور دیانتداری کی بہت قدر کرتے تھے۔ جولین نے فوراً ہی معافی مانگی اور گھبراہٹ میں الجھے ہوئے طریقے پر اپنی رائے کو کھجانے کی کوشش کی تاکہ وہ اس کے ساتھیوں کو زیادہ قابل اعتماد معلوم ہو لیکن جس چہرے پر اس کا طمانچہ پڑا تھا اس نے اس کا نشان ثبت ہو گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں نہٹنے والی نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ کوئی علمی کام کرنے والا کبھی اپنے ایسے ساتھی کو معاف نہیں کرتا جو اس کی ذات میں ان چیزوں کو دیکھ لے جنہیں وہ خود اپنے سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہو کیونکہ اب خواہ وہ کچھ کرے اسے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جو چیز دیکھنے سے وہ بچنا چاہتا ہے، وہ اس میں موجود ہے۔ جولین پر اپنے اس حریف سے بھی زیادہ ہیبت طاری تھی جس پر اس نے یہ ضرب کاری لگائی تھی۔ وہ تمام راستے دل میں یہ کہتا رہا ”اور غضب یہ ہے کہ وہ دیانتدار ہے! جولین جانتا تھا کہ وہ دیانتدار ہے۔ وہ اس بات کی تصدیق کے لئے رسوئی پر چڑھنے کو تیار تھا بے غرضی کی زندگی حق کی پیشکش۔۔۔۔۔ اس نے زہر زند کیا اور کہا ”واہ رے ایماندار لوگوں کی صداقت!“

اس تجربے نے اس کی دنیا کو بالکل ہی درہم و برہم کر دیا۔ اب اس کو اپنی سخت مذہبی تعلیم کے اثرات کا احساس ہوا۔ جو لوگ بہت زیادہ غماظ ہوتے ہیں وہی اکثر مذہب سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ آزادی کے ذوق میں ایسا کر رہے ہیں لیکن دراصل اس میں پاکیزگی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور تلاش حق کا وہ ذوق جو باطل کے ساتھ معاملہ کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اس کو خیال تھا کہ یہ چیز اسے مذہب سے باہر ذہنی آزادی کے دعووں میں مل جائے گی لیکن یہ وہاں بھی منقوٹ تھی۔ جولین نے اس لحاظ اور مردت کو دونوں ہاتھوں سے دھکیل دیا جس نے اب تک اس کے گرد پیش کے ایماندار آدمیوں کی پردہ پوشی کی تھی اور معاملات پر بے لاگ طریقے سے تنقید شروع کر دی۔ اس زمانہ میں اس نے نہ معلوم اپنے کتنے ساتھیوں کو سپرد خاک کیا مگر اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ان پر غرضی تقریریں بھی کرتا۔ اس نے اب تک ان کو اسی

قدرت کی نظر سے دیکھا تھا کہ ان کی ذلت اس کی اپنی ذلت تھی۔

اس نے اپنے استاد سے بگاڑ کر مناسب سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا۔ کیونکہ یہ مغالطہ بہت خاموشی کے ساتھ ہوئی جس طرح کوئی باپ بستر مرگ پر اپنی جان دے اور مرتے وقت درد انگیز اور ملامت آمیز نظر سے چپ چاپ اپنے بیٹے کو دیکھے۔ اس نے بغیر کسی نظارہ مارائیگی کے جولین کی تحریر کو پڑھنے سے انکار کر دیا کیونکہ جب جولین اپنی مرضی کے خلاف ایک راستے پر ڈال دیا گیا تو وہ تلاش حق سے باز نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ اپنی تحریر کو لے کر اپنے استاد کے پاس آیا۔ اس نے کہا ”نہیں“ میں اسے نہیں دیکھوں گا۔ بالکل بے کار بات ہے۔۔۔۔۔“ اس نے اپنے چوڑے ہاتھ کو جو بڑھاپے کی وجہ سے سوجا ہوا تھا جولین کے ہاتھ پر رکھا اور کہا۔

”میرے دوست تم مجھے بہت رنج پہنچا رہے ہو۔ غور تو کرو۔ تم اپنے تمام مستقبل کو تباہ کر رہے ہو۔ ہماری توقعات کو باطل کر رہے ہو، ہمارے فرض مشترک کی ادائیگی میں کوتاہی کر رہے ہو۔“
ان الفاظ نے جولین میں سختی پیدا کر دی۔

”ہم سب کا، تمام سائنس کے غامضوں کا مشترکہ فرض صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ حق کی خدمت کریں خواہ اس کی قیمت کچھ بھی دینا پڑے۔ تم نے خود مجھے یہ سبق پڑھایا ہے۔“
بوڑھے آدمی نے اپنا بھاری سر ہلایا اور اس کی خون آشام آنکھوں میں شعلہ کی سی چمک پیدا ہوئی۔
”جتنی کہی ہمارے وطن سے جدا نہیں ہو سکتا۔ دونوں کا اقتضا ایک ہی ہے۔“

”تسلیم ہے لیکن وطن کا فرض ہے کہ جاوہر حق سے مخوف نہ ہو۔“ جواب ملا ”وطن سب پر مقدم ہے۔ ہم سب اس کے غلام ہیں۔ سب ہیں لیکن۔۔۔۔۔“ مگر استاد نے قطع کلام کر کے کہا ”ہر چیز جو ہمارے پاس ہے بغیر امتنان کے۔“ دونوں خاموش ہو گئے۔ بوڑھے آدمی کی آنکھوں کا شعلہ بجھ گیا تھا۔
اس نے جولین کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ منتظر تھا کہ جولین بولے اور وہ الفاظ کہے جن کی اس کو توقع تھی۔
جب یہ خاموشی طویل پڑ گئی تو اس نے اپنا سر اٹھایا جو ایک بیار شہر کا سا تھا اور اپنے بھاری پوٹوں کو کھولا جو نابوت کے ڈھکنے کی یاد دلاتے تھے اور اس کی جاری نم آگلیں بجھاہ نے محبت، خوف اور التجا

موجود ہے اور اس کے خاموش محاسبہ سے ان کی تردید ہوتی ہے گویا وہ ان پر محض اپنی خاموشی سے حکم لگا رہا ہے۔ کیونکہ اب وہ اُس کو نظر انداز نہ کر سکتے تھے اور ان کا خصلہ اس کے تحمل اور ضبط سے اور بڑھ جاتا تھا۔ اندھی جبلت سے مجبور ہو کر انھوں نے اس کے ضبط اور خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی۔ سب سے زیادہ اشتعال دلانے والا اس کا وہ دوست تھا جس کی دوستی اب جانی دشمنی میں تبدیل ہو گئی تھی جس کے رخسار پر ہمیشہ کے لئے اس کے طمانچہ کا نشان ثبت ہو گیا تھا۔ جولین کو انھوں نے خاموش رہنے نہیں دیا خاموش رہنے اور آزادی فکر میں تو بڑا آرام ہے۔ لہذا انھوں نے اس کے سامنے ایک تحریری اعلان پیش کیا جس پر دستخط کرنے سے اس نے انکار کر دیا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ اپنے وجوہات بتاؤ۔ جولین اپنے عقائد کا عام اعلان کرنے سے بہت گھبراتا تھا لیکن اس نے اپنے فرض کی ادائیگی سے کوتاہی نہیں کی اور وجوہات کو بیان کر دیا۔ اس کا بیان اس قدر صریح اور واضح تھا کہ اس کو دیکھ کر وہ لوگ بہت زچ ہوئے جنھوں نے تا عاقبت اندیشی سے اس کو اس تحریر پر مجبور کیا تھا اور اگر ان کا بس چلتا تو وہ الفاظ واپس اس کے گلے میں اتار دیتے لیکن احمقانہ جوش میں وہ خود ہی نیچے آ رہے۔ انھوں نے دشمن کے لئے ایک جال لگایا تھا اور خود ہی اس میں پھنس گئے۔ اگر وہ اپنے غیض و غضب کو اندر ہی بند رکھتے تو شاید معاملہ زیادہ بڑھتا مگر اخبار نویسوں کو اس کی اڑتی ہوئی خبر مل گئی اور ان میں سے ایک نے کسی طرح اس مرتد کے خطرناک بیان کی ایک نقل حاصل کر لی۔ سیاسی ناظر کی حافقت نے کرپے کو اور نیم پر چڑھا دیا۔ اس کے اعلان سے جہاں لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کے اراکین نے کس طرح حب وطن کے جوش میں اپنے ایک نا اہل رکن پر کلنک کا ٹیکہ لگایا ہے وہاں انھیں بارود و خانہ کاراستہ بھی معلوم ہو گیا اس پر مزید تہمید ہوا کہ مضمون میں سے بہت سے حصوں کو جن میں کوئی خاص بات نہ تھی جو نہ دوسروں سے زیادہ شورش انگیز تھے نہ کم، بھونٹے طریقہ پر حذف کر دیا گیا۔ اس سے عوام کے تخیل کو اور اشتعال ملا اور انھیں زیادہ سخت اور بے پناہ مضامین کی تلاش ہوئی چنانچہ جولین کو خود اپنا مضمون پڑھ کر تعجب ہوا اور اس کی فطری جھجک نے اس سے سوال کیا ”مگر یہ باتیں کس نے کیں؟ تم سے کس نے کہلائیں؟“

لیکن وہ خود سے یہ سوال کرتے ہی خاموش ہو گیا اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اینٹ اس کے برابر

کھڑی اس کی تحریر پڑھ رہی ہو۔ جولین بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے کمرے میں دو تین پکر لگائے۔ پھر وہ بیٹھ گیا اور مسکرایا۔

”اچھا جو اس عورت کی مرضی..... جو ہونا ہے ہو جائے گا۔“

بالآخر اس عورت نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا جس طرح اس نے خود نظام ماسٹرٹ کی تحریریں توڑ ڈالی تھیں اسی طرح اب جولین سے بھی وہی کرایا۔ اب وہ تنہا تھا، اس کی صحبت میں تنہا تھا لیکن وہ ایسا خیال پرست نہ تھا کہ یہ نہ سمجھے کہ ”وہ“ دراصل اس کے اپنے دماغ کا عکس ہے۔ اسے زندہ جیتی جاگتی گوشت اور پوست کی اینٹ کی ضرورت تھی جو اس کے دوش بہ دوش اس دنیائے آب و گل میں جدوجہد کرے لیکن اب بھی اسے کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ اس کی تلاش کرے۔ اب وقت گذر چکا تھا اور بازی ہاری جا چکی تھی۔ وہ ان تقدیر پرستوں میں سے تھا (خدا ان پر اپنی برکت نازل کرے۔ ہیں ان کی تعظیم کرنا ہوں مگر ان کی ہانڈی پر رشک کی نظر نہیں ڈالتا انھیں ہی ان کے پٹھانے لیے مبارک ہیں) جو شکست سے خائف نہیں ہوتے، اس کو قبول کر لیتے ہیں مگر اس کا کوئی تدارک نہیں کرتے۔ جولین ڈاڑھی کے ساتھ اپنے گھر کے صحرا میں زندگی بسر کرتا رہا جس میں اس کی خوشنصیبی سے ایک بچی کے شور و غل سے کچھ جان سی پڑ چکی تھی۔ گھر سے باہر کی تمام دنیا اس کے لئے ایسا دیران ماحول بن گئی تھی جو محاصرت پر تلی ہوئی تھی۔ اس کے علمی اور تعلیمی مشاغل منقطع ہو گئے۔ اکیڈمی کے معزز اراکین آئندہ احتیاط رکھیں گے کہ صرف اپنے ہم خیالوں کو اکیڈمی میں داخل کریں یعنی وزرا اور افسران اور ان کی اپنی قسم کے ارباب علم و خوں نے وطن کے نیک مقصد کی خاطر حق کے ساتھ دغا کی تھی۔ جولین کے استاد اور مربی نے اس کے محبت آمیز خطوط کا جواب نہیں دیا اور اس رسالے کو بغیر پڑھے واپس کر دیا جس میں جولین نے اعتدال کے ساتھ اود مخالفین کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اپنا یہ مقالہ پیش کیا تھا کہ جنگ کی ذمہ داری تمام قوموں کی مشترکہ ہے اور تمام اہل علم کا فرض ہے کہ وہ جلد باہمی مصالحت کرنے میں کوشاں ہوں۔ فرانسیسی ”جماعت عمال کے سربراہوں نے جو خود ہر طرح سے محفوظ تھے لیکن گھر پر رہ جانے والے لوگوں کے محافظ بن بیٹھے تھے کئی مرتبہ اس کے یونیورسٹی کے لکچروں میں گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کی.....

جولین نے اس کے بعد اور کوئی چیز ایسی نہیں لکھی جس سے عام رسوائی ہو لیکن اس میں اس کی مصلحت شناسی کو دخل نہ تھا۔ خبروں کا ناظر اب زیادہ ہوشیار ہو گیا تھا اور اس کی لکھی ہوئی ایک سطح بھی شائع نہ ہو سکتی تھی یہاں تک کہ اس کے وہ رسائل بھی جو عماراتِ قدیمہ کے متعلق تھے شبہ کی نظر سے دیکھے جاتے تھے مگر اس کا دماغ بالکل بے خوف تھا۔ وہ جس راستے پر چلتا تھا اس سے کوئی چیز اس کو بٹا سکتی تھی۔ اس کا جسم بغیر چون و چرا بغیر کسی شکایت یا اظہارِ مسرت کے وفاداری کے ساتھ اس کے دماغ کی پیروی کر رہا تھا اور بوقتِ ضرورت اس کے اشارے پر گھسان کی لڑائی میں کود جانے کو تیار تھا۔

لیکن ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۶ء کے درمیان وہ اس مقام تک نہیں پہنچا تھا۔ اس عرصے میں وہ خاموشی اور یک سوئی کے ساتھ غور و فکر میں مصروف رہا۔ اس کے ”ارتداد“ کی وجہ سے اس کے گرد جو خلا قائم ہو گیا تھا اس کی وجہ سے اسے اور فرصت مل گئی اور اس ذہنی تنہائی کی بدولت اس کی جرات میں اضافہ ہوا اور اس کی فطرت میں اور زیادہ گہرائی پیدا ہو گئی۔ اس نے دوسروں کے سہارے کے بغیر اپنا کام نکالنا سیکھ لیا۔ وہ لوگ جنہوں نے اس کو زمین کی ہوا سے محروم کر کے پہاڑ کی ہوا کھانے پر مجبور کیا تھا اپنی عداوت اور اپنے مقصد میں ناکامی کی وجہ سے اور زیادہ برا فروختہ تھے کہ انہوں نے خواہ مخواہ اس فضیلت اور رسوائی کو دیا یا کیونکہ ان کی کوششوں سے وہ دب تو گئی لیکن اس کا انداز نہیں ہوا۔

جولین کے نقادانہ دماغ اور وجدان میں جناد و توازن قائم ہو گیا تھا اس کا پختہ ثرہ تصنیف تھی جس کا نام اس نے ”آئین کے لوگوں کا مکالمہ“ (*Dialogues of the People on the Aventine*) رکھا تھا جس میں اہل روح، جو شہر سے اپنا رشتہ منقطع کر چکے ہیں آپس میں ہنگامہ خیز تبادلہ خیال کرتے ہیں اور اس مرتبہ اس شخص کو آخری لفظ کہنے کا موقع نہیں ملتا جو محض شکم پری کی نیابت کرتا ہے: ”جو روٹی کھانا چاہتا ہے وہ اس کو حاصل کرنے کے لئے کام کر کے دکھائے“۔ ”اپنے ہاتھوں کو سامنے کرو“ اے عالمو، فاضلو، مصورو، مصنفو۔ اپنے اعمال کا دفتر پیش کرو۔ تم نے گذشتہ سو برس میں کیا خدمات انجام دی ہیں کہ تم رائے عامہ کے حاکم (یا غلام) بنے رہے ہو؟“ یہ بڑی دلچسپ نمائش تھی۔ تمام قلم کے سورا یا بیچ پر لائے گئے تھے! لیکن اصل ڈراما نمائشی کی روح میں تھا جس نے اس کو دیکھ کر

میں مشغول تھا۔ اصل مستقبل کی تشکیل کر رہا تھا اگرچہ خود اسے اس کا مطلق شان گمان نہ تھا۔ وہ لاعلمی میں انسانوں اور قوموں کے اس عظیم الشان کارخانے میں کام کر رہا تھا جہاں اس جیسے بہت سے لوگ ایک نظام جدید ایک دنیائے نو کی تعمیر میں کوشاں تھے۔ اور بعد میں جب اُسے اس کا احساس ہوا جب خارجی واقعات پرانہ طور پر اس کے کتب خانے کے گوشہ عافیت میں گھس آئے تو اس نے خود کو انقلاب کی جماعت میں بھرتی پایا۔ اس وقت تک یہ ”انجمن انقلابی“ مسلسل دس سال مخالفوں کی ذہنیت کے خلاف اپنے بے پناہ تیر چلا چکا تھا۔

اور ابھی اُسے اس بات کا پوری طرح احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ ایبٹ نے جو اس وقت کئی ہفتے کی علالت کے بعد رو بصحت تھی اپنے بستر علالت ہی پر اس کی تصانیف کا مطالعہ کیا اور ایک ہی منظر میں اس حقیقت کو اس کی ذہنیت کے اس انقلاب عظیم کو پہچان لیا۔ مسرت نے اس کے سینے میں جوش مارا اور پرانی محبت جو ابھی تک زندہ تھی بیدار ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس نے بھی خلائی کی ہے۔ اس شخص کی جو اس سے محبت کرتا تھا اس کا جولین، تیر انداز!

تفاسیر القرآن

قرآن اللہ کا پیغام اور آسمانی نور ہے جو بنی نوع انسان کے لئے شمع ہدایت بنا کر اُتارا گیا۔ صحابہ کرام نے جن کی زبان میں قرآن اُتر ا تھا اور جو اس کے اولین مخاطب تھے بے شک اس کو سمجھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات جو عمل بالقرآن کا نمونہ تھی ان کے لئے اسوہ حسنہ تھی۔ انھوں نے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر عمل کرتے دیکھا اسی طرح خود اس کی تمیل کرنے لگے۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے عمل کو اسی کے مطابق رکھا۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کا دعویٰ ہے مفصل اور نوربین ہے۔ اس کی تعلیمات عمل کرنے اور نصیحت لینے کے لئے واضح اور روشن ہیں۔ صحابہ کرام پر حقیقت کھل گئی تھی کہ یہ کتاب انسان کے ظاہری اور باطنی اعمال کو سنوارنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔ اسی کے مطابق اپنے اعمال کو رکھنا اس کے اتارنے والے کے نزدیک قبولیت کا ذریعہ ہے۔ اس لئے وہ نظری بحثوں میں زیادہ نہیں الجھے۔ انھوں نے اس کی آیات کی توضیح اور تشریح کے لئے سوالات بھی بہت کم کئے۔ کیونکہ ان چیزوں میں تو میں اس وقت پہنچتی ہیں جب ان کے ایمان اور عمل میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے اور صحابہ کرام کی قوت ایمان اور جذبہ عمل کا وہ عالم تھا کہ ان کی ایک نگاہ سے بڑے بڑے فلسفیوں اور عالموں کے ذخیرے سوخت ہو سکتے تھے۔

عہد صحابہ کے بعد پہلی صدی ہجری کے اوائل میں جب دوسری قومیں بھی جو عہد تعلیم اسلام کے آغوش میں آچکی تھیں قرآن کی تشریح اور توضیح کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ اس وقت سے تفسیریں لکھی جانے لگیں بیان کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلی تفسیر عبدالملک کی فرمائش سے سعید بن جبیر نے مدون کی تھی لیکن وہ معدوم ہو گئی۔ تیسری صدی ہجری میں امام ابن جریر طبری نے اپنی مشہور تفسیر لکھی جو آج بھی موجود ہے اور اُمّ التفاسیر کہی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے بعد سے آج تک جس قدر تفسیریں لکھی گئی ہیں وہ سب کی سب اسی سے ماخوذ ہیں۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں پندرہ اسناد اس کل علم کو جمع کر دیا جو قرآن کے متعلق اس وقت تک مسلمانوں کے پاس تھا۔

طبری کے بعد علماء اسلام نے اس قدر تفسیریں لکھیں جن کا شمار نہیں کیا جاسکتا اور آج تک ان کا سلسلہ جاری ہے۔ جس طرح ہر زمانہ میں فقہاء اور محدثین کی کثرت رہی اسی طرح مفسرین کی بھی جماعت ہر عہد میں رہی۔ بعض بعض تفسیریں اس قدر مضبوط لکھی گئیں کہ دو دو سو اور تین تین سو جلدوں میں ختم ہوئیں۔ تفسیر صدائق البیان کے متعلق مورخیں لکھتے ہیں کہ پانسو جلدوں میں تھی لیکن ان مفسروں نے جہانگیر قرآن کی تشریح کا متعلق ہے طبری کی تفسیر پر کچھ زیادہ اضافہ نہیں کیا۔ صرف اسرائیلی قصوں، مجوسیوں کے افسانوں، عل کے اختلافات اور اقوال کو درج کر کے اس کو بڑھانے کی کوشش کی۔ بعض بعض مفسروں نے اپنے اپنے خاص خاص اعتقادات یا فنی زاویہ نگاہ سے تفسیریں لکھیں اور قرآن کو اسی رنگ میں رنگنا شروع کیا۔ فلسفیوں نے فلسفیانہ بحثیں کیں۔ معتزلہ نے اعتزال اور موصوفیہ نے تصوف کا رنگ بھرا۔ فقہانے استنباط مسائل پر زیادہ رجحان رکھا اور موروں نے تاریخی تفصیلات لکھیں اور انہیں چیزوں کا ناظم تفسیر رکھا گیا۔ علامہ زعفرانی نے نوکثات میں اپنا سارا زور بدیع اور بیان پر صرف کر دیا ہے تفسیر بعض نام کے لئے ہے۔ حقیقت میں امام رازی کی تفسیر کبیر کے متعلق جو فقرہ مشہور ہے کہ ”اس میں سب کچھ ہے ہجر تفسیر کے“ وہ کثافت پر زیادہ چسپاں ہے اس لئے کہ امام رازی نے تو بہت کچھ قرآنی مسائل حل کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

الغرض آج ہزاروں تفسیروں کے لکھے جانے کے بعد بھی اگر کوئی تفسیر کا نامد ہے تو ابن جریر طبری ہی کی ہے۔ وہی پہلی تفسیر ہے اور اسی کو اب تک آخری تفسیر بھی سمجھا جائے۔ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آغاز عہد اسلام میں صحابہ کرام اور تابعین اعلام نے قرآنی آیات کو کس طرح سمجھا تھا اور قرآن فہمی میں ان کے اندر کس قسم کے اختلافات تھے۔

طبری کی یہ تفسیر قرآن فہمی کے لئے ایک ذخیرہ قیمتی۔ اس سے مدد لے کر قرآنی حقائق کو واضح کرنے کی کوشش کی جاسکتی تھی لیکن اب بعد کے مفسروں نے ہجر نقل و نقل کے کوئی خاص ترقی نہیں کی اور یہ فن ذرا بھی آگے نہیں بڑھا۔ اب تک جس قدر تفسیریں لکھی گئی ہیں ان میں غور کرنے سے بڑے بڑے نقائص نظر آتے ہیں جسب ذیل ہیں :-

۱۔ سب سے پہلی اور ابتدائی خرابی یہ ہے کہ ان مفسروں نے قرآن کی تشریح کے اصول نہیں مفہوم کئے۔ زمانہ ابعد میں اگرچہ علماء اصول نے کچھ قواعد مرتب کئے ہیں لیکن وہ قرآن فہمی کو پیش نظر رکھ کر نہیں بنائے گئے

ہیں بلکہ زیادہ تر اغاظ اور اس کے استعمال کے متعلق ہیں اور محض تپاسی ہیں جن سے ہر نقطہ پر اختلاف کی گنجائش موجود ہے اور پھر بالکل ناکافی۔ علامہ ابن تیمیہ نے جو ترجمان القرآن کے لقب سے مشہور تھے کچھ اصول لکھنے شروع کئے تھے مگر صرف تئیس ہی لکھ سکے۔ شہادہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے بھی اصول تفسیر میں نو زائکیر نامی ایک رسالہ لکھا مگر اس کو اصول کتنا کسی طرح صحیح نہیں۔ وہ تو صرف ان کی قرآن فہمی کی نوعیت ہے اور بس۔

الغرض تفسیر قرآن کے اصول ابھی تک قطعاً مرتب نہیں ہو سکے ہیں۔ حالانکہ ایسے اہم علم کے لئے سب سے پہلا کام یہ تھا کہ اس کے اصول بنائے جاتے۔ اس لئے یہ تمام تفاسیر جو لکھی گئی ہیں کسی علمی یا عقلی اصول پر مبنی نہیں ہیں۔

(۲) ان مفسروں نے قرآن کی تفسیر کا جو طریقہ رکھا ہے وہ وہی ہے جس کے مطابق کسی انسانی کتاب کی تشریح کی جاتی ہے یعنی فاتحہ سے شروع کر کے ایک ایک آیت کی سلسلہ وار تفسیر لکھتے چلے جاتے ہیں اور آخر تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس سے آیات اور اغاظ کے معنی کی شرح تو ضرور ہو جاتی ہے مگر قرآن نہیں سمجھیں آتا یعنی اس کی کوئی تعلیم مل نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اس کی تعلیمات اس ترتیب اور ربط کے ساتھ نہیں بیان کی گئی ہیں جس طرح انسانوں کی کتابوں میں ہوتی ہیں۔ بلکہ اس کی ہر تعلیم متعدد سورتوں اور آیتوں میں اس کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے تاوقتیکہ کسی خاص مسئلہ کے متعلق اس کی تمام تعلیمات متفرق سورتوں سے نکال کر جمع نہ کر لی جائیں اور ان کو صحیح ترتیب کے ساتھ مرتب نہ کیا جائے وہ مسئلہ ہرگز سمجھ میں نہیں آسکتا۔ لہذا ان تفسیروں اور ترجموں سے جو سلسلہ سلسلہ آیات کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں قرآنی تعلیمات کی مطلق توضیح نہیں ہوتی۔ فہم قرآن کے لئے ایسے ترجموں اور تفسیروں کی نوعیت تقریباً وہی ہے جو فن طب میں کتب مفردات کی ہے جن میں حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ دواؤں کے نام، خواص اور بدل وغیرہ لکھ دئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص ان کو پڑھ کر طبیب نہیں ہو سکتا بھئیہ ان تفاسیر و تراجم کے مطالعہ سے بھی کوئی قرآن کا عالم نہیں ہو سکتا۔

(۳) ایک خاص عیب یہ ہے کہ ان تفسیر نگاروں نے خود اپنے دماغوں سے بہت کم محنت لی ہے، الاماثر اللہ زیادہ تر اپنے سے پہلے مفسروں کے اقوال اور روایتیں درج کی ہیں۔ بہت سے مفسر تو اس قسم کے ہیں جنہوں نے اپنی تفسیریں محض ثواب کا ذخیرہ اور جنت کا ذریعہ سمجھ کر لکھی ہیں یعنی تقریباً الی اللہ فدام قرآن میں

داخل ہو گئے ہیں۔ بحالیکہ ان کی تفسیروں میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی ہے جس پر کسی طالب قرآن کی زبان سے ان کے لئے منفردت کی دعائیں یا جو بوجھ اپنی تصنیف کا وہ پڑھنے والوں پر ڈال گئے ہیں اس کی کوئی تلافی ہو سکے۔ اگر مفسرین نے دماغ سے کام بھی لیا ہے تو یہ کہ اپنے خاص نظریہ کو موقع بے موقع قرآن کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کرمانی کی تفسیر عجائب الغرائب اور وہ تفسیر جو شیخ محمد بن الدین ابن عربی کی طرف منسوب ہے اسی قسم کی ہیں۔ یہ درحقیقت خالص تفسیر بالرائے ہیں جن سے سوائے انسانی خیالات کے آسمانی پیغام کی ماہیت نہیں سمجھی جاسکتی۔

(۴) عام طور پر ان تفاسیر میں آیات اور الفاظ قرآن کی تشریح روایات سے کی گئی ہے۔ روایت کا بجائے خود وجود درجہ ہے وہ ظن سے زیادہ نہیں ہے۔ اس طرح پر قرآن کو جو بالکل یقینی ہے اور جس پر ہم مسلمان ایمان رکھتے ہیں ان مفسروں نے مضمون تشریحوں میں ڈال دیا ہے اور اس کے مفہوم کی قطعیت کھودی ہے۔

بالخصوص تفسیر میں جو روایات ہیں ان کا بڑا حصہ تو خود محدثین کے نزدیک موضوع ہے اور اسرائیلیات تو بیشتر ناقابل اعتبار ہیں۔ قدیم مفسروں نے ان روایات کا سلسلہ اسناد بھی لکھا تھا مگر متاخرین نے اس کو بھی حذف کر دیا جس کی وجہ سے بعد کی تفسیروں میں وہی قصے اور وہی روایتیں بلا اسناد کے منقول ہوئے اور عوام میں ان کی حقیقت مسلمت کی سی ہو گئی اور بہت سی آیات کی غلط تفسیریں امت میں رائج ہو گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن قدر تفاسیر کی کثرت ہوتی گئی اسی قدر مسلمانوں کو قرآن کریم کی اصلی اور صحیح تعلیم سے بعد ہوتا گیا۔

(۵) یہ مفسرین بالعموم قرآن میں نسخ کے قائل ہیں۔ اس لئے حکم اور یقینی آیات پر بھی نسخ کے احکام لگاتے چلے جاتے ہیں بلکہ جن لوگوں نے نسخ اور منوخ آیات پر کتابیں لکھی ہیں ان کی تو کوشش یہی ہے کہ جس قدر ہو سکے نسخ دکھلائیں۔ ان کے بیان کے مطابق نصف بلکہ اس سے بھی زیادہ احکامی آیتیں منوخ ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے زیادہ غور کیا تو ان کو صرف پانچ آیتیں ایسی مل سکیں جو منوخ ہیں۔ مگر وہ بھی منوخ نہیں ہیں یہاں کہ تفصیل کے ساتھ ہم نے ان پر اپنی کتاب تاریخ القرآن میں بحث کر دی ہے۔ غرض اس نسخ کے عقیدہ نے ان تفسیروں کے اندر ایک عجیب اہمال پیدا کر دیا ہے۔

(۶) ان مفسروں کو قرآن کریم کی صاف اور سیدھی تعلیم کمتر پسند آتی ہے۔ اس میں مختلف طریقے سے ندرت اور غرابت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس مقصد کو زیادہ تر موضوع اور معمول روایتوں سے حاصل کرتے

ہیں قصص میں اس قسم کی عجیب و غریب باتیں جو بیان کی گئی ہیں ان کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔ معمولی اور سیدھی باتوں میں بھی یہ اپنی جہت طرازی سے اٹانے کرتے ہیں۔ ”تنزل الملكة والروح نیا“ میں ’روح‘ کی تفسیر کی گئی ہے کہ ایک فرشتہ ہے جو ساتوں آسمان کا ایک قعر بنا سکتا ہے۔ اس کا سر عرض کے تلے اور پاؤں زمین کے ساتوں طبق کے نیچے ہے۔ اس کے ایک ہزار سر ہیں اور ہر سر اس دنیا سے بڑا ہے اور ہر سر میں ہزار ہزار منہ ہیں۔ اٹنے آؤ۔ قوم ثمود کی آزمائش کے لئے اللہ نے جو اونٹنی نکالی تھی اس کی نعت تفسیروں میں ہے کہ پھاڑیں سے کراہنے کی آواز آئی اور وہ اس میں سے پیدا ہوئی۔ حالانکہ قرآن کے کسی حرف سے اس کا اشارہ تک نہیں ملتا۔ ”استوت علی الجودی“ کی تفسیر میں لکھے ہیں کہ حضرت نوح کی کشتی پہلے کعبہ کے پاس آئی (یہ کعبہ ابراہیمی تو ہو نہیں سکتا جس کا ذکر قرآن میں ہے۔ غالباً فرشتوں کا بنایا ہوا ہوگا اسی وجہ سے ڈوبا نہ تھا) اور سات بار اس کا طواف کیا پھر بن کی طرف گئی۔ وہاں سے پلٹ کر جودی پہاڑ پر جا کر دسویں رجب کو جو جمعہ کا دن تھا ٹھہر گئی۔ یہ ہے ہمارے مفسروں کی قرآن فہمی۔

ایک مورخ نے لکھا ہے کہ روم کے کنیہ میں کسی بزرگ کی ننگ مہر کی صورت بنا کر رکھی ہے جہاں غنیمت مند حاجت طلبی کے لئے آتے ہیں اور اس کے نیچے شمعیں یا تیاں روشن کرتے ہیں۔ سرور زمانہ سے ان پکٹے بیج دار دھوؤں سے وہ مفید صورت اس قدر سیاہ ہو گئی ہے کہ اب کوئی طاقت اس کو صاف نہیں کر سکتی۔ یہی کیفیت ہمارے ان مفسروں کی ہے جنہوں نے قرآن کو واضح کرنے کے لئے اپنی اپنی تفسیروں کی جو شمعیں روشن کیں ان سے اس کا نورانی چہرہ اس قدر تہ سیاہیوں کے نیچے چھپ گیا کہ اب اللہ ہی اس کو دور کرے تو کرے۔

(۷) یہ غیر بن ببت سی آیاتوں کی تفسیر میں متعدد صغافی اور مختلف اقوال نقل کرتے چلے جاتے ہیں مثلاً ”غیر المغضوب علیہم دلا العالین“ کی تفسیر میں بیسویں قول ہیں۔ ”والعز و لیا ل عشر“ کی متعدد تفسیریں ہیں۔ ”و شاہد و مشہود“ کی شرح میں کئی باتیں لکھی گئی ہیں۔ ”اصحاب الا خود“ کی تفسیر میں لکھے ہیں کہ وہ اہل فارس تھے یا یمن کے باشندے تھے یا حبشی یا عجمانی یا شامی تھے۔ ان مرض سینکڑوں آیات ہیں جن کی تفسیر یا کیا کر کے لکھتے چلے جاتے ہیں اور کسی ایک بات کو جزم و یقین کے ساتھ نہیں بیان کرتے۔ ان مختلف اقوال میں اتفاق کی صورت ہوتی ہے نہ تطابق کی۔ اگر ایک بات کو دوسری پرتزیج دیتے ہیں تو درایت سے کام نہیں لیتے بلکہ

فائل کی غفلت و شہرت کے اوپر اس کا معیار رکھتے ہیں۔ غرض ان مختلف اقوال میں صحیح فیصلہ کرنے کی قوت ان کے اندر مفقود ہوتی ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن کا مضمون ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے ایسی تفسیروں سے بچائے اس کے کہ آیات کا مضمون واضح ہو اکثر گود لکھ دھندا ہو کے رہ جاتا ہے کیونکہ مفسر خود کوئی مضمون نہیں سمجھ سکتا ہے۔

۱۰، ان تفسیر میں قرآنی حقایق کی جستجو کم ہوتی ہے اور غیر متعلق اور غیر ضروری باتوں میں مضمون کے صفحہ سیاہ کئے جاتے ہیں جنت کا ذکر آئے گا تو اس کے پایوں اور آنجوروں کی تعداد شمار کر لے لگیں گے اور بعض کٹر اور طوطی کی پائنتس کریں گے۔ دوزخ کے بیان میں اس کے طبقوں کی گہرائی اور سانچوں اور بچھوؤں کی درازی ناپے لگیں گے۔ اصحاب کعب کے قصے میں ان کی تاریخی حقیقت کھنے کے بجائے ان کے ناموں کی فہرست اور ان کے کئے کی نسل بیان کریں گے۔ اور جنگ بدر میں فرشتوں کے عزوں کی حقیقت سمجھنے کی جگہ ان کی شکلوں گھوڑوں، عماموں کا رنگ اور ساری اور قتل جملہ کی کیفیت لکھیں گے۔ اگر ان چیزوں کا موقع نہ ہوگا تو فصاحت و بلاغت کی لطافتیں دکھلائیں گے یا خیالی فلسفیانہ بحثیں کریں گے۔

یہ عیوب و استقام جو میں نے بیان کئے موجودہ تفسیر میں کوئی تفسیر بھی ان سے خالی نہیں ہے۔ اگر اسی کو قرآن کی خدمت سمجھا جاتا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اب تک اس کی کوئی خدمت ہی نہیں ہوئی۔ ہمارے زمانہ کا ایک تلاشی حق ان تفسیر کے متعلق لکھتا ہے:-

”آج اگر کوئی طالب حقیقت اپنی بھی ہوئی آگ سلگانے کی نیت سے کسی بڑی سے بڑی تفسیر کی طرف رجوع کرتا ہے تو پیلا ورق کھوتے ہی اس میں انسانی باطل آرائی اور غلط گوئی، داستان ہرانی اور حقیقت پوشی، آسمان سوالی اور رسیاں جوابی کی وہ حبیب سوز بدعنوانیاں دیکھتا ہے کہ اس قصاب خانہ عقل و فہم کو دیکھ کر روح کا پٹھتی ہے۔ کہیں اس کے اندر صرف و نحو کے متعلقات ملتے ہیں کہیں اعراب پر لپی چوڑی کٹیں ہیں کہیں اسباب فصاحت پر جرح و قدح ہے کہیں ظن و قیاس کے ظلت انگیز مناظرے ہیں کہیں حدیث اور قال قال کا بے سراگ ہے کہیں فرضی اور بے سند قصوں کا طویلہ

ہے کہیں بے ربطیاں ملیں تک ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں، ہر آیت سیاق سے الگ سیاق سے علیحدہ، اندر سے ٹکڑے ٹکڑے باہر سے بے مطلب اور بے مقصد بن گئی ہے۔ جہاں ربط روز روشن کی طرح عیاں ہے وہاں غفلانہ تلاش ہے۔ جہاں بے ربطی کی خبیث عظیم اور تدبر و علم کی ضرورت ہے وہاں آئیں بائیں شائیں ہے۔ نہ اصول مطلب سے بحث ہے نہ نتائج پر نظر ہے نہ علم کی تلاش ہے نہ حکمت کی جستجو ہے.....

کسی مفسر قرآن کی نظر آج تک اس بات پر نہیں رہی ہے کہ ناظر کا جہاد عاقلانہ و عوامی کی ماہیت کو سمجھنا ہے کہ چند الفاظ میں اس کے اندر کیا لکھا ہے، چند جملوں میں وہ کیا اصول ہیں جن پر چلے جاتے، ان کی حکمت الہی کیا ہے، ان کی دستور سی سند کیا ہے، وہ کیوں ذکر للعالمین ہے، کیوں ہدیٰ اور رحمتہ ہیں۔ بعینہ یہی باتیں ہیں جو ہر تفسیر اور ترجمہ میں کالعدم ہیں۔ اسی مدعا کو عثمان کر لوگ تفسیریں پڑھتے ہیں اور یوں ہوا کر رہ جاتے ہیں کوئی مستقل اصول، کوئی گر، کوئی کارگر بات موجودہ تفاسیر سے ان کے پلے نہیں پڑتی۔ الغرض تفسیر یا ترجمہ قرآن کا مطالعہ تلاشی علم کے لئے مدت مدید سے وہ بی نتیجہ اور ناموفق رہا ہے کہ ایمان کے شعلہ کو آسمان سے لے کر زمین کے بجائے متقدم کی اس سلگتی مہوئی چمکا کر بھی بجھا دیتا ہے جو مسلمان کے دل میں رسماً یا غفلتاً موجود ہے، تذکرہ علامہ عنایت اللہ خاں مشرقیؒ

سب سے بڑی مصیبت یہ مہوئی کہ متاخرین نے یہ طے کر لیا کہ قرآن فہمی میں عقل کو دخل نہیں دینا چاہئے بلکہ جو کچھ متقدمین کہہ گئے ہیں اسی کو صحیح تفسیر عقین کرنا چاہئے۔ اس عقیدت نے قرآن فہمی کا دروازہ ہی بند کر دیا اور مسلمان بالعموم اسی ذخیرہ پر جہل و جهل سے چلا آتا تھا فانی ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود علماء اسلام کا طبقہ بھی قرآن سے محروم ہو گیا چہ جائیکہ عوام اور قرآن چھوڑنے کی جو سزا تھی وہ سب کو ملی لیکن وہ خیمہ نور یعنی قرآن کریم اسی طرح زندہ اور زندگی بخش ہے۔ وہ ہر زمانہ کے لئے ہے اور ہمیشہ ایک نیا عالم پیدا کر سکتا ہے۔ وہ ایسی مکمل کتاب ہے جو واضح ہے، مفصل ہے، اپنے اصول اپنے اندر رکھتی ہے اور اپنی تفسیر خود ہے۔

علم سیاست اور اجتماعی تباہی

[ذیل میں ہم ایک مشہور اطالوی عالم سنو رمو کا دروا کے ایک مضمون کا ترجمہ درج کرتے ہیں۔ یہ ان کی مکرملہ الآرا تصنیف ”سیاست بحیثیت علم“ سے ماخوذ ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ جرمن زبان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ میر]

میاں جس سوال پر بحث مقصود ہے وہ علمی حقیقت سے شاید ان تمام مسائل سے زیادہ اہم ہے جن سے علم سیاست بحث کرتا ہے یا جن پر اسے بحث کرنا چاہئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس علم کی ترقیوں سے ایک دن وہ تباہ کن انتشارات یک علم رک سکیں گے یا کم از کم ان کی نقد اور شدت میں کمی ہو سکے گی یا نہیں جو بد فعات وقتاً فوقتاً پیدا ہو کر تہذیب و تمدن کی ترقی کو روک دیتے ہیں اور ان قوموں تک کو، کچھ ہی عرصہ کے لئے سہی، متعطلہ بربریت کی طرف بے جاتے ہیں جو انسانیت کی تاریخ میں متنازعیت حاصل کر چکی تھیں۔ میں یہاں بعض باتیں پیش کرنا چاہتا ہوں جو شاید اس پیچیدہ مسئلہ کے حل میں کچھ مدد دے سکیں، مگر ان کے اظہار سے پہلے خود مسئلہ کو ذرا زیادہ صحت و وضاحت کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ یہ انتشارات عموماً اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب قوم بوڑھی ہو جاتی ہے اور ای کافرخی قبیہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد مر جاتی ہے۔ مجھے تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ جب لوگ قوموں کے بڑھاپے اور ان کی موت کا ذکر کرتے ہیں یہ سب ایک شاعرانہ استعارہ کا استعمال ہوتا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور استعارہ بھی ایسا جس سے اس منظر کا پورا پورا تصور قائم نہیں ہو پاتا جس کی تحقیق منظور ہے۔ اور ان لوگوں کے ذہن میں تو یہ تصور اور بھی قائم نہیں ہو پاتا جنہوں نے تاریخ کا مطالعہ چنداں غور سے نہیں کیا۔ جو فرد تو ضرور بڑھا ہوتا ہے اور مرنے والا ہے۔ یہ اس کی تقدیر کا تقاضا ہے جب اس کی قوت حیات ختم ہو چکتی ہے کوئی مرض یا کوئی شدید خارجی سبب اس کے کسی ایسے عضو کے فعل کو پوری طرح انجام نہیں دیتا

دیتا یا بالکل بذکرتیا ہے جو حیات کے لئے لازمی ہے۔ جماعت کے باب میں ایسا مادی بوڑھا یا بچہ میں نہیں آتا۔ اس لئے کہ ہر نئی نسل کے جوانوں میں پوری پوری قوت حیات موجود ہونی چاہئے۔ مادی موت بھی ناممکن سی معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ اس کے واسطے تو یہ ضروری ہوگا کہ ایک پوری نسل کی نسل اولاد پسیدہ کرنے سے محروم رہے۔

ہاں، لوگ ایسی قوموں کی مثالیں دے سکتے ہیں جو بالکل غائب ہو گئیں اور جن کے اخلاف کا آج پتہ بھی نہیں لگتا۔ مثلاً تھاسینیکی دسی آبادی غائب ہو گئی، آسٹریلیا کی اصلی آبادی بھی ختم ہوا چاہتی ہے، جزائر کناری کے گروہوں میں شاید کچھ گنتی کے آدمی بچے ہوں تو بچے ہوں۔ امریکہ کے تیرے اصلی قبائل بالکل مٹ چکے اور بہت غمخیز بٹنے کو ہیں۔ لیکن ان سب صورتوں میں ایک چھیدی چھیدی منتشر آبادی کا معاملہ تھا جو سکریا یا مہمگی سے اپنا پیٹ پانتی تھی، جن کی روزی سفید آدمیوں کی نوآبادی نے ان سے چین لی جب سفیدوں سے ان کا تعلق ہوا تو ان کا تمدن اس قدر لپٹ تھا کہ نہ یہ زراعت شروع کر سکے نہ ان سفیدوں سے دولت آفرینی کے اور طور طریقے سیکھ سکے۔

لیکن صورت حال بالکل اور ہوتی ہے جب ایسے لوگوں کا معاملہ ہو جو زراعت تک پہنچ چکے ہیں، خیر انتہا منظم اور قوی قومیتوں کی شکل رکھتے ہیں اور اپنا مخصوص تمدن پیدا کر چکے ہیں۔ اس حال میں شاید کبھی بھی اخلاف کی کمی کے باعث کوئی نسل مادی طور پر نہیں مری ہے۔ اس منزل کو پہنچنے کے بعد لوگ اپنی اصلی شکل کھو سکتے ہیں، دوسرے تمدنوں میں جذب ہو سکتے ہیں، اپنا مذہب اور کبھی کبھی اپنی زبان بھی بدل سکتے ہیں، ان میں کامل ذہنی اور اخلاقی تبدیلی ہو سکتی ہے، مگر مادی طور پر پھر بھی جئے جاتے ہیں!

اس قسم کے قلب ماہیت کے باوجود جئے جانے کی مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ قدیم گیلک اور قدیم آئیرین قوموں کے اخلاف برابر لاطینی تمدن کے زیر سایہ زندگی گزارتے رہے جس نے ان کی تشکیل کی تھی۔ قدیم عراقی یا شامی اقوام، آٹھویں صدی کی عربی فتوحات کے بعد عربوں کی زبان اور ان کا مذہب اختیار کرنے کے باوجود بھی آخر میاں ہی کیں۔ یہی مصر میں ہوا، جہاں نام نہاد عربی آبادی میں اب تک بھی اپنے ان اصلی اجداد کا ناک نقشبہ محفوظ ہے جنہوں نے عہد فرعون کی کا تمدن پیدا کر کے اسے چار ہزار سال کی عمر بخشی تھی۔

اٹلی کے موجودہ باشندے آج بھی زیادہ تر قدیم اطالوی نسل سے ہی ہیں اور موجودہ اہل یونان کی رگوں میں آج بھی پگھلیں یا اسطر کے کسی ہم عصر کا یا نویں دسویں صدی کے کسی بازنطینی کا خون دوڑتا ہے۔

اگر ہم ان قوموں کو نظر انداز کر دیں جنہیں کسی بلند تر تمدن والی پر دہی حکومت نے اپنے اندر جذب کر لیا ہے جیسے کہ گیلک، آئبرین اور ہٹ سی اور کم و بیش بربریت میں رہنے والی قوموں کو روم کی اولوالعزمی نے ایک قومی شیرازہ میں منسلک کر لیا تھا، ہاں اگر ہم ایسی قوموں کو نظر انداز کر دیں تو یہ بات صاف ہے کہ جو قوم خود اپنا تمدن بنا سکتی اور اسے صدیوں تک قائم رکھ سکتی ہے اس کی موت بس دو وجوہ سے آسکتی ہے اور آتی بھی ہے۔ یہ وجوہ اسے اندر سے گھن کی طرح کھا کھا کر کھوکھلا کر دیتی ہیں اور پھر باہر سے ذرا سا دھکا انہیں ختم کر دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اور تقدیر کا کرشمہ دیکھیے یہ دونوں وجہیں ایک دوسرے سے اکثر وابستہ ہوتی ہیں۔ قومیں واقعی مرتی اس وقت ہیں جب ان کے برسرِ اقتدار طبقہ میں یہ صلاحیت باقی نہیں رہتی کہ زمانہ کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے ساتھ اپنی نئی تنظیم کر سکیں اور جماعت کی بہت ترین گہرائیوں سے نئے عناصر کو ابھار کر اپنے خون کی تجدید کر سکیں اور جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں موت ان قوموں کے لئے بھی مقدر ہے جن میں وہ اخلاقی قوتیں فنا ہو جائیں جو انہیں مجتمع کئے رہتی ہیں اور جن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انفرادی مساعی کی ایک بڑی تعداد متفق و متحد و نظم ہو کر ایک ہی مشترک مقصد کی خادم بن جاتی ہے، بالفاظ دیگر، بڑھا چا جو موت کا پیش خمیہ ہے، ان سیاسی تنظیمات پر طاری ہوتا ہے جن میں وہ خیالات و جذبات اپنا تسلط کھو چکے ہیں جو ان کی انفرادیت کے برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں اور ایسے نئے خیالات و جذبات پیدا نہیں ہوتے جو انہیں مشترک اور متحدہ سی کے قابل بنا سکیں۔

اسی حقیقت سے روایات، رسم و رواج اور بزرگوں کی ریت سے اس داغی کی توجیہ ہوتی ہے جو آٹا و صر کی پرانی ریاستوں سے لے کر سلطنت روم کے عہد تک قدیم اقوام کے مذہب اور سیاسی و مذہبی کی بنیاد تھی۔ یہی داغی چند نسل پہلے تک چین و جاپان میں کار فرما رہی اور جس سے باوجود اس کے کہ ظاہر صورت اس کے خلاف ہے خود یورپ کی جدید اقوام بھی نا آشنا نہیں خصوصاً انیگلو سکسین نسل کی قومیں۔ قوم ظاہر جمعی طور پر محسوس کرتی ہے کہ اگر اسے مزہ نہیں ہے تو بعض اصولوں اور بعض نیایدی خصائص کا پابند رہنا ازل سے ضروری ہے اور یہ اصول اور خیالات ان تمام اجزاء میں جاری و ساری ہوتے ہیں جن سے قوم عبارت ہے۔ وہ محسوس کر لیتی ہے

کہ اس کی شخصیت اسی طرح قائم اور اس کی مخصوص اجتماعی ہئیت اسی طرح برقرار رہ سکتی ہے کہ اس سے ہی ہر الگ الگ تپھر کو وہ چنانچہ میر ہوتا ہے جو ان سب کو باہم جوڑے رکھتا ہے۔

اگر ماضی کی پرتش میں مبالغہ ہو اور دوسری قوتیں اس کی وجہ سے یک تلم اثر انداز نہ ہو سکیں تو پھر خوش قسمتی کیلئے یا بد قسمتی اس کا لازمی نتیجہ جمود ہوتا ہے۔ لیکن جمود بلا بادش بس اسی وقت ممکن ہے کہ دوسری تمام قوتیں بھی حرکت نہ کریں۔ چین و جاپان نے سترھویں اٹھارویں اور کچھ کچھ انیسویں صدی میں یہ کوشش کی تھی کہ کامل سکون کی حالت میں زندگی گزاریں۔ لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی اور انھیں اس سکون سے نہایت سختی کے ساتھ بےخبر ہو کر باہر گھسیٹا گیا۔ اور یہ بات ہے بھی قدرتی۔ اس لئے کہ کامل جمود انسانی جماعت کے لئے ایک مصنوعی سی کیفیت ہے۔ خیالات، جذبات اور رسوم کا دائمی تغیر فطری ہے اور اس تغیر کا اظہار ریاستی تنظیمات سے ہونا ضروری ہے۔ اگر اس بات کو روکنا منظور ہو تو ان تمام اثرات کو مٹانا ہو گا جو شہرہ و تحقیق، امتثال علوم اور وصیت تجربہ سے رونما ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی موجودگی میں تو نئی ذہنیت کا پیدائش ہوتا اور ان نئے جذبات کا نشو و نما پانا ناگزیر ہے جن سے اجداد کی تعلیمات پر یقین اور روایتی خیالات پر بھروسہ، جو سیاسی عمارت کی بنیاد ہے، البا اوقات اندر ہی اندر سے کمزور ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک یونانی جو فلاطون اور ارسطو کے ساتھ رہتا سمجھتا ہو ان دونوں پر شکل ہی سے عقیدہ رکھ سکتا تھا جو ہومر نے انسانی شکلوں میں پیش کئے ہیں؛ اور اس بات کے تسلیم کرنے پر تو وہ اور بھی آمادہ نہ ہوتا کہ یہ دونوں یونانی شہروں کے فرمانرواؤں کو جنھیں یونان کے سب سے بڑے شاعر نے مخلوق کا چرہ ایا قرار دیا ہے، برابر شہرہ دیتے رہتے ہیں اور ان کے پشت پناہ ہیں۔ والٹر کا کوئی مہجر فرانسیسی شکل ہی سے باور رکھ سکتا کہ کوئی پانزدہم کو خدا کی طوف سے فرانس پر حکومت کرنے کا فرض تفویض ہوا ہے۔ اور ایک چینی یا جاپانی جو کسی یورپی یا امریکی یونیورسٹی میں پڑھ آیا ہے، شکل اس یقین کو محفوظ رکھ سکتا ہے کہ مملکت انسانی کا مکمل ترین و جامع ترین اظہار بس کٹھنسیوس کی تصانیف میں ہے۔

ان حالات سے ظاہر ہے کہ ان نعمت امتزاجات اجتماعی کو جن سے تہذیب کا کوئی خاص نمونہ خستہ ہوتا اور جس کے باعث متعلقہ نسلوں کو بے حساب مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے، یعنی اس چیز کو جسے ریاست یا قوم کی موت کہتے ہیں، مٹانے کی بس ایک تدبیر ہے۔ اور وہ تدبیر یہ ہے کہ آہستہ آہستہ مگر مسلسل اخلاقی اتحاد عمل

کے نئے عناصر پیدا کئے جائیں جو پرانوں کی قائم مقامی کر سکیں۔ غالباً اس معاملہ میں بھی بہترین نتائج اسی طرح حاصل ہو سکتے ہیں کہ دو نظری طور پر تضاد رجحانات میں یعنی تحفظ و تجدید، بقا و تغیر کے رجحانات خالص میں جمع توازن قائم رکھا جائے۔ بالفاظ دیگر ایک سیاسی تنظیم، ایک قوم یا ایک تمدن صحیح معنوں میں غیر فانی ہو سکتے ہیں اگر وہ یہ کر سکیں کہ اپنے کو برابر بدلتے رہیں مگر کبھی منتشر نہ ہونے دیں۔

اور اگر واقعی قوموں کی موت، سیاسی تنظیمات کا مکمل انتشار، اور یہم و شدید مصائب اجتماعی جن سے تمدن کی ترقی بالکل رک جاتی اور انسانیت پھر سے بربریت کے نعروں میں جا پڑتی ہے کبھی ٹٹائے جا سکیں گے تو اس میں یقیناً علم سیاست کی ترقی اور اثر کو بہت کچھ دخل ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ گذشتہ زمانہ میں بارہا محض سیاسی تجربہ نے ایسے انتشارات کو روکا تھا ماہے بشیر ملکہ اس تجربہ کو کسی غیر معمولی دماغ نے روشن کر دیا مگر کسی غلط تعلیم نے اسے گمراہ نہ کر دیا ہو۔ اس لئے مجھے یہ بات بالکل صاف معلوم ہوتی ہے کہ اگر ان قوانین کو صحیح علم ہو جائے جو ان کی اجتماعی فطرت میں کارفرما ہیں تو یقیناً یہ علم شخصی تجربہ سے زیادہ موثر ثابت ہو گا۔ اس علم سے ہمیں کم سے کم اس میں تیز کرنا پڑے گا کہ کن چیزوں کا وقوع ممکن اور کن کا سرے سے ممکن ہی نہیں ہے۔ اور اس طرح کم از کم یہ تو یہ ہو کرے گا کہ تیسرے نیک ارادے اور بہت ساری خوش متبتی اس میں ضائع جائے بلکہ الٹی نقصان وہ ثابت ہو کہ آدمی خواہ مخواہ اجتماعی زندگی میں اس تکمیل کی امید لگا بیٹھے جو کبھی حاصل ہی نہیں ہو سکتی، علاوہ بریں اس سے یہ بھی ممکن ہو جائے گا کہ سیاسی زندگی میں بھی وہی طریقے برتے جائیں جن کا استعمال انسانی ذہن قدرت کی قوتوں کو قابو میں لانے کے وقت کیا کرتا ہے۔ اور وہ طریقہ جس سے تو ہے کہ آدمی ان قوتوں کے فعل کو تو جہ سے مشاہدہ کرتا ہے، انہیں سمجھتا ہے، اور انہیں مسترد کئے بغیر ان کے عمل کو کم و بیش بدلتا رہتا ہے۔

میں کہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میری رائے میں انیسویں صدی میں اور بیسویں صدی کے اس ابتدائی زمانہ میں علم تاریخ کی ترقیات اور علوم اجتماعی کی تصریحات نے یقینی واقعات اور ملکی معلومات کا ایسا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے کہ موجودہ اور آنے والی نسل کے لئے ایک واقعی علمی سیاست کی تدوین ممکن ہو گئی ہے۔ اور یہ وہ بات ہے جو پہلی نسلوں کے لئے ناممکن تھی۔ البتہ یہ بتانا بہت دشوار ہے کہ یہ علم اپنے کو عمل کے لئے موثر بنائے گا۔ یہ ایک عنصر خصال کی حیثیت کب اختیار کرے گا جس سے دوسرے عناصر عمل کی تکمیل اور ان میں تغیر ممکن ہو بصورت

کا کوئی نظام، علمی سیاسی قوت اس وقت بن سکتا ہے جب وہ کم سے کم مکران طبقہ کی اکثریت کا جزو بن جائے اور ان کے خیالات و احساسات پر اسے غلبہ حاصل ہو جائے۔ مگر اس غرض کے لئے وہ خیالات سب سے کم موزوں جلتے ہیں جو وقتی علمی ہوں، اس لئے کہ ان میں لوج یا تطابق کی صلاحیت نہیں ہوتی اور اسی لئے ان میں بہت کم یہ قوت ہوتی ہے یا بالکل نہیں ہوتی کہ ان جذبات کا رخ موڑ سکیں جو کسی خاص وقت غلبہ پاتے ہیں یا کسی وقتی غرض کے پورا کرنے میں مدد دے سکیں۔

فاشزم

۱ ذیل میں ہم فاشستی مذہب کے بانی 'موسلینی' کا ایک مقالہ ترجمہ کر کے پیش کرتے ہیں۔ یہ مقالہ موسلینی نے ۱۹۳۲ء میں *Enciclopedia Italiana* کی چودھویں جلد کے لئے لکھا تھا۔ اس سے اس نے سیاسی مذہب کی فلسفیانہ اساس اور بانی مذہب کی ذہنیت پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ دیکھا

(۱)

اب تو اس بات کو بہت زمانہ ہونے آیا۔ جب میں نے ۱۹۱۹ء میں میلان کے اندر پوپوٹو ڈالائیہ میں دعوت دے کر بنگ عظیم میں مداخلت کی عامی جماعت کے ان سب اراکین کو یکجا کیا تھا جو خود جنگ میں شریک ہو چکے تھے اور جنوری ۱۹۱۵ء میں فاشستی انقلابی جماعت کے قیام کے بعد سے برابر میرے ساتھ تھے۔ تو اس جلسہ کے وقت میرے ذہن میں کوئی خاص مسلک یا مذہب نہ تھا۔ مجھے ذاتی تجربہ صرف ایک مذہب کا تھا یعنی اشتراکیت کا کوئی دس برس کا تجربہ یعنی ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۴ء کے موسم سرما تک۔ لیکن اگرچہ میں اس تحریک میں پہلے ایک معمولی رکن کی حیثیت سے اور پھر چیئرمینیت کا دھندھ لیتا رہا مگر اشتراکی مذہب کا تجربہ عمل میں مجھے کبھی نہ ہوا تھا۔ اور میرا مسلک ذاتی اس زمانہ میں بھی عمل کا مسلک تھا۔

۱۹۰۵ء کے بعد سے اشتراکیت کا کوئی ایسا نظریہ نہ تھا جسے سب بلا اختلاف منتے ہوں۔ اس لئے کہ مذہب اشتراک میں ترمیم کی تحریک برنشتائن کی قیادت میں اٹھ چکی تھی۔ ۱۰ دھرمالات وقت کے اثر سے ایک انتہا پسند انقلابی تحریک بھی رونما ہو چکی تھی جو اگرچہ اٹلی میں کبھی بھی باتوں سے آگے نہیں بڑھی مگر دوس میں اسی پر بولشویک مذہب کی بنیاد قائم ہوئی۔ بغض اصلاح، انقلاب اور مرکزیت یہ وہ الفاظ تھے جن کی مدد سے باگزشت بھی آج ختم ہو چکی ہے۔ مگر فاشستی تحریک کے بے دھارے میں ان خیالات کا پتہ چلتا ہے جو سوسیئل اور پیگنی سے شروع ہوئے تھے اور لاگرویل کی 'تحریک اشتراکی' *Mouvement Socialiste* سے 'یا اطالوی حزب العمال کی

تحریک سے جس نے ۱۹۲۴ء سے ۱۹۱۷ء تک اطالوی اشتراکی حلقوں میں ایک نیا عنصر شامل کر دیا تھا، جسے گیلویٹی کی دغا نے بہت کچھ کمزور کر دیا۔

۱۹۱۹ء میں جنگ عظیم کے بعد اشتراکیت جغیت ایک مسلک کے ختم ہو چکی تھی۔ بس ایک نفرت باقی تھی۔ عمل کا صرف ایک امکان اس کے لئے تھا، خصوصاً اٹلی میں یعنی ان لوگوں سے انتقام جنہوں نے جنگ کی حمایت کی تھی اور جنہیں اب اس کے سناج کا کفارہ دینا چاہئے تھا۔ میرے اخبار ’پوپولو ڈائلیہ‘ کا دوسرا نام ان دنوں تھا ’سابق سپاہیوں اور دولت آفریں جماعت کا اخبار‘ اور یہ الفاظ ’دولت آفریں جماعت‘ اسی وقت سے ایک دہری رجمان کا پتہ دے رہے تھے۔ فاشستی تحریک کسی ایسے مسلک کی پیداوار نہیں ہے جس کی پہلے سے مفصل طور پر تدوین ہو چکی ہو۔ اسے تو عمل کی ضرورت نے پیدا کیا ہے۔ اسی لئے پہلے دن سے یہ اس قدر نظری نہیں ہے جس قدر عملی ہے۔ فاشزم محض ایک اور سیاسی جماعت کا نام نہیں ہے۔ یہ تو اپنی زندگی کے پہلے دو سال میں بھی سب سیاسی جماعتوں کا مخالف رہا۔ یہ تو بجائے خود ایک زندہ تحریک ہے۔

میں نے اس زمانہ میں اسے جو نام دیا اس سے گویا اس کی ماہیت تعین ہو گئی۔ پھر بھی اگر کوئی اس زمانہ کے اخباروں کی گرد آلود مسلیں اٹے پٹے اور اس طبع کی کارروائی پڑھے جس میں *Fasci Italiani di combattimento* نامی جماعت کی تشکیل ہوئی تھی تو وہاں کسی حزب مسلک کی تعلیمات نہ ملیں گی بلکہ کچھ جوامع الکلم ہوں گے، کچھ امیدیں اور کچھ حوصلے، جو اپنی اصل حالت سے تپ تپا کر ایک دن اس مسلک کے تصورات ترکیبی بننے والے تھے جسے فاشستی سیاسی مسلک کہتے ہیں اور جو حال و ماضی کے تمام اور مسلوں سے جدا ہے۔

میں نے اس وقت کہا تھا کہ ”اگر سرمایہ دار طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ جو سبکی ان پر کرنے والی ہے اسے اپنے اندر سے گذار دیں تو وہ بہت دھوکے میں ہے۔ ہمیں تو اپنا کام فوراً شروع کر دینا چاہئے..... ہم تو محنت کرنے والے گرد و کھیتی اور موثر قیادت کا عادی بننا چاہتے ہیں۔ اور انہیں یقین دلانا کہ کسی صنعتی یا تجارتی کاروبار کو کامیابی سے چلانا سہل کام نہیں ہے..... ہم ہر رجعت پسندی کا مقابلہ کریں گے چاہے وہ صنعتی ہو چاہے روحانی..... جب مسند حکومت پر بائشین کی جگہ خالی ہو تو ہمیں اس کے لئے لڑنے

کو بھی تیار رہنا چاہئے..... ہیں عملت کی ضرورت ہے، جب موجودہ حکومت ٹوٹے تو ہیں اس کی جگہ لینے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ جانشینی کا حق نہیں تو بیعت چاہئے، اس لئے کہ ملک کو جنگ میں شریک ہونے پر مجبور نہیں کیا تھا اور ہیں نے اسے فقیاب کرایا..... سیاسی سائنس کی موجودہ طریقہ بالکل ناکافی ہے، نمائندگی براہ راست افراد متعلقہ کی ہونی چاہئے..... اس لائحہ عمل کے خلاف یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہ تو اسی دکارپوریشن کے خیال کی طرف لوٹنا ہوا۔ اگر ایسا ہے تو بھی کیا مضائقہ ہے..... لہذا میری خواہش ہے کہ چیمبر معاشرتی نقطہ نظر سے قومی حزب العما کی حمایت کو از سر نو قبول کرے؟ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اس پہلے دن بھی پایا زسان سیولکرویں نقطہ دکارپوریشن“ منہ پر آیا جو پھر بعد کو دوران انقلاب میں وہ ادارہ ثابت ہوا جسے جماعتی قانون سازی نے ترتیب دے کر جماعتی عد کی بنیاد بنا دیا ہے۔

(۲)

روم پر چڑھائی سے پہلے کا زمانہ بڑی دشواریوں کا زمانہ تھا، عمل کی ضرورتوں میں تحقیق علمی اور تکمیل مسلک کی فرصت کہاں تھی؟ قصوں اور کانوں میں جنگ کرنی تھی۔ بہت کچھ بحث و مباحثہ بھی ہوتا تھا مگر جو بات اہم تھی اور مقدس، وہ یہ کہ لوگ جانیں دے رہے تھے اور جانتے تھے کہ جان کیسے دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مسلک کی خوبصورتی سے بیان کئے ہوئے اور انتہام سے مکمل۔ کئے ہوئے مسلک کی، موٹے موٹے عنوانات کی اور کٹے چھٹے وضعات کی کمی ہو، مگر اس کی جگہ ایک اور چیز ہے رہی تھی جو اس سے زیادہ فیصلہ کن تھی یعنی یقین۔

پھر بھی اگر کوئی شخص جو تحقیق کرنا اور مواد سے کام لینا جانتا ہو، کتابوں اور مضمونوں کم و بیش اہم کانگریسوں کی قراردادوں اور تقریروں سے اس زمانہ کے واقعات کو سمجھنے کی کوشش کرے تو وہ پائے گا کہ ناشستی مسلک کے اساسی اصول اسی کٹاکش کے زمانہ میں موصول کئے تھے۔ اسی زمانہ میں ناشستی تمیل نے اپنے کو خوب سلیح کر لیا تھا، اچھی طرح نکھار لیا تھا اور اپنی ذہنی تنظیم کا کام شروع کر دیا تھا۔ انفرادی شہری اور

ریاست کے تعلق کا مسئلہ تھا، اس سے تعلق آئمہ اور آزادی کے مسائل تھے، سیاسی اور اجتماعی مسائل بھی تھے اور مخصوص قومی مسائل بھی اور ان سب کے لئے حل کی تلاش تھی اور ہر لہزم، جمہوریت، انٹراکٹ اور فری مین جماعتوں سے مقابلہ بھی جاری تھا۔

لیکن چونکہ نظم و ترتیب کا نہ ہونا ان حالات میں ناگزیر تھا اس لئے فائٹنرزم کے مخالفوں نے اس کی اصلاحیت ہی سے انکار کیا ہے کہ وہ کوئی نظم مسلک پیش کر سکتا ہے۔ اگرچہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہی یہ مسلک نشوونما پا رہا اور مرتب ہوتا رہا ہے، پہلے صیاد کہ سب نے خیالات کا حال ہوتا ہے کچھ شور و غلب کے ساتھ اور ایک شدید بے دلیل انکار کی صورت میں اور بعد کو مثبت تعمیری حیثیت سے اس نے ان قوانین اور اداروں کی شکل اختیار کی جو مسئلہ، مسئلہ اور مسئلہ میں فاشستی حکومت نے نافذ کئے ہیں۔

اس وقت فائٹنرزم ایک باطل نرالی چیز ہے، حیثیت عدم حکومت کے بھی اور حیثیت مسلک سیاسی کے بھی۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ آج فائٹنرزم خود اپنے اوپر اور دوسروں پر اپنی تنقیدی استعداد سے کام لینے کے بعد ایک واضح اور مخصوص نقطہ نظر قائم کر چکا ہے، جس کی طرف وہ رجوع کر سکتا ہے اور تمام معاملات میں جن سے دنیا اس وقت دوچار ہے، چاہے علی ہوں یا ذہنی، یہ اس کی روشنی میں عمل پیرا ہو سکتا ہے۔

اور سب اہم بات یہ ہے کہ وقت کی سیاسی مصلحتوں سے قطع نظر فائٹنرزم جس قدر انسانیت کے مستقبل

اور اس کی نشوونما پر نگاہ ڈالتا ہے تو نہ امن عام کا فائدہ سمجھ میں آتا ہے، نہ اس کے امکان پر یقین۔ لہذا

یہ امن پرستی کے مسلک کو رد کرتا ہے، کہ یہ ترک سہی کا مسلک ہے اور قربانی و ایشار کے مقابلہ میں بڑی کا مظاہرہ۔ جنگ ہی انسانی قوت کو بلند ترین درجہ تک پہنچا سکتی ہے اور جن قوموں میں اس کی صلاحیت ہے ان پر خیرات کی مہر ثبت کر دیتی ہے۔ باقی سب آزمائشیں بس بدل اور قائم تمام ہیں جن سے آدمی کبھی اس جگہ نہیں پہنچتا جہاں ایک عظیم الشان فیصلہ کن اندر وری ہوتا ہے، یعنی زندگی اور موت میں فیصلہ۔ لہذا جو مسلک امن کے اس مضمر نظریہ پر

مبنی ہو وہ فائٹنرزم کا مخالف ہے۔ اسی طرح فائٹنرزم کی روح کے منافی ہیں تمام بین الاقوامی جمعیتیں اور انجمنیں۔

ہر چند کہ مخصوص حالات سیاسی کی وجہ سے کبھی انھیں تسلیم ہی کیوں نہ کرنا پڑے اور تاویخ بنا دیگی کہ اگر ایک تہہ بھی کسی محرک سے قوی قومی جذبہ بیدار ہو گیا تو وہ جذبہ باقی محرک ہو یا خیالی یا عیالی، یہ سب جمعیتیں اور انجمنیں منتشر

ہو کر ہوا میں اٹتی پھیرے گی۔

یہ امن پرستی کی مخالفت و نہایت فاشترم نے افزاؤ کی زندگی میں بھی شامل کر دی ہے۔ سکو اوڈر سٹاک
یہ پرغور مقولہ *Me ne fero* جو زخم کی ٹپیوں پر لکھا ہوتا ہے محض *مصلحتی غلطی نہیں*، ایک سیاسی
ملک کا خلاصہ نہیں، بلکہ مقابلہ و مبارزت کی تعلیم ہے، مقابلہ کے خطوں کو اٹھانے کا درس ہے، اور اٹلی کے
لئے زندگی کی ایک نئی راہ کی علامت ہے۔ غرض یہ کہ فاشترم زندگی کو قبول کرتا ہے اور اس سے محبت کرتا
ہے، یہ خودکشی کا نام نہیں جانتا اور اسے بڑی حقارت سے دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی ایک فرض ہے،
ایک کشش اور ایک فرخ۔ اس کے نزدیک زندگی لمبہ ہونی چاہئے اور پر اپنی خاطر بھی زندہ رہنا چاہئے، لیکن
اس سے زیادہ دوسروں کے لئے، ان کے لئے جو قریب ہیں اور ان کے لئے جو دور ہیں، ان کے لئے جو
اس وقت موجود ہیں اور ان کے لئے جو بعد کو آئیں گے۔

فاشترم واقعی اپنے ہمایہ سے محبت کرتا ہے، لیکن یہ ہمایہ اس کے لئے کوئی غیر واضح اور دھندلا
تصور نہیں ہوتا۔ اس ہمایہ کی محبت کی وجہ سے ضروری تعلیمی و مادی سختی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی
نیز فرق مراتب میں حامل ہوتی ہے۔ فاشترم کسی ”عالمگیر معائنہ“ کا قائل نہیں۔ مذہب اقوام کی جمیتہ میں
اچھی طرح زندہ رہنے کے لئے وہ اپنے معاصرین پر نہایت تیز نگاہ رکھتا ہے، ان کی کیفیت دماغی کو اچھی
طرح دیکھتا رہتا ہے، اور ان کے اغراض کے متغیر رجحانات میں کسی عارضی اور فریب دہ ظاہر داری سے
دھوکا نہیں کھاتا۔

زندگی کے اس تصور نے فاشترم کو اس نظریہ کی ضد بنا دیا ہے جو نام نہاد علمی مارکسی انٹراکٹ کی بنیاد ہے
یعنی تاریخ کی مادی تعبیر کا نظریہ جس کی رو سے تہذیب انسانی کی تاریخ کی تشریح بس مختلف جماعتی طبقوں کے
اغراض کے تصادم سے اور وسائل و ذرائع دولت آفرینی میں تغیر و رتی سے ہو سکتی ہے، اس بات سے تنک
کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ معاشی زندگی کے تغیرات شلئے اجناس خام اور اخیس کا آمد بنانے کے نئے
طریقوں کی دریافت اور سائنس کے نئے اختراعات سے بہت کچھ اثر پڑتا ہے لیکن یہ کہنا کہ تاریخ انسانیت
کی تشریح ان سے ہو سکتی ہے اور دوسرے تمام عناصر کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے ایک ہوکا ہے۔ فاشترم آج بھی

اتفاق دیکھتا ہے اور منہ پر کھینکنا غصہ پر اور شجاعت یعنی ان اعمال چہن میں براہ راست یا بالواسطہ کوئی اثر کار فرما نہیں ہوتا۔

اور اگر تاریخ کا یہ مادی تصور تسلیم نہ کیا جائے جس کی رو سے انسان بس کھینکیاں ہیں جنہیں محبت و اتفاق کی موصیں کبھی ادھر لٹا دیتی ہیں کبھی ادھر کہ اصلی موثر قوتیں تو ان کے قابو سے باہر ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم جنگ طبقات کے تصور کے بھی منکر ہیں جو اس نظریہ تاریخ کا ناگزیر نتیجہ ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ فاشیزم اس بات کا منکر ہے کہ جماعتی زندگی کو بدلنے میں جنگ طبقات کی قوت ہی سب سے غالب قوت ہے۔

اشتراکیت کے ان دو بنیادی اصولوں کو رد کرنے کے بعد اس میں سوائے ان جذباتی آرزوؤں کے اور کیا رہ جاتا ہے کہ کوئی ایسا جماعتی نظم ہو جائے کہ انسانی رنج و تکلیف میں کمی ہو سکے اور یہ آرزو اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود انسانیت۔ لیکن اس میں بھی فاشیزم 'معاشی' مسرت کا منکر ہے جسے اشتراک پرور کرنا چاہتا ہے اور معاشی ارتقا کے ایک خاص لمحہ میں ہر ایک کو مادی خوشحالی کی زیادہ سے زیادہ مقدار فراہم کر دینے کی امید دلاتا ہے۔ فاشیزم مسرت کے مادی تصور اور اس کے امکان سے بھی انکار کرتا ہے اور اسے اپنے مختصر عین یعنی انیسویں صدی کے نصف اول کے معاشین کے لئے چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ یعنی فاشیزم اس حسابی مساوات کا منکر ہے جس کی رو سے مادی خوشحالی برابر ہوتی ہے مسرت کے کہ اگر یہ صحیح ہو تو انسان حیوانوں کی سطح پر اتر آئے جنہیں بس ایک ہی چیز کا دھیان ہوتا ہے کہ خوب کھائیں اور مٹے ہوں اور اس کی وجہ سے انسانیت خالص جسمانی وجود کی لپیٹوں میں پہنچ جاتی ہے۔

(باقی)

دنیا کی رفتار

جمعیۃ اقوام اور | اٹلی اور حبش میں بالآخر جنگ شروع ہو گئی بین الاقوامی مشوروں سے بس یہ کام نکلا
جنگ حبش | کہ اٹلی نے پوری طرح تیاریاں کر لیں اور پھر وقت مقررہ پر فوجی اقدام شروع کر دیا۔
جمعیۃ اقوام نے غالباً برطانوی اثر سے اٹلی پر نقص امن کا الزام لگا دیا ہے اور اب اپنے دستور کی مختلف دفعات
کے ماتحت اٹلی کے خلاف مناسب کارروائیوں کا مسئلہ پیش ہے۔

ہمیتہ کے دستور کی جن دفعات کا ذکر اس سلسلہ میں آیا ہے وہ دفعہ ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹ اور دفعہ ۲۰ ہیں۔ دفعہ ۱۰ کی رو سے اراکین جمعیۃ پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ باقی تمام اراکین جمعیۃ کی ملکیت اور
ان کی سیاسی خود مختاری کا احترام کریں اور انھیں خارجی حملوں سے محفوظ رکھیں۔ اور اسی دفعہ میں یہ عام ذمہ دیکھنا
سہی شق ہے کہ اگر ملکہ ہو جائے تو جمعیۃ کی کونسل ان تدابیر کے متعلق ہدایت کرے گی جن سے یہ فرض پورا کیا جاسکے۔
دفعہ ۱۱ کے الفاظ بھی بہت عام اور غیر واضح ہیں۔ اس کی رو سے ”قوموں میں امن کے تحفظ کے لئے
جمعیۃ ہر مناسب اور موثر تدبیر کیا کرے گی“

دفعہ ۱۳، شق ۴، کا مفاد یہ ہے کہ اگر کوئی ریاست کسی ثالثی یا عدالتی فیصلہ کو تسلیم نہ کرے تو جمعیۃ کی
کونسل اس فیصلہ کو نافذ کرانے کی تدابیر تجویز کرے گی۔

دفعہ ۱۵، شق ۴، میں اراکین جمعیۃ اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ کسی تنازعہ میں وہ اس فریق کے خلاف
جنگ نہ کریں گے جس نے جمعیۃ کی کونسل کی سفارشات کو تسلیم کر لیا ہو بشرطیکہ یہ سفارشاتیں فریقین کو چھوڑ کر باقی سب ریاستوں
نے یہ اتفاق رائے منظور کی ہوں۔ اور اگر یہ اتفاق رائے نصیب نہ ہو تو پھر ہر ایک ریاست کا یہ حق محفوظ ہے کہ
وہ حق و انصاف کے قیام کے لئے جو کارروائی مناسب سمجھے کرے۔

لیکن ان دفعات کی عدم وضاحت کے مقابلہ میں دفعہ ۱۶ بالکل واضح ہے اور اس میں حملہ آور کے خلاف
کارروائیوں کی تفصیل ہے مگر ان کارروائیوں کے اختیار کرنے کی شرط یہ ہے کہ جمعیۃ کا کوئی رکن دستور کی دفعات ۱۲،

۱۲ اور ۱۳ کی خلاف ورزی کر کے جنگ شروع کر دے۔ ایسی صورت میں سمجھا جائے گا کہ اس نے تمام اراکین جمعیۃ کے خلاف ایک جنگی کارروائی کی ہے اس لئے وہ ذمہ داری لیتے ہیں کہ نور آس پر ایسا دباؤ ڈالیں گے کہ وہ قانون جمعیۃ کی پابندی پر مجبور ہو جائے۔ اور پھر اس کے بعد اسی دفعہ میں دباؤ ڈالنے کی تدابیر کی تفصیل ہے۔ اس دفعہ میں اہم بات یہ ہے کہ جس ریاست کے خلاف یہ تدابیر اختیار کی جائیں اس نے واقعی جنگ شروع کر دی ہو۔ غالباً اسی خیال سے اٹلی نے جنگ تو شروع کر دی ہے مگر اعلان جنگ نہیں کیا!

اس سلسلہ میں دباؤ ڈالنے کی چند تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں ان کی چار قسمیں کر سکتے ہیں (۱) اخلاقی اور سیاسی تدابیر (۲) مالی اور معاشی تدابیر (۳) بین الاقوامی مقاطعہ (۴) فوجی تدابیر۔

اخلاقی اور عارضی سیاسی تدابیر اسی وقت تک کارگر ہوتی ہیں کہ سابقہ کسی کمزور سے ہو۔ اسی وقت بین الاقوامی رائے عامہ کا پاس بھی ضروری ہوتا ہے اور سیاسی تعلقات کے انقطاع کا ڈر بھی کچھ کارگر ہوتا ہے ورنہ جب کوئی طاقتور ریاست شریعہ آمادہ ہوتی ہے تو وہ رائے عامہ اور سیاسی تعلقات کی زیادہ پروا نہیں کرتی۔ نہ اس کا خیال رکھتی ہے کہ اس کے اعمال کے نتائج کو باقی ملکوں میں تسلیم کریں گی یا نہیں۔ جاپان نے چین میں جو کیا اس میں دنیا کی رائے عامہ کیا کر سکی جمعیۃ اقوام نے جب منچو کو کی ریاست کو اپنی قرارداد و امور ۱۱ مارچ ۱۹۳۵ء کی رو سے تسلیم نہیں کیا تو کیا جاپان نے زبان حال سے یہ جواب نہ دیا کہ ”کردم و شد“ لیکن بہر حال وضع داری کے سلسلہ میں یہ چیزیں بھی ابھی تک غصہ کو غصے سے روکنے کی تدابیر میں شمار ہوتی ہیں۔ مالی تدابیر میں طویل مدت کے لئے قرض اور قھوڑی مدت کے لئے ساموکارہ اور تجارت میں ادھار کا انتظام کرنے سے انکار کرنا خاصی موثر تدبیر ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ دباؤ ضرورت پڑنے ہی ڈالا جاسکتا ہے اور اگر بروقت ڈالا جائے تو خاصا موثر ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن اس میں بھی دشواریاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ادھار اور اعتبار کا جال کچھ ایسا پیچیدہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اس میں آسانی سے یہ تپہ چل سکے کہ ادھار کے دیگیا۔ بظاہر کسی کو دیا جاسکتا ہے اور استفادہ کوئی اور کر سکتا ہے۔ دوسرے جس کے خلاف یہ تدبیر اختیار کی جائے وہ بھی یہ کر سکتا ہے کہ اپنے تمام سابقہ قرضوں کی ادائیگی سے انکار کر بیٹھے۔ البتہ مالی تدابیر کو بہت زیادہ موثر بنایا جاسکتا ہے اگر مظلوم قوم کے لئے زیادہ جنگ میں مالی آسانیوں کا انتظام کیا جاسکے۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں مظلوم اقوام کی مالی امداد

کے متعلق ایک معاہدہ کا مسودہ بنا تھا اور اس پر بہت سی ریاستوں کے دستخط بھی ثبت ہو چکے تھے (جس میں اٹلی بھی شامل ہے!) لیکن اس معاہدہ کا نفاذ ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اٹلی اور صرب کے قضیہ میں صرب کو مالی امداد پہنچانے کے متعلق اراکینِ جمعیت کا رویہ کیا رہتا ہے۔

معاشی تدابیر میں سب سے پہلے تو یہ ہو سکتا ہے کہ جمعیت ان اسلحہ اور ان تمام اشیاءِ خام کی برآمد منوع قرار دے جو جنگ کے لئے لایا ہیں۔ لیکن اگر تمام اراکینِ جمعیت علاً ایسا کر بھی دیں تو بھی یہ تدبیر کارگر اسی وقت ہو سکتی ہے کہ جو ملک جمعیت کے رکن نہیں ہیں (مثلاً امریکہ، جرمنی اور جاپان)، وہ بھی اس پر عمل کریں۔ اگر یہ ایسا کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو جمعیت کو یہ طے کرنا ہو گا کہ بحری ناکہ بندی کی جائے یا نہیں۔ ناکہ بندی میں ان قوموں سے بھی جنگ کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔

لیکن معاشی اعتبار سے اس سے زیادہ موثر چیز یہ ہے کہ اراکینِ جمعیت غاصب ملک کے مال کی درآمد اپنے بیاں روک دیں۔ اس میں علی آسانیاں بھی ہیں اور ناکہ بندی کی ضرورت بھی نہیں۔ غاصب اس کی وجہ سے سب اداۃ خارجہ سے محروم ہو جاتا ہے جس کے سبب وہ دوسرے ملکوں سے بھی آبائی مال نہیں خرید سکتا۔

رہا مقاطعہ معاشی جو دفعہ ۶ کا منشا معلوم ہوتا ہے سو اس کی تاثیر میں کیا کلام۔ مگر اس کی عملی مثال بھی بے صاف ہیں۔ اس دفعہ کی رو سے تمام اراکینِ جمعیت کا فرض ہے کہ فوراً غاصب ریاست کے تمام تعلقات تجارتی و مالی منقطع کر دیں اپنی رعایا اور غاصب حکومت کی رعایا میں ہر قسم کا ربط منقطع کر دیں اور غاصب حکومت کی رعایا اور تمام دوسری حکومتوں کی رعایا کے درمیان مالی تجارتی اور شخصی روابط کو روکیں چاہے یہ دوسری حکومتیں جمعیت کی رکن ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن ایسی کارروائی کے امکانات بہت کم ہیں۔ مقاطعہ کرنے سے بعض حکومتوں کو کم اور بعض کو زیادہ نقصان پہنچے گا۔ احتمال ہے جس کا انحصار غاصب سے سابقہ تعلقات پر ہے۔ پھر اس کے لئے ناکہ بندی ضروری ہو جاتی ہے جس میں صاف صاف جنگ کی صورت نکھرتی ہے۔ غاصب سے بھی اور دوسری ریاستوں سے بھی جو جمعیت کی رکن نہیں۔

اور جمعیت کے دستور میں غالباً انھیں دشواریوں کا خیال کر کے فوجی تدابیر کا ذکر بھی ہے چنانچہ اسی دفعہ ۱۶ میں ہے کہ ”ایسے حالات میں کونسل کا فرض ہو گا کہ متعلقہ حکومتوں کو مشورہ دے کہ کس قدر بری“

بحری یا ہوائی فوج ہر کزن جمعیۃ کو اس غرض سے فراہم کرنی ہوگی کہ دستور جمعیۃ کو برقرار رکھا جائے۔ لیکن مختلف اراکین میں فوجی ذراہمی کا تناسب مقرر کرنے کی درخواستی کسی نئی بین الاقوامی فوج کے اجتماع کی تفتیش پر اس فوجی قوت کی قیادت کا مسئلہ اور ایسی ہی اور بہت سی باتیں اس سفارش پر عمل کرنے میں حائل ہوں گی۔

بلکہ اس وقت کہ اٹلی کے خلاف برطانیہ کے سخت اصرار پر محض معاشی اور مالی مذاہیر اختیار کرنے کا فیصلہ ہوا ہے اس سخت اختلاف ملے ہے کہ یہ مذاہیر بھی کس انداز سے اختیار کی جائیں۔ ایک طرف تو وہ ہیں جو دفعہ ۱۷ اے اٹلی کا کامل مقاطعہ کرنے کی تدبیریں سوچ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ قومیں بھی جو جمعیۃ کی رکن نہیں کسی طرح اس بات پر مجبور کی جائیں کہ اٹلی کو مالی و معاشی مدد نہ دیں اور اگر دینا چاہیں تو انہیں روکا جائے۔ دوسری طرف وہ ہیں جو جتاتے ہیں کہ ایسا کیا گیا تو ان دوسری قوموں سے تصادم ہو جائے گا اور ہم معاہدہ پیرس میں یہ عند کر چکے ہیں کہ سولے اپنی ملکی حفاظت کے کسی حال میں جنگ نہ کریں گے۔ لہذا دفعہ ۱۷ کے ماتحت جی حاکم اور دوائی کوئی ریاست کرے وہ اس اپنے ہی علاقہ میں محدود ہو۔ اپنے ملک سے باہر نکل کر کچھ کرنا ضروری نہ قرار دیا جائے۔

اس تذبذب اور اختلاف کی صورت میں عام ہے کہ اٹلی کے خلاف معاشی اور مالی دباؤ کی تدابیر بھی کچھ بہت موثر طور پر کام میں نہ لائی جاسکیں گی۔ لیکن اخلاقی لحاظ سے اس میں شک نہیں کہ اٹلی کو جمعیۃ نے غائب قرار دے کر بڑی جرات کا ثبوت دیا ہے۔ یوں ہی بیٹوں کے ٹھکانوں میں ایسی کارروائیاں چند بار ہو جائیں تو شاید بین الاقوامی معاہدوں کی وقعت میں تھوڑا بہت اضافہ ہو۔ بنی الحال تو اٹلی نے اس معاشی دباؤ کے مقابلہ کا کچھ نہ کچھ انتظام کر ہی لیا ہے۔ چنانچہ اواخر اگست ہی میں سولینی نے یہ بیان دیا تھا کہ ”ہم شہرستی حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے کہ اطالوی قوم کو یہ بتا دے کہ ملک کے اعلیٰ ترین فوجی حکام نے دوسری قوموں کے دباؤ ڈالنے کے مسئلہ پر ہر پہلو سے غور کر لیا ہے اور جہاں تک جنگی دباؤ کا تعلق ہے ان کے مقابلہ کے لئے تمام ضروری فیصلے اور مذاہیر کچھ عرصہ ہو چکا کہ جا چکی ہیں۔ غذا کے مسئلہ پر بھی غور کیا جا چکا ہے اور اس سال ہماری فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔ صنعتی مال کے متعلق حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ حال اور مستقبل کی فوجی ضرورت کے لئے شہری آبادی کو اپنے صرف میں کمی کرنی ہوگی۔ چنانچہ حکومت نے مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کر کے فیصلہ

کیا ہے :-

۱، جس شخص کی پریس میں کوئی رقم یافتہ ہو اُسے لازمی طور پر حکومت کے سپرد کر دے اور تمام پریسی قرضوں کے تسکات نیز اطالوی قرضوں کے تسکات کو ۹ سال کے اطالوی تسکات میں تحویل کرادیا جائے جن پر ۷ فی صدی سود ملے گا۔

۲، تمام تجارتی شرکتوں کا منافع عارضی طور پر ۷ فی صدی سے زیادہ نہ دیا جائے۔

۳، منافع سود اور تسکات کی آمدنی پر۔ ۱۱ فی صدی ٹیکس لیا جائے۔

۴، ۱۹۳۷ء کے ختم تک تمام موٹے چلنے والی گاڑیوں میں تیل کی جگہ اس کے بدل کا استعمال عام کر دیا جائے۔

ان تدابیر سے اٹلی کو امید ہے کہ وہ معاشی اور مالی وباؤ کو کچھ عرصہ آسانی جھیل لے گا اور اس عرصہ میں فرانس کسی نہ کسی بچ سے معاملے کر اسی دے گا اور اس کے قرائن اسی وقت سے معلوم ہو رہے ہیں۔ رسالہ جامعہ میں شروع سے یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اس جنگ میں اٹلی زیادہ دن مبتلا نہیں رہنا چاہتا۔ اس کی مالی حالت کا تقاضا یہی ہو کہ جنگ طویل نہ ہو۔ مگر ملک کی اندرونی سیاسی حالت مجبور کرتی ہے کہ جنگ ہو اور اس میں فتح بھی حاصل ہو ورنہ ملک کو فتح کرنا بہت صبر آزما اور دشوار کام ہے مگر حبش کی غیر منظم افواج پر ابتدائی معرکوں میں فتح حاصل کرنا بہت سہل ہے۔ چنانچہ اٹلی یہ ابتدائی فتوحات حاصل کرنے کے بعد بخوشی معاملات پر تیار ہو جائے گا۔ معاملات کے وقت چونکہ جمعیت کے فیصلوں اور دنیا کی دئے عامہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس کی اخلاقی حالت بہت قوی نہ ہوگی اس لئے حبش کی تقسیم میں دوسرے حصہ داروں کو بھی اپنا حق لینے میں آسانی ہوگی۔ غرض مختصر یہی جنگ کے بعد معاملات کے طے ہو جانے میں سب کا فائدہ ہے۔ اس لئے شاید یہی صورت پیش آئے۔

جاپان اور حبش | اٹلی اور حبش کی جنگ کے سلسلہ میں حبش کے ساتھ جاپانی سمدر روی کی خبریں بار بار اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلے سامان جنگ بھیجنے کی اطلاعیں آئیں، پھر جاپانی فوجی افسروں کے وہاں پہنچنے کی

خبر آئی۔ ان خبروں کی تردید بھی کبھی شائع ہوئی لیکن یہ خبریں ایک ایک کر کے صحیح ہوں یا نہ ہوں اجمالی طور پر یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ جاپان ایشیائی اور افریقی اقوام کی سیادت کا خواب ضرور دیکھ رہا ہے کہ اس سیادت کے صلہ میں ہی اس کی روز افزوں صنعتی قوت کے لئے نئی نئی منڈیاں کھلیں گی، حبش کے متعلق جن خبروں کا ذکر ہم نے کیا ان سے اس معاشی رابطہ کا جزوی اظہار ہوتا ہے جو پچھلے چند سال میں جاپان اور حبش کو میان قائم ہو گیا ہے۔ ابھی ۱۹۳۱ء تک حبش کی کل درآمد کا تقریباً ۵۰ فیصد ہندوستان سے جانا تھا اور صرف ۱۲ فیصد جاپان سے۔ آج حبش کی کپڑے کی منڈی میں جاپانی مال ۷۰ فیصدی سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ جاپانی فوجی انجینئروں کی جماعت بھی عرصہ سے وہاں کئی ہوئی ہے۔ یہ ظاہر اس غرض سے ہوائی جہازوں کے مرکز قائم کرنے میں حکومت کو مشورہ دے ۱۹۳۲ء کے موسم سرما میں حبشی وزیر خارجہ نے قاہرہ میں یہ بیان دیا کہ جاپانی اثر حبش کی معاشی زندگی میں بہت اہم جز بن گیا ہے۔ پھر حبشی حکومت نے یہ اعلان کیا کہ روٹی کی کاشت کے لئے حکومت نے ۴ لاکھ ہیکٹار (ایک ہیکٹار = ایکڑ) زمین جاپان کو بلا کسی معاوضہ کے دی ہے اور اس کے بعد اور بھی دینے کا قصد ہے۔ بعد کے واقعات سے معلوم ہوا کہ یہ قصد بوجہ ابھی کیا گیا۔ اس کے علاوہ جاپانی تاجروں کو اور اہل صنعت کو ملک کے بعض علاقوں میں منتقل بود و باش اختیار کرنے کا حق بھی دیا گیا ہے۔ ایک جاپانی حبشی شرکت کو ۶ لاکھ ہیکٹار زمین کا ٹیکہ دیا گیا ہے اس شرط پر کہ حکومت کو پیداوار کا ۱۰ فی صدی بطور ٹانگہ داری دیا جائے گا۔ چونکہ یہ علاقہ غیر آباد ہے اور ذرا شبی جس میں حبشی خوشی سے بے نہیں اس لئے مارچ ۱۹۳۲ء میں حبش اور جاپان میں ایک اور معاہدہ ہوا کہ جاپانی کسان اس علاقہ میں آکر بس سکتے ہیں۔ چنانچہ جاپانیوں کی روز افزوں تعدادیں بسنے کے لئے برازیلی جارہی ہے۔ اس معاہدہ میں یہ قابل لحاظ دفعہ بھی ہے کہ دونوں حکومتیں اپنے باشندوں میں مناکحت کے تعلقات بڑھانے میں سامی ہوں گی!

حبش نے جاپانی مال پر محصول درآمد میں بھی بہت کچھ کمی کر دی ہے جس سے برطانوی اور اطالوی تجارت کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ مگر اب جاپانی 'غیر منڈب ایشیائی' تو رہے نہیں کہ جب چاہا دایا 'ایک مضبوط حکومت کی قوت ان کے ساتھ ہے۔ ان کا یہ منصوبہ کہ افریقہ میں کپاس کی کاشت بڑے پیمانہ پر کر کے یورپ کی صنعت پارچہ بانی پر ایک اور ضرب کا یہی گٹھائیں سب پر عیاں ہے مگر کوئی کرے تو کیا کرے۔

جج ہے زبردست مارے اور روئے نہ وے۔

نہرویز اور جنگ پیش | اٹلی کے غلات تدابیر اختیار کرنے کا چرچا اب عرصہ سے ہے۔ ان میں ایک تدبیر شاید پہلی مرتبہ، جون کو برطانوی ایوان عام میں مسٹر اٹلی اور سٹرنیڈ نے اپنی تقریروں میں پیش کی اگر اٹلی اور پیش میں جنگ شروع ہو جائے تو نہرویز کو اٹلی کے جہازوں کے لئے بند کر دیا جائے۔ اس وقت سے اس مسئلہ پر بڑی دلچسپ بحث ہو رہی ہے جمعیۃ اقوام یا برطانیہ یا مصر کو اس کا حق بھی ہے نہرویز کو بند کرے۔

نہرویز ایک کمپنی کی ملک ہے جسے ۱۸۸۵ء اور ۱۸۸۶ء میں خدیو مصر نے تعمیر نہر کے لئے کچھ مراعات عطا کیے تھے۔ اس شرکت پر فرانسیسی قانون کی دفعات نافذ ہیں اور اس کی آخری عدالت ماریس ہے۔ لیکن چونکہ کمپنی کا مقام اسکندریہ میں ہے اس لئے مقامی نوعیت کے معاملات میں مصری عدالتوں کو حق سماعت حاصل ہے کمپنی کا انتظام ۳۲ ڈائریکٹروں کے سپرد ہے جس میں سے ۲۱ فرانسیسی ہیں، ۱۰ برطانوی ہیں اور ایک ولندیزی۔ منجملہ ۴ لاکھ حصوں کے ۷۶۹۰۲ یعنی کوئی ۴۴ فی صدی برطانیہ کے ہاتھ میں ہیں۔

نہرویز ۱۸۶۹ء میں کھل گئی تھی ۱۸۸۵ء میں عربی پاشا نے خدیو کے غلات علم بغاوت مذکورہ تو اس وقت برطانوی فوجوں نے اس عذر پر کہ نہر خطرہ میں ہے اس پر قبضہ کر لیا اور نہر ۳ دن تک جہازوں کے لئے بند رہی۔ اسی وقت سے نہر کی بین الاقوامی حیثیت کا مسئلہ سامنے آیا اور ۱۸۸۵ء میں برطانیہ، جرمنی، آسٹریا، ہسپانیہ، فرانس، اٹلی، ندرلینڈ، روس اور ترکی میں باہم ایک معاہدہ ہوا جس کا منشا یہ تھا کہ نہرویز جنگ اور صلح کے زمانہ میں یکساں بلاروک ٹوک سب جہازوں کے لئے کھلی رہے گی چاہے تجارتی ہوں چاہے جنگی۔ اس معاہدہ کی تصدیق برطانیہ نے مصری سیاست کی غیر یقینی حالت کی بنا پر ملتوی رکھی اور کبھی ۱۸۸۵ء میں جاکر اس معاہدہ کو قبول کیا۔ اس معاہدہ کی دفعہ ۹ کی رو سے مصری حکومت اس معاہدہ کو نافذ کرنے کے لئے مناسب کارروائی کرے گی اور اس کے وسائل کافی نہ ہوں گے تو سلطان ترکی سے مدد لے گی۔ مصر کی حفاظت کے لئے حکومت کو مناسب کارروائی کا اختیار ہے مگر پھر بھی نہرویز جہازوں کی آمد و رفت میں ہرج نہ واقع ہونا چاہئے۔ نہراپنی تاریخ میں صرف دو دفعہ بند ہوئی ہے۔ ایک تو ۱۸۸۵ء میں خدیو کے حکم سے سرد سلسلے نے

تین روز کے لئے اسے بند کیا، اور دوسرے جنگ عظیم کے زمانہ میں جبکہ ترکی افواج کی نقل و حرکت کے باعث مصر اور نہر کی حفاظت خطرہ میں تھی۔ مگر چند ہی روز بعد نہر پھر کھول دی گئی۔ اسپین اور امریکہ کی جنگ کے زمانہ میں اسپینی بیڑہ نہر میں سے گذرا (۱۹۱۷ء)۔ مصری حکومت نے اسپینی بیڑہ کو جو نیلا جارہا تھا اس شرط پر کوئٹہ لینے دیا کہ وہ اسپین کو واپس مو جائے گا۔ روس اور جاپان کی جنگ میں (۱۹۱۴ء) برطانیہ نے باوجود جاپان کا حلیف ہونے کے روسی بیڑہ کو نہر میں سے گذرنے دیا۔

غرض سوائے اس کے خود نہر کا وجود خطرہ میں ہوا۔ مصری مملکت کا، نہر سویز کو بند کرنا اس معاہدہ کے خلاف ہوگا لیکن اٹلی کے خلاف اس حربہ کو استعمال کرنے کے موید کہتے ہیں کہ جمعیت اقوام اس میں الاقوامی معاہدہ کو اپنے دستور کی دفعہ ۲۰ کے ماتحت رد کر سکتی ہے جس میں سب اراکین جمعیت نے اس دستور کو قبول کئے ان تمام معاہدوں کو رد کر دیئے کا اقرار کیا ہے جو اس کی وضاحت سے متضاد ہوں۔ لیکن قانونی تدبیر زیادہ صحیح معلوم نہیں ہوتی اس لئے کہ خود صلیئمہ و رسائی میں اس معاہدہ کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اور جس معاہدہ کو صلیئمہ صحیح تسلیم کرے اسے پھر اپنے سے متضاد قرار دے کر رد کیے کر سکتا ہے۔ اس پہلو پر اٹلی کے رسالہ *Estero e affare* نے اپنی جن کی اشاعت میں بڑی وضاحت سے بحث کی ہے۔ لہذا اگر جمعیت نہر سویز کو بند ہی کرنا چاہے تو اسے اپنی دفعہ ۱۹ کے تحت پہلے اس مسئلہ والے معاہدہ کو غیر ضروری ہونے کی بنا پر منسوخ کرنا ہوگا اور اس معاہدہ پر خود اٹلی کے دستخط بھی ہیں!

لیکن سچ پوچھیے تو یہ قانونی بحثیں بے سود ہیں۔ اگر جمعیت صرف اعلان کرے گی کہ نہر بند ہے تو اٹلی نے اس کے دوسرے اعلانات کے ساتھ جو کیا ہے اس کے ساتھ بھی کر سکتا ہے۔ اگر جمعیت یا جمعیت کا کوئی رکن اتنی قوت رکھتا ہے کہ اٹلی کو روک سکے اور اس قوت کے استعمال کے لئے بھی تیار ہے تو وہ بحر روم اور بحرِ حمر میں بحری ناکہ بندی کر کے اطالوی جہازوں کو سویز تک پہنچنے ہی کیوں دے گا کہ اس کے بلاروک ٹوک آزاؤ گذرگاہ ہونے کا مسئلہ زیر بحث آئے۔

بِسْمِ اللّٰهِ جامعہ

جلد ۲۴ | ستمبر ۱۹۳۵ء | نمبر ۱۲

فہرست مضامین

- ۱۔ روی مسلمانوں کا ادب پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن) ۹۷۷
 . استاد تارنچ جامولہ .
- ۲۔ کفن (افسانہ) جناب پریم چند صاحب بی۔ اے۔ ۹۸۸
 . ایڈیٹر "منہس" .
- ۳۔ ہندو اور مسلم قومی تحریکیں محمد عاقص ۹۹۷
- ۴۔ نازو (افسانہ) جناب اختر انصاری صاحب بی۔ اے (آکسن) ۱۰۱۸
- ۵۔ برطانیہ میں نئی روشنی جناب ریاض الدین احمد صاحب ایم۔ اے ۱۰۲۳
 . ریوے سر جے اسکالرسلم یونیورسٹی .
- ۶۔ کمزور پولوا (افسانہ) جناب محمد حیات اللہ صاحب بی۔ اے (علیگ) ۱۰۴۰
- ۷۔ کانگریس کی جوہلی (م - ع -) ۱۰۵۵
- ۸۔ دنیا کی رفتار ذ۔ ح۔ ۱۰۶۱

پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

یاد رکھنے کی بات

مشہور مصنفین اردو مثلاً مرزا غالب، خواجہ علی، علامہ شبلی، مولانا آزاد، مولانا ناسر، علامہ اقبال، منشی پریم چند اور اردو کے مجید مصنفین کی بلند پایہ تصانیف و تراجم اور لاہور، لکھنؤ، الہ آباد، حیدر آباد، اورنگ آباد، اعظم گڑھ وغیرہ مقامات کی سب کتابیں ہر وقت ہمسے یہاں موجود رہتی ہیں۔ شائقینِ فہرست طلب فرما کر اپنی پسندیدہ کتابیں منتخب فرمائیں۔

رعایت۔ مطبوعات جامعہ پر حصول ڈاک اور پکیٹنگ بالکل معاف ہو سکتا ہے بشرطیکہ
(الف) فرمائش مبلغ دو روپے سے کم نہ ہو۔
(ب) رقم بذریعہ منی آرڈر پیشگی ارسال کی جائے۔

مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسری کتابوں پر اس شرط کے ساتھ کہ فرمائش مبلغ پانچ روپیہ سے کم نہ ہو اور رقم پیشگی پہنچ جائے حصول ڈاک معاف کیا جائے گا۔
البتہ ان کتابوں پر جو ہیں بھی کسی خاص رعایت سے نہیں ملتیں یہ ممکن نہ ہو گا۔

مکتبہ جامعہ کے مندرجہ ذیل رسائل کے نمونے مفت طلب کیجئے
”رسالہ جامعہ“ ماہوار باتصویر ”پیامِ سلیم“ ماہوار ”کتاب نم“ ماہوار
سالانہ چندہ (ص) سالانہ چندہ (ع) سالانہ چندہ (م)

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

روسی مسلمانوں کا ادب

(ماخوذ از رسالہ REVUE DES ETUDES ISLAMQUES)

(۲)

ترک آذربائیجان

(کو مرید ایک برلی کی رپورٹ)

عہد قدیم اور قرون وسطیٰ کی ممتاز ادبی شخصیتیں آذربائیجان کے ادب کی ابتدا آٹھویں صدی سے ایک شاعرہ زہیدہ خاتون کی تصانیف سے ہوئی۔ ہمارے تاریخی ماخذ اتنے کم ہیں کہ ہم نویں صدیء کے ادب کی نسبت کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ زہیدہ خاتون کے بعد دادا گوگت نے شہرت حاصل کی، جو دسویں صدی میں گذرا ہے۔ پھر آذربائیجان میں اسلام پھیلا، ترکی عورت کی حیثیت گھٹ کر لونڈی کے برابر ہو گئی اور اس بے عزتی سے بچنے کے لئے عورتوں نے بغاوت کی۔ ان کی رہبر ایک شاعرہ محنتی خانم تھیں۔ باہوویں صدی میں ابوالعلا نجوی نے بہت نام پیدا کیا۔ وہ ”معارفین“ کہلاتا ہے۔ اس کے کلام کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:-

”میں اپنے معاصرین کا علم بردار ہوں۔ گنج والے میری قسمیں کیوں نہ کھائیں جب شاعر سب مجھے اتما مانتے ہیں کہ میری نقل کہتے ہیں۔ مجھے اس اعتبار کا حق بھی ہے، کیوں کہ میں شاعروں کا سردار اور رہبر ہوں“

لیکن نجوی کے حسن بیان اور کلام کی فنی قدوقیمت کے باوجود آج کل کے انشا پرداز،

۱۵۔ یہ مصرعی بھوٹ ہے۔ عورتوں کی حیثیت گھٹنے اور ان کے حقوق سلب ہونے کا سبب ایرانی اور باطنی تہذیب

کے اثرات تھے۔ ملاحظہ ہو:- خالدہ ادیب کی کتاب ”ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش“ ساتواں نچر۔

جو ”گنج سرخ“ کہلاتے ہیں، اس کی تصانیف سے کوئی فیض حاصل نہیں کر سکتے، انھیں اپنا موافقی حق نہیں ٹھہرا سکتے، اس لئے کہ گنجوی نے دل و جان سے اپنے آپ کو دربار کے حوالے کر دیا تھا اور اپنے کلام کو امر اور اشعار کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں مشہور شاعر شیخ نظامی جنھوں نے ابوالعلا گنجوی کے بعد میدان ادب میں قدم رکھا، پہلے کی طرح اب تک عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، اور ان کے کلام میں وہی تازگی ہے جو آٹھ صدی پہلے تھی۔ یہ زبردست فکر اور ارسٹ جن کی تصانیف کا یورپی اور ایشیائی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، اپنے بارے میں یوں لکھتے ہیں:-

”اگر تو اس صدی میں کسی سے پوچھے کہ وہ کہاں ہے، تو شاعر کا ہر شعر ایک حدائے بازگشت کی طرح نیکے لگا کر یہاں!“

شیخ نظامی نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ چھوڑا ہے جو ”پنج گنج“ کے نام سے مشہور ہے۔ اس پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے بعض تصورات پر دائمی حقیقت کا رنگ کیسا چڑھا ہوا ہے۔ وہ زیادہ تر الحاد کے سلسلے پر بحث کرتے ہیں اور دیوتاؤں اور مذہبی رہنماؤں کو بری طرح لتاڑتے ہیں۔ شاہی حکومت اور جاگیر نظام معاشرت کی بھی انھوں نے خوب خبر لی ہے۔ عوام میں انھیں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، ان کے شعرا اب تک لوگوں کی زبانوں پر ہیں، اور محبت اور احترام نے ان کی شخصیت کو ایسا چمکا دیا کہ اب تک اس کی روشنی دھیمی نہیں پڑی ہے۔ شیخ نظامی مشرقی دنیا کی نمایاں شخصیتوں میں سے ہیں اور اس لئے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی تصانیف کے ترجمے اور اشاعت کی کتنی ضرورت ہے۔

چودھویں صدی کے آخر میں عماد الدین نسیمی، جن کا شمار آذربائیجان کے بہترین شاعروں میں ہوتا ہے، محفل ادب میں رونق افروز ہوئے تبلیغی شاعری کے علاوہ ان کی بعض تصانیف ایسی ہیں جن میں زندہ دلی اور شبیہ اور استعارے کی رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ ان کا بیان نہایت نفسی اور دلگداز ہے، اور وہ آذربائیجان کے ترکی ادب کے بانی مانے جاتے ہیں۔

کوئی چار سو برس سے فضولی ترکوں کے دلوں کو گردیدہ کئے ہوئے ہے۔ وہ ایک بے مثل شاعر تھا، اور اس کی تصانیف ایک بہت غیر معمولی قابلیت کا پتہ دیتی ہیں۔ دوسرے جدید فضولی نے روسی اور یورپی

مستشرقین سے بھی داد و مول کی ہے، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا کلام ترکی شاعری کا مثالی نمونہ ہے۔
 فضولی اشرف کے مذاق سے نا آشنا تھا اور عوام کے مذاق اور حوصلوں کو خوب سمجھتا تھا، اس نے کبھی
 دربار کی غلامی نہیں کی، اور اس نقطہ نظر سے اس کی تصانیف بے عیب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک
 بڑا شاعر اور مصور مانا جاتا ہے۔ آذربائیجانی ادیبوں کے اس سر تاج نے ترکی زبان کی نشو و نما میں بھی
 بہت مدد دی، کیونکہ ترکی اس وقت تک محض عربی اور فارسی الفاظ کی ایک آمیزش تھی۔

فضولی کا خاص میدان غزل ہے۔ اپنے شاہکار ”لیلیٰ المجنوں“ میں اس نے آزاد عشق اور
 مردوں عورتوں کی مساوات کی تعلیم دی، اور اپنے زمانے کے رسم و رواج کی پردہ دری کی۔ ترکی تھیٹر یا
 میں یہ قصہ اب تک بڑے شوق سے دیکھا جاتا ہے۔

صبح انقلاب | اٹھارہویں صدی کے شاعر واقف کی تصانیف ترکوں کی قومی شاعری کی نشو و نما
 کے ایک قدم آگے بڑھنے کا ثبوت ہیں۔ اس کی خاص تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس میں عوام کی شاعری
 کی طرف رجحان پایا جاتا ہے، اور اس نے گیتوں کو رواج اور ترقی دینے کی بڑی کوشش کی۔

اس کے بعد انیسویں صدی میں باقی خائف، قاسم بے ذاکر، اور اخوند نے ادبی تخلیق کا سلسلہ
 جاری رکھا۔ اگر ہم واقف اور ذاکر کا مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ذاکر کا حقیقت اور معاشرتی حالات سے
 بہت زیادہ گہرا تعلق تھا، اور جمہور اور اس کی زندگی سے وہ بہت زیادہ قریب تھا۔ ذاکر اس زمانہ میں
 پیدا ہوا جب زار کی حکومت آذربائیجان کو لوٹ رہی تھی، اور وہ ان زمینداروں کا نمائندہ ہے جن کے
 مال و دولت کو کسی غارت کر رہے تھے۔ ذاکر کے طنزیہ کلام میں اس زمانے کے سیاسی، معاشی اور
 معاشرتی تغیرات کے بہت سے اشارے ملتے ہیں، اور اسی وجہ سے اس کی خاص حیثیت ہے۔ پھر بھی
 ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ ذاکر قدامت پسند تھا، اور ترقی کے جو آثار اس وقت تھے وہ اسے نظر نہیں آئے
 انیسویں صدی کے دوسرے حصے کے معاشرتی تصورات فتح علی اخوند کی تصانیف میں ظاہر ہوتے ہیں۔

اخوند ایک بہت بڑا عالم تھا جس نے یورپی تہذیب کے بہترین عناصر کو جذب کر لیا تھا۔ اس کی تصانیف
 ایک تصویر خانہ ہیں جس میں ہر قسم کے لوگوں کی شبیہیں ملتی ہیں، جیسے تاجر، چھوٹے زمیندار، ایرانی نسل

اودنے سرکاری ملازم، مالک، مولوی، من چلے وغیرہ، اور ان کی صورتوں اور سیرتوں میں وہی رنگارنگی ہے جو کس کے بڑے حقیقت نگاروں کے کارناموں میں دکھائی دیتی ہے۔ اس کی سب سے مشہور تصنیف ”عاجی ترا“ میں نئے سرمایہ داروں کی حوصلہ مندی اور لالچ، اور چھوٹے زمینداروں کے عنقریب ناپید ہونے والے طبقے کی ذہنیت کا خاکہ خوب اتارا گیا ہے۔

اخوند نے عورتوں کی مغلوبیت اور مردوں عورتوں کے درمیان عدم مساوات کے خلاف زور سے احتجاج کیا۔ اس کی ہر ہیروئن عام طور سے بڑی ہنس مند، ذہین اور تیز ہوتی ہے۔ وہ ترکوں کی زندگی کو یورپی رنگ میں رنگنا چاہتا تھا۔ اپنے مزاحیہ ڈراموں میں اس نے مدرسوں اور دینی درسگاہوں پر جہاں نوجوان اپنا وقت ضائع کرتے تھے بڑی معاذانہ تنقید کی ہے، اور اسی کے ساتھ زاری حکومت کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ لیکن اس کا خاص حمد ایران کی زندگی اور طرز حکومت پر تھا، اور یہی اس کی تلوار کی حار سب سے زیادہ تیز معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اخوند نے نظام جاگیر، تنگ نظری، سرکاری ملازموں اور ملاؤں کی تنگ نظری اور حرص کا بھی بھانڈا بھوڑ دیا۔

یہ ڈرامے سب سیدھی سادی عام فہم زبان میں لکھے گئے ہیں، اور ان کی بدولت عام مذاق کو بہت ترقی ہوئی۔ اس اعتبار سے اخوند نے زبان اور طرز بیان میں بڑی جدت کی، کیونکہ اس نے پرانا اسلوب، جو ادب سے لطف اندوز ہونا ایک بہت چھوٹی جماعت کے لئے مخصوص کر دیتا تھا، بالکل ترک کر دیا۔ لاطینی حروف اختیار کرنے کا مسئلہ سب سے پہلے اسی نے چھیڑا، اور یہ بھی اس کے کارناموں میں شمار ہونا چاہئے؟

اخوند پہلا ترکی ڈراما نویس تھا اور وہ قومی تعمیر کا بانی مانا جاتا ہے۔

ترکی سرمایہ داروں کی جماعت ایسے زمانے میں پیدا ہوئی جب پٹرول کی تجارت بڑھ رہی تھی اور اس میں اپنی ذات کا احساس بھی بہت تھا۔ اسی کے بل پر اس نے عقائد اور تہذیب کو ایک نئی شکل دی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس کے تسلط کو قائم رکھے۔ رسالہ ”فیوضات“ جو مشہور کھچتی تاگیف کی سرپرستی میں جاری ہوا، سرمایہ داروں کی زبان بن گیا۔ اپنی اشاعت کے پہلے ہی دن سے اس نے قدامت پسندی

ترک اتحاد، اتحاد اسلام اور قومیت کی حمایت شروع کر دی۔ ”فیوضات“ کے حلقے کے مصنف۔ علی بابا، محمد ہادی۔ عوام سے علیحدہ رہے، اور قوم ان سے بیگانہ رہی، کیوں کہ ان کی تصانیف عوام کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھیں۔ لیکن اپنا کام وہ کر گئیں، اور سرمایہ داروں کی خود پسندی کو بڑی وفاداری کے ساتھ سراہا۔ دوسری طرف، ادنیٰ سرمایہ داروں کی جمہور، جس میں روس کی انقلابی تحریک نے جان ڈالی تھی، اپنے عقائد کا ایک رسالہ میں اظہار کرتی رہی جو ۱۹۰۶ء میں قائم ہوا اور جس کا نام ”ملا ناصر الدین“ تھا یہ رسالہ زاری حکومت اور ملاؤں کے تسلط کا دشمن تھا، اور اس میں استبداد، تشدد، مذہب، تاریکی خانی اور مزدوروں اور کسانوں کو لوٹنے کے خلاف مضامین نکلتے رہے۔ صابر، ایک شاعر جو ”ملا ناصر الدین“ کے حلقہٴ ادارت کا نمائندہ ٹہرایا جاسکتا ہے، طنز یہ رنگ میں بہت تند و تیز ہو گیا اور اس کا کلام کم مائی مانا جاتا ہے۔ اس کے مضامین اور رسالے، اس کا مشہور ”خپ خپ نامہ“ ایسے کارنامے ہیں جنہوں نے وطن کے باہر بھی لوگوں کو اس کے نام سے آشنا کر دیا ہے۔

۱۹۱۹ء کا سال ایسا گذر رہا ہے جو آذربائیجان کی تاریخ پر ایک دھبہ ہے۔ ”مساواتوں“ کا تسلط ترکی ادب کی تاریخ میں ایسے صفحات چھوڑ گیا ہے جن سے آذربائیجان کی بے آبروئی ہوتی ہے، جن میں نہر اگلا گیا ہے اور خود پسندی کا ڈمکا بجایا گیا ہے۔ محفل ادب بہت سے نااہلوں سے بھر گئی جو سرمایہ داروں اور زمینداروں کی چاکر ہو کر تھے، اور ملک میں فساد پیدا کر کے اس کے بڑے شاذ ارنامہ رکھتے تھے۔ ”مساواتی“ مصنف قومیت کو رواج دینا چاہتے تھے اور ترکی اور آرمینی بھائیوں کو اشتعال دے کر ایک دوسرے سے لڑاتے تھے۔ اس دور کی تصانیف، جو بس کہنے کے لئے ”ادبی“ ہیں کوئی قدر نہیں رکھتی ہیں۔

سوڈت عہد کا ادب | اپریل ۱۹۲۰ء سے آذربائیجان کی ادبی اور تہذیبی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ اس وقت تک قومیت اور سرمایہ داروں کی ذہنیت ترکوں کے ادب پر حاوی رہی تھی۔ ۱۹۲۰ء میں ”قرن قلم“ پر ورتی مصنفوں کا اتحاد قائم ہوا، اس نے پرانے عقائد اور ذہنیت کے خلاف حم کر لڑنا اور تہذیبی انقلاب اور مین کی تعلیمات کی حمایت کرنا شروع کیا۔ وہ مزدور جمہوں نے خطوط کتابت

کے ذریعہ انشا پر دہازی کی مشق کی تھی اس کے گرد جمع ہو گئے، اور نئے شاعر اور نثر نگار نمودار ہونے لگے۔

اس ادبی حلقے کا نمائندہ، سلیمان رستم، آذربائیجان کے پروتاری ادب کا ہر اول ہے اور اس کی نظمیں کا پہلا مجموعہ، ”رنج سے راحت تک“ ادبی اور سیاسی نقطہ نظر سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ پروتاری نثر کے لئے نذر علی، ایک اشتراکی نے مفید محرک کا کام دیا۔ خانہ جنگی کے متعلق اس نے جو ناول لکھے ہیں وہ ہر طرح سے قابل قدر ہیں۔ اس حلقے کے اور ممتاز اراکین فاروق، فیضی، اسماعیل حافظ، ابو الحسن وغیرہ ہیں۔ اس تحریک کے ایک ہمدرد، مشہور ڈراما نویس جعفر جبرلی نے سیاسی اور علمی موضوعوں پر پروتاری پہلو سے بحث کی ہے۔

۲۳ اپریل ۱۹۳۲ کو اشتراکی پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے جو فیصلہ کیا اس کا آذربائیجان میں دس بارہ نئی کتابوں کے ذریعہ خیر مقدم کیا گیا جن میں نظموں کے مجموعے ہیں اور ناول بھی۔ اشتراکیت کی تعمیری کوششوں نے کئی پرانے مصنفوں کو انہی طرف کھینچ لیا ہے، اور بہت سے قابل نوجوان مصنفوں کی جماعت میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس طرح پروتاری مصنفوں کے اتحاد کے اراکین تعداد میں اب ساٹھ کے قریب ہیں۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۸ء تک ہمارے یہاں اتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں جتنی کہ انقلاب کے پہلے پندرہ برس میں (یعنی ۱۹۰۵ء تا ۱۹۲۰ء) اور یہ وہ زمانہ تھا جب ”ساداتی بچو اپنے سوا کسی کو قومی تہذیب کی نمائندگی کرنے کا حق نہیں دیتے تھے، حکومت کر رہے تھے۔

آذربائیجان کی پروتاری شاعری ابھی تک بچپن کی کمزوریوں اور بیماریوں میں مبتلا ہے، اور اسی وجہ سے ہیں اس میں بہت سی خامیاں ملتی ہیں۔ انھیں دور کرنے کے لئے حقیقت نگاری کے اشتراکی طرز کو اختیار کرنا چاہئے لیکن یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ایسے زمانے میں جب بنیادی تغیرات عمل میں آ رہے ہیں آذربائیجان کا ادب عروج پر نہیں ہو سکتا۔ اس وقت کے مصنفوں میں صمد برغون کی مثال لیجئے۔ اس کا دماغ بہت الجھا ہوا ہے۔ اسے چاہئے کہ اپنے ذہن کو، جو سرمایہ داری اور زناج، پرانی دیہاتی زندگی اور پرانے رسم و رواج کے رنگ میں ڈوبا ہے، آہستہ آہستہ قابو میں لائے اور پاک صاف کرے۔ اب برغون اشتراکی ہر اولوں کے خیالات اختیار کر رہا ہے اور اپنے کلام کا معیار بڑھا رہا ہے،

جیسا کہ اس کی دو نظموں، ”لائین“ اور ”شاعر کی نصیحت“ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ممد برغون دیہاتی زندگی کو بہتر واقفیت رکھتا ہے، اور اس کے جو مرتعہ اس نے پیش کئے ہیں ان کا ادبیں جواب نہیں ملتا۔ اس میدان کے باہر اس کا ذہن اتنی خوبی سے کام نہیں کرتا، پٹرول کی جنگ پر اس نے ”لوک تبن“ کے عنوان سے جو نظم لکھی، جس میں نغض کے کنویں کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے، فنی نقطہ نظر سے خاص قدر نہیں رکھتی۔ اس وقت وہ ایک نظم تیار کر رہا ہے جس میں ان اشتراکیوں کی زندگی بیان کی جائے گی جو دیہات میں مصروف ہیں۔

ایک اور شاعر، فیلی میکائل، نے اور پرانے عقائد کی کشش سے گزرتا رہا کی جنگجوں میں آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ اس کی آخری نظمیں ”لینن گرا“ اور ”سیاستوپول“ ثابت کرتی ہیں کہ وہ پروتاری مقاصد میں محو ہو گیا ہے۔ ”سیاستوپول“ کے بعض حصے ایسے ہیں جو کبھی بھلائے نہیں جاسکتے۔ فیلی نے جو سمت طے کیا ہے اس سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ایک معصوم، جو کسی اور طبقے کا رکن تھا، انقلاب کے بعد کس طرح ایک پروتاری مصنف ہو گیا، اور عقائد کے ساتھ اس کی فنی قابلیت کی بھی کس طرح اصلاح ہوئی۔

نئی تخلیقی قوتیں | اب ہمارے یہاں شاعروں کی ایک نئی نسل پیدا ہو رہی ہے جس نے اپنا مخصوص اسلوب بیان بھی نکالا ہے۔ اگر ہم نکل کے طور پر رسول رضا کے کلام کو لیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس کے یہاں سیاسی خیالات کی فراوانی ہے اور حقیقی مسائل سے بحث کرتا ہے، مگر وہ حقیقت نگاری سے رومانیت کے عنصر کو بالکل خارج نہیں کر سکا ہے۔ اسی طرح ایک اور شاعر، مشفق، اپنے پرانے تعصبات اور لواہم پر غالب آنے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن وہ بھی پروتاری ذہنیت کو غیر طبقوں کے اثرات سے آزاد نہیں کر سکا ہے۔ یہاں پر ہمیں فرخ اور رحیم کا بھی ذکر کر دینا چاہئے جنہوں نے پچھلے سالوں میں ہندی تصانیف شائع کی ہیں۔ ۱۹۵۷ء سے اس وقت تک ترکی ادب کی نثر کو نظم کے مقابلے میں کم ترقی ہوئی ہے، پھر بھی ہم اس میدان میں بھی زندگی اور جدوجہد کے آثار دیکھتے ہیں، اور پچھلے دو برس میں چھ ناول اور کئی بڑے افسانے چھپے ہیں۔

۱۹۳۳ء میں فوجان مصنف ابوالحسن نے اپنا زبردست ناول ”ایک دنیا کی موت“ لکھا۔ یہ ناول ایک تصویر خانہ ہے جس میں اشتراکیت کے جنگجو سورا قدامت پسندوں اور کچھ دے سر مایہ دانوں کے مقابلے پر رکھ کر دکھائے گئے ہیں۔ یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ ابوالحسن فنا ہونے والی دنیا کے بہنے والوں کو بہتر جانتا ہے اور ان کی سیرتوں کو بہتر بیان کر سکتا ہے۔ نئے دور کے آدمیوں کی سیرتیں مصنوعی اور نامکمل معلوم ہوتی ہیں۔

حال کی تصانیف میں ”ایک دنیا کی موت“ کے بعد محمد سعید اور دوبا دی، ایک پرانے اشتراکی مصنف کے ناول ”قبرستان کبر آلود“ کا درجہ آتا ہے، جس کا موضوع ۱۹۰۸ء کی ایرانی انقلاب ہے۔ اس کتاب میں واقعات، سیاسی اور معاشرتی حالات، اور ان مختلف طبقوں کی کارگزاری جو اس انقلاب میں شریک تھے بیان کی گئی ہے۔ اس میں مجتہدوں اور تاجروں کی غداری کا پول کھول دیا گیا ہے۔ اور زاری حکومت نے انقلابی تحریک کا سرکچنے کے لئے جو کارروائی کی اس کی مذمت کی گئی ہے۔ لیکن اور دوبا دی ابھی تک اشتراکی حقیقت نگاری کے خاص طرز سے مانوس نہیں معلوم ہوتا۔ اس نے واقعات کو مسخ کر دیا ہے، کسانوں نے انقلاب میں جو حصہ لیا اس کا وہ حق ادا نہیں کر سکتا ہے، اور ماروائے قفقاز کی انقلابی جماعت نے جو نمایاں خدمات انجام دیں ان پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔

ترکی نثر میں فوجان اشتراکی مصنف سمرغ کا ناول ”دشمن“، جس میں زرعی اصلاح کی تحریک کا ابتدائی زمانہ دکھایا گیا ہے، خاص اہمیت رکھتا ہے۔

مہدی حسین کا ناول ”سیلاب“، جو مال جمیں شائع ہوا ہے بیت مقبول ہوا۔ اس میں ہمارے ملک کی خانہ جنگی کے ایک دور کا قصہ سنایا گیا ہے۔ مصنف نے یہ واضح کر دیا ہے کہ پروتاری انقلاب میں مزدوروں اور کسانوں کی خاص کارگزاری کیا تھی، اور عوام کی ذہنیت میں کون سی تبدیلیاں ہوئیں جن کی بدولت وہ نئی زندگی کی تعمیر کے لئے جان دینے پر تیار ہو گئے۔ لیکن اس میں مزدوروں کی کارگزاری فرضی معلوم ہوتی ہے اور کسانوں نے جو کچھ کیا وہ بہت بڑھا کر دکھایا گیا ہے۔

یوسف وزیر اور کانتے مرہ مصنف میں جنہوں نے انقلاب سے پہلے نام پیدا کیا۔ وہ کسی پارٹی کے

رکن نہیں ہیں اور اسی وجہ سے ایک عرصے تک انھوں نے مکعبا بند کر دیا۔ کتنے ہر مزاحیہ طرز میں ماہر ہیں اور اس کے کئی افسانے چھپ چکے ہیں۔ اس کا نیا ناول ”کول خوستان“ جس میں دیہات کی نئی زندگی دکھائی گئی ہے، یہ ثابت کرتا ہے کہ مصنف نے کس قدر ترقی کی ہے۔ یوسف وزیر انقلاب سے پہلے کے حریت پسند بورژوا مفکروں کا ایک نمائندہ ہے۔ اس نے اپنا ناول ”۱۹۱۰“ ابھی ختم کیا ہے جس میں اس سال کے روسی انقلاب کے واقعات بیان کئے گئے ہیں، اور انقلاب کے دشمنوں کے ہر فرقہ کی خود غرضی اور زیادتی واضح کی گئی ہے۔

حال کی تصانیف پر ہم مجموعی طور پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کی طرف ایک خاص رجحان ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تقریباً تمام مصنف حقیقی زندگی اور اشتراکی نظام کی تدریجی تعمیر کا الگ کھڑے ہوئے تماثا دیکھ رہے ہیں، اور اس میں مباح کہ چاہئے حصہ نہیں لیتے۔ ہمارے تاریخی ناولوں کا خاص نقص یہ ہے کہ وہ مصنوعی اور واقعات سے خالی ہیں، اور ان میں تاریخی واقعات کی اشتراکی نقطہ نظر سے تشریح نہیں کی جاتی ہے۔ ان تصانیف کے علاوہ اور جو ہیں ان کی خامی موضوع کا غلط انتخاب ہے، ان میں اس وقت کی مصنوعات کا بہت کم ذکر آتا ہے اور تہذیب اور رسم و رواج کا بس ایک دھندلا سا خاکہ نظر آتا ہے۔ پٹرول کے لئے جو جنگ ہوئی اس پر دو سال کے عرصے میں صرف دو کتابیں لکھی گئی ہیں جن کی کوئی خاص وقعت نہیں۔ روٹی کا مسئلہ چھیڑا بھی نہیں گیا ہے۔

آذربائیجان کے سوڈٹ ادب کا سب سے کمزور پہلو ڈراما ہے۔ جعفر جبریلی نے، جو ہماری ڈراما نویس کا ہر اول ہے، ”مرکز“ی اشتراکی کمیٹی کے اپریل ۱۹۳۷ء کے فیصلے کے بعد ایک ڈراما لکھا جس کا عنوان ”یا چار“ ہے۔ اس میں حقیقت نگاری کے صحیح اصول کے مطابق دیہات کے مختلف طبقوں کی کشمکش بیان کی گئی ہے، زمیندار کسان کے سنبڑ سے نقاب ہٹا کر اس کی اصل صورت دکھائی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ ہی نسل کے کارپرداز ماہر ان فن کے چند ثنائی نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ جعفر جبریلی کی تصنیف ان مساواتوں کی لنویات کا دندان شکن جواب ہے جو ملک کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور یہ دعویٰ ثابت کرنے میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں کہ کوئی دائمی ہنرمند مصنف سوڈٹ عقائد اور عمل کا حامی نہیں ہو سکتا۔

حسین جاوید جعفر جبرلی سے بھی زیادہ قابل شاعر اور ڈراما نویس ہے جس کے خیالات اور زبان میں آہستہ آہستہ تغیر ہو رہا ہے۔ اب تک اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ ترک اتحاد اسلامی کے متعلق ایک تصدیق ہے۔ ۱۹۲۲ء میں اس کا ڈراما ”سیاوش“ شائع ہوا، جس میں پرانے ایرانی اور ترکی محلات کی بد اخلاقی دکھائی گئی ہے، کسانوں کی بغاوتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور حریت پسند اشرف کی بڑی سی واضح کی گئی ہے۔ حسین جاوید ایک نئے اور نرالے طریقے پر نئی زندگی سے مفاہمت کی کوشش کر رہے۔ آذربائیجان کے ”اتحاد انشا پردازان سووٹ“ اور اس کے شعبہ ڈراما کو اب یہ ضرورت پیش آئی ہے کہ نئے ڈراما نویسوں کے حلقے تیار کریں، انھیں تصنیفوں سے ملحق کر دیں اور انھیں کاغذ لاری دکھانے کا موقع دیں۔

ان نوجوان مصنفوں میں جنھوں نے انشا پردازی کے میدان میں ابھی قدم رکھا ہے ثابت رحمن، ابراہیم مرزا، یوسف، شہدائے حسین، ناطق، سری ولی، جعفر ہندال، انور اور اخوند حامد قابل ذکر ہیں۔ دو نوجوان ترک عورتوں کے نام بھی یاد رکھنا چاہئے جنھوں نے پرولتاریہ کی اس فتح کی شان میں تصدیق کی ہے جس کی بدولت مشرقی عورتیں آزاد ہو گئیں۔ یہ مہیا دلبازی اور نگار۔ افسوس ہے آذربائیجان میں ابھی تک لوگ ان نوجوان مصنفوں کی کچھ بہت قدر نہیں کرتے۔

آذربائیجان کے مصنفوں کی کامگریس نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ہم نے ادب میں کتنی ترقی کی ہے، اور یہ بتاتے ہوئے کہ ہمیں اصلاح کے کون سے ذریعے اور طریقے اختیار کرنا چاہئیں، ہمارے کام کی خامیاں اور غلطیاں بھی بتا دی ہیں۔ اشتراکی طرز کی حقیقت نگاری اختیار کرنے کے علاوہ آذربائیجان کے مصنفوں کو چاہئے کہ ایسے موضوع منتخب کریں جن کا سووٹ سے سچا تعلق ہے، انسان کے ذہن اور ضمیر پر سرمایہ داری کے فلسفہ حیات کا جو کچھ اثر باقی ہے اسے بالکل مٹا دینے کی جگہ کوشش کریں، اور ملکی زندگی کی تعمیر میں عملی شرکت کریں۔

گردابجد اور ادب بھی تیار کر لیا گیا ہے | آرمینیا میں ایک لاکھ ترک اور چھپس ہزار آرمینی ہیں۔ انشا پردازوں کا ایک عام اتحاد قائم ہونے سے پہلے ترکوں اور کردوں کے الگ الگ حلقے تھے، ان میں صرف چند نوجوان

مصنف کام کرتے تھے جن کے مضامین وغیرہ اخباروں اور جرائدوں میں شائع ہوتے تھے۔ اسی سلسلہ میں کرد ادب کا ایک مجموعہ چھپا۔ آرمینیا میں سوڈٹ حکومت قائم ہونے کے دو ایک سال کے اندر کرد آبادی کے لئے ایک لاطینی ابجد تیار کی گئی اور تعلیم کے لئے ایک ادارے کی بنیاد بھی رکھی گئی۔ ابجد کا معین بنانا عام تعلیم کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے، اس لئے کہ کردوں کے پہلے کوئی اپنی ابجد نہیں تھی، جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ عربی حروف میں۔ آرمینیا میں ابجد کے رائج ہوتے ہی کئی دہائیوں میں اور سیاسیات اور معاشیات پر رسالے شائع کئے گئے اور ایک کرد۔ آرمینی فزہنگ لغات مرتب ہوئی۔ اب "اشترکی محضر" کا کرد زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ کردستان کے ادب العوام کا ذخیرہ بہت بڑا ہے، اور اس سے انشا پر وازی کو بڑی تقویت پہنچ رہی ہے۔ پہلے زمانے کے پہاڑی قبائل اور اس وقت کے مزدور اور ان کے بچے جنہوں نے تعمیری ادارہ اور آرمینیا کی سرکاری یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے قومی ادب کو فروغ دینے کی بہت کوشش کر رہے ہیں، اور اس کا اثر ان کردوں پر بھی پڑ رہا ہے جو سوڈٹ اتحاد میں شامل نہیں ہیں۔

نئے دور کے کرد مصنفوں میں سب سے ممتاز بھئیے جندی، امینہ اودال، نوری، جرجو، عرب، شمی لون، احمد سے مازی، اتار سے شیر و، جیمیل ہیں جو



کفن

(۱)

بھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دروازہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی 'اور رہ کر اس کے منہ سے ایسی دلخراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کھجوتھم لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی، فضا سنائے میں غرق۔ سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا، معلوم ہوتا ہے بچگی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا۔ جادیکھ تو آ۔
 مادھو دردناک لہجہ میں بولا۔ مرنا ہی ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا کروں۔
 "تو بڑا بے درد ہے بے۔ سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا اُسی کے ساتھ اتنی بپھائی"
 "تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور اُتھ پانوں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔"

چاروں کا گنہ تھا اور سارے گانوں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چورتھا کہ گنہ بھر کام کرتا تو گھنٹے پھر چم پیتا۔ اس لئے انھیں کوئی رکھتا ہی نہ تھا۔ گھر میں سُخی بھراناج بھی موجود ہو تو ان کے لئے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فائے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر کڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار سے بیچ لاتا۔ اور جب تک وہ پیسے رستے دونوں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے جب فائے کی نوبت آجاتی تو پھر کڑیاں توڑتے، یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گانوں میں کام کی کمی تھی۔ کاشتکاروں کا گانوں تھا۔ محنتی آدمی کے لئے پچاس کام تھے۔ مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بٹاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پا کر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاشش دونوں سا دھوپتے تو انھیں قناعت اور توکل کے لئے ضبط نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ انکی خلقی صفت تھی۔ عجیب بُدنگی تھی انکی۔ گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پھٹے جیتھر دس سے انبی عربانی کو ڈھانکے

ہوئے دنیا کی فکروں سے آزاد۔ قرض سے لدے ہوئے۔ گالیاں بھی کھاتے، مار بھی کھاتے۔ مگر کوئی غم نہیں بسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر لوگ انہیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹریا آلو کی فصل میں کمیوں سے مٹریا آلو اکھاڑلاتے اور بھون بھون کر کھا لیتے۔ یادس پانچ آلو کھڑ لڑتے اور رات کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی۔ اور مادھو بھی سہاوت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں آلو کے سانسے بیٹھے آلو بھون رہے تھے جو کسی کے کھیت سے کھودلائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا۔ مادھو کی شادی پچھل ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اُس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے، گھاس چھیل کر، وہ سیر بھر آئے کا انتظام کر لیتی تھی۔ اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آسوی ہو گئے تھے۔ بلکہ کچھ اکثر نے بھی گئے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بدلتا تو بے نیازی کی شان سے دو گنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دروازہ سے مری جا رہی تھی۔ اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ وہ مرجائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھینے ہوئے کہا۔ جا کر دیکھ تو۔ کیا حالت ہے اُس کی۔ چڑیل کا پھسا دھوکا اور کیا یہاں تو ادھو جھابی ایک مدیہ مانگتا ہے۔ کس کے گھر سے آئے۔ مادھو کو انہ لیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر کے گا۔ بولا۔ مجھے دہاں ڈر لگتا ہے۔

”ڈر کس بات کا ہے۔ میں تو یہاں ہوں ہی“

”تو تمہیں جا کر دیکھو نہ“

”میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن اُس کے پاس سے ہلا بھی نہیں۔ اور پھر مجھے بچائیگی کہ نہیں۔ کبھی اُس کا منہ نہیں دیکھا۔ آج اس کا اگھرا ہوا بدن دیکھوں! اسے تن کی سدا بھی تو نہ ہوگی۔ مجھ دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی۔“

میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہو گا۔ سوٹھ، گڑا، تیل، کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں۔
 ”تب کچھ آجائے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو۔ جو لوگ ابھی ایک چمبہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلا کر
 دیں گے۔ میرے نواز کے ہوئے۔ گھر میں کبھی کچھ نہ تھا۔ مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔“

جس سماج میں رات دن محنت کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور
 کسانوں کے مقابلہ میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے
 وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے معقالبہ
 میں زیادہ باریک بین تھا۔ اور کسانوں کی ہی دماغ جمیت میں شامل ہونے کے بدلے مشاطروں کی فتنہ پرانہ
 جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ مشاطروں کے آئین و آداب کی پابندی بھی کرتا۔
 اس لئے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گانوں کے سرغنہ اور ٹھیکیل بنے ہوئے تھے اس پر سارا گانوں
 انگشت نہائی کرتا تھا۔ پھر میری آسے تیسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ مستہ حال ہے تو کم سے کم آسے کسانوں کی
 سی جگہ توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بجا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔
 دونوں آلو نکال نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھا تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انھیں ٹھنڈا
 ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں مل گئیں۔ جھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا
 لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندک کا حصہ زبان اور حلق اور تالو کو جلا دیتا تھا اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے
 سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے کافی سامان تھے۔
 اس لئے دونوں جلد جلد نگل جاتے۔ حالانکہ اس کوشش میں انکی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اُس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی جس میں سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اُسے
 جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی۔ اور آج بھی اُس کی یاد تازہ تھی۔ بولا۔
 وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں
 کھلائی تھیں۔ سب کو۔ جھوٹے بڑے، سب نے پوڑیاں کھائیں۔ اور اصلی گھی کی۔ چٹنی، راستہ، تین طرح کے
 سوکھے ساگ، ایک برسے وائرکاری، دہی، چٹنی، مٹھائی۔ اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔

کوئی روک نہیں تھی۔ جو چیز چاہو مانگو۔ اور جتنا چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے ایسا کھایا، ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا۔ مگر پروسنے والے میں کہ سانسے گرم گرم گول گول، ہلکتی ہوئی کچڑیاں ڈالے دیتے ہیں منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہئے۔ تیل کو ہاتھ سے روکے ہوئے ہیں۔ مگر وہ ہیں کہ دئے جاتے ہیں۔ اور جب سب نے منہ دھو لیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا۔ مگر بٹھے پان لینے کی کہاں سہہ تھی۔ کھڑا نہ ہوا جانا تھا۔ چٹ پٹ جا کر اپنے کبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھا کر۔

مارھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔ اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا۔

”اب کوئی کیا کھلائے گا۔ وہ جہانا دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کچھایت سو جیتی ہے۔ سادی

بیاہ میں مت کھرج کرو۔ کریا کرم میں مت کھرج کرو۔ پوچھو گریہوں کا مال بٹور بٹور کہاں رکھو گئے مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے۔ ہاں کھرج میں کچھایت سو جیتی ہے۔“

”تم نے ایک میں پوڑیاں کھانی ہوں گی!“

”میں سے جیادہ کھائی تھیں۔“

”میں پچاس کھا جاتا۔“

”پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھانی ہوں گی۔ اچھا بٹھا تھا۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے۔“

اُلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہی الاؤ کے سامنے اپنی دھو تیاں اور ٹعہ کر پالوں پیٹ میں ڈالے

سور ہے، جیسے دوڑے بڑے اُردو رگینڈ لیاں مارے پڑے ہوں۔

اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

(۲)

صبح کو، مارھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پر

کمیا بھنگ رہی تھیں۔ پتھر آئی ہوئی آنکھیں اور پرنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت

ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مارھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس آیا۔ پھر دونوں زور زور سے اُٹے اُٹے کرنے اور چھاتی پٹنے لگے۔

پڑوس والوں نے یہ آہ وزاری نہی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشنی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دعوئے کا موقع تھا۔ کفن کی اور کڑی کی نگر کرنی تھی۔ گھر میں تو میسلس حزن غائب تھا جیسے چل کے گھولے میں نرس۔

باپ بیٹے دوتے ہوئے کانوں کے زمیندار کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت کو نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انھیں اپنے ہاتھوں پیٹ چکے تھے، چوری کی علت میں۔ وعدہ پر کام پر نہ آئیگی علت میں۔ پوچھا۔ کیا ہے بے گھسوا۔ روتا کیوں ہے۔ اب تو تیری صورت ہی نہیں نظر آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے تم اس کانوں میں رہنا نہیں چاہتے۔

گھسوانے زمین پر سر رکھ کر آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے کہا۔ سرکار بڑی بہت میں ہوں۔ مادھو کی گھر والی رات بھر گئی۔ دن بھر تڑپتی رہی سرکار۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سر حانے بیٹھے رہے۔ دوا دار دو کچھ ہو سکا سب کیا۔ مادھو ہمیں دگا دے گئی۔ اب کوئی ایک دن دینے والا نہیں رہا ملک، تباہ ہو گئے۔ گھرا جڑ گیا۔ آپ کا کلام ہوں۔ اب آپ کے سوا اس کی ٹی کون پار لگے گا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا وہ سب دوا داروں میں اٹھ گیا۔ سرکار ہی کی دیا ہوگی تو اس کی ٹی اٹھ گئی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوا دار پر جاؤں۔

زمیندار صاحب رحمت آدمی تھے۔ مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں "چل دور ہو یہاں سے۔ لاش گھر میں رکھ کر سڑا۔ یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آکر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا۔ بد سٹش"۔ مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقع نہ تھا۔ طوعاً و کرہاً دور روپے نکال کر پھیکدے۔ مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالا۔ اس کی طرف ہاتھ تک نہیں۔ گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دور روپے دے تو کانوں کے سببے ہا جنوں کو انکار کی جرات کیونکر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام کا دھندھو راٹھینا جانتا تھا۔ کسی نے دوائے دے، کسی نے چہار آنے۔

ایک گھنٹہ میں گھیسو کے پاس پانچ روپیہ کی معقول رقم جمع ہو گئی۔ کسی نے غلہ دیدیا، کسی نے لکڑی۔ اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے۔ اور ہر لوگ بانس بانس کٹتے لگے۔
 گانوں کی رتین اقلب عورتیں آکر لاش کو دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دہلے انداز میں گرا کر
 چلی جاتی تھیں۔

(۳)

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا۔ لکڑی تو اسے جلائے بھر کوں لگی ہے۔ کیوں مادھو!
 مادھو بولا۔ ہاں لکڑی تو بہت ہے۔ اب کھین چلے۔
 ”تو کوئی ہلکا سا کھین لے لیں“
 ”ہاں اور کیا۔ لاس اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی۔ رات کو کھین کون دیکھتا ہے“
 ”کیا بڑا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن دھاکنے کو چھیرا ہی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کھین
 چاہئے۔“
 ”کھین لاس کے ساتھ چلی ہی تو جاتا ہے“

”اور کیا رکھا رہتا ہے۔ یہی پانچ روپیہ پیسے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے“
 دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماز معنوی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں اور ہر ادھر گھومتے
 رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمدہً ایک شراب خانے کے سامنے آ پہنچے۔ اور
 گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ وہاں ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے
 پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب پی۔ کچھ گزبک۔ اور دونوں برآمدہ میں بیٹھ کر پینے لگے۔
 کئی گجیاں میم پینے کے بعد دونوں سرور میں آ گئے۔

گھیسو بولا۔ کھین لگانے سے کیا ملتا۔ آکھر مل ہی تو جاتا۔ کچھ پیو کے ساتھ تو نہ جاتا۔
 مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلارہا ہو۔ دنیا
 کا دستور یہ ہے کہ لوگ ہاتھوں کو تباہیوں روپے کیوں دیدیتے ہیں۔ کون دیکھتا ہے پر لوگ میں ملتا

ہے یا نہیں۔

”بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پنکھیں۔ ہمارے پاس چونکنے کو کیا ہے؟“
 ”لیکن لوگوں کو جواب کیا دو گے! لوگ پوچھیں گے نہیں کہن کہاں ہے!“
 گھیسو ہنسا۔ کہیں گے سوپے کمر سے کھک گئے۔ بہت ڈھونڈا ملے نہیں۔

مادھو بھی ہنسا اس غیر متوقعہ خوش نصیبی پر، قدرت کو اس طرح شکست دینے پر۔ بولا۔ بڑی اچھی
 تھی۔ بچاری۔ مری بھی تو خوب کھلا بلا کر۔

آدھی بوتل سے زیادہ تم ہو گئی۔ گھیسو نے دوسرے لوریاں سنگوائیں، گوشت اور سالن اور چٹنی
 کلیجیاں اور تلی ہوئی پھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے ہی دوکان تھی۔ مادھو پیک کر دو تپلوں میں ساری
 چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگلیں کوئی شیر اپنا
 شکار آزار دہو۔ نہ جابدہی کا خوف تھا، نہ بنامی کی نکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انھوں نے بہت پہلے
 طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا۔ ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اسے پن نہ ہو گا؟

مادھو نے فرق عقیدت جھکا کر تصدیق کی۔ جرور سے جرد ہو گا۔ بھگوان، تم انتر جامی (علیم)
 ہو۔ اُسے بکٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہر دے سے اُسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ
 کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔ بولا۔ کیوں دادا، ہم لوگ بھی تو دلہا
 ایک نہ ایک دن جائیں گے ہی۔

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پر ملامت انداز سے دیکھا۔
 ”جو دہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے کہ تم نے ہمیں کہن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے؟“
 ”کہیں گے تمہارا سر“

”پوچھی تو جرد“

”تو کیسے جانتا ہے اسے کہیں نہ ملے گا؟ تو مجھے ایسا لگتا تھا ہے! میں ساٹھ سال دنیا میں
 کیا مجھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کہیں ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے۔“
 مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا۔ کون سے بچے؟ روپے تو تم نے چٹ کر دے؟
 گھیسو تیز ہو گیا۔ میں کہتا ہوں اسے کہیں نہ ملے گا۔ تو ماننا کیوں نہیں؟
 ”کون دے گا۔ بتاتے کیوں نہیں؟“

”دہی لوگ دیں گے جنھوں نے ابھی دیا۔ ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے۔ اور اگر کسی
 طرح آجائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے ہیں گے۔ اور کہیں تیسری بار ملے گا۔“

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور سادوں کی چمک تیز ہوتی تھی، مے خانہ کی رونق بھی بڑھتی جاتی
 تھی۔ کوئی گاتا تھا، کوئی بہکتا تھا، کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا، کوئی اپنے دوست کے منہ میں ساغر
 لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا۔ ہوا میں نشہ۔ کتنے تو چلوں آتے ہو جاتے ہیں۔ یہاں آتے
 تھے صرف خود فراموشی کا مزہ لینے کے لئے، شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زلیست
 کی بنا یہاں کھینچ لاتی تھی۔ اور کچھ دیر کے لئے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں، یا مردہ ہیں، یا زندہ درگد
 ہیں۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزے لے لے کر چمکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی
 طرف جی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں۔ پوری قوم بیچ میں ہے۔
 کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بھی ہوئی پوریوں کا قبل اٹھا کر ایک بھکاری کو دیدیا جو کھڑا انکی
 طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور ”دینے“ کے غرور اور مسرت اور ولولہ کا انچی زندگی میں پہلی بار
 احساس کیا۔

گھیسو نے کہا۔ لے جا۔ کھوب کھا اور اسیر باد دے۔ جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی، بڑے تیل اکیڑ
 اسے جبرور پہنچ جائے گا۔ روٹیں روٹیں سے اسیر باد دے۔ بڑی گاڑی کمائی کے پیسے ہیں۔
 مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ بینکھ میں جائے گی دادا بینکھ کی رانی بنے گی۔

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا۔ اہں بیٹا، بیکٹھ میں جا بیگی۔ کسی کو ستایا نہیں۔ کسی کو دبایا نہیں۔ مرتے مرتے ہماری زندگی کی سب سے بڑی لاس پوری کر گئی۔ وہ نہ بیکٹھ میں جائے گی تو کیا یہ موتے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں۔ اور اپنے باپ کو دھونے کے لئے گنگا میں جلتے ہیں اور مندروں میں جل چڑھاتے ہیں۔

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بھی بدلا۔ تلون نشہ کی غاصیت ہے۔ یا س اور غم کا دورہ ہوا۔ مادمو بولا۔ مگر دادا بچاری نے زندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔ مری بھی کتنا دکھ جھیل کر۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

گھیسو نے سمجھایا۔ کیوں روتا ہے بیٹا۔ ٹھس ہو کہ وہ مایا جال سے کُت ہو گئی۔ جنجال سے جھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلد مایا موہ کے بندھن توڑ دے۔ اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے۔
ٹھلنی کیوں نینا جھمکاوے، ٹھلنی۔

سارا مینا نہ محو تماشا تھا اور یہ دونوں سکیش مخمور محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ندچنے لگے۔ اچھلے بھی، کودے بھی، گرے بھی، ٹکے بھی۔ بھاؤ بھی بتائے اور آخزنہ سے بدست ہو کر وہیں گر پڑے۔



ہندو اور مسلم قومی تحریکیں اور ہندوستانی قومیت کی تحریک

(چودھری رحمت علی ایک صاحب ہیں جو کیرج یونیورسٹی میں تعلیم پڑھ رہے ہیں۔ عرصہ ہوا ان کا ایک مطبوعہ خط کیرج سے موصول ہوا تھا جس پر انہوں نے ”پاکستان کی قومی تحریک“ کے صدر کی حیثیت سے اپنے دستخط کئے تھے۔ اس خط کی ابتدا میں بانیوں حاشیہ پر ہندوستان کا ایک نقشہ بنا ہوا تھا جس کے شمال مغربی گوشہ کو سبز رنگ سے کر نمایاں کیا گیا تھا اور اس پر پاکستان کا لفظ لکھا گیا تھا۔ اس کے رنگے ہوئے حصے میں ہندوستان کے پانچ موجودہ صوبے اور ریاستیں یعنی کشمیر، شمال مغربی سرحدی صوبہ، بلوچستان، پنجاب اور سندھ شامل تھے۔ اس خط پر ۶ جولائی ۱۹۴۷ء کی تاریخ درج تھی اور یہ اس وقت لکھا گیا تھا جب کہ پارلیمنٹ قانون حکومت ہند کے مسودہ کو آخری شکل و صورت دے رہی تھی۔

اس تحریر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ہندو ————— ستان اور پاکستان دو ایسے خطے ہیں جن کے باشندے ایک دوسرے سے نمایاں طور پر ممتاز ہیں۔ ان کی تہذیبیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ان کا فلسفہ، تمدن، زبان، ادب اور فنون لطیفہ ایک دوسرے سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ ان کے مذہب، ان کی معاشری اور تاریخی روایات میں ابتدا سے کوئی باہمی یکجہ گت اور ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ ان دونوں علاقوں میں ایک ہی قوم کے دو فرقے آباد نہیں ہیں بلکہ دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ ان کے مسائل کامل فرقہ دارانہ سمجھوتوں سے نہیں بلکہ بین الاقوامی معاہدوں سے حل ممکن ہے۔ اس لئے مجوزہ ہندوستانی فیڈریشن میں پاکستان کو ہندو ————— ستان کے ساتھ

شریک کر کے جو ظلم پاکستان کے ساتھ کیا گیا ہے اس کے خلاف جدوجہد کرنا ضروری ہے تاکہ اس ناانصافی کا ازالہ ہو سکے اور پاکستان ہندوستان سے الگ ہو کر اپنی مخصوص قومی زندگی کو ترقی دے سکے۔

ہیں چودہری رحمت علی جیسا کہ کوئی ذاتی واقفیت نہیں ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ علما کس مدت تک ایک شخص اور بے ریا کار کن ہیں۔ کیمراچ میں ان کا اپنی تحریک شروع کرنا بدی نظر میں مشتبہ سا معلوم ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ چودہری رحمت علی صاحب سے زیادہ شاطرانہ پس پردہ اس تحریک کو چلانا چاہتے ہوں اور ہندوستان میں بھی ایک اسٹریٹا کر یا ترکوں کے خلاف جیسے عربوں کی قومی تحریک شروع کی گئی تھی ایسی ہی کسی چیسر کا آغاز کر کے یہاں کی قومی تحریک کی بنیادیں بھی کھوکھلی کی جا رہی ہوں۔ اس مضمون میں ہمارے پیش نظر چودہری رحمت علی صاحب یا برطانیہ کے وہ ہونہار فرزند نہیں ہیں جو مشرقی ممالک کی ذہنیت کو یہاں کے لوگوں سے بہتر سمجھ کر کرنل لائیس بننے کی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے خط کا حوالہ دینا یہاں صرف اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ ان کے خط میں جو مطالبہ پیش کیا گیا ہے اسے ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تحریک کے ارتق کی آخری منزل سمجھنا چاہئے۔ جب کسی ملک کی آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصہ سے اپنے آپ کو بہت زیادہ مختلف پانے لگے اور جب مغابہت اور مصالحت کے تمام دروازے اپنے لئے بند پائے تو اس کا انجام یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے دل میں یہ تنہا پیدا ہو کہ وہ اپنی ایک جدا گانہ دولت و حکومت قائم کرے۔ ذیل کے مضمون میں اسی بات کے دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آیا واقعی صورت حال اس درجہ خراب ہو گئی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے متحد ہو کر ایک مشترکہ قومی زندگی بسر کرنا نا ممکن ہو گیا ہے اور ایک کو دوسرے کے ظلم سے بچانے کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ناگزیر ہو گیا ہے تاکہ دونوں علیحدہ علیحدہ کر اپنی مخصوص قومی زندگی کو اس وجہ سے گزار سکیں۔

اس مضمون کو اس عنوان کی پہلی قسط سمجھنا چاہئے ہمیں توقع ہے کہ ملک کے اہل ارادے

حضرت بلا قید مذہب اس موضوع پر رسالہ جامعہ کے ذریعہ اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار فرما کر
اس سلسلہ کو جاری رکھیں گے۔

اب اس قومیت کی بیداری [آدنی تنہا زندگی بسر نہیں کرتا بلکہ دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر] ہنس بول کر
اپنا وقت گزارتا ہے۔ لیکن سب لوگوں کے ساتھ اس کی راہ درسم، مردت و محبت یکساں نہیں ہوتی۔ کچھ
لوگوں کی صحبت میں اسے لطف حاصل ہوتا ہے اور کچھ لوگوں کی صحبت اسے گراں گذرتی ہے جس کا اظہار بعض
صورتوں میں وہ گراہیت اور نمایاں نفرت کے ساتھ کرتا ہے اور بعض صورتوں میں بھول رواداری کے ساتھ۔
یہ ہو سکتا ہے کہ تھوڑے عرصہ کے لئے کاروباری معاملات میں یا غیر معمولی حالات کے زیر اثر وہ ان لوگوں سے
بھی جن کی صحبت اسے گراں گذرتی ہے میل جول رکھنا گوارا کرے۔ لیکن اپنے دن رات کا بیش تر حصہ برضا و رغبت
وہ ایسے ہی لوگوں کے ساتھ بسر کرنا پسند کرے گا جن کے خیالات اور احساسات میں وہ اپنے ساتھ ہر قدم پر
یگانگت، ہم آہنگی اور اتحاد و اتفاق دیکھے گا۔ ساتھ اٹھنا بیٹھنا، ساتھ کھانا پینا، ایک ہی زبان میں گفتگو کرنا،
ایک ہی وضع کا کپڑا پہننا، ایک ہی طرز کے مکان میں رہنا، کائنات و زندگی کے متعلق ایک طرح کے اعتقاد رکھنا،
ایک ہی انداز سے عبادت کرنا، ایک ہی قسم کی چیزوں کو پسندیدگی اور نا پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنا،
آپس میں شادی بیاہ کو جائز رکھنا، ایک ہی ادب، صنعت، طرز عمارت، مصوری، موسیقی سے لطف حاصل کرنا
معاشی کاروبار میں مشترکہ اغراض و مقاصد رکھنا، غرض کہ اتنے بے شمار نقطہ ہائے اتصال ہوتے ہیں کہ جب ایسے
لوگ ایک دوسرے سے ملے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی جسم کے متعدد اعضاء ہیں جو باہم مل کر ایک دوسرے
کی تکمیل کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں جب ایک شخص اپنی ترقی کے لئے کوئی کوشش کرتا ہے تو اس سے کل نبرد
برادری، قبیلہ یا قوم کی ترقی از خود ہو جاتی ہے اور جب جماعت کی ترقی کا کوئی کام کیا جاتا ہے تو اس کا اثر واسطہ
در واسطہ ہر فرد کی ذات تک پہنچتا ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض لوگوں سے رفاقت اور بعض سے ینگاہی کا کیا سبب ہے ؟
اس کا ایک سبب نہیں متعدد اسباب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اتحاد نسل، اتحاد زبان، اتحاد مذہب، تمدن و معاشرت

آباد، تجارتی اتحاد، فتح و شکست، حملہ و دھت، رنج و راحت میں باہمی شرکت، شرکت وطن، شرکت
محکومیت وغیرہ وغیرہ۔

زمانہ حال میں مغربی ممالک نے ان رشتوں میں جس رشتہ کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے وہ شرکت
وطن کا رشتہ ہے۔ لیکن ملک پرستی بجائے خود کوئی قوی جذبہ بن سکتی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ آسان نہیں
ہے۔ اس کی مخالفت میں کہا جاسکتا ہے کہ آدمی کسی بے جان قطعہ زمین سے محبت نہیں کرتا بلکہ اس پر
بسنے والے آدمیوں سے اسے تعلق اور لگاؤ ہوتا ہے۔ اور اگر یہ آدمی ایک جگہ قیام نہ کریں تو زمین سے کوئی
محبت نہ پیدا ہو۔ اس کو ثابت کرنے کے لئے شکار اور گلہ بانی کی مانند بدوش زندگی کو پیش کیا جاسکتا ہے جس
میں ایک جماعت مستقل طور پر کسی جگہ قیام نہ کرنے کے باوجود اپنی جماعتی زندگی کے شیر ذوق قائم رکھتی ہے۔
لیکن ملک پرستی کے حامی یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب آدمی ایک خاص قطعہ زمین پر بس جاتا ہے وہاں اپنے لئے مکان
بنالیتا ہے، باغ لگالیتا ہے، مسلسل کھیتی باڑی کرتا ہے تو اس وقت کیا صورت ہوتی ہے؟ کیا اس
وقت بھی زمین کی محبت سے انکار کیا جاسکے گا؟ لیکن تاریخ کی گردش سے ایک ایسی صورت بھی پیدا ہو سکتی
ہے جس میں ایک آدمی کے لئے صرف وہ آدمی منافع باقی رہ جائیں جو زمین اور املاک سے حاصل ہوتے ہیں
اور اس کی وہ تمام دماغی اور روحانی لذتیں اس سے چھین لی جائیں جن سے اس کی یا اس کے آباء اجداد کی زندگی
الامال راہ کرتی تھی۔ آدمی عموماً کسی ایک زبان کے الفاظ میں غیر معمولی شیرینی، کسی ایک طرز کی مصوری
اور صنائی میں خاص نزاکت حسن اور کسی ایک نوع کی موسیقی میں بے مثال نغمہ پاتا ہو اور اسے اپنا سمجھ کر اس کی
خاص طور پر قدر کرتا ہو۔ لیکن انسانی آبادی کے مختلف گروہوں میں جو اتحاد و ارتباط اور افتراق و اشتقاق
کا سلسلہ جاری ہے اور بعض وقت قربت اور بعض وقت بعد پیدا ہوتا رہتا ہے، ایک گروہ کا اثر و اقتدار ایک
وقت زیادہ اور دوسرے کا کم ہوتا رہتا ہے اور جسے قوموں، تمدنوں اور تہذیبوں کے عروج و انحطاط، ترقی و زوال
کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی وقت ایسی شکل اختیار کر لے کہ جس کے
زیر اثر ایک آدمی کو اپنی زمین اور املاک کے آدمی منافع تو حاصل رہیں لیکن اپنی تمام تمدنی وابستگیوں سے
وہ محروم کر دیا جائے تو کیا اس وقت وہ آدمی اس محدودی کو خاموشی سے گوارا کرے گا؟ کیا وہ ان کے ضائع

ہونے کے بعد بھی اپنی زندگی کو مکمل باور کتا رہے گا؟ کیا اس کی زندگی میں ایک خدا، ایک اشتہا، ایک غلظت اور بے جینی پیدا نہیں ہوگی جسے ٹھوڑی سی آزادی اور اختیا رکی حالت میں وہ ضرور رفع کرنے کی کوشش کرے گا؟ مخلوق، مجبوری اور غلامی کی حالت میں تو یہ ممکن ہے کہ لوگ ان محدود میوں کو گوارا کرتے رہیں لیکن ان چیزوں کی یاد اندر ہی انسان کے دلوں میں سنگتی رہے گی۔ وہ موقع کے منتظر رہیں گے اور جب کبھی موقع ملے گا وہ اس دے ہوئے شعلہ کو بھڑکا کر اس کی تاریکی اور یرانی کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ تدریس سوچتے رہیں گے کہ اپنی حالت محکومیت کو آزادی میں بلیں اور ان کی آزادی کا مفہوم ان چیزوں کے احیاء و ترقی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ اور جب کبھی یہ بھیجی ہوئی چنگاری ذرا بجے گی کیا لوگ اسے "احساس قومیت کی بیداری" کے نام سے موسوم نہ کریں گے؟

اس سے ظاہر ہوا کہ کسی ایک ملک کی محض سکونت احساس قومیت پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس کے لئے ضرورت اور رشتوں کی بھی ہے جن کی بنیاد پر قومیت کا احساس بیدار ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی مخالفت میں یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ مادی منافع کے لالچ میں جب ایک ہی مقام پر مستقل سکونت اختیار کرنے کے لئے آدمی مجبور ہوتا ہے تو اس جگہ کے تمدن و معاشرت کے طریقوں سے بھی اسے مانوس ہونا پڑتا ہے اور رفتہ رفتہ اپنے پرانے طریقوں کو بھول کر نئے طریقوں کو جو جدید ماحول میں کامیاب زندگی گزارنے کے لئے زیادہ موزوں ہے اختیار کر لیتا ہے۔

زمین کی محبت اور تمدن و تہذیب کی محبت میں جب کشمکش ہو جاتی ہے اس وقت اس کا انحصار دروڑوں میں سے کون کس پر غالب آئے گا اس بات پر ہوگا کہ آبادی کا اپنے قدیم تمدن و تہذیب سے ٹکراؤ کس شدت کے ساتھ ہے۔ اس فتنے کو قائم رکھنے کے لئے کس قسم کے مواقع موجود ہیں مثلاً کوئی ایسا محکمہ معاشری نظام ہے جو سخت حملوں کو بھیلنے کی اہلیت رکھتا ہے اور تہذیب و تمدن کے شیرازہ کو منتشر نہیں ہونے دیتا یا کہیں باہر کوئی ایسی جگہیں ہیں جہاں وہ تمدن و تہذیب زندہ اور مایں بہ ترقی ہو اور جہاں سے ترک سکونت کر کے لوگ برابر اس قطعہ زمین کی طرف آ رہے ہوں یا جہاں کی ترقی کی مثال یہاں سکونت اختیار کرنے والوں کے لئے حوصلہ افزا ہو پھر اس خاص قطعہ زمین پر بسنے والی دوسری آبادیوں کا رویہ بھی اس پر اثر ڈالے گا۔ یہ نوید اگر مہربانانہ دیکھا جائے

ایل ہوگا تو نقطہ اسے اتصال جلد پیدا ہو سکیں گے اور پرفانی و فاداریاں جلد فنا ہو سکیں گی ورنہ تصادم عرصہ تک جاری رہے گا۔

یہی حال تقریباً اور دوسرے رشتوں کا بھی ہے مثلاً نسل کی پاکیزگی اسی وقت تک قائم رہے گی جب باہمی ازدواج میں رکاوٹیں ہوں گی۔ زبان اور مذہب کے اختلافات بھی اسی وقت تک نمایاں رہیں گے جب تک عصبیت کے ساتھ ان کی پابندی کی جائے گی۔ تجارت و صنعت کے رشتے، مفاد کے اشتراک اور اختلاف کے ساتھ بندھتے اور ٹوٹتے ہیں۔ فتح و شکست حملہ و مدافعت، رنج و راحت اور محکومیت کے رشتوں کا انحصار، شرارت کی شدت اور مدت پر ہوگا۔

ان تمام باتوں کی پیش نظر نگاہ کر اس بات کا فیصلہ کرنا کہ کس وقت اور کن اسباب کے تحت کسی انسانی گروہ میں احساس دوری یا قربت اس قدر قوی ہو جائے گا کہ وہ اپنے آپ کو ایک علیحدہ قوم کہنے لگے گا بہت دشوار ہے۔ اس سلسلہ میں رینان کے اس علمی انکشاف کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جس میں اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ قومیت کے وجود کے لئے جو شرط ضروری ہے وہ نسل کا اشتراک ہے، مذہب، زبان، تمدن و معاشرت وغیرہ کا بلکہ قومیت جس چیز سے پیدا ہوتی ہے وہ صرف قومیت کا احساس ہے۔ اگر یہ احساس موجود ہے (اس سے بحث نہیں کہ اس کا محرک کیا ہے) تو اور تمام دوسرے اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی ایک انسانی گروہ قوم کہلا سکتا ہے۔

پھر قوم کے لفظ کا جو مفہوم موجود زمانہ میں ہے اسے پیدا ہونے سے بھی بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ لارڈ اکیٹن نے اس کی ابتدا افراق پولیٹکس سے کی ہے۔ انگلستان کو اس کے مخصوص حالات اور معاشی ضروریات نے سوٹھویں صدی میں سب سے پہلے ایک قوم بنا دیا۔ فرانس میں یہ چیز اٹھارویں صدی کے آخری حصہ میں پیدا ہوئی۔ جرمنی کی قومیت ایک اعتبار سے نپولین سے شکست کھانے کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ اٹلی میں بھی تقریباً جرمنی کے ساتھ ساتھ قومیت کا احساس پیدا ہوا۔ اس لئے مغرب میں انیسویں صدی کو قومیت کی صدی کہا جاسکتی ہے۔ مشرقی ممالک نے بھی اس نئے تخیل کے اثر کو مغرب سے قبول کیا اور یہاں بھی انیسویں صدی کے آخری سالوں سے قومیں پیدا ہونے لگیں۔

ہندوستان میں قومیت کا احساس کب پیدا ہوا اس کے متعلق لوگوں میں اختلاف رائے ہے بعض لوگ اس کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں وہ عناصر ہی نہیں پائے جاتے جو قومیت کے لئے ضروری ہیں ان کے نزدیک ہندوستان کی حیثیت ایک جغرافی اصطلاح سے زیادہ نہیں ہے۔ اس ملک کی وحدت اس قدر زیادہ ہے اور یہاں کے صوبوں، ضلعوں، زبانوں، مذہبوں، ذاتوں، معاشرت اور پیدائش دولت کے حلقوں میں اس قدر شدید اختلاف پائے جاتے ہیں کہ یہاں کی آبادی کو آدھوں کا ایک گروہ تو کہا جاسکتا ہے لیکن جماعت نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ان میں باہم ایسے تعلقات اور روابط نہیں ہیں جو انہیں کسی قریبی اور باہر رشتہ سے منسلک کرتے ہوں۔ جو رشتے میں وہ اس قدر سطحی اور کمزور ہیں کہ وہ بہت کم پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔

لیکن اگر یہ بات صحیح ہے تو ہندوستان میں قوم و قومیت کے جو الفاظ پچھلے پچاس سالوں سے ہر جگہ دوام کی زبان پر ہیں ان کا کیا مفہوم ہے؟ سرسری مشاہدہ سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کی آبادی کو مذہب، معاشرت اور تاریخی روایات کی بنا پر دو نمایاں بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جن میں اکثر صورتوں میں باہمی اختلاف کا احساس بھی خاصا شدید پایا جاتا ہے۔ یہ دو گروہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہیں آئندہ صفحات میں باہم دیکھیں گے کہ ان دونوں گروہوں میں مشترک طور پر کسی بیرونی قوم کے مقابلے میں باہم ایک دوسرے کے مقابلے میں کسی قسم کا کوئی قومی جذبہ پایا جاتا ہے یا نہیں۔

ہندوؤں میں قومیت کا احساس | ہندوؤں میں ایک طرح کی بنیادی وحدت تو نہایت قدیم زمانہ سے پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے دو کتابیں ”ہندوستان کی بنیادی وحدت“ اور ”ہندو مت میں قومیت“ لکھی ہیں۔ ان میں انھوں نے ان نمایاں قوتوں کو جو ہندوؤں کی زندگی میں وحدت پیدا کرتی ہیں نہایت تفصیل کے ساتھ دکھائے۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ اس طرح ہندوستان کے رہنے والے نہایت قدیم زمانہ سے برہم دت کو یعنی اس ملک کو جو ہالیہ اور جنوبی ہندوؤں کے درمیان واقع ہے اپنا مشترک وطن سمجھنے لگے تھے۔ رامائن میں ایک دو ماہ ہے جس میں ماں اور مادر وطن کو بہشت سے بھی زیادہ عزیز اور لائق احترام بیان کیا گیا ہے۔ یہ حب وطن کی وہ صورت ہے جو ترقی کر کے قومی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر جتنے ہندو تاریخی طاقتیں، مقدس

ہندوستان کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور جن کی یا تو اور دشمن مذہب کے پابند ہندو اکثر کرتے رہتے ہیں وہ بھی ملکی اور تمدنی اتحاد پیدا کرنے کے نہایت موثر ذریعہ ہیں۔ ک۔ م۔ پانیکار نے بھی اپنی کتاب ”ہندوستانی قومیت :- اس کی ابتدا“ تاریخ اور نصب العین“ میں یہ بات ظاہر کی ہے کہ ہندوستانی تاریخ میں چند گنتا موریہ کے زمانہ سے مرہٹوں تک برابر ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک مرہٹوں اور سکھوں کا عروج ایک طرح کی قومی تحریک تھی جسے بجا طور پر ہندو جذبہ قومی و مذہبی کے احیاء سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مٹراپ۔ ن۔ بوس نے اپنی کتاب ”سوراج : تمدنی و سیاسی“ میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ برطانیہ کی آمد سے قبل ہندوستان میں سیاسی تو نہیں لیکن تمدنی قومیت پائی جاتی تھی جسے مغرب نے فنا کر دیا۔ بالوچ چند پال نے اپنی کتاب ”روح ہند میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں ایک وفاق قومیت پائی جاتی تھی جس میں بھارت ورش کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور راجہ حانیوں باہمی دوستی سے ایک وفاق حکومت بنالیتی تھیں جس کا صدر ایک چاراجہ ہوا کرتا تھا اور ہندوستان کی قومیت کا یہ بحیل یورپ کی ملکی قومیت سے مختلف تھا۔ ان کا خیال ہے کہ مسلم حکومت نے ہندوستانی تمدن کی اس وحدت کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا لیکن مغرب نے پرانے نظام تمدن کو بر باد کر ڈالا۔

لیکن جب ہندوستانی تاریخ کے تجزیات کا نہیں بلکہ واقعات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس کی قومیت کا وجود اپنے مفہوم کے تمام لوازم کے ساتھ ثابت نہیں ہوتا گو اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک نہایت طویل زمانہ تک ہندوستانیوں میں ایک مشترک تمدن رائج رہا ہے اور اس تمدن کا اثر اس قدر ہمہ گیر تھا کہ جنوب کے دراوڑوں کو بھی یہ اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا اور اس سے آزاد ہونے کا کوئی رجحان ان میں نہ پایا جاتا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی فتح کے بعد ہندوستان کی تمدنی وحدت میں ایک بڑی خلیج پیدا ہو گئی جس کو ہمارے قومی وحدت کو حاصل کرنا سہل نہیں رہا ہے۔ لیکن جو لوگ ہندو قومیت کے عناصر اتحاد کو اپنے سامنے رکھتے ہیں وہ مسلم عنصر کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ ہندو تمدن کی قوت انجذاب کے بہت زیادہ قائل ہیں اور ہندوستان کی گزشتہ تاریخ کی صد ہا مثالیں سامنے رکھ کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا ہندو تمدن میں جذب ہو جانا نہایت آسانی سے ممکن ہے۔

ہندو قومی تحریک کو شعوری طور پر 'قصد و ارادہ کے ساتھ چلانے والی تحریکیں برہمن سماج' آریہ سماج اور رام کرشن اور دیواکانند کے مشن تھے۔ تھیا سوئیگل سوسائٹی نے بھی بڑی مدت تک ہندو قومیت کے احیاء کو ہی اپنا مقصد قرار دے لیا ہے۔ یہ سب ہندو مذہب کی اصلاحی تحریکیں ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ جارحانہ اور کسی قسم کی مغاہمت پر نہ آمادہ ہونے والی جماعت آریہ سماجوں کی ہے۔ اس نے ابتداء سے صرف ہندو راج کا ہی خواب دیکھا ہے اور ہندوستان کو صرف ہندوؤں کا ہی مورد فی حق سمجھا ہے۔ ان کی ترقی کے مفہوم میں صرف ہندو مذہب، زبان، معاشرت اور علوم و فنون کی ترقی اور احیاء شامل ہیں۔ ہندوستان کے دوسری عناصر کو وہ اپنے اندر جذب کر کے فنا کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستانی تعلیم یافتوں میں ابتدائی لوگ مغرب کے تمدن سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے اور ان کے پیش نظر جو نصب العین ہندوستانی قومیت کا تھا وہ مغربی نمونہ کا تھا جس میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی ترقی ترقی مغرب کی تقلید کے ذریعہ سے ہی ممکن تھی لیکن بعد کے تعلیم یافتہ لوگوں پر مذہبی رنگ غالب ہونا شروع ہوا اور اس کے غلبہ کے ساتھ ساتھ قومیت کی بنیاد مذہب پر رکھی جانے لگی جس میں غیر ہندوؤں کے لئے شرکت ناممکن ہوگئی۔ ہندی اور سنسکرت کی ترویج اور ترقی کی کوششیں جگمگ گیتا اور نہ ہی شاستروں کا مطالعہ، دیانت کے فلسفہ کا جدید مغربی فلسفہ سے مقابلہ اور اس کی برتری کی تبلیغ، ہندو عہد تاریخ کی خوبیاں اور کارگزاریاں، شیواجی کو قومی ہیرو سمجھنا، گروگل پاٹ شالوں کا قیام، ہندو یونیورسٹی، ہندو سماج کی اصلاحی تحریکیں مثلاً اچھوت سدھار، بیواؤں کی شادی، نوعمری کی منادی کا انسداد، تیواروں تقریبوں پر فضول خرچی سے پرہیز، تعلیم نسواں وغیرہ شروع کی گئیں اور ان میں صرف ہندوؤں کو پیش نظر رکھا گیا۔ پھر چونکہ مسلمان ملک کی سیاسی تحریک سے علیحدہ رہے اور بنگال کے انفرق سے ہندو مسلمانوں میں بھی کچھ بزرگی پیدا ہوئی اس لئے دوری اور بڑھتی رہی اور فرقہ وارانہ ذہنیت کے نہایت شدید مظاہرے ہونے لگے اور جتنا زیادہ دھرم کے پابند لیڈروں اور پندتوں کا اثر پبلک زندگی میں بڑھا اتنی ہی زیادہ ہندوستانی قومیت ہندو قومیت بنتی چلی گئی۔ کانگریس لیگ سمجھوتہ کے ذریعہ ہندو قومیت اور مسلم قومیت کے علمبردار ایک دوسرے سے کچھ قریب ہوئے اور تحریک عدم تعاون کے بنگالے میں تو اس قدر تضاد اور بغیر ہم آہنگ عناصر کچھ حصے کے لئے شیر و شکر ہوئے کہ جس کی مثال شاید کم مل سکے گی۔ لیکن یہ اتحاد عوام تک

قائم نہ رکھا۔ اس نے بنیادی اختلافات کو ایک مشترکہ شکایت کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لئے دبا دیا۔ بڑی احیاء کے وہی لیڈر جو ایک دوسرے کی مخالفت میں سرگرم رہتے تھے اپنی مخالفتوں کو بھلا کر ایک دوسرے کے شریک ہو گئے۔ لیکن ان کی راہیں اس قدر بنیادی طور پر مختلف تھیں کہ تھوڑے عرصہ کے بعد جدائی لازمی تھی۔ چنانچہ نہایت سخت تصادم ہوا اور ہندو مہاسبھا، سنگٹھن، شدمہی اور ایسی ہی فاصلہ ہندو قومی تحریکیں شروع ہو گئیں جو ابھی تک ہندوستانی زندگی کے شیرازہ کو منتشر کئے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں میں قومیت کا احساس | مسلمانوں میں نہ بھی عقیدے کی سادہ اور واضح یکسانیت، عبادت کے جماعتی طریقے اور معاشری زندگی میں مساوات ایسے عوامل ہیں جن سے اتحاد بہت جلد پیدا ہوتا اور دیر تک قائم رہتا ہے۔ پھر حکمران طبقہ کی حیثیت سے ہندوستان میں زندگی گزارنے کی وجہ سے بھی ان میں باہمی تعلق اور یکجہالت بڑھ گئی۔ تمدن و معاشرت کے مخصوص طریقے پیدا ہو گئے جن کی بنا پر مسلمان اپنے آپ کو حاکم سمجھ کر غیر مسلم رعایا سے الگ الگ رہنے لگے۔ سلطنت جب ہاتھ سے نکل گئی اس وقت بھی مسلمانوں کی عزت و عظمت یہاں کی مقامی آبادی میں باقی رہی اور ان کی معاشرت کا اختلاف نمایاں رہا جس کی تقلید کرنا یہاں کی محکوم رعایا اپنے لئے باعث فخر سمجھتی تھی۔ انگریزوں کے برسرِ اقتدار ہونے سے ان کے عہدے، ریکستیں، جاگیریں، منصب اور معافیاں ان کے ہاتھ سے نکلنے لگیں لیکن پھر بھی عرصہ تک بہت سی باقی رہیں جن کی وجہ سے ان کی شان و شوکت اور نمود و نمائش اور اقتدار و برتری قائم رہیں۔ عہدہ کو عہدہ کا بیشتر اہل اسلام مسلمانوں پر رکھا گیا اور ان سے بدلہ لیا جانے لگا۔ ان کی تباہ حالی کو دیکھ کر سرسید نے مسلمانوں اور انگریزوں میں مغایرت اور مصالحت کرانا چاہی۔ ابتدا میں سرسید ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی بہبودی کے خواہش مند تھے لیکن مسلم حکومت اور اقتدار کی یاد گاریں ان سے اس قدر قریب تھیں کہ وہ اسلامی اثرات کو جو ایک عرصہ تک جاری رہنے کی وجہ سے ہندوستان کی زندگی کا ایک جزو بن گئے تھے انھیں ہندو اور مسلمان برضا و رغبت اختیار کر چکے تھے مٹا ہوا دیکھنا گوارا نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ جب کچھ ہندوؤں نے اردو کے مقابلہ میں ہندی کے رواج دینے کی کوششیں شروع کیں تو سرسید کو بہت ناگوار ہوا اور اس دن سے انھوں نے سمجھ لیا کہ ہندو مسلم اتحاد ممکن نہیں ہے اور وہ اب

پوری طور پر مسلمانوں کے لئے ہی کوشش کرنے لگے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے لئے خاص طور پر کوشش کرنے کا ایک اور سبب بھی تھا۔ مسلمان اپنے منصب اور غرور کی وجہ سے انگریزی تعلیم سے اور انگریزوں نے ہندوستانیوں کو ترقی کے جو مواقع دے تھے ان سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا سکے تھے اور وہ ہندوؤں کے مقابلہ میں تعلیم اور سرکاری ملازمتوں میں بہت پیچھے رہ گئے تھے اس پس ماندگی کو مٹانے کے لئے بھی سب مسلمانوں کی تحریکوں کو ہندوؤں سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ سرسید کی ہستی بڑی ہمہ گیر واقع ہوئی تھی۔ انھوں نے مسلم مذہب، زبان، تمدن و معاشرت، تعلیم — سب کو بچانے کے لئے بیک وقت کوششیں شروع کیں اور مسلمانوں کی ایک قومی درس گاہ قائم کر کے ہندوستان میں مسلم قومیت کی تحریک کو مستقل بنیاد پر قائم کر دیا۔ سرسید کے علاوہ اور لوگ بھی مذہبی تحفظ اور احیاء کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ دارالمصنفین یہ بنیاد دار سے ان دوسرے لوگوں کی کوششوں سے قائم ہوئے۔ پھر مسلم قومی شاعروں میں حالی اور مصنفین میں نذیر احمد شبلی اور سرسید کے رفقاء خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ ان سب کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ایک قومی بیداری شروع ہوئی جو ہندو قومی بیداری سے بالکل علیحدہ ایک چیز تھی۔ سرسید ناقد بن گئے جب سرسید سے انڈین سلی سوشلسٹ کے سلسلہ میں اشتراک عمل کرنا چاہا تو سرسید نے انکار کر دیا۔ کانگریس سے بھی سرسید علیحدہ رہے۔ ان کے مقابلہ میں ایک طرف تو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی گئی جس میں مسلمانوں کے تعلیمی اور اصلاح معاشرت کے مسائل پر بحثیں ہونے لگیں اور دوسری طرف آل انڈیا مسلم لیگ قائم کی گئی جو پاکستان کے سیاسی مسائل پر غور و فکر کرنے لگی۔ سرسید ابدا ہی سے حکام رس تھے اور اس حکام رس کی بنا پر انھیں یہ اعتماد تھا کہ وہ مسلمانوں کے لئے انگریزوں سے ہندوؤں کے مقابلہ میں بہتر سیاسی مراعات حاصل کر سکیں گے۔ اسی مقصد کے تحت انھوں نے اپنے مدرسہ کے اساتذہ میں بہت سے انگریزوں کو بھرتی کیا۔ سرسید کے پیش نظر غالباً کل ہندوستان کی آزادی کا نصب العین کبھی بھی نہیں رہا۔ ان کا سطح نظر شاید صرف یہ تھا کہ انگریزوں کے ساتھ اشتراک عمل کر کے ہندوستان پر انگریزوں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ حکومت قائم کریں مگر سرسید اپنے مذہبی عقیدہ میں قدامت پسند نہیں تھے۔ وہ مغرب سے بہت زیادہ متوجہ تھے۔

اسی لئے، مغربی فلسفہ کے ساتھ اپنے مذہبی عقائد کی جادو بجایا مطابقت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ ممکن ہے یہ بھی ہو کہ سرسید مذہبی علماء کے ان فتوؤں کی مخالفت کرنا چاہتے تھے جن سے غدر کے زمانہ میں مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف جہاد پر آمادہ کیا گیا تھا اور جن کی موجودگی میں انگریزوں سے اشتراک عمل اور مصالحت کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ بہر حال سرسید کی تحریک انگریزوں اور مغربی تہذیب سے معاہدہ کی خواہش مند تھی۔ لیکن علی گڑھ تحریک سے علیحدہ ملک میں راسخ العقیدہ مسلمانوں کی مذہبی اجیل کی تحریکیں شروع ہوئیں اور اسلامی ملکوں کی سیر و سیاحت سے ہندوستانی مسلمانوں کی یہ تحریکیں برہمنی اسلامی ممالک کا اثر بھی قبول کرنے لگیں۔ ان تحریکوں میں جمال الدین افغانی کی بین الاقوامی اسلامی تحریک نے خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ یہ تحریکیں انگریزوں سے مصالحت نہیں چاہتی تھیں بلکہ انہیں مسلمانان عالم کا سب سے بڑا دشمن سمجھتی تھیں جگہ جگہ بھیس، بھقان اور جنگ عظیم نے مسلمانوں کی مذہبی قومیت اور غیر ملکی اسلامی ہمدردیوں کو ہیبت نمایاں کیا اس دور کے مصنفین میں ”الہلال“ کے ابو الکلام، ”کامرہ“ کے محمد علی، ”زمیندار“ کے خضر علی خاں اور ڈاکٹر اتبیل بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ تحریک عدم تعاون اور خلافت میں مسلمان اس لئے شریک نہیں ہوئے تھے کہ وہ ہندوستان کی آزادی کے ہیئت زیادہ خواہش مند تھے بلکہ وہ اس لئے شریک ہوئے تھے کہ وہ خلافت اور اسلامی ممالک کی آزادی کے ہیئت زیادہ تہمتی تھے۔ چنانچہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو قومی اتحاد خلافت کے سلسلہ کی حمایت کی وجہ سے پیدا ہوا تھا وہ خلافت کے ختم ہو جانے پر باقی نہ رہ سکا۔ ہندوستان کے مسلمان مذہب اور سیاست کو دو علیحدہ علیحدہ چیزیں نہیں سمجھتے تھے اور ان کی تسنای بھی کہ خلیفہ کی قیادت میں آزاد مسلمان ریاستوں کا ایک دفاع قائم کریں۔ خواہ اپنے لئے ہندوستان کے مسلمانوں نے کوئی سیاسی نصب العین نہیں بنایا تھا۔ ان کی ساری امیدیں اور تمناں غیر ملکی اسلامی ریاستوں کی آزادی سے وابستہ تھیں اور انہی کی کامیابی یا ناکامی سے وہ خوش اور رنجیدہ ہوتے تھے لیکن جب ترکوں اور دیگر اسلامی ملکوں نے مذہب اور سیاست میں تفریق پیدا کر کے خالص قومی ریاستیں قائم کرنا شروع کیں تو ہندوستانی مسلمانوں کی قومی زندگی کھو چکی ہو گئی۔ اس کے سامنے کوئی نصب العین نہیں رہا۔ دوسری طرف ہندوؤں کے مذہبی اور منکھن شروع کر دینے کی وجہ سے

ہندو مسلم اتحاد کے مواقع بھی بہت کم ہو گئے۔ اس کے بعد تنظیم اور تبلیغ کی تحریکیں شروع ہوئیں اور اب اس بات کی کوششیں ہونے لگیں کہ مسلم قومیت کو ہندوستان میں فروغ دینے کی تمام ممکن تدبیریں اختیار کی جائیں اور ان کو ایک مضبوط حیثیت دی جائے۔ مسلمانوں میں جتنا جتنا اپنی عظیم قومیت کا احساس بڑھتا رہا ہے اور جتنا انہوں نے ہندو قومیت کو ترقی کرتے اور منظم ہوتے دیکھا ہے اتنے ہی وہ اپنے سیاسی تحفظ کے لئے بھی زیادہ کوشاں ہوتے گئے ہیں۔ چنانچہ اس وقت مسلم قومیت کی انتہائی شکل پاکستان کے تشکیل کو سمجھنا چاہئے۔ لیکن پاکستان کا تشکیل ابھی تک مسلمانوں کی ایک نہایت ہی محدود جماعت کے ذہنوں میں پایا جاتا ہے۔ اس نے کسی منظم تحریک کی شکل ابھی تک اختیار نہیں کی ہے۔ اس کا رہنما کیسٹن میں ابھی تک تسلیم حاصل کر رہا ہے۔ پاکستان کی قومی تحریک کے حامیوں کی طرف سے جن جن صوبوں کو پاکستان میں شامل کیا گیا ہے اس میں پنجاب کا پورا صوبہ بھی شامل ہے۔ لیکن اس صوبہ میں مسلم اکثریت صرف ۴۴ فی صد ہے اور سکھوں اور ہندوؤں کی اقلیت میں ہندو قومیت اس درجہ سرایت کئے ہوئے ہے کہ وہ کسی طرح مسلم اکثریت کے پاکستان کا جزو بننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس لئے پاکستان کی قومی تحریک کے نصب العین کو پورا کرنے کے لئے مسلمان اس نارضمانہ، کثیر القاعدہ، خوش حال اور برسرِ اقتدار اقلیت کی خواہشات کو کس طرح پامال کر سکیں گے یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ کسی طرح توقع نہیں کی جاسکتی کہ یہ اقلیت ان کی خاطر پنجاب کے زرخیز صوبہ کی نفع بخش سکونت ترک کر کے یو۔ پی۔ بمبئی، مدراس سی۔ پی۔ بہار آویں وغیرہ کے ہندو صوبوں میں دلوں کی مسلم آبادی کی جگہ بائیں کی۔ اسی طرح ان ہندو صوبوں کی مسلمان آبادی بھی شاید اپنی اپنی اہلک و عیال کو چھوڑ کر پنجاب میں بسنے کے لئے بہت زیادہ بے چین نہ ہوگی یا اسی حالت میں پاکستان کس طرح بن سکے گا اور جو مسلمان پاکستان سے باہر ہوں گے ان کے ساتھ ہندو اکثریت کے کس سلوک کو مناسب سمجھائے گا ایسے سائل میں جو بہت پیچیدہ ہیں اور جن کے تعلق ضرورت ہے کہ کہ پاکستان کے حافی پوری روشنی ڈالیں۔ ان باتوں پر مسلمانوں کو بہت جلد غور کرنا چاہئے کیونکہ سیاسی زندگی میں کوئی واضح نصب العین نہ رکھنے کی وجہ سے انہیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔

ہندوستانی قومیت | مسلم قومیت اور ہندو قومیت کے مقابلہ میں اب ہندوستانی قومیت کا مطالعہ کرنا بھی

غزدری ہے۔ یہ بالکل جدید چیز ہے اور مغرب کے اثر اور تعلیم سے ہندوستان میں پیدا ہوئی ہے۔ مغرب کی آزادی کی تحریکوں پر اس کی بنیاد قائم ہے۔ ایسے لوگوں نے اسے شروع کیا جنھوں نے انگلستان اور مغربی ملک کے عہد جدید کے ادب کا مطالعہ کیا تھا انگریزی گٹا کارٹا اور بن آف رائٹس کی دفعات، ہیمپڈن اہربرک کی تقریریں، مل کی تعانیف، 'روشو'، ہنٹنگوڈ وغیرہ کی تحریریں — یہ چیزیں اس جذبہ قومی کی محرک ہوئیں۔ انگریزی تعلیم سے ان لوگوں کو ایک مشترک زبان ملی جسے صوبوں کے درمیان تبادلہ خیال کے لئے استعمال کیا جاسکتا تھا، مغربی تاریخ کی معرفت انھوں نے مغربی تمدن اور روح قومیت کو اختیار کیا اور انگریزوں کی صحبت اور رہنمائی میں انھوں نے قومی تنظیم کے طریقوں کو سیکھا۔ انگریزی پڑھنے والے لوگوں کا ابتدائی طبقہ تو انگریزوں کی برتری سے اس درجہ مرعوب تھا کہ اس میں کسی قسم کا صحیح قومی احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن بعد کے تعلیم یافتہ لوگوں نے اصلاحات کا مطالبہ کرنا شروع کیا۔ گورنروں کی کونسلوں میں کچھ شستوں کی خواہش کی اور رسول سروس کے اعلیٰ عہدوں پر تقرر جالو۔ مگر ان کی قومیت بھی بے جا تھی یہ ملک کے فرزند ہونے کی حیثیت سے اس بات کا مطالبہ نہیں کرتے تھے کہ انھیں اور صرف انھیں ملک کی قسمت کے فیصلہ کا حق ملنا چاہئے بلکہ وہ انہی اہلیت اور قابلیت ثابت کر کے عہدوں کے خواہش مند ہوتے تھے۔ وہ کسی کی نایبندگی نہیں کرتے تھے بلکہ ذاتی منفعت کے لئے تمام کوششیں کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ انھیں معلوم ہوا کہ جس طبقہ کی وہ نمائندگی کرتے ہیں اس کے منلو کو اس لئے نقصان پہنچ رہا ہے کہ عنان حکومت ایک غیر قوم کے لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے بعد سے وہ شعوری طور پر صحیح معنی میں قوم پرست ہو گئے جن خیالات کو انھوں نے انگریز مفکرین اور مصنفین کے یہاں پڑھا تھا انھیں اپنے حالات کے عین مطابق پایا۔ خصوصیت کے ساتھ جب ہندوستانی قومیت کے معاشی پہلو کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس وقت اس بات کا پورا پورا چلتا ہے کہ ہماری تحریک قومیت کس درجہ انگریزی تعلیم کی ممنون کر م ہے۔

ایں سلسلہ میں سوشلزم کے غدر نے قومیت کی ترقی میں جو حصہ لیا ہے اس کا بیان کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ غدر بلاشبہ برطانوی سلطنت کے خلاف ہندوستانی قومیت کی پہلی جنگ آزادی تھی مولویوں نے جہاد کے فتوے دے کر اور پنڈتوں نے ملکشوں کو نکالنے پر آمادہ کر کے لوگوں کی ملکی، مذہبی،

تمدنی اور معاشرتی روایات کو قوی احساس کی شکل میں زندہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ بات صرف ایک بہت محدود حد تک صحیح ہے۔ کیونکہ قومیت صحیح معنی میں کسی جاگیردارانہ نظام میں باطنی ہی نہیں جاہلیتی۔ غدر کے اکثر رہنما مرہٹوں اور مغلوں کے نیم جاگیردارانہ نظام سلطنت کو زندہ کرنا چاہتے تھے۔ جاگیرداری نظام کے ایسے حامیوں نے جنہیں انگریزوں سے کچھ توقعات تھیں غیر ملکپوں کی حمایت کی۔ لیکن ایسے لوگوں نے جنہیں مغربی سیلاب کے تیزی سے پھیلنے کی وجہ سے نقصان پہنچا تھا اس طوفان کو روکنے کی کوشش کی۔ باغیوں کی اس کوشش کا انجام نہایت دردناک ہوا۔ لیکن اپنی شکست کے باوجود انھوں نے عوام کی ان بے چینیوں کی طرف منکر کی کی وجہ منعطف کرادی جو پرانے نظام کے برباد ہونے اور اس کی جگہ کسی نئے نظام کے نمودار نہ ہونے سے پیدا ہوئی تھیں۔ زراعت کا زوال، صنعتوں کی تباہی، عوام کی تباہ حالی اور ناموزوں اور غیر مانوس اداروں کا قیام یہ چیزیں ہیں جن کی بنیاد پر بعد کو ہندوستانی قومی تحریک کو شروع کیا اور چلایا گیا۔

ہندوستانی قومیت کا معاشی پہلو | ہندوستانی قومیت کی ترقی میں جن معاشی اسباب نے خاص طور پر اپنا اثر کیا ان میں سب سے اول لائق ذکر سفر اور ذرائع نقل و حمل کی سہولتیں اور تجارت کی ترقی ہیں۔ ان سے صوبہ جات میں باہمی میل ملاقات کے زیادہ امکانات پیدا ہوئے اور وہ موانع اور تعصبات ختم ہو گئے جو ملک کے ایک حصہ کو دوسرے سے جدا کیا کرتے تھے۔ جب ہندوستان کے لوگ دور دراز صوبوں میں بھی گھر بٹھانے اور آرام پانے لگے اور جب ملک کی وسعت کے باوجود قربت بڑھنا شروع ہوئی تو پھر ہندوستان ایک جغرافیائی اصطلاح باقی نہیں رہا بلکہ اس کے قومیت کے تخیل نے ایک زندہ وجود کی شکل اختیار کر لی۔ رسائل خبر رسانی کی ترقی سے لوگوں کے خیال میں وسعت پیدا ہوئی اور اصلاح معاشرت کی ایک قومی تحریک کا آغاز ہوا۔ پھر مغربی ادبی تمدن و تہذیب نے اور زیادہ بنیادی طور پر بیاں کی زندگی پر اثر ڈالنا شروع کیا۔ انگلستان نے عیساکہ کارل مارکس نے نیویارک ڈبلی ٹریبون میں لکھا تھا غیر شعوری طور پر ہندوستان میں ایک معاشرتی انقلاب کی ابتداء کر دی۔ لالہ لاجپت رائے نے ہندوستانی قومی تحریک کی بنیادوں کے متعلق اپنی کتاب ”نوجوان ہندوستان“ میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”ہندوستان میں انگریزی

حکومت کے طریقے ان کا نظام تعلیم، ان کے مطایح، ان کے قوانین، ان کی عدالتیں، ان کی ریلیں، تار گھر، ڈاکخانے، دفانی جہاز — سب کے سب ہندوستانیوں میں جذبہ حب الوطنی پیدا کرنے کے موجب ہوئے۔ برطانیہ نے اس بات کو اس وقت نہ جانا لیکن اتحاد کے یہ تمام ذرائع غیر شعوری طور پر ہندوستانی قومیت کی بنیاد رکھتے رہے۔

اس کے علاوہ ہماری قومیت کو ملک کی صنعتی ترقی سے بھی بہت گہرا تعلق ہے۔ کانگریس کی ابتدا نہایت اعتدال پسند جماعت کی حیثیت سے ہوئی تھی لیکن جب یہ حقیقت روز بروز زیادہ واضح شکل میں نظر آنے لگی کہ ہندوستان سے ناجائز طریقہ پر انتفاع حاصل کیا جا رہا ہے اور جب ہندوستانیوں میں یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ صنعتی ترقی کے ذریعہ جو فوائد برطانیہ کو ہندوستان سے حاصل ہو رہے ہیں ان کا حق انھیں برطانیہ سے زیادہ ہے تو کانگریس میں قومیت کا رنگ نمایاں ہونے لگا۔ ”جسٹینس کسی ایسے ملک میں جہاں کوئلہ اور لوہا پایا جاتا ہے ایک دفعہ رائج کر دی جاتی ہیں تو ایسے ملک کو ان مشینوں کے خود پیدا کرنے سے کوئی شخص باز نہیں رکھ سکتا۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں ریلوں کا شروع کرنا اور پھر یہ توقع کرنا کہ ہندوستان میں وہ تمام صنعتیں جو ریلوں کی فوری ضروریات کو پورا کرتی ہیں ترقی نہ پائیں گی ایک ناممکن چیز کی تمنا کرنا ہے۔ نہ صرف ایسی صنعتیں قائم ہوں گی بلکہ ان کے بعد ایسی دوسری صنعتیں بھی قائم ہوں گی جو ریلوں سے قریبی طور پر متعلق نہیں ہیں۔ غرض کہ ہندوستان میں ریلوں کے رواج کو جدید صنعت کا ہر اول سمجھنا چاہئے۔ مارکس نے یہ مشین گوئی مسئلہ ہمیں کی تھی اور یہ بڑی حد تک صحیح ثابت ہوئی ہے کہ سامراجی حکمت عملی کی وجہ سے ہندوستانی صنعت کی ترقی میں بہت سے موانع پیدا ہوئے اور رفتار خاصی سست رہی۔ ہندوستانی قومیت کا حقیقت آغاز اس وقت ہوا جب ہندوستان کے سرمایہ داروں نے دیکھا کہ قومی آزادی کے بغیر وہ صنعت کے بیشتر منافع سے محروم رہیں گے۔

مندرجہ بالا راتعات کی روشنی میں یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ہندوستانی قومیت کے تخیل کو ر۔س۔د، دادا بھائی ناروڈی، ریناڈے اور گوکھلے کی تحریروں سے کیوں اس قدر نفوس پہنچی۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے غیر ملکی فاتح کے ناجائز انتفاع کی قطعی کھول کر رکھ دی تھی اور ہندوستانیوں کو بتلایا تھا

کو غیر ملکی حکومت کی وجہ سے انھیں کس کس قسم کے معاشی نقصانات پہنچ رہے ہیں۔

پہلی بات جس کی طرف ان لوگوں نے توجہ دلائی یہ تھی کہ ہندوستان سے دولت مستقل طور پر نکلنے کی طرف کھینچی ہوئی چلی جا رہی ہے ”مطالعات وطن“ کے نام سے جو قوم انگلستان روانہ کی جاتی ہیں وہ ایک طرح کا خراج ہیں جو ہندوستان اپنی حکومت کی وجہ سے انگلستان کو ادا کرتا ہے۔ ہندوستان میں جو انگریز ہیں ان کا اپنی تختہ انہوں کو ہندوستان میں خرچ کرنے کی جگہ انگلستان بھیجتا، پشن جلد مل جانے کی سہولتیں، رخصت انگلستان میں بسر کرنا اور اسی قسم کے ہزاروں قومی نقصانات کے خلاف نہایت تکمیل کے ساتھ رائے عامہ کو متوجہ کیا گیا پھر ہندوستان کے قرضہ عامہ کے بارے میں تحقیق کر کے یہ بتلایا گیا کہ اس کے ایک بڑے حصہ کا بار خواہ مخواہ ہندوستان کے سر نہٹھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں تجارت و صنعت کے منافع کی شکل میں ہندوستان کو جو نقصان پہنچ رہا ہے وہ بھی بتلایا گیا۔ کلکتہ کے نزدیک جو یورپ والوں کے جوٹ کے کارخانے ہیں جب وہ ۱۱۲ لاکھ پیر کاتے ہیں تو اس میں سے ہندوستانی مزدوروں کو تو صرف بارہ روپیہ اجرت کے دیتے ہیں اور باقی سو روپیہ اسکاٹ لینڈ کے سرمایہ داروں کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں قحط کے بار بار واقع ہونے سے جو تباہ مالی ہندوستان کے کسانوں میں پھیلی تھی اور ہندوستان میں عسرت و افلاس ترقی پر تھا اس کی ذمہ داری بھی غیر ملکی حکومت پر رکھی گئی۔ کہا گیا کہ کسانوں سے جس قدر مالگذاری وصول کی جاتی ہے وہ تقریباً سب کی سب غیر ملکیوں کو چلی جاتی ہے۔ ہندوستانی صنعتوں کی تباہی اور زراعتی پیشہ پر آبادی کے ایک دوز افروز حصہ کا انحصار یہ چیز بھی برطانوی اعمال نامے کو سیاہ کرنے کے لئے استعمال کی گئی۔ پھر غرض کے بعد سفید فوجوں کے اعضاء سے ہندوستانی ممانعت کا خرچ بہت بڑھ گیا تھا اس نے بھی قومی شکایات میں ایک نمایاں جگہ اختیار کر لی۔

اس تمام بحث کے بعد یہ بات غالباً محتاج وضاحت نہیں رہتی کہ ہندوستانی احساس قومیت کی بیداری میں غیر ملکی تسلط سے ہماری قومی عزت نفس کو جو نقصان عظیم پہنچا ہے اسے بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہیں بلکہ اس میں زیادہ دخل مادی احساس زیاں کو ہے۔ ابتدا میں کانگریس کی طرف سے ہندوستانیوں کے لئے صرف چند زاید عہدوں کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں یہ صورت نہیں رہی۔ کیونکہ پھر کانگریس نے ایک طرف تو

مالیات کی آزادی یعنی قومی خرچ کی نگرانی کا مطالبہ کرنا شروع کیا اور دوسری طرف قومی صنعتوں کے تحفظ کی تحریکیں چلانا شروع کر دیں۔ پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ۱۹۲۴ء تک برطانوی حکومت اسی حکمت عملی پر کاربند رہی جس سے برطانوی درآمد، خصوصیت کے ساتھ لنکا شائر کے کپڑے کو تقویت پہنچتی تھی۔ جب کبھی سرکاری آمدنی بڑھانے کے لئے باہر کے کپڑے پر پٹی لگائی جاتی تھی تو اس کے تاخیری اثرات کو زایل کرنے کے لئے ہندوستان میں بنے ہوئے کپڑے پر اکریک محصول بھی ساتھ ہی ساتھ لگادیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں سرکار کی طرف سے جو نہریں بنائی جاتی تھیں ان سے بیشتر روٹی پیدا کرنے والی زمینوں کی آبپاشی مد نظر ہوتی تھی تاکہ اس سے ایک طرف تو لنکا شائر کی روٹی کی ضرورت پوری ہو سکے اور دوسری طرف سرکاری مالگذاری کے ادا کرنے میں سہولت ہو۔ لیکن ہندوستانی قومیت کو آہستہ آہستہ کامیابی حاصل ہونا شروع ہوئی۔ چنانچہ ہندوستانی فولاد کی صنعت کو سرکاری طرف سے تائین اور عطیات دلائے گئے جس سے اس کی ترقی میں بہت مدد ملی۔ پھر ہندوستانی کپڑے کے کارخانوں کے تحفظ کے لئے لنکا شائر تک کے خلاف محصل درآمد عاید کرائے گئے۔

غرض کہ ہندوستانی قومیت کی جنگ میں معاشی قوتوں کا اثر ہر قدم پر نمایاں نظر آتا ہے۔ بنگال میں افزاق کے خلاف جو شورش کی گئی اس میں ”سودشی“ کی تحریک کو بھی ساتھ ہی ساتھ چلایا گیا۔ جنگ عظیم کے زمانہ کی معاشی اتری نے قومی تحریک میں پروتاریہ یعنی مزدوروں اور کسانوں کے طبقہ کو بھی قومی تحریک میں شامل کر دیا جس سے ہماچل گاندھی کی ستیاگرہ (۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۰ء) نے ایک نئی صورت اختیار کر لی۔ ۱۹۲۰ء میں عالمگیر کسادبازاری کے اثرات ہندوستان کے لئے نہایت تباہ کن ثابت ہوئے۔ ۱۹۳۰ء کی پیداوار کی قیمت ۱۹۲۰ء کے مقابل میں نصف رہ گئی۔ پھر چاندی کی قیمت گھٹنے اور شرح مبادلہ کے بڑھنے سے بھی ہندوستان کو نقصان پہنچا۔ انہی معاشی اسباب کی بنا پر ہماچل گاندھی دوبارہ قومی قوتوں کو مجتمع کر کے برطانوی حکومت کو کئی سال تک پریشان رکھ سکے۔

ان معاشی قوتوں کے مقابل میں جب ایسی غیر معاشی قوتوں کو رکھا جاتا ہے جیسے انگریزوں اور ہندوستانیوں میں اعزاز و مرتبت کے لئے کشش، قانونِ اعلیٰ سے بیزاری، ریلوں اور دوسری سرکاری ملازمتوں میں گورے

کالے کی تفریق، سی۔ آئی۔ ڈی اور سنسٹرپ کی زیادتی، اخباروں اور مجلسوں کے خلاف قوانین و فیرو تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بدلے خود ہندوستانی قومیت کی تحریک پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ اس اتحاد قومی کے پیدا کرنے میں مادی مفاد کے اشتراک کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

ریشیزم کی تحریک زندگی کے معاشی پہلو کی اہمیت نے ہندوستان میں ایک نئی تحریک یعنی سوشلزم کا بھی آغاز کر دیا ہے۔ یہ تحریک بھی مغرب سے آئی ہے اور مغربی مفکرین کے خیالات ہی کی راہ میں منت ہے۔ یورپ میں کارل مارکس جس کا ذکر ضمناً اوپر کیا جا چکا ہے اس تحریک کا بانی تھا اور لینن اور اسٹالین نے اسے روس میں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ اس تحریک کے حامیوں کا یہ خیال ہے کہ مشین اور اعلیٰ پیمانہ پر صنعتی کاروبار کے طریقے رفتہ رفتہ انسانیت کے ارتقا کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں اور اب ان کو اختیار کئے بغیر تمام دنیا کے لئے مفر کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آتی ہے۔ لیکن پیداوار کے ان جدید طریقوں میں بہت زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے جسے ہر دولت پیدا کرنے والا شخص فراہم نہیں کر سکتا۔ اس لئے ایک قلیل جماعت سرمایہ داروں اور ایک کثیر جماعت مزدوروں کی پیدا ہو جاتی ہے۔ سرمایہ داروں کی جماعت قلیل سے قلیل تر اور مزدوروں کی جماعت کثیر سے کثیر تر ہوتی جاتی ہے۔ نفع طلبی کی ذہنیت کے ماتحت سرمایہ داروں کی دولت اور اقتدار برابر بڑھتا جاتا ہے اور مزدوروں کے احساس افلاس اور بے بسی میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے پھر سرمایہ داروں کا اقتدار ایک ملک تک محدود نہیں رہتا بلکہ کل عالم پر چھا جاتا ہے۔ اس لئے ان کی پالیسیاں تمام دنیا کے ذخائر، منڈیوں اور مزدوروں کو نظر کے سامنے رکھ کر متعین کی جاتی ہیں۔ مزدوروں کو کارخانوں میں ایک جگہ کام کرنے سے میل ملاقات کے مواقع زیادہ ملتے ہیں اور باہمی مفاد کے اشتراک کا انھیں احساس ہو جاتا ہے جس سے ایک مزدور ذاتی نفع کے لئے دوسرے کا مقابلہ نہیں کرتا بلکہ سب مزدور جماعتی نفع کے لئے مل کر سرمایہ دار سے سودا کرتے ہیں۔ اپنی قوت کا احساس رفتہ رفتہ یکجہاں کی ان کے حوصلوں کو بہت بڑھا دیتا ہے اور اب وہ اجرت میں خیف، ریشی یا اوقات کار میں کمی سے مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ سرمایہ داروں کے قلیل گروہ کی جگہ مزدوروں کی جماعت کا مکمل تسلط زمین، سرمایہ اور پیداوار دولت کے وسائل پر چاہنے لگتے ہیں اور چونکہ سرمایہ داروں کا تسلط عالمگیر ہوتا ہے اس لئے ان کا ہر جگہ مقابلہ کرنے کے لئے انھیں بھی

اپنی تحریک کو عالمگیر بنانا چاہتا ہے۔ تمدن و معاشرت کے اختلاف کی ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں ہے وہ ان سب کو بورژوازی یعنی سرمایہ داروں کی تخلیق کی ہوئی چیز سمجھتے ہیں۔ یہ تحریک مذہب سے بالکل منحرف ہے۔ اسے نشہ سمجھتی ہے جسے پلا کر سرمایہ دار مزدور کو عاقبت کی امید میں دنیا کی تکالیف کو پہننے کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ یہ انسانی ذہنیت اور نظام معاشرت میں ایک بنیادی انقلاب چاہتی ہے۔ ہندوستان میں یہ تحریک ابھی نئی نئی شروع ہوئی ہے اور صرف ایک قلیل التمداد تعلیمیافتہ جماعت کے ذہنوں میں اس کا پورا خاکہ پایا جاتا ہے۔ صنعتی شہروں کے مزدوروں میں بھی اس کا کچھ کچھ اثر ہے۔ لیکن ابھی عام طور پر اسے کسانوں اور مزدوروں نے اختیار نہیں کیا ہے۔

خاتمہ | ہندو قومیت، مسلم قومیت، ہندوستانی قومیت اور سوشلزم کی تحریکوں کا ہم نے علیحدہ علیحدہ مطالعہ کیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ کون سی تحریک ان میں دوسری تحریکوں پر غالب آئے گی یا ان میں باہم کوئی جھگڑت اور ہم آہنگی پیدا کی جائے گی۔ پانچ ممکن صورتیں ہیں جو دیکھنا ہو سکتی ہیں:-

(۱) مسلم قومیت کا ہندوستان پر مکمل تسلط۔

(۲) ہندو قومیت کا ہندوستان پر مکمل تسلط۔

(۳) ہندوستان کی تقسیم و حصوں میں۔ ایک حصہ میں خالص اسلامی قومیت اور دوسرے میں خالص ہندو قومیت۔ گو پاکستان اور ہندوستان دائمی پیدا ہو جائیں۔ آبادیاں قومیت کی بنا پر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جائیں۔ رہی یہ بات کہ اس پاکستان اور ہندوستان میں کون کون سے علاقے شامل ہوں یہ بات عام رائے شماری اور باہمی سمجھوتہ سے طے کر لی جائے۔

(۴) ہندو قومیت اور مسلم قومیت کی باہمی آمیزش سے ایک ایسی قومیت پیدا ہو جس میں دونوں کے عناصر شامل ہوں۔

(۵) ہندو قومیت اور مسلم قومیت دونوں کی تباہی اور ان کی جگہ مغربی وضع کی سرمایہ دارانہ قومیت یا بالشورزم کی قسم کا نیا معاشی اور معاشرتی نظام پیدا ہو جائے۔

اب ان میں سے واقعی کون سی صورت رونما ہوگی اس کا فیصلہ تو مشکل ہے لیکن اگر نبد و توہمیت
 اہل مسلم توہمیت میں کوئی ایسا باعث بھجوتہ ہو سکے جس سے مذہب اور معاشرت کی بنیادی باتوں کو ترک
 کئے بغیر دونوں فریق اپنے سیاسی اور معاشی معاملات میں جن کی اہمیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے شریک
 رہ سکیں تو میں سمجھتا ہوں یہ بہت مناسب بات ہوگی کیونکہ اور تمام کوششوں میں (چاہے ان کے دوسرے
 فوائد اور کتنے ہی کیوں نہ ہوں) غیر ضروری فتنہ و فساد اور تکلیف و مصیبت کا احتمال ہے۔



نازو

یہ شہر کو مناظر قدرت اور ان کی دلپذیر نشا و ایوں سے بہت محبت ہے۔ چنانچہ ہم شہر سے بہت کافی فاصلے پر رہتے ہیں۔ ہمارے چھوٹے سے مکان کے گرد ایک چھوٹا سا احاطہ ہے جس میں پھول ہیں، کیاریاں ہیں اور روشیں ہیں لیکن اس احاطے کے باہر دس فطرت دست انسانی کی گتائیوں سے نا آشنا ہے۔ چاند، سورج، مینہ اور شبنم مشاطہ کے فرائض دن رات انجام دیتے ہیں اور اس کے سادہ حسن اور مصوم شباب کو برقرار رکھتے ہیں۔ ہمارا مکان فطرت کی ان نشا و ایوں میں اس طرح محصور ہے جس طرح ایک آشیانہ درخت کے سرسبز تپوں اور گھنی شاخوں میں گھرا ہوتا ہے۔ مکان سے کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر ریل کی پٹری ہے، جس پر سے دن رات یلیں گزرتی ہیں۔

یہ گزرنے والی ریلیں اکثر مجھے ناز و کی یاد دلاتی ہیں۔ اُس ناز و کی جوانی بہن کی گود میں پرورش پاکر اپنی بہن کو داغ دے گئی، جو جوان ہوئی اور جوان ہو کر مر گئی، جو گلاب کے پھول کی طرح شاداب تھی اور چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن، لیکن جس کی جوانی ان دونوں کی جوانی سے بھی زیادہ مختصر تھی۔

اماں جان کی ناگہانی موت کے وقت ناز و صرف تین برس کی تھی میں نے اس کو بڑی محبت، بڑی جانفشانی سے پالا۔ میں دن دن بھر اس کو گود میں لے رہتی اور ساری ساری رات پنگوٹے میں لٹا کر لوریاں سناتی رہیں اس کو اس قدر پیار کرتی تھی کہ اماں جان بھی اگر زندہ ہوتیں تو شاید نہ کر سکتیں۔ وہ میری محبت بھری گود میں سانس لے کر بڑی ہوئی، جوان ہوئی۔ اس کی جوانی پڑھتی ہوئی آنکھ کی طرح آئی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہو گئی۔ اُس کا چہرہ دمک اٹھا، جہان بھر کی تابانیاں اور رونقیں اس میں سمٹ کر آگئیں۔ اس کے سیاہ بال بے حد گھنے اور لانے ہو گئے۔ اس کا قد اتنا دراز ہو گیا کہ اگر وہ منہ موڑ کر کھڑی ہوتی تو سچ مجھ ایک عورت معلوم ہوتی ہیں اس اٹھان، اس بالیدگی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی لیکن آہ مجھے یہ علم نہ تھا کہ یہ ساری بچپن، یہ تمام رعنائی ایک فریب ہے، ایک دھوکا ہے۔ یہ جوانی جو آنکھ کی طرح

آئی ہے ایک بھونکنے کے مانند گزر جائے گی۔

ہائے وہ کیسی محسوس اور نامراد صبح تھی جب نازد نے مجھ سے کہا تھا کہ ”آپ امیر سے سر میں دروہے اور کچھ حرارت محسوس ہو رہی ہے۔“ میں نے اس کے چڑھتے ہوئے بخار کو معمولی سوہنم کا نتیجہ سمجھا تھا اور اس کی طرف زیادہ توجہ نہ کی تھی۔ اس وقت میں کیا جانتی تھی کہ یہ بخار وہ بخار نہیں ہے جو ایک درون کی دوا کے بعد اتر جاتا ہے بلکہ وہ بخار ہے جو اکثر دیشتر موت کا نقیب بن کر آتا ہے۔ آبا جان نے علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ دہلی کے افضل سے افضل طبیب بلائے اور جب ان کی کوششیں ناشکور رہیں تو باہر والوں سے زحزع کیا لیکن بخار کسی طرح نہ اترتا۔ اور بالآخر ایک دن مجھ نامراد کو یقین دلادیا گیا کہ کوئی ارضی طاقت میری بہن کو موت کے منہ سے نہیں بچا سکتی۔ مجھ سے قہار رویا گیا میں روئی، قہانم کیا گیا کیا اور قہنی دعائیں مانگی گئیں، مانگیں، مگر طبیعوں کی اس رائے میں تبدیلی نہ ہوئی اور میری نازکی پالی ہوئی نازد اسی طرح موت سے تشریب تر ہوتی چلی گئی۔

نازد بچپن سے ایک بت خاموش اور کم سخن بڑکی تھی۔ وہ بات کرنا جانتی ہی نہ تھی۔ صرف وہ جانتی تھی۔ جب تک اس نے ہوش نہیں سمجھا لابات کرنے کی بجائے ہمیشہ آنسو ہی بہائے۔ یعنی اگر اس کو کبھی کسی چیز کی ضرورت ہوتی یا کوئی تکلیف ہوتی تو بجائے اس کے کہ مجھ سے آکر کہے وہ کسی جگہ تنہائی میں بیٹھ کر روتے لگتی۔ جب بڑی ہو گئی تو یہ رونا تو کم ہو گیا لیکن زبان کی ویسی ہی گونگی رہی۔ چنانچہ اس نے اپنی طویل بیماری کے زمانے میں کبھی زبان سے کچھ نہ کہا۔ دن دن بھر خاموش آنکھیں کھولے پڑی رہتی طبیعوں نے جو اس کی صحت کی طرف سے بالواسی ظاہر کی تھی اس کی بابت اس سے کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ نادان نہ تھی۔ سب کچھ سمجھتی تھی۔ اور اپنی بیماری کی نوعیت سے اچھی طرح واقف تھی۔ ایک دفعہ — یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ چلتی پھرتی تھی اور ابھی اتنی کمزور نہیں ہوئی تھی کہ بستر سے بھی نہ اٹھ سکے — اس نے اپنے کمب میں سے ایک قیمتی دوپٹہ نکال کر اوڑھ لیا۔ ایسے دوپٹے عام طور پر کسی تقریب کے سلسلے میں ہکائے جاتے ہیں اور روزانہ استعمال میں نہیں آتے جس خیال کے ماتحت اس نے یہ دوپٹہ اوڑھا تھا مجھ پر اچھی طرح واضح تھا۔ تاہم میں نے تجاہل سے کام لیا اور جب وہ سامنے آئی

تو مصنوعی تعجب کا اظہار کیا۔ لیکن وہ جواب میں بالکل خاموش رہی۔ اس طرح اکثر اس کی باتوں سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ اپنے لا علاج مرض کو بچاوتی ہے اور نتیجے سے واقف ہے۔

جب نازو تندرست تھی — ابھی بیمار نہ پڑی تھی — تو اس کے جوان دل میں بہت سی حیران آرزوئیں تھیں۔ بنجاریں آرزوؤں کا یہ لہلہاتا ہو چہن چہلےس کے رہ گیا اور اس کے سارے ذوق و شوق ختم ہو گئے۔ لیکن اس حالت میں بھی دوارمان اس کے دل میں باقی تھے۔ وہ ریل میں بیٹھنا چاہتی تھی اور ”آپا زبیدہ“ کے بیاہ میں شریک ہونے کی آرزو مند تھی۔

نازو دہلی میں پیدا ہوئی اور ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی دہلی سے باہر نہیں گئی۔ اس لئے اس کو ریل کے سفر کا ارمان تھا۔ جن لوگوں کی رشتہ داری شہر سے باہر ہوتی ہے ان کو ریل کا سفر آئے دن دہش رہتا ہے لیکن سہارے تمام اعزاء و اقارب دہلی ہی میں تھے۔ صرف نانا ابا کی وجہ سے تھوڑا سا تعلق میرٹھ سے تھا کہ وہ وہاں برسوں سے مقیم تھے۔ چنانچہ جب نازو کو دہلی میں تھی تو اماں جان کے ساتھ چند مرتبہ میرٹھ گئی بھی تھی لیکن اس کو اس زمانے کا کچھ ہوش نہ تھا۔ پھر ادھر تو اماں جان کا انتقال ہوا اور ادھر نانا ابا کی آنکھیں بند ہوئیں یہ تعلق بالکل ختم ہو گیا اور نازو ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی دہلی سے باہر نہ جاسکی۔

نازو کی دوسری خواہش یہ تھی کہ وہ کسی لڑکی کے بیاہ میں شریک ہو۔ وہ بیاہ کی تمام رسموں کو دیکھنا چاہتی تھی اور اپنے اس شوق کے متعلق اکثر باتیں کیا کرتی تھی۔

بیاری سے کچھ دنوں پہلے اس کو امید ہو گئی تھی کہ اب یہ دونوں خواہشیں بہت جلد پوری ہو جائیں گی۔ میرٹھ میں سہاری خالہ کی بیٹی زبیدہ کا بیاہ ہونے والا تھا۔ خالہ اماں نے ابا جان کو کھٹا کھٹا کر زبیدہ کی شادی اکتوبر میں ہوگی اور میں سب کو میرٹھ بلاؤں گی۔ نازو نے اسی وقت سفر اور شادی میں شرکت کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ دو دن اور بٹھنے لگن گن کر وقت کا ٹرہی تھی اور ابھی مارچ ہی کا مہینہ شروع ہوا تھا کہ اس موزی بنجانے اس کو آیا۔

پھر بھی میں نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ جب زبیدہ کا بیاہ ہوگا تو میں تجھ کو اپنے ساتھ لے کر میرٹھ جاؤں گی اور فی الحقیقت میں اس کو میرٹھ لے جانا چاہتی تھی تاکہ اس کے دل میں یہ ارمان نہ رہ جائے چنانچہ

جب بیاہ میں ایک ہفتہ رہ گیا اور خالہ اماں نے ملاوے کا خط لکھا تو میں نے ابا جان سے ذکر کیا اور ناز کو میرٹھ لے جانے کی اجازت مانگی۔ انھوں نے قطعیت کے ساتھ انکار کر دیا۔ مجھے اس کی بالکل امید نہ تھی، میں حیران و شہدہ رہ گئی، تھوڑی دیر کے لئے بدحواس ہو گئی۔ پھر جب میں ذرا سنبھلی اور مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ یہ صدمہ ناز کو کے لئے ناقابل برداشت ہو گا تو میں نے اپنی تمام کوششیں ابا جان کو راہنی کرنے میں صرف کر دیں۔ میں روئی بھی، منٹیں بھی کہیں، اوروں سے سفارشیں بھی کرائیں، لیکن ابا جان نے جو ایک دفعہ کہہ دیا تھا وہی کہتے رہے۔

ناز و خالہ اماں کے خط کی بابت سن کر بہت خوش ہوئی تھی اور اس دن سے دل ہی دل میں امید کر رہی تھی کہ اب بہت جلد میرٹھ کے سفر کی تیاریاں ہوں گی۔ لیکن تین دن گزر گئے اور نہ ابا جان نے عبادت دی اور نہ مجھ میں کسی وقت باوجود کوشش کے اتنی ہمت پیدا ہو سکی کہ میں ناز سے کہہ دیتی کہ ”بیاری نازو! تمہارے ابا جان تم کو میرٹھ جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ تم وہاں نہ جاؤ گی۔“ آخر چوتھے روز دوپہر کے وقت جب وہ کھانا کھا کر لیٹی تو میں نے جی کر اکر کے کہا ”ناز و جج کی ڈاک سے خالہ اماں کا دوسرا خط آیا ہے۔ زبیدہ کی شادی ملتوی ہو گئی، غالباً ایک دو مہینہ کے بعد ہو گی۔“ ناز نے یہ سن کر اپنی نظریں جھکالیں اور منہ سے کچھ نہ کہا۔ تھوڑی دیر بعد میں اس کی دو ایلیے الماری تک گئی۔ جب دو ایلیے میں انڈیل کر لائی تو میں نے دیکھا کہ ناز کو کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب جاری ہے۔ یہ آنسو اس کے زرد زرد رخساروں سے دھلک کر نیچے گر رہے ہیں اور تکیے کو جھگور رہے ہیں۔

اس واقعے کو پانچ برس گزر چکے ہیں۔ اب نہ نازو ہے نہ ابا جان ہیں۔ نہ وطن ہے نہ وہ گھر جس میں میں نے اپنی زندگی کا عظیم ترین صدمہ برداشت کیا۔ میں ہوں میرا دیران دل ہے، پردیس ہے اور جنگل میں یہ مکان ہے۔ رات کو جب ہر طرف سناٹے کا عالم ہوتا ہے، آسمان سے غلطیں بستی ہیں، اور جنگل کی وسیع پنائیوں سے جھینگروں اور مینڈکوں کے شور کے سوا کوئی آواز نہیں آتی تو ٹھیک ساٹھ نو بجے ریل اپنی شاندار مہیت انگیز گڑا گڑا ہٹ کے ساتھ میرے مکان کے سامنے سے گذرتی ہے۔ اس وقت بن ایسا محسوس کرتی ہوں کہ ناز و افقی کے کسی بعد ترین گوشے سے، حسرت و اشتیاق کے ساتھ ریل کر

دیکھ رہی ہے اور اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھائے ہوئے ہے لیکن جب ریل اس کے اشتیاق کو
 پامال کرتی ہوئی، اس کے اراٹوں کو کھینچتی ہوئی، سفاکانہ بے اتفاقی کے ساتھ نکل جاتی ہے تو اُس کے
 ہاتھ گر پڑتے ہیں، اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔

ہوں، مگر وہ اس کی پروا نہ کریں۔

کوئیں سے ہنستے ہی زمین دار صاحب کا مکان تھا۔ راستہ کے برابر گندھوں تک اونچا چوڑا تھا۔ جس پر ایک بڑا سامدانہ کمرہ تھا۔ دروازوں پر پکیں پڑی رہتی تھیں۔ اندر تخت، بچھا تھا۔ اس بھاف چادر تھی رہتی تھی بڑی بڑی پھیلی پھیلی کرسیاں تھیں۔ کنیز سوچا کرتی تھی کہ ان پر بیٹھنے سے بڑا آرام ملتا ہوگا۔

کنیز کی آنکھیں پکوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اور سوچ رہی تھی کہ دیکھا چاہئے آج شبیریاں کیا سوگ نکالتے ہیں، کوئی فقرہ کہتے ہیں، یا پانی پھینکتے ہیں، یا ڈھیلہ مارتے ہیں۔ کہ اتنے میں پیچھے سے شبیریاں تیزی سے آئے زن سے اس کے گلے میں کوئی چیز لال رنگ کی ڈالی۔ اور پھر اس کا منہ چوم کر کود کر کمرے کے اندر گھس گئے۔

صبح کی خنٹی ابھی باقی تھی، اور کنیز کے ہاتھ پاؤں کوئیں کے پانی سے بیگے ہوئے تھے اس نے اس کو ہلکی ہلکی سرودی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اس حادثہ سے اس کا سارا بدن ہلک سے جل اٹھا، پیشانی پر پسینہ کے قطرے آگئے، دل دھک دھک کرنے لگا، اور آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ اس نے گھبرا کر چوڑے کا سہارا لیا۔ گھڑا اس پر رکھ دیا۔ اور پھر نیچی آواز سے کہنے لگی۔

”شبیریاں! لونڈیوں سے دل لگی ابھی نہیں۔ میں سٹ جاؤں گی، آپ کا کچھ نہیں ہوگا۔“

نہ معلوم شبیریاں کمرے کے اندر تھیں بھی یا نہیں۔ اور کنیز کی آواز آنکھوں نے سنی بھی یا نہیں۔

کنیز نے اس درست کئے، اور گھڑا اٹھا کر گھر ملی۔ ادھر ادھر دیکھتی جاتی تھی کہ کسی نے دیکھا تو نہیں۔ مگر ابھی سننا تھا، کوئی راہگیر نہیں تھا چوڑے کے دوسری طرف چھپر کے نیچے ایک آدمی ہیلوں کو کھول رہا تھا۔ مگر وہ آڑ میں تھا۔ یہ دیکھ کر اس کے دل کو ڈھاکس ہوئی۔ مگر شبیریاں کی اس حرکت پر اس کو غصہ بہت تھا۔ اگر کوئی دیکھ لیتا، بغاٹن نے کبھی دیکھا ضرور۔ ورنہ کیسے معلوم ہوا، اتنے میں اس کی نگاہ اپنے گلے پر پڑی تو دیکھا شیشے کا ترش ہوا ایک مار پڑا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بیر ہوٹی کے ایسے لال لال دانے تھے۔ بیچ میں ہرنگار کا ایک ایک پھول تھا۔ پٹنے سے اس میں جنبش پیدا ہوتی تھی جس سے

جگمگ کر رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر اس کے دل میں ایک لہری پیدا ہوئی۔ غصہ تو بدستور باقی رہا۔ مگر ساتھ ہی شبیر میاں کی محبت بھی زور کر آئی، اس نے چپکے سے گھر ایک ہاتھ سے سنبھال کر، دوسرے ہاتھ سے ہار اتار لیا، اور اس کو کمر میں کھوس لیا۔ اور پھر گھر چلی گئی۔

ماں چو لھا لیپ رہی تھی۔ باپ ہنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھا حقہ گڑا گڑا رہا تھا۔ چوٹا بھائی نمودریاں کھول رہا تھا۔ کنیز نے گھڑا سٹی کے بنے ہوئے چھوٹے سے چوڑے پر رکھ دیا، اور بولی ”اب میں اتنے سویرے پانی لینے نہیں جایا کروں گی“

ماں نے یہ سن کر منہ بگاڑ لیا۔ مگر کچھ بولی نہیں۔ باپ نے سنا سنا نہیں۔ مگر نمو بولا۔

”اب میں سویرے سویرے مرغیاں نہیں کھولا کروں گا“

یہ کہہ کر اُس نے مرغیوں کو کنیز کی طرف دونوں ہاتھوں سے ہشکا دیا۔

کنیز۔ ”دیکھو نمو! مجھے یہ باتیں نہیں اچھی لگتیں۔ میری ہر بات کی نقل کرتا ہے۔ میری ہر بات کی نقل کرتا ہے“

نمو۔ ”بڑی وہ بنی ہیں۔ میں کیا نقل کرتا ہوں۔ میں نے کوئی بات تم سے کہی“

نمو نے پھر مرغیوں کو ہشکا دیا۔ اب ایک مرغی پھڑپھڑا کر کنیز پر آگئی۔

کنیز۔ ”حرام زادہ۔ ٹھہر تو۔۔۔۔۔“

نمو فوراً گھر کے باہر بھاگ گیا۔

ماں۔ ”یہ کیا ہے کنیز! تو ہر وقت نمو کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ اس نے اتنا ہی تو کہا تھا کہ میں

سویرے سویرے مرغیاں نہیں کھولا کروں گا۔ اس میں کیا برائی“

کنیز نمو کی حرکت بیان کرتی۔ مگر اس کا دل بھرا ہوا تھا، رونا آگیا۔ چپکے سے چھپر کے نیچے

ہنگ پر لیٹ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔ ماں نے اٹھ کر مرغیوں کو گھر سے باہر نکال کر دروازے بند کئے

باپ ویسے ہی حقہ پیتا رہا۔ بیچ بیچ میں کھانستا جاتا تھا۔ نمو باہر ہی تھا، اور جب تک کنیز گھر میں تھی اس کے

لٹنے کی کوئی امید نہ تھی تھوڑا سا رو لینے کے بعد کنیز کے دل کی بھر اس نکل گئی۔ اُس نے چپکے سے کہتے

بار نکالا۔ اور اس کو بچھنے پر پھیلایا۔ اب تک شبیر میاں پر غصہ بہت کم ہو چکا تھا۔ مگر یہ سوچ کر کانپ جاتی تھی کہ اگر کوئی دیکھ لیتا تو کیا ہوتا؟ ماں باپ مارتے مارتے میرا کیا حال کر دیتے؟ اور گاؤں میں کتنی بدنام ہو جاتی۔ مگر 'خیر' اب کیا پروا۔ کسی نے دیکھا تھوڑے۔ شبیر میاں کتنے اچھے لگتے ہیں۔ گودا گودا رنگ جو صاف صاف کپڑے پہنتے ہیں۔ بال بہت درست رہتے ہیں۔ ان کے سفید پاؤں چپلوں میں کیسے اچھے لگتے ہیں۔ جب نیکو پہنے ہوئے، بندوق ہاتھ میں لئے شکار سے واپس آتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ انکی قربت ہر طرح کے خطروں سے محفوظ کر دیگی۔ وہ سچ محبت کرتے ہیں۔ درنہ سویرے سویرے اٹھ کر، گھنٹوں انتظار میں کیوں بیٹھے رہتے۔ میرے تلنے کی کیا تدبیریں سوچا کرتے ہیں۔ ایک دن اُنھوں نے پیالہ بھر سرخ رنگ ڈال دیا تھا۔ میں کتنی گھبرا گئی تھی کہ اماں دیکھیں گی تو کیا کہیں گی۔ اور پھر کوئیں پردھونے لگی۔ مگر وہاں پہنچتے پہنچتے رنگ اڑ گیا۔

کیز نے ہار گلے میں بہن لیا۔ اور کوٹھری کے اندر جا کر آمینہ دیکھنے لگی۔ یہاں ابھی اندھیرا تھا۔ اس لئے کچھ صاف نظر نہیں آیا۔ اتنے میں ماں کی آواز آئی۔

”زمیندار صاحب کے یہاں نہیں جائے گی؟ ابھی کوئی بلائے آتا ہوگا۔ پھر گھر میں مار بھی پڑے گی!“ کیز نے جلدی سے اُرا تار کر میں کھوس لیا۔ باہر آئی، کوٹھیا کو دانت مانجے پھر ایک ٹوٹی سی لنگھی جس کے آدھے آدھے دندانے سیل سے بندھے طاق پر سے اٹھا کر مانگ درست کی، اور زمیندار صاحب کے یہاں چلی۔

اب اس کو دوسری فکر داغی ہوئی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ شبیر میاں اس کو ڈیوڑھی میں جیسے ملتے اور اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے۔ مگر گداتے۔ گالوں پر ہاتھ مارتے، اور پھر اپنے کمرے میں جس کا ایک دروازہ ڈیوڑھی میں مکتا تھا گھس جاتے۔ اب اس کا غصہ تو فرو ہو چکا تھا۔ اور دل ہی دل میں اس خیال سے کہ شبیر میاں اس کے انتظار میں کھڑے ہوں گے خوش ہو رہی تھی۔ بوسہ کے خیال میں بھی اس کو لذت محسوس ہوتی۔ مگر اس لذت میں ایک عجیب قسم کا ڈر ملا ہوا تھا۔ ایسا نامعلوم ڈر جو بچے تاریکی میں محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ کہہ کیا کہتی تھی۔ زمیندار صاحب کی ڈیوڑھی سے گدڑا ضروری تھا۔ پٹانگ تلنے

یہ آہستہ آہستہ گئی۔ اور وہاں پہونچنے پر ذرا رکی۔ پھر زن سے دوڑ کر ڈیوٹر می پار کر گئی۔

زمیندار صاحب کی بہو، اور شبیر میاں کی بڑی بھانج زچہ جانے میں تھیں۔ آج کل کنیز انہیں کا کام کرتی تھی۔ ان کی طبیعت میں حکومت بہت تھی۔ بات بات پر کنیز کو ڈانٹا کرتیں۔ اکثر ذرا سی غلطی پر بار بھی پڑ جاتی آج کو، ڈانٹا صاف کرانے کے لئے دیر سے منتظر تھیں، کنیز کو دیکھتے ہی برس پڑیں۔ دوری سے ایک ڈانٹ بتائی۔ خرب آتے آتے ہنچا کھینچ مارا، گھڑا نہ خالی گیا۔ اب کسی دوسرے حربہ کی تلاش ہوئی۔ سکیئے۔ چادریں۔ پاندان۔ پانی سے بھر لوٹا۔ اور شاید لوٹے ہی کی باری آتی۔ مگر جوتیوں پر نگاہ پڑ گئی۔ ایک اٹھا کر کھینچ ماری۔ جو اتفاق سے کنیز پر جا پڑی، اگر سیدھی لگی جاتی تو کنیز کی اور شامت آتی۔ مگر طوفان اب بھی فرو نہیں ہوا تھا۔ اور کونسوں کی بوچھاڑ جاری تھی، اتفاق سے شبیر میاں آگئے۔ اٹھوں نے بھانج کی اس فرعونیت پر وہ چار فقرے کہے جس سے وہ خاموش ہو گئیں، اور کنیز کی جان بچی۔

کنیز نے چپکے سے کوٹھا اٹھالیا، اور صاف کرنے چلی گئی۔ مگر نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوا تھا کہ شبیر میاں اس کو گھور رہے ہیں۔ ایک دفعہ کام کرتے کرتے اس نے دبی نظروں سے پیچھے دیکھا، تو شبیر میاں سے نگاہیں چار ہو گئیں۔ دونوں اضطراب سے مسکرا دئے۔ شبیر میاں فوراً دوسری طرف دیکھنے لگے۔ کنیز نے بھی جھپک کر گردن جھکالی۔

کنیز کے دل میں اب اپنی قدر پیدا ہو گئی۔ شبیر میاں کے میاں اتنی لونڈیاں اور مائیں ہیں۔

باہر نوکریاں چوکیدار ہیں۔ مگر وہ صرف میری ہی طرف داری کرتے ہیں۔ کتنے فخر کی بات ہے؟ رات کو کھانا کھلا کر کنیز جب گھر جانے لگی تو ڈیوٹر می کے قریب پہونچ کر اس کا دل بٹھکا وہ دروازے پر ٹھکی، اور صبح والی ترکیب پر عمل کرنا چاہا۔ مگر نہ جانے کیوں وہ دوڑنے سے باز رہی۔ اور معمولی تیز رفتاری سے ڈیوٹر می کو عبور کرنا چاہا۔ شبیر میاں جو دروازے کی اوٹ میں کھڑے انتظار کر رہے تھے فوراً اس پر بھٹ پڑے۔ اس کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ اور اپنے لب اس کے لبوں پر چھکا تو اس فوری حملہ سے کنیز بدحواس ہو گئی۔ کھانا جو گھڑائے جا رہی تھی ہاتھ سے چھوٹ پڑا۔ شبیر میاں اس کو لے کر اپنے کمرے میں بھاگ گئے۔ کنیز نے ہاتھ پر مارے۔ گر گر لائی۔ برا بھلا کہا۔ چیخنے کی دھمکی دی۔ مگر شبیر میاں

تجربہ کار تھے۔ ان کی گرفت مضبوط تھی۔ علاوہ ازیں بے پناہ انہماک محبت، اور گرا گرم بوسوں سے انہوں نے اس کی قوت ارادی کو کمزور کر دیا۔ کنیز کے جسم میں برقی لہر دوڑ گئی۔ انجام کی تصویر دماغ کے سامنے دھندلی ہو گئی۔ اس نے اضطراب آخری جدوجہد کرنا چاہی۔ مگر بے سود۔ وقت گزر چکا تھا شراب کا ایک نشہ رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا رفتہ رفتہ سرور و نشاط کا جسم و دماغ پر راج ہو گیا، اور پھر اس نے خوشی خوشی اپنے کو طوفانی لہروں میں چھوڑ دیا۔

— (۲) —

اس واقعہ کو ڈیڑھ مہینہ گزر گیا۔ شبیر میاں کی چھٹیاں ختم ہو گئیں، اور کالج مکمل کیا۔ انہوں نے مختلف بہانوں سے ایک ایک دن اور دو دن دیر کرنا شروع کر دی۔ ان کے والد دوسرے زمینداروں کی طرح معاملات سے بے خبر نہیں رہتے تھے۔ اس لئے شبیر میاں کے لئے یہ ناممکن تھا کہ ان کو کسی قسم کا دھوکا دیتے۔ وہ ایک دن تو وہ شبیر میاں کو طرح دیتے رہے۔ اور پھر انہوں نے شبیر میاں کو کوچ کا حکم سنایا۔ اسی رات کو کنیز شبیر میاں سے احاطے کے چھوڑے ایک جگہ پر جو پہلے سے مقرر کر لی تھی ملنے لگی۔ شبیر میاں بہت پہلے سے انتظار میں بیٹھے تھے۔ اس کو دیکھ کر آہستہ سے بولے

”کنیز یا“

”جی“

پھر کنیز نے پوٹی ایک کنارے رکھ دی، اور شبیر میاں سے بھر کر بیٹھ گئی۔ اور بولی

”بھئی ایک نشانی اپنے پاس رکھئے گا؟“

”کیوں نہیں“

کنیز نے ایک رومال شبیر میاں کے ہاتھ میں دیا۔

کنیز - ”آپ کے قابل تو نہیں ہے“

شبیر میاں نے غور سے رومال دیکھا۔ معمولی نین مک کا بنا ہوا رومال تھا جس پر انگریزی میں بتوا سا ”شبیر“ سرخ ریشم سے لکھا ہوا تھا۔ شبیر تھوڑی دیر تک اس کو چاند کی روشنی میں جو درخت سے جھنک کر

ہلکی ہلکی آ رہی تھی دیکھتے رہے۔ اور پھر بولے

”تو یہ تم نے بنایا۔“

”میں کیا بناتی؟ جی تو یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح سے خود بنانا سیکھ کر بناتی۔ مگر لونڈیوں کو کام دھندو

سے کہاں اتنی چٹھی — بنوایا ہے۔“

”بنوایا ہے! لمیں!!“

”جی۔“

”کس سے؟“

”آپ کو اس سے کیا مطلب؟ جس سے بنوایا ہے وہ کسی سے کہے گا نہیں۔“

”تو بڑی گدھی ہے۔ بچی کس کی۔ لونڈی پھر لونڈی۔ تجھے میری عزت کی ذرا پروا نہیں۔“

کنیز ذرا آبدیدہ ہو کر بولی

”دوسرے گاؤں میں بنوایا ہے۔ بنانے والے کو معلوم بھی نہیں کس کے لئے بنوایا — نہیں

لیجئے گا؟“

کنیز شبیر میاں کی محبت میں سرشار تھی۔ اس کے چہرے نہیں چھپتی۔ اکثر دوسروں کے سامنے ایسی

حرکتیں کر بیٹھتی کہ اگر ان کو کوئی مذاخیال سے دیکھے تو ان دونوں کے تعلقات پر شک کرنے لگے۔ شبیر میاں کنیز

کی ایسے حرکات پر بہت چراغ پا ہوتے اور انہی کے خیال سے کنیز اپنے کو امکان بھر سمجھالے کھتی۔ کنیز رفتہ

رفتہ اپنے تعلقات کے غیر رسمی ہونے کو بھول گئی تھی، ہاں، اگر کبھی شبیر میاں کی شادی کا تذکرہ آتا۔ یا کوئی بڑا،

بڑھا شبیر میاں کو دعا دیتا ”اللہ کرے شادی میاں ہو“ تو کنیز کا دل کرٹھو جاتا۔ اور اس وقت اس کو اپنے

تعلقات کی ناپائیداری کا احساس ہوتا۔ مگر پھر شبیر میاں سے ملاقات ہوتے ہی اس کو بھول جاتی۔ اس محبت

کے کھیل نے اس کی زندگی میں لذت پیدا کر دی تھی۔ جس کی وجہ سے رنج اس کے دل میں ٹہر ہی نہیں پاتا۔

شبیر میاں نے آخر کنیز کے جذبات کا خیال کر کے رومال جیب میں رکھ لیا، اور پھر بولے۔

”کل صبح کو میں روانہ ہو جاؤں گا۔“

”پھر اب کیا ہو گا“

”تو بھی کسی بچوں کی ایسی باتیں کرتی ہے۔ ہو گا کیا؟ میں دسمبر کی جہیوں میں پھر آؤں گا۔“
کنیز تھوڑی دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ شبیر میاں نے جب کچھ ڈھارس دینے کی کوشش کی تو وہ ان کے سینہ پر سر رکھ کر رونے لگی اور ان کے سمجھانے سے کسی طرح نہیں چپ ہوتی۔ بڑی مشکلوں سے انھوں نے سمجھا بھگا کر ڈانٹ ڈپٹ کر اور صبح پھر رٹنے کا وعدہ کر کے اس کو گھر بھیج دیا۔

شبیر میان دہاں سے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے پاس کے تالاب کے پاس چلے گئے۔ یہاں مینڈک جھینگروں کے صحن سے آواز ملا کر غائیں غائیں کر رہے تھے۔ کچڑ اور مٹی کی گھاس کی بو ہوا میں پھیلی ہوئی تھی۔ ساتویں تاریخ کا چاند غروب کے قریب تھا۔ درختوں کے سایہ لمبے ہو گئے تھے، اور روشنی بھی مدہم تھی۔ اس منظر نے شبیر میاں کے دل کو ذرا سکون دیا۔ ان کی طبیعت بہت پیچیدہ تھی۔ سرور کا دور گزر چکا تھا، اب خمار کا وقت تھا۔ کچھ کنیز کی بے بسی۔ کچھ اپنی عزت آبرو کا ڈر، سب سے زیادہ بدمزاج باپ کی ناراضگی کا خطرہ ان کے دل میں بھجان مجھے تھا ان کو اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا۔ اور یہ جانتے تھے کہ اپنے قصور کا بانی کسی اور کو قرار دیں۔ اس وقت ان کو اپنے چھوٹے بھائی کی اتنا یاد آ رہی تھی جو دو سال پہلے انکی زندگی کا بہت اہم جز بن گئی تھی۔ اور اس کے چلتے دو پران کی معصومیت بھینٹ ہوئی تھی۔ یہ اپنا سارا قصور اسی کے سر منڈھنے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد کبھی کبھی ہوا چلنے لگی، دور سے کوئل کی آواز آرہی تھی۔ شبیر میاں کے دل میں گداز پیدا ہونے لگا۔ انھوں نے جیب سے رومال نکال کر دیکھا۔ کنیز کی محبت عود کر آئی۔ اور یہ سوچنے لگے۔ کہ درحقیقت تمام تصویک زمرے دار میری کنیز سے محبت تھی۔ اس محبت کا انجام یہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ کیا میں کنیز کی شادی کر لیتا؟ یہی محبت سو وہ اب بھی میرے دل میں باقی ہے۔ شبیر میاں نے رومال چوما۔ سینہ سے لگا لیا۔ اور پھر کنیز کے ساتھ وفادار رہنے کا وعدہ کیا۔

صبح کنیز بہت سویرے اٹھ کر شبیر میاں کے کمرے میں گئی۔ مگر وہ کمرے میں موجود نہیں تھے۔ اس کو

بہت حیرت ہوئی۔ ڈیڑھ مہینہ کے اندر یہ پہلا واقعہ تھا کہ انھوں نے وعدہ خلافی کی تھی۔ کیوں نہیں آئے؟ کیا بات ہے؟ کیا رومال کے معاملہ میں برا مان گئے۔

شبیر میاں اس ڈر سے نہیں آئے تھے کہ شاید پھر کنیز رونے دھونے لگے یا کوئی ایسی طاقت کر بیٹھے جس سے ان کی اخفاکی ماری کوششیں خاک میں مل جائیں۔ کنیز تھوڑی دیر تک انتظار کرتی رہی اور پھر افسردہ دل گھر کے اندر چلی گئی۔

دس بجے شبیر میاں سامان و امان درست کر کے روانہ ہونے لگے۔ ماں، بھاج کو سلام کیا۔ چٹائی ہوئی، نگاہ کنیز پر ڈالی جو کھینچے سے لگی کھڑی ہوئی تھی۔ اور پھر باہر چلے گئے۔ کنیز آنکھ بچا کر ایک کوشٹری میں گھس گئی اور رو کر خوب دل کی بھڑاس نکالی۔

اب اس نے دسمبر کی چھٹیوں کا انتظار شروع کیا۔ ایک دن سے دوسرا دن ہوا۔ پھر ایک ہفتہ سے دوسرا ہفتہ۔ ایک مہینہ ہوا، پھر دوسرا مہینہ شروع ہوا، اور یوں ہی زندگی کٹنے لگی۔ وہی روزمرہ کا کام۔ بیسیوں کی ڈانٹ لونڈیوں، ماماؤں کے طعن تشنیع۔ صبح کام کرنے آنا، اور رات کو گھر واپس چلا جانا۔ پہلے اسی زندگی کی عادی تھی اس لئے احساس بھی نہیں تھا۔ مگر اب ایک بار زندگی کی لذت اٹھا چکی تھی اس کو ایسا معلوم ہوتا کہ جنت میں داخل کی گئی، اور پھر نکال کر پینک دی گئی۔ اب کام بھی خراب کرنے لگی تھی، اس لئے بیسیوں کی توجہ بھی اس کی طرف سے ہٹ گئی۔

دو مہینہ کے بعد اس کی صحت میں نمایاں تغیر ہونے لگا۔ دبی ہو گئی۔ چہرے پر زردی آگئی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ طعنے پڑ گئے۔ جو اس کو دیکھتا تو کہتا کہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ یہ چپ ہو رہی۔ ایک مہینہ اور گزرا، اب ماں باپ کو اس کی بیماری کی طرف توجہ ہوئی۔ کنیز کا نکاح تو دو سال پہلے ہو چکا تھا، ان لوگوں نے بیماری کا رنگ بھانپ کر خستی کے لئے سلسلہ جنابی کی۔ کنیز کی سسرال دلے راضی ہو گئے۔ مگر انھوں نے پانچ مہینہ کی مہلت چاہی۔ اور گیہوں کی فصل کٹنے پر خستی کی تاریخ مقرر کی۔ اور بعد خستی کرنے پر اصرار ہوا۔ جس کو ان لوگوں نے بالکل نا منظور کر دیا ایک مہینہ اور گزرا، اور ماں باپ کی تشویش بہت بڑھ گئی ہر ایک سے کہنے لگے کنیز یا کو جلد مگر بیدار ہو گئی ہے۔ جب لوگوں نے دائے دی کہ گاؤں کے ویدیج کو

دکھادو۔ یا کوس بھر پر اسپتال ہے وہاں لے جاؤ تو ان دونوں نے ہال دیا ہاں گنڈا تعویذ کرنے لگے۔ دو ایک دوائیاں بھی کھلائیں۔ آنے والی مصیبت بانجھیں چڑھائے اپنے دانت دکھا رہی تھی۔ مگر یہ دونوں اپنے کو دھوکے ہی میں رکھنا پسند کرتے تھے۔

کنیز کے لئے سب طرح مصیبت تھی۔ ماں طعن تشنیع کرتی۔ باپ منہ سے سیدی طرح بات نہ کرتا اگر دونوں میں سے کبھی کوئی ہمدردی دکھاتا تو اس طرح کہ کنیز شرمندہ ہو جاتی۔ زمیندار صاحب کے یہاں ڈانٹ اور ماراں دونوں زیادہ ہو گئی تھی۔ ہاں اگر کوئی غمگن تھا تو بغاٹن، اس نے دو ایک دوائیاں بھی لاکر چپے چپکے کھلائیں۔

کنیز اب خوش تھی، کیونکہ دسمبر کی چھٹیاں قریب آرہی تھیں۔ شبیر میاں آنے والے تھے، ان کے یقین تھا کہ ان کے آتے ہی کنیز اکثر لوگوں سے پوچھا کرتی کہ چھٹیاں کب شروع ہوں گی۔ اور کب تک میں گی۔ رفتہ رفتہ چھٹیاں آ گئیں۔ مگر کنیز کو حیرت تھی کہ شبیر میاں کی ماں اور بھانجی ابکی خلاف معمول ان کے آنے کا استغفار نہیں کر رہی ہیں۔ اس وجہ کو پیسے سے اس نے سمجھا ہی نہیں چاہا جب دن گزرتے گئے، اور شبیر میاں نہ آئے، تب یہ سمجھتی گئی، اور اس کا دل اندر ہی اندر ٹوٹا گیا آخر ایک دن شبیر میاں کی ماں سے تصدیق ہو گئی۔ وہ کسی کو بتا رہی تھیں کہ ”ابھی ہم لوگوں نے شبیر میاں کو نکھاسے کہ یہاں نہ آؤ۔ بلکہ اپنی بہن کے یہاں ہواؤ“

کنیز اب بہت بیمار رہنے لگی۔ زمیندار صاحب کی بیوی نے اس کی ماں کو بلا کر پانچ روپیہ لئے اور کہا کہ کنیز کا علاج کرو اور جب تک اچھی نہ ہو جائے کام کاج کے لئے نہ بھیجو۔ کنیز اب گھر میں بے کار پڑی رہی۔ کبھی کبھی دو ایک چھوٹے چھوٹے کام کر دیتی۔ اور اس کی جلدھر کی بیماری روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ ماں سب دیکھتی تھی سمجھتی تھی۔ اور ترس کھا کر چپ ہو جاتی تھی۔ باپ اکثر جلا اٹھتا تھا۔

”کبھی بڑے گھروں میں لڑکی نوکر نہ رکھائے“

ایک دن رات کو کنیز کے ماں باپ، اپنے خیال میں اس کو سوتا پا کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔

ماں۔ ”بسیا کے یہاں چلے چلو۔ بہت دن سے ہم لوگ وہاں نہیں گئے ہیں“

باپ - ”کھا خراب قسمت ہے؟ کھیتی کو دیکھوں؟ کیا کروں؟“

ماں - ”تم پہنچ کر چلے آنا“

باپ - ”کنیز جانے کے بھی قابل ہے؟“

ماں - ”جلے گی نہیں تو کیا کرے گی۔ بد نصیب کہیں کی؟“

باپ - ”منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا“

کنیز سب سن رہی تھی۔ اس نے اسی وقت طے کر لیا کہ کچھ ہوا اپنے ناپاک وجود کو ماں باپ کے مکان سے ہٹا لیجاؤں، کہاں جاؤں گی؟ نہ اس نے یہ سوال سوچا، اور نہ سوچ سکتی تھی۔ رات بھر گئی رہی جب اس کے خیال میں دو تین گھنٹہ رات رہ گئی، چپکے سے اٹھی اور کوٹھری میں چلی گئی۔ وہاں جلانے کی ٹکڑیاں اور کندھے کے دھیرے تھے۔ اس نے ان کو ایک کونے میں ہٹا دیا۔ اور ٹٹول کر ایک چھوٹی سی ہانڈی نکالی۔ اس میں سے شبیر میاں کا دیا ہوا ہار نکالا۔ اور گلے میں پہن لیا۔ اور پھر چپکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

کنیز کو وقت کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ درحقیقت صبح ہو گئی تھی۔ اور لوگ میلوں کو لیے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے ان میں سے ایک نے کنیز کو دیکھا، اور پہچان کر کہا۔

”کہاں جا رہی ہے کنیز؟“

کنیز گھبراتی، ہچکچاتی۔ پھر بولی۔

”ویدجی کے یہاں۔ ابا کی طبیعت بہت خراب ہے“

”ویدجی اور کھان؟“ تالاب پار جا“

کنیز اسی طرف مڑ گئی۔ اس کے لئے تو سب ستیں یکساں تھیں۔ تھوڑی دور جا کر اس نے خیال کیا کہ صبح تو ہو گئی تالاب پار بہت سے جانتے والے مل جائیں گے۔ اس لئے پہلے ہی والا راستہ بہتر ہے۔ گھومے ہی وہ پٹی دیکھا کہ ان کا راہبر کھڑا دیکھ رہا ہے۔ نہ معلوم راستہ بتانے کے لئے، یا کنیز کا ارادہ دریافت کرنے کے لئے۔ مجبوراً وہ اسی سمت چلی۔ کچھ دور جا کر اس کے ”علی ادی چچا“ آتے دکھائی دیے۔ اس نے فوراً راستہ بدل دیا، اور پگڈنڈی چھوڑ، شرک پر نکل گئی۔ اور صر سے ہیل گاڑی آرہی تھی۔ گاڑی کا پردہ چھوٹا ہوا

صرف ایک کونہ اٹھا ہوا تھا۔ گاڑی خیراتی ہانک رہا تھا جو کنیز کے ساتھ لاکھیلہا ہوا تھا۔ کنیز نے سونچا کہ اس کو درست بنانا چاہئے۔ قریب جا کر خوشامد سے کہنے لگی۔

”خیراتی سڑک کو جا رہا ہے؟ مجھے بھی اپنے ساتھ لیتا چلتا ہے۔“
”کہاں جائے گی؟“

”خالدہ کے پاس۔ اپنا علاج کرانے۔“
”اکیلی؟“

”ہوں۔“

خیراتی معنی خیز تبسم سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اور بولا
”ہوں! ہوں ہوں۔“

کنیز کھسیا کر بولی

”اگر لیجانا ہو تو ویسا کہ۔ نہیں تو میں خود چلی جاؤں گی۔“

کنیز اس لئے اور گھبرا گئی تھی کہ اس کے علی الدی چچا قریب آرہے تھے۔ بارے خیراتی اس کو گھبراایا
ہوا دیکھ کر ترس کھا گیا، اور بولا
”بیٹھ جا۔“

کنیز علی الدی چچا سے آڑ میں ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئی اور پردہ چھوڑ دیا۔ گاڑی کچی سڑک پر کھسکھسرتی ہوئی چلنے لگی۔ علی الدی چچا برابر سے گزرتے۔ کنیز کے دل کو اطمینان ہوا اور وہ گاڑی کے ہچکچولوں سے مزہ لینے لگی۔ زندگی میں صرف تین چار بار گاڑی پر بیٹھی تھی۔ مگر کسی مرتبہ اس طرح نہیں کہ پوری گاڑی اسی کے لئے وقف ہو۔ کنیز آرام اور اطمینان پا کر گاڑی میں لیٹ گئی، اور پردے کا ایک کونہ اٹھا کر جھانکنے لگی۔ خیراتی پوری آواز سے تانیں اڑا رہا تھا۔

”مٹ نہ جائے درد دل۔ مٹ نہ جائے درد دل۔“

گاڑی سڑک چھوڑ ایک باغ کے بیچ سے گزری۔ اور اس کے بعد ایسے راستہ سے چلنے لگی جس کے

دونوں طرف بہت اونچے پتار کے جھنڈ کھڑے تھے۔ کنیز بچن میں گاؤں کے ہر حصہ میں گھوم چکی تھی۔ اس لئے اس کو تعجب ہوا کہ خیراتی کدھر جا رہا ہے۔ اور بولی

”کدھر جا رہا؟“

خیراتی بدستور تائیں مار رہا تھا

”درد دل ہو، بھئی درد دل“

گفتگو کی گنجائش نہ پا کر کنیز خاموش ہو گئی۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی، اس لئے لیٹے لیٹے آنکھ لگ گئی۔ مگر تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ اس کو ایک طرح کی بھینسی محسوس ہوئی، اور آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو گاڑی ہی کے مکان کے دروازے پر کھڑی ہے۔ اور خیراتی اس کے ماں باپ سے باتیں کر رہا ہے۔

خیراتی۔ ”اترئیے بیگم صاحبہ۔ سڑک آگئی یہ“

باپ۔ ڈانٹ کر بولا۔ کنزیا۔ اُتر۔۔۔۔۔

کنز ڈر سے کانپتی ہوئی اتری۔ اترتے ہی باپ نے ایک گھونسا مارا۔ اور پھر ایک لکڑی اٹھا کر چار پانچ ضربیں لگائیں۔ کنیز دروازے سے گذر کر صحن میں گر پڑی۔ باپ نے اب ایک لات رسید کی، پھر بھی غصہ کم نہیں ہوا۔ برابر گالیاں دے جا رہا تھا۔ آخر ماں کو رحم آگیا اور بولی۔

”کیا مار ڈالو گے وہ غریب کیا کرتی تم ہی نے اس کی زندگی و ماں کر دی تھی۔ زمیندار کے گھر میں

نہ کر رہ کر آج تک کوئی لڑکی بچی ہے۔ ابھی پارسال جھنڈو کی بیوہ کے بچہ ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔“

”چپ۔ بڑ بڑکے جاتی ہے۔ میں گاؤں میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔“

پاس پڑوس کے مرد، اور عورتیں اکڑ جمع ہو گئیں۔ قصہ ان لوگوں کو خیراتی سے معلوم ہو گیا تھا اور جو کچھ باقی بچا، وہ ماں باپ کی لڑائی سے کھل گیا۔ ہر ایک اپنی سی کہنے لگا۔

”بڑا کیا۔“

”بڑا کیا۔“

”بڑا ہوا۔“

”کہاں گئی تھی؟“

”گئی ہی کیوں تھی؟ کوئی نکال رہا تھا۔“

”بجاری غیرت دار ہے۔“

”پہلے سے سوچ لیتی۔“

ماں باپ کا بُرا حال، سب کے سامنے دکھڑا رہے تھے۔ ایک عورت بولی۔

”ایسی باتیں غریبوں کے گھر ہو جاتی ہیں۔“

دوسری عورت۔ ”عزت آبرو بڑے لوگوں کی باتیں ہیں۔“

غل شور سنکر زمیندار صاحب کے گھر سے بغاٹن خبر لینے آئی۔ اور کنیز کے باپ سے پوچھنے لگی۔

”کیا بات ہے؟“

”کیا بتاؤں؟ شبیریاں نے ہم لوگوں کی عزت لے لی۔ اور اس حرام زادی کو تو کسی کام کا نہ رکھا۔
یہ سنتے ہی دو تین آدمی بول اُٹھے۔

”ہائیں ہائیں۔ کسی کا نام کیوں لیتے ہو؟“

”کیا کہہ رہے ہو۔ کیا کہہ رہے ہو؟“

”کسی کا نام کیوں لو۔ اپنی قسمت کو کہو۔ قسمت کو۔“

”اے اپنا نکھا۔“

ایک بڑھیا نے بغاٹن کے پاس جا کر کہا۔

”یہ نہ کہہ دینا کہ کسی کا نام لیا۔ کیا فائدہ؟ جو ہونا تھا ہو چکا۔“

دوسری عورت۔ ”زمیندار صاحب کو خفا کر کے گاؤں میں رہنا ہو گا کیسے۔“

تیسری۔ ”دریاں رہ کر گھر چھپتے ہیں۔“

بغاٹن چپکے چپکے جلی گئی۔ جو جمع ہو گئے تھے وہ بھی ایک ایک دودو کر کے رخصت ہونے لگے۔ دو عورتیں

ٹہر گئیں۔ انہوں نے کنیز کو من سے اٹھایا جو ابھی تک منہ ڈھکے، بے گل بڑی رو رہی تھی۔ اور اس کو لیجا کر پلنگ پر

لٹایا۔ چٹیں بہت بے جگہ لگیں تھیں۔ خوب سینکا گیا۔ ہلدی جو نالٹا گیا گیا۔ مگر کنیز کی بچپنی میں کچھ کی نہیں ہوتی۔ اکثر وہ بڑی زور سے چیخ اٹھتی۔ ان عورتوں کے کچھ سمجھ میں آیا۔ کچھ نہیں سمجھ میں آیا۔ مگر جو بن پڑا کرتی رہیں۔ آخر تین سببے آٹھ مہینہ کا چھوٹا سا بچہ پیدا ہوا۔

چار روز کے بعد کنیز کے ماں باپ گھر نمبر چھوڑ کر صبح تڑپ کے کنیز کو لیکر گاؤں سے چلے، اور یہ ارادہ کیا کہ کنیز کو مصلحتاً کچھ دنوں کے لئے اس کی خالہ کے پاس پہنچا دینا چاہئے۔ پھر جیسا رنگ ہو دیا کیا جائے گا کیونکہ اس کی رخصتی کی طرف سے تو اب بالکل مایوسی ہی ہو چکی تھی اور زمیندار صاحب نے بھی اعلان کر دیا تھا کہ میں اسی خراب عورت کو گھر میں نہیں آنے دوں گا۔ سورج نکلے نکلے یہ لوگ ایک کوس نکل گئے۔ وہاں کسی شاہ صاحب کا مزار تھا ان لوگوں نے جا کر دوپہ چڑھائے۔ ایک بابا جی بیٹھے تھے، دعائیں دینے لگے۔ ان کی نگاہ کنیز پر پڑی دیکھا تو ایک نوجوان عورت گلے میں شیشے کا سرخ ہار پہنے۔ گود میں ایک لڑکائے کھڑی ہے۔ دوپٹہ منہ کی طرف گھونٹھ کی طرح لٹکا ہوا ہے۔ بابا جی اس کی طرف دیکھ کر۔ کنیز کے باپ سے کہنے لگے۔

”پوتا ہے کہ تو اسے؟“

کنیز بغیرت کے مارے کٹ گئی۔ اور اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ بابا جی اس شرم سے نتیجہ افذ کر کے بولے۔

”پوتا ہے۔ اللہ اچھا رکھے۔ لکھا کر دای دادا کا پیٹ بھرے“

تینوں مسافروں میں سناٹا چھا گیا، اور وہاں سے خاموش چل کھڑے ہوئے۔

پندرہ دن بعد جب کنیز کے ماں باپ کنیز کو پہنچا کر واپس ہوئے تو یہاں آتے ہی معلوم ہوا زمیندار صاحب کے یہاں شادی کے سامان ہو رہے ہیں۔ شبیر میاں کو قسمتوں سے بڑی المدار بیوی مل رہی ہے۔ یہ دونوں ٹھنڈی نسلیں بھر کر گھر چلے گئے۔



کانگریس کی پچاس سالہ جوبلی

۲۰ برس پہلے کانگریس کی زندگی کے پچاس سال پورے ہوئے۔ اس موقع پر ملک کے تقریباً

تمام تہذیب اور برصغیر میں جلوس نکالے گئے اور ہندوستان کے بھٹے کو سلام دی گئی۔ اس تقریب میں ہندوستان کی آبادی کی کافی کثیر تعداد شریک ہوئی اور ملک کے پڑھتے لکھتے اور دہندہ لوگوں کی ایک بڑی جماعت نے جسے ہندوستان کی ترقی اور سیاسی زندگی کا بطور پرستار کہا جاسکتا ہے اس جشن جوبلی کو کامیاب بنانے میں تقریریں تحریر اور اجتماع کے ذریعہ پوری سرگرمی کے ساتھ کوشش کی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کانگریس کیا چیز ہے جس کی پچاسویں گولڈن جوبلی کے لئے اس قدر شور و ہنگامہ برپا کرنا سبب سمجھا گیا۔ کانگریس ایک ایسے ادارے کا نام ہے جو ایک زندہ اور ترقی پذیر تحریک کو چلا رہا ہے۔ اس کی بنا چند مغزوفات پر

رکھی گئی ہے جو شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے چلانے والوں کے ذہن میں ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ ان میں سب اہم مغزوفہ یہ ہے کہ اس قوم میں جسے انگریزوں نے اپنی سہولت کے لئے ایک واحد حکومت قرار دے رکھا ہے اور جس کا سیاسی نام انھوں نے ہندوستان قرار دیا ہے دراصل ایک ہی قوم آباد ہے جس کے اغراض و مقاصد مشترک ہیں اور جو متحد ہو کر اپنی فلاح و بہبود کے لئے کوشش کرنا چاہتی ہے۔ افغان، بلوچ، پنجابی، سندھی، بنگالی، گجراتی اور مدرسی جو دور دراز علاقوں میں رہتے ہیں ان کے آپس کے فرق، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور دوسرے مذہبوں کے اختلافات، ہندی، امرتھی، اُردو، بنگالی، تامل، تملیگو وغیرہ بولنے والوں کی باہمی بریگائی، زمیندار اور کسان، سرمایہ دار اور مزدور، شہری اور دیہاتی کی تفریق — یہ سب چیزیں غیر اہم اور ناقابل التفات ہیں بنیادی طور پر ہندوستان کے بسنے والے ایک ہیں۔ ان میں قومی وحدت کا احساس پایا جاتا ہے۔ ان کی شکایتیں اور محرومیاں یکساں، ان کی تمنائیں اور حوصلے مشترک، ان کے اغراض و مقاصد ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ یہ سب ملکی ہیں اور انگریز غیر ملکیوں سے ان کا ہر قدم پر تھا دم ہے کیوں کہ انگریزوں کے ہندوستان پر قبضہ کرنے سے اعلیٰ فوجی اور مدنی عہدے ہندوستانیوں کے ہاتھ سے چھین گئے۔ ملک کی تجارت اور صنعت برباد ہو گئی، زراعت پر محصول کا بار اس قدر بڑھا کہ کسانوں کی حالت گھٹتی ہو گئی اور ان کی قوت مدافعت اس قدر کم ہوئی کہ ذرا سی بدحالی کے مقابلہ

کی بھی سکتا ان میں باقی ندرہا غیر ملکی تہذیب، زبان، مذہب اور تعلیم کو فروغ ہوا۔ ملکی علوم اور تمدن کو زوال ہوا۔ ملک کے رہنے والے ذلیل اور خوار ہو گئے۔ حکومت کے اقتدار کی ایسا ناجائز فائدہ اٹھایا گیا کہ برسے برس ہندوستانی بھی ایک چھوٹے سے چھوٹے انگریز کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو گیا۔ تو انہی کی سخت گیری نے تقریر، تحریر اور اجتماع کی آزادی سلب کر لی۔

ہندوستان اور اسلحہ رکھنا ممنوع قرار دیا گیا۔ غرضکہ زندگی کے بیشتر حقوق چھین لئے گئے جن کے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے ہر ہندوستانی انفرادی طور پر تڑپا کرنے لگا۔ اس انفرادی تڑپ کو اجتماعی شکل و تنظیم دینے کے لئے ایک سیاسی جماعت کا نگہبیس کے نام سے ۱۸۸۵ء میں قائم کی گئی۔ اس جماعت نے پچاس سال تک مسلسل اپنی بدوجہد کو جاری رکھا ہے۔ اس نے اپنا کام (اگر ابتدائی دو تین سالوں کو نظر انداز کر دیا جائے) حکومت کی سرسپتی سے نہیں بلکہ اس سے آزاد رہ کر اور اس کی مخالفت کے باوجود اپنی ذاتی کوشش سے چلایا ہے۔ اپنے مقصد کے حصول میں یہ ابھی تک ناکام ہے لیکن اس جماعت کے رہنماؤں کا خیال ہے کہ وہ اپنی منزل مقصود کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں۔ کچھ حصہ سے اس کا سطح نظر موجودہ غیر ملکی حکومت کو ختم کرنا اور اس کی جگہ ملکی اور نمایندہ حرز کی حکومت کو قائم کرنا ہو گیا ہے۔ یہ نصب العین اس کے سامنے اپنے قیام کی ابتدا سے ہی واضح شکل میں موجود نہ تھا۔ پہلے اس کے مطالبات بہت کم اور نرم تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے حوصلے بڑھتے گئے ہیں اور اب اس نے مکمل آزادی کو اپنا مقصد قرار دے لیا ہے۔ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جو طریقے اس نے مقرر کئے ان میں بھی رفتہ رفتہ تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ پہلے عرضی اور ڈیپوٹیشن کے ذریعہ حکومت ہند اور حکومت انگلستان کو اپنے مطالبات کی طرف متوجہ کیا جاتا تھا اور ان کی فیاضی اور انصاف پسندی سے اصلاحات کے ملنے کی امید کی جاتی تھی۔ لیکن اب حکومت کے فوائد کو مانگنا بنا کر انگلستان کو صلح کی شرائط کے لئے مجبور کرنے کا حوصلہ کیا جانے لگا ہے۔ پہلے یہ تحریک چند اعلیٰ انگریزی تعلیم حاصل کئے ہوئے لوگوں تک محدود تھی جنہوں نے یورپ کی آزاد اور آئینی حکومتوں کا مطالعہ کیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ تحریک پھیل کر کم علم اور بے علم لوگوں میں بھی پہنچ گئی ہے۔ پہلے مزدوروں اور کسانوں کی شکایتوں کی ترجمانی چند خود ساختہ نمائندے کرتے تھے اب ان کے صحیح نمائندے بھی سامنے آنے لگے ہیں اور ایسے آئین و دستور کے خاکے بنائے جاتے ہیں جن میں ان کے حقوق کی پوری نگہداشت ہو سکے

گی۔ کانگریس کی یہ ترقی بہت سے لوگوں کے لئے نہایت قابل اطمینان نظر آتی ہے۔ لیکن جب اس کا مقابلہ دوسرے ملکوں کی ترقی سے کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی رفتار کس درجہ پرست ہے۔ امریکہ، جرمنی، اٹلی، جاپان، روس، کنیڈا، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ، نیوزیلینڈ کی پچاس سال پہلے کی حالت کا جب ان کی موجودہ حالت سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ دوسرے ملکوں کو مقابلہ میں ہندوستان کی رفتار کس قدر پرست ہے اور اس وقت اطمینان کی جگہ رنج و افسوس کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستان نے نصف صدی یونہی باتوں میں گنوا دی اور جو کام کرنے کا تھا وہ ابھی تک پورا نہ ہو سکا۔

مگر اس قسم کی سخت رائے کا اظہار شدت کے ساتھ اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب یہاں کے مخصوص حالات کو غیر معمولی نہ سمجھا جائے۔ جو لوگ یہاں کے موانع اور دشواریوں کو اسی ملک کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں ان کی نگاہ میں کانگریس کی کارگزاریاں کسی طرح حقیر نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انگریزوں نے اس وسیع علاقہ کو جو آج ہندوستان میں شامل ہے رفتہ رفتہ مختلف حکمرانوں سے حاصل کیا تو اس میں کسی قسم کا کوئی ایسا قریبی رشتہ اتحاد نہیں پایا جاتا تھا جو از خود اسے ایک سیاسی وحدت عطا کر سکتا۔ ذرائع آمد و رفت اور وسائل خبر رسانی کی خامیوں کی وجہ سے آبادی کا بیشتر حصہ صرف ایک محدود علاقہ سے معاشرتی، تجارتی اور سیاسی تعلقات پیدا کر سکتا تھا۔ اکثر علاقے بلکہ چھوٹے چھوٹے گاؤں اپنی معاشی اور اجتماعی ضروریات کے لئے کسی دوسرے کے محتاج نہ ہوتے تھے۔ ان کی آبادی کے اکثر افراد کی دنیا اپنے گاؤں یا اس پاس کے مین بچیس گاؤں تک محدود ہوتی تھی۔ اس مختصر دنیا کے باہر دوسرے علاقوں کے معاملات سے انھیں بہت کم سروکار ہوتا تھا۔ تمام ہندو سوسائٹی ذات پات کے ایک تدبیر کی نظام میں بندھی ہوئی تھی۔ چار بڑی ذاتیں تھیں جن میں ہزاروں اور نئی شاخیں پیدا ہو گئی تھیں۔

برہمن، کستری اور ویش کی دنیا شدت کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہوتی تھی۔ پھر برہمنوں، کستریوں اور ویشوں کے بعض مختلف مدارج تھے۔ ادنیٰ درجے کے شہر میں رہنے والے برہمن علم حاصل کرنے یا تارادشمن کے لئے اور راجہ ہماراجوں کے ساتھ دور دراز کا سفر کرتے تھے۔ فوج میں لڑنے والے کستریوں کو بھی جنگ کی وجہ سے ایک وسیع رقبہ اور کثیر آبادی سے واقفیت ہو جاتی تھی۔ قیمتی مال کی تجارت کرنے والے ویش بھی

نفع کی تلاش میں بہت سے علاقوں میں گھومتے تھے۔ لیکن اس اعتبار سے سب سے زیادہ سفر کرنے والے بیراگی اور مہاتما ہوتے تھے جو گھر بار کو چھوڑ کر سنیاں لے لیتے تھے اور خانہ بدوشی کی حالت میں مکان اور غذا کی فکر سے آزاد، جان و مال سے بے پروا، رہنروں اور ڈاکوؤں سے نڈر ہو کر پاسبانہ جدھر چاہتے تھے گھومتے پھرتے تھے۔ ان سفر کرنے والے لوگوں کی وجہ سے زندگی میں ایک طرح کی وحدت پیدا ہوتی تھی لیکن اس کا اثر، وسعت اور گہرائی دونوں لحاظ سے، بہت محدود تھا۔ کیونکہ سنیاں، ویش اور ایک حد تک برہمن بھی ایک طرح کی بین الاقوامی آبادی ہوتے تھے اور دو علاقوں میں ان کے باہمی تعلقات کی وجہ سے کسی سیاسی وحدت کا پیدا ہونا لازمی نہ تھا۔ کشتری لڑائی کے میدان میں مخالفت کے لئے ہی ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ پھر چوتھویں بہت وحدت ان سب کی وجہ سے پیدا بھی ہوتی تھی وہ مسلمانوں کے اقتدار کے بڑھنے سے ختم ہو گئی۔ کیونکہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ان لوگوں کی معرفت کتنی قسم کا رشتہ اتحاد پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ گو منتشر مسلمانوں میں باہمی وحدت پیدا کرنے کے لئے علماء، رؤس اور تاجر، ذات پات کی تفریق نہ ہونے کی وجہ سے نسبتاً زیادہ کامیاب رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں گزشتہ صدی کی ایک مثال پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ سترہویں کے آس پاس سکھوں کے مذہبی مظالم کے خلاف جہاد کرنے کے لئے مجاہدین کی جو جماعت حضرت سید احمد صاحب بریلوی کی سرکردگی میں یو۔ پی۔ دہلی، راجپوتانہ، سندھ، بلوچستان اور سرحدی صوبہ کا دورہ کرتی ہوئی پنجاب پر حملہ آور ہوئی، اس کا خیر مقدم مسلمانوں نے ہر جگہ اپنی قومی فوج سمجھ کر کیا۔ یہ جماعت اللہ پر توکل کر کے سامان رسد کا انتظام کئے بغیر نکلی تھی لیکن اسے کسی جگہ فراہمی رسد میں کوئی غیر معمولی دشواری نہیں ہوئی بلکہ لوگوں نے زخود برضا و رغبت اس کی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ لیا اور ہر جگہ رضا کاروں کے ذریعہ اس کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس جماعت کا نشانہ یہ تھا کہ سکھوں نے مسلمانوں کے فرائض مذہبی یعنی اذان، نماز، جماعت وغیرہ کی بجا آوری میں جو پابندیاں بہ جبر عاید کی ہیں ان کا خاتمہ کیا جائے۔ اس جماعت کو نظم و انتظام کی خرابی اور مقامی ریفقان کارکی غداروں اور دغا بازی کی وجہ سے کامیابی نہیں ہوئی۔ علماء اور درویشوں کے ذریعہ مسلمانوں میں آسانی سے جو وحدت پیدا کرائی جاسکتی ہے اس کی دوسری مثال سترہویں کے آخر کو بھی

سمجھنا چاہئے۔ بہر حال برطانوی ہندوستان میں محکوم رعایا کی حیثیت سے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کے شامل ہوجانے سے ہندوستان کے قومی اتحاد کا مسئلہ پیچیدہ ہو گیا ہے۔ لوگمانیہ ملک کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ہندوستانی قومیت کی جنگ دورِ خہ نہیں بلکہ سرِ خہ ہے جس میں فریق ایک طرف سے صرف انگریز اور دوسری طرف سے ہندوستانی نہیں ہیں بلکہ ایک طرف ہندو، دوسری طرف انگریز اور تیسری طرف مسلمان ہیں۔ مسٹر گوکھلے کے متعلق سنسر سر جوہی نائیڈو کے حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کی طرف سے کچھ زیادہ پُر امید نہ تھے کیونکہ انھوں نے خاتون موصوف سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ یہ اتحاد میری اور تنھاری زندگی میں تو ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس کے بعد جو واقعات رونما ہوئے اور برابر پھلتے جا رہے ہیں ان سے اس سلسلہ کی پیچیدگی برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ فقرہ پرست رہنما اپنے اوارس الگ الگ بنا کر اپنے مورچے مضبوط کر رہے ہیں اور اپنے فریقوں کو اکٹا اکٹا کر تشدد کی طرف زیادہ مائل کرتے جا رہے ہیں۔ اب اوصوری جنگ کرنے کا خیال لوگ ترک کر رہے ہیں اور آخر تک رطوکر ہمیشہ کے لئے فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن انگریزوں کی موجودگی میں یہ غالباً ممکن نہیں ہے کیونکہ ان کا مفاد بہ ظاہر اسی میں ہے کہ آپس کے جھگڑوں کو جہاں تک ہو سکے بڑھایا جائے تاکہ فائدہ چٹائی کی حالت میں کبھی ایک فریق کا اور کبھی دوسرے کا ساتھ دے کر دونوں کے زور کو کم کیا جائے اور اپنی جڑیں مضبوط کی جائیں۔ ابتدا سے وہ یہی کھیل کھیل رہے ہیں ورنہ ان کی قلیل تعداد ہندوستان کی کثیر آبادی پر کیسے حکومت کر سکتی تھی۔

مندرجہ بالا حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں نا اتفاقی اور عدم اتحاد کے عناصر درجہ توہی ہیں اور کسی متحدہ قومیت کا ارتقا کس قدر نامکن الحصول نظر آتا ہے۔ کانگریس کی یہ ایک بڑی کارگزاری ہے کہ ایک ایسے ملک میں جو احساس وطنیت سے بالکل معز تھا اس نے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک یکجا گنت پتہ اکر دی۔ کانگریس کے بانیوں نے ہندوستانی ذہن کو عہد قدیم کی تنگ نظریوں، عہد متوسط کے تعصب اور جاگیردارانہ نظام کی ہمہ گیری سے آزاد کرنے کا ہتھیار کیا تھا۔ اور ان کے پیروؤں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس کام کو جاری رکھا۔ اس میں شک نہیں کہ برطانوی حکومت کے قیام، ذرائع آمد و رفت اور وسائل خبر رسانی کی ترقی، امن و تعلیم کے رواج اور تجارت و جدید صنعت کے فروغ سے بھی اس کام میں

بہت امدادی بلکہ بعض انتہا پسند تو شاید یہ تک کہیں گے کہ کانگریس کا احیاء ماضی کی تحریکیں ان حسید
 قوتوں کے آزادانہ عمل میں مزاحم ہوئیں جس کی وجہ سے ملکی اتحاد اور ارتقاء تو میت کو صد مہینچا اور ترقی
 کی رفتار سست ہو گئی۔ لیکن جو لوگ مغربی آزاد تجارت کی تباہ کاریوں اور انتفاع ناجائز سے واقف
 ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ مغرب کے یہ عطیے کسی غیر منظم جماعت کے لئے کس درجہ نقصان رساں ثابت ہو سکتے
 ہیں اور وہ صحیح طور پر اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ کانگریس نے نفع ذاتی کی جگہ نفع قومی کے تخیل کو ابھار کر
 ہندوستان کی مدافعت کی طاقت کو کس قدر استوار کیا ہے۔ اس کا کام ابھی تک نامکمل ہے۔ رجعت کی
 قوتوں کو کانگریس نہیں بلکہ برطانوی شہنشاہیت ابھار رہی ہے اور قوتوں کا عمل اس قدر پیچ در پیچ
 ہے کہ بعض وقت جو کام تو میت کی ترقی کے لئے شروع کئے جاتے ہیں وہ فی الحقیقت مخالف کو نقصان
 پہنچانے کی جگہ فائدہ پہنچاتے ہیں۔ بہر حال سیاست کی ان پیچیدگیوں کے باوجود کانگریس کی خدمت
 بصورت مجموعی ہندوستان کے لئے مفید ثابت ہوئی ہے۔



نہیا کی فتنہ

برطانیہ اور اٹلی | جس کے معاملہ میں برطانیہ اور اٹلی کا جو اختلاف ظاہر ہوا ہے اس کے اسباب پر ذیل کو اقتباس سے روشنی پڑے گی جو ہم ایک مشہور جرمن اخبار نیوشٹرنوا سے ناخبرشٹن (MUECHNER NEUESTE NACHRICHTEN سے لیتے ہیں)

اٹلی میں متحدہ شاہی حکومت کے قیام سے برابر یہ سمجھا جاتا تھا کہ ملک کی پرامن اور خود مختار نشوونما کے لئے بہترین ضمانت انگلستان کی دوستی ہے۔ اٹلی والے حقیقت حال سے اچھی طرح واقف تھے۔ انیسویں صدی میں انگلستان بلا شرکت غیرے بحر روم پر حاوی تھا اور وہاں کوئی بات اس کی مرضی کے بغیر نہ ہو سکتی تھی جو صورت آج باقی نہیں ہے۔ انگلستان کی غرض بھی اس میں پوشیدہ تھی کہ اٹلی مضبوط ہو۔ انیسویں صدی میں بحر روم کی سیاست میں فرانس اور انگلستان کے تضادم کو نہ بھولنا چاہئے۔ فرانس برابر جانتا تھا کہ بحر روم اس کا ہو جائے اور انگلستان اسے اس منصوبہ میں برابر شکست دیتا تھا۔ اسی لئے وہ اٹلی کو رفتہ رفتہ بحر روم میں تقویت دیتا جاتا تھا تاکہ ایک ایسی طاقت پیدا ہو جائے جس کے اغراض فرانس کے خلاف ہوں اور چاہے بعد کو یہ اس کی جگہ لینا چاہے مگر اس وقت اپنی کمزوری کے باوجود فرانس کے خطرہ کو دفع کر سکے۔ اٹلی چونکہ فرانس کے مقابل میں کمزور تھا اس لئے انگلستان کو پورا بھروسہ تھا کہ یہ ہمارے ساتھ رہے گا۔ اٹلی اپنے جغرافیائی موقع اور اپنی معاشی ساخت کی وجہ سے مجبور تھا کہ انگلستان کا دم چھلا بنا رہے۔ بحر روم کا انگریزی بیڑا اس کے ساحلی شہروں کو تباہ کر کے اس کے جسم پر کاری زخم لگا سکتا تھا۔ اور اگر کہیں فرانس سے بھی اس کی اُن بن ہو تو اس کے ملک کی کال ناکہ بندی کر سکتا تھا جنگ عظیم کے بعد بھی پہلے تو دونوں ملکوں کے اس تعلق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ فاشستی حکومت نے ہر طرح انگلستان سے تعلقات استوار رکھے بلکہ انہیں اور بہتر بنانے کی کوشش کی، حالانکہ اپنے ابتدائی زمانہ میں یہ حکومت صاف صاف

فرانس کے خلاف رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ اٹلی نے مصر اور ایشیائے کوچک میں تمدنی اور معاشی نشر و تبلیغ کا ایک جال بچھایا۔ پھر مصر کے بغلطین میں لچبپی لینا شروع کی۔ یہاں کی ناشستی اٹلی نے اپنے سہم دوسرے فرامیض لئے، ایک تو ایشیائے کوچک کے محافظ کی حیثیت سے فرانس کی جگہ لینا چاہی دوسرے میجونی نخریک سے روابط بڑھائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی تدبیریں شروع کیں تاکہ ان کی مدد سے حبش کو زیر کرے۔ ایشیائے کوچک کی ان تین قوتوں سے کھیلنے کے لئے ضرورت تھی کہ حکمت عملی میں لوچ ہو، چنانچہ یہی لوچ اور تغیر پذیری ناشستی سیاست خارجہ کی امتیازی خصوصیت رہی ہے۔

اٹلی کی یہ کوششیں ایسی تھیں جیسے کوئی خشک زمین میں آئندہ بارش کی امید پر نمایاں کھوٹے لیکن اس کے علاوہ بھی اٹلی نے بحروم میں براہ راست قوت حاصل کرنے کی تدبیریں کیں۔ اس نے فاتح بننے کا حوصلہ کیا۔ اس کے لئے بس طرابلس اور ترکی میں میدان تھا۔ طرابلس جس پر پہلے برائے نام قبضہ تھا واقعی تفصیل کے ساتھ فتح کیا گیا، لیکن اناطولیہ میں قدم نہ جہانے کی تلافی اس کم قیمت علاقہ میں تسلط نہ ہو سکی۔ شراکت سیاسی کے نئے شریک کی حیثیت سے روم نے انگلستان سے چاہا کہ اپنی سلطنت کے کچھ کام اس کے سپرد کئے جائیں جس سے بعض علاقوں میں اس کا درخورد ہو جائے۔ فاتی اٹلی نے نہایت ذور اور اصرار سے انگلستان کو جتایا کہ یہ شراکت تاریخ نے مقرر کر دی ہے، اس کا وجود ہی انما لازم ہے، اور اٹلی صاف شرائط طے کرنے پر آمادہ ہے۔ لیکن انگلستان کئی سال تک سب سناتا رہا اور کوئی جواب نہ دیا۔ اٹلی کو لیبیا میں تسلط کے علاوہ اس سب قصہ سے جو حاصل ہوا وہ مصر کی دوستی۔ اٹلی نے مصری قومی تحریک سے اچھا تعلق پیدا کر لیا، اگرچہ صاف احتیاط کے ساتھ کہ انگلستان خفا نہ ہو جائے لیکن اٹلی اور انگلستان کے تعلقات میں کھلی ہوئی کشیدگی ۱۹۰۳ء میں رونما ہوئی جب اٹلی نے بحر احمر کے علاقہ میں اپنا سیاسی جال بیٹھانا شروع کیا مگر یزوں کا خیال ہے کہ یہاں اٹلی نے بین کوہن سعود کے مقابلہ میں ابعلا۔ عرب کے معاملات میں کسی کی مداخلت انگلستان کو ذرا نہیں بھائی۔ انگلستان ہرگز یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ ہندوستان سے آمدورفت کے راستے میں کوئی رکاوٹ

پیدا ہو۔ اٹلی نے سلطنت برطانیہ کے اس اصول اس سی کی خلاف ورزی کی تھی، لیکن مین کی شکست ہاش نے معاملہ کو طے کر دیا۔ البتہ اطالوی اور برطانوی اخبارات میں جو تو تو میں میں ہوئی تھی اس کی تلخی باقی رہی۔

اب اس مرتبہ اٹلی اور انگلستان کے تعلقات میں جو کشیدگی ظاہر ہوئی ہے وہ اس اعتبار سے بالکل نئی بات ہے کہ اٹلی والوں نے بالارادہ اسے پیدا کیا ہے۔ اب تک انگلستان سے دوستی فاشستی سیاست خارجہ کا ایک سکہ عقیدہ تھا۔ لیکن پچھلے دنوں اطالوی اخبارات نے برابر اس عقیدہ کی تحقیر کی ہے اور ہنسی اڑائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اٹلی کے ہوائی بیڑہ کی ترقی بالکل نئی صورت حال پیدا کر دی ہے اور اب اٹلی کو بحر روم میں برطانوی قوت کا سہارا درکار نہیں ہے۔ آج اگر اٹلی کو انگلستان سے مدد درکار ہے تو اتنی ہی انگلستان کو اٹلی سے مطلوب ہے۔ اٹلی کے ہوائی جہاز چاہیں تو مالٹا کو دو گھنٹہ کے اندر بالکل برباد کر دیں۔ آج سے پہلے اٹلی جو چیز ایک نئے کم مایہ شریک کار و بار کی حیثیت سے مانگتا تھا اسے آج وہ اپنا تاریخی حق جانتا ہے۔ بحر روم میں برطانوی تسلط ایک تاریخی یادگار ہے اور بس اس کو زیادہ نہیں۔ بحر روم۔ بحر لاطینی ہے جس میں فرانس اور اٹلی ایک دوسرے کے معاند ہیں۔

یہ اطالوی اخبارات کا خیال ہے۔ دیکھنا چاہئے کہ بحر روم میں قوتوں کا تناسب واقعی کیا ہے۔ کیا ہوائی بیڑہ کی ترقی نے واقعی اٹلی کا پلا بھاری کر دیا ہے ؟ ہمارا خیال ہے کہ نہیں۔ اور یہ کچھ بحری اور ہوائی جنگ کے نقطہ نظر سے نہیں مثلاً اس بات کو خیال سے نہیں کہ سویز پر یا قبرس پر یا مالٹا پر اطالوی حملہ کامیاب ہو گا یا نہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ اس تصادم سے دونوں قوتوں کا سخت نقصان ہے۔ یہ سچ ہے کہ مالٹا کو چند گھنٹوں میں زمین کے برابر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے یارمو، اور نیلز اور خود روم بھی راکھ کا ڈھیر ہو چکے ہونگے۔ یعنی خود اٹلی کا وجود معرض بحث میں آجائے گا اور انگلستان کے ہاتھ سے تو زیادہ سے زیادہ بحر روم میں اقتدار کے چند مسائل نکل سکیں گے۔ یہ سچ ہے کہ مالٹا کو اٹلی کے حملہ سے بچا یا نہیں جاسکتا۔ مگر مالٹا کو انگلستان اٹلی پر کم کے گولہ کی طرح پھینک سکتا ہے، بیٹیک گولہ پاش پاش ہو جائے گا مگر اپنا تباہی کا کام تو کر جائیگا۔ پھر انگلستان بحری راستہ پر جو اسکندریہ، سویز

اور فلسطین کے ساتھ ساتھ جاتا ہے ملے کر ان اور بھی شکل اس وجہ سے ہو گیا ہے کہ پچھلے چند سال میں انگلستان نے صرف سنگا پور میں نہایت تیزی سے بحری قلعہ بندی نہیں کی ہے بلکہ فلسطین کا بندرگاہ حیفہ بھی دیکھتے دیکھتے دنیا کا سب سے مضبوط جگہ مرکز بن گیا ہے۔

معاملات کا سیاسی پہلو اور بھی پیچیدہ ہے۔ جب اٹلی نے پہلے پہل بحرا احمر کے علاقہ میں ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے تو برطانوی وزارت بحر کے ایک رکن نے اسے 'سلطنت ہوا کی نالیوں میں سلطان' سے تعبیر کیا تھا۔ اور یہ بات ہے بھی بالکل ٹھیک۔ اس لئے اس علاقہ میں کسی ملک کو سرگرم عمل ہونا چاہیے اس کا رخ انگلستان کے خلاف نہ بھی ہو برطانیہ کے راستے میں جس پر اس کی زندگی کا درم مدار ہے جو در ان خطاط کا بیج بونا ہے۔ اور اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہے۔ خدا اگر بخش پر اٹلی کا حملہ کامیاب ہو جائے تو اٹلی مشرقی افریقہ میں ایک سلطنت قائم کرے گا جو قدرتی طور پر بحرا احمر کے دوسرے ساحل پر بھی پہنچنا چاہے گی۔ پھر دمشق کے اندر و فی حالات کا تقاضا یہ ہو گا کہ مصری قومی تحریک کی مدد کے علاوہ اور کچھ بھی اٹلی مسلمانوں کی حمایت کرے۔ اور اگر بالفرض یہ اسکانات واقعہ نہ بھی نہیں تب بھی برطانوی سلطنت کی ہوا کی نالی میں یہ ہر دم کی تحریک کیلئے کم مصیبت ہوگی۔ جو تصادم برسوں سے برطانوی ہوشیاری سے ٹالے جا رہے ہیں مثلاً جاپان سے تصادم یا عالم اسلام سے ٹکرائیں اٹلی کے اعمال ممکن ہے یہاں تک سامنے لاکھڑا کریں۔

انگلستان کو بحرہد میں ابھی تک حربی تفوق حاصل بھی ہو تب بھی اس علاقہ میں ایک ضدی اور تبصری ہوئی قوت کی کارفرمائی اسے ضرور بچین رکھے گی۔ پچھلے دس برس میں انگلستان نے مشرق سے مغرب تک تحفظ بحری کی چار لائنیں قائم کی ہیں۔ سب سے دور 'ہانگ کانگ' میں 'پھر مینگا پور' میں جس پر 'الینڈ' کی مدد سے قبضہ رکھا جائے گا، 'پھر عدن'، 'پھر حیفہ'، 'بندر جمہ' اور 'اسکندریہ'۔ یہ حفاظتی قلعہ بالکل برباد ہو جائے گا اگر سب سے قریب والی لائن اور اس کے بعد والی کے درمیان یا سب سے قریب والی لائن کے سامنے بھی کوئی قوت مسلط ہو جائے اور بلا تامل اپنی سیاست کے انچھڑ پھٹتی رہے۔

انہماستان دالیں نے اپنی روایتی دوزخی سے ان تمام باتوں کو دیکھ لیا تھا۔ اس لئے وہ جہیزیں نکلتے بناتے اور مالٹائیں اطالوی تمدن کے مقابلہ میں خود مالٹا کی زبان اور تمدن کی حمایت کرنے پر نہیں رک گئے۔ بلکہ ان کی نظر میں بحر احمر میں امن کے قیام کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جہش پر حملہ کو روکنے کے لئے انھوں نے اٹلی کو برطانوی نوآبادیوں میں سے کچھ علاقہ دینے تک پر آمادگی ظاہر کی۔ اٹلی نے اس کو یوں قبول نہ کیا کہ اس کے معنی یہی ہوئے کہ اٹلی کی توسیع کا مسئلہ پھر ٹل گیا۔ اٹلی سمجھتا ہے کہ اگر جہش کو سمندر تک پہنچنے کا راستہ مل گیا تو وہ اس سے اور قوت پکڑے گا اور اس وقت جس حملہ کو انگریز اپنی مداخلت سے رکوانا چاہتے ہیں وہ بعد کو اور بھی دشوار ہو جائے گا۔

یونان میں شاہی | جنگ عظیم نے کتنے تخت خالی کر دئے تھے۔ مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رد عمل شروع ہو گیا ہے۔ کہیں کہیں تو بادشاہوں کی جگہ ان سے بھی زیادہ مطلق العنان قاید حکمرانی کر رہے ہیں اور کہیں تخت کی زینت و زینت کے لئے بادشاہوں کی داپسی کے ڈھنگ ڈالے جا رہے ہیں۔ چنانچہ یونان نے اپنی آبادی تقریباً ۵۰ فیصدی اکثریت کی رائے سے اپنے پرانے بادشاہ جارج دوم کو مہر تخت پر متمکن کر دیا ہے۔

بظاہر تو یہ بات ہے کہ قوم اپنے پرانے بادشاہ سے راضی ہو گئی ہے۔ بادشاہ نے بھی تو آخر قوم کی خاطر اپنی رومانوی بیوی الزبتھ کو طلاق دیدی جس سے یونانی اور جویونانیوں سے سخت خفا تھی لیکن اس تغیر میں دول عظمیٰ کی سیاست کو بھی اچھا خاصا مدخل ہے۔ یعنی انگلستان کی سیاست کا تقاضا یہ ہے کہ بمقام کے ممالک میں اس کا اثر شاہی خاندانوں کی وساطت سے مضبوط ہو۔ اس لئے کہ آئندہ کبھی روس سے ٹکرا ہوئی تو اس کی بڑی ضرورت پڑے گی۔ جن ممالک میں درپردہ اشتراک کی تبلیغ نے روسی اثر کو بہت کچھ بڑھا دیا ہے وہاں برطانیہ کی یہ کوشش اور بھی شدت کے ساتھ جاری ہے۔ اور انھیں ممالک میں سے یونان بھی ہے۔ بغیر اڈاکا اور بارشاہی انگریزی اثر میں ہے ہی۔ رومانیہ سے تعلقات بہت اچھے نہ تھے مگر انھیں بھی درست کرنے کی کوشش جاری ہے۔ بلغاریہ کے بادشاہ کی شادی ایک اطالوی شہزادی سے ہوئی ہے اور اس سے خیال ہوتا ہے کہ بلغاریہ اٹلی کے موجودہ حریف برطانیہ کا ساتھ

مذہ سے گا۔ مگر کہتے ہیں کہ اطالوی شہزادی کا سیاسی اثر زیادہ نہیں ہے۔ اور بلغاریہ اور یوگوسلاویا میں تعلقات روز بروز زیادہ خوشگوار ہوتے جاتے ہیں اور اس سے غالباً انگریز بھی بلغاریہ میں کام لے سکیں گے۔ یونانی تخت پر انگلستان کو شاہ جارج دوم کی واپسی میں بھی چنداں اعتراض نہ تھا مگر خیر تو یہاں تک تھی کہ ملک منظم کے ذریعہ شہزادہ کنٹ کو یونان کے تخت پر پہنچانے کے منصوبے بھی بنائے گئے تھے۔ اور اس سلسلہ میں یونان کے سابق وزیر اعظم سدلاریس نے یوگوسلاویا کا سفر کر کے خود شہزادہ کنٹ اور دوسرے با اثر لوگوں سے گفتگو کر لی تھی۔ لیکن فرانس اور اٹلی جو رجحیت شاہی کے حامی تھے شاید انگلستان کے اثر کو اتنا قوی ہونے دینا نہ چاہتے ہوں۔ یا اور وجوہ ہوں کہ آخر کو قرہ شاہ جارج دوم کے نام ہی پڑا۔

بقاع میں انگلستان کی دلچسپی کا اصل سبب یہ ہے کہ اگر بلقانی حکومتوں سے دوستانہ تعلقات ہوں تو بحر روم میں انگریزی بیڑہ کو بڑی تقویت ہو جائے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ بحری اسلحہ نے جیل الطارق کے قلعوں کو بیڑہ کے لئے بہت کچھ بے کار بنا دیا ہے۔ اگر اطالوی ہوائی جہاز اس پر حملہ کر دیں تو شاید اس کا بچنا بھی دشوار ہو۔ اسی وجہ سے انگریز مالٹا کو مغرب طبنانے میں شب و روز لگے ہوئے ہیں۔ جزیرہ قبرس بہت دور ہے اور اس پر جو کچھ سرمایہ لگا ہے اسے برطانوی بحری قلعوں میں تقریباً ضائع شدہ خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن قبرس اور مالٹا کے درمیان متعدد چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں جن سے اب تک کوئی بحری کام نہیں لیا گیا ہے لہذا یہ سب یونان کے ہیں۔ اب کہ شاہی قایم ہو گئی ہے غالباً ان جزیروں کے لئے بات چیت جدو جہد شروع ہو گئی۔

غرض کچھ یونانیوں کی اپنی خواہش کہ سیاست کی تہلیل اور سکوں کا سامان کریں، کچھ برطانیہ کے مذکورہ بالا منصوبے، پھر فرانس اور اٹلی کا کسی خالص برطانوی شہزادے کے مقابلہ میں شاہ جارج دوم کو غنیمت سمجھنا، نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ جارج تخت یونان پر روقی افروز ہیں۔ ان کی تشریف آوری سے پہلے ہی یونان کے وزیر اعظم سدلاریس کو ان کے ایک رفیق وزیر جنگ جنرل کونڈامیس نے (شاید اس شہزادہ کنٹ کی حمایت کے شہ پر کیا کیا!) نکال باہر کیا تھا۔ اب شاہ جارج نے تخت نشین ہونے کے چند روز بعد

بی جنرل کو مذاہیں کو رخصت کر دیا ہے اور فی وزارت کے مشورہ سے حکومت فرما رہے ہیں۔

جنرل فلپائن کی آزادی | ہندوستانیوں کو یہ معلوم کر کے یقیناً تعجب ہو گا کہ کل ۶۴ برس ریاستہائے متحدہ امریکہ کے قبضہ میں رہنے کے بعد حکمران ملک ہی کے ایک قانون سے جنرل فلپائن کو آزادی حاصل ہونے والی ہے ! اور انگریز حکمرانوں اور اس ملک کی آزادی خواہ جماعت کے لئے فلپائن میں یہ امر کین سیاسی تجربہ بہت سنی آموز ثابت ہو سکتا ہے۔

آزادی کی کوشش تو اہل فلپائن کوئی بیس سال سے کر رہے تھے مگر ۱۹۰۱ء میں گزشتہ کو مملکت فلپائن کے پہلے منتخب شدہ صدر مانیل کیڑوں نے اپنے جلیل القدر عہدہ کے فرائض انجام دینے شروع کر دیے اور امریکہ اور مشرق بعید کے باہمی تعلقات میں ایک نئے باب کا آغاز ہو گیا۔ موجودہ قانون کی رو سے ریاستہائے متحدہ امریکہ فوراً اپنے اقتدار میں معتد بہ کمی کر دیگی اور دس سال میں ملک کا سیاہ و سفید ملک والوں کے ہاتھ میں لے کر بالکل علیحدہ ہو جائے گی۔

لیکن ہندوستانی آزادی خواہوں کے لئے اس تجربہ کا یہ سبق بھی قابل توجہ ہے کہ آزادی کا حاصل کر لینا ہی کافی نہیں، اسے باقی رکھنے اور ترقی دینے کے لئے قوم میں اخلاقی، معاشی اور فوجی قوت بھی ہونی چاہئے فلپائن میں ابھی نئے دستور سیاسی کو رائج ہوتے کوئی دو ہفتے ہی ہوئے ہوں گے اور یہ سوال خود اہل کے منکرین سیاسی کو ستانے لگا کہ دنیا کی موجودہ حالت میں اور خصوصاً جاپانی حلقہ اثر میں اس آزادی کو برقرار بھی رکھا جاسکے گا یا نہیں۔

مگر یہ واقعہ جب کسی طاقتور سے قائم ہوتا ہے تو طرح طرح کی گتھیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کے سلجھانے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ امریکہ سے تعلق نے فلپائن کی معاشی زندگی میں اسی قسم کی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ جب سے تعلق ہوا تجارت خارجہ کو ترقی ہوئی۔ ۱۹۰۱ء سے تجارت آزاد کا بلند شروع ہوا پہلے تو کچھ پابندیاں تھیں مگر ۱۹۰۱ء سے امریکہ اور فلپائن کی تجارت میں کسی قسم کی رکاوٹ محال درآمد و

برآمدگی زری۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۲ء تک ۲۰ برس میں فلپائن کی تجارت خارجہ تقریباً چوٹی ہو گئی۔ یہ عجیب بات تھی، مگر فلپائن والے امریکی منڈی کے دست نگر بھی ہو گئے۔ یعنی پہلے ۱۹۱۷ء میں فلپائن سے جو مال باہر جاتا تھا اس کا کل ۱۲ فیصدی امریکیں کھیلتا تھا، ۱۹۲۲ء میں ۷۰ فیصدی مال وہاں جانے لگا اور جو مال باہر سے فلپائن آتا تھا اس میں بقدر ۵۵ فیصدی ریاستہائے متحدہ امریکہ کا حصہ ہو گیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ تجارت خارجہ چند زرعی اجناس تک محدود ہے۔ ایک شکر کی کا حصہ فلپائن سے باہر جانے والے مال میں ۶۰ فیصدی ہے۔ اور یہ سب کی سب امریکہ جاتی ہے، شکر، ناریل، تبا کو اور سنی کو کچی کر لیجے تو فلپائن کی برآمد کا ۹۰ فیصدی ہو جاتا ہے۔ اور ہر امریکہ کے سوتی کپڑے کے لئے فلپائن کی منڈی سب سے بڑی ہے اور ایشیائی منڈیوں میں امریکی گوشت، لوبہ اور فولاد کی بھی بہترین منڈی ہے۔ غرض جب سیاست فلپائن کو امریکہ سے علیحدہ خود مختار ریاست بنانے کے درپے ہے تو معیشت ان جزائر کو امریکہ کا ایک جزو بنانے کی فکر میں ہے۔ اور سیاست کی اس جیت میں بھی بعض امریکی معاشی حلقوں کا اثر کارفرما ہے۔ اگر امریکی فلپائن کی شکر اور ناریل کے تیل کی درآمد بند کرنے کی کوئی تدبیر ہو سکتی تو امریکہ کے زرعی حلقے اس خود مختاری کے لئے حامی نہ ہوتے۔ امریکیں فلپائن کی آزادی کی حمایت سیاسی تدبیر کی رہیں منت نہیں بلکہ معاشی اغراض کی پابند ہے۔ چنانچہ اس جدید قانون آزادی کے دفعات سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے، اس قانون کی رو سے فلپائن کی منڈی تو کمال آزادی سے دس سال پہلے کے زمانہ میں امریکی مال کے لئے بالکل کھلی رہے گی مگر امریکی منڈی میں فلپائن کے روٹی، شکر اور کھوپرے کے تیل کی مقررہ مقادیر ہی جا سکیں گی۔ اور اس مدت کے آخری ۵ سال میں خود فلپائن کی حکومت بھی خود اپنے مال کی درآمد پر حاصل لگائے گی۔ غرض جب فلپائن کا تعلق امریکہ سے بالکل قطع ہو جائے گا۔ تو کھوپرے کے تیل، کمی صنعت اور سگار سازی کی صنعت کیسے ترسہ ہو جائے گی لیکن چونکہ کھوپرے اور تبا کوئی مانگ دنیا میں ہے اس لئے صنعت کی تباہی کے ساتھ ان صنعتوں کی زرعی اسس باقی رہ سکے گی۔ مگر شکر کا مال بہت ہی خراب ہوگا۔ شکر کی صنعت کے اہلکار اگر امریکہ کی منڈی نکل گئی تو یہ اپنے کثیر مصارف پیدائش کی وجہ سے کو با اور جاوے دنیا کی منڈیوں میں مقابلہ نہ کر سکے گی اور اس کی تباہی کے معنی ہیں ۲۰ لاکھ اہل فلپائن کا روٹیوں کو محتاج ہو جانا اور حکومت کی آمدنی کے ۶۰ فیصدی

خطرہ میں پڑ جاتا۔ اس کی تباہی کے معنی ہیں غیاث کے تمام ساہوکارہ کا درہم دبرہم ہو جانا کہ دس سب سے بڑے بنکوں کے قرضوں میں کوئی نصف کے قریب اس شکر کی حمايت پر دے جاتے ہیں 'سرکاری بنک کے کوئی سوا دو کروڑ ڈالر کے قرضہ میں سے تین چوتھائی شکر پر ہی دیا جاتا ہے۔ سرکاری ریل کی آمدنی کا کوئی نہ فیصد شکر کی صنعت ہی سے ممول ہوتا ہے۔ اس صنعت کی تباہی سے سارا نظام معیشت منہدم ہو جائے گا۔ اور ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے خود آزادی کا تجربہ ناکام ہو جائے۔

یہ سائل غلپان کے اہل سیاست کو پریشان کر رہے ہیں اور ان کو امید ہے کہ ملک میں زرعی فصلوں کا تنوع بڑھ کر اور صنعتوں کو فروغ ملے گا اور اپنی ضرورتیں آپ پوری کر کے پروس پر اتنا سہارا لینے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ لیکن زرعی تنوع پیدا کرنے میں بہت دیر لگتی ہے اور صنعت کے قیام کے لئے سرمایہ کار ہوتا ہے اور اس کی ان جزائر میں کچھ لکھی جاتا ہے نہیں۔ ڈر ہے کہ سیاسی تبدیلی کے باعث پروس سرمایہ کچھ عرصہ تک اُدھر کارخ نہ کرے گا۔ اور اس لئے صنعتی ترقی کی رفتار کچھ زیادہ تیز نہ ہوگی۔

ان معاشی دشواریوں کے ساتھ مشرق بعید اس علاقہ میں سیاسی پیچیدگیاں بھی کچھ کم نہیں ہیں اور حفاظت ملی کا مسئلہ اس وجہ سے اور بھی اہم ہو گیا ہے، خیال ہے کہ جزائر غلپان جمعیتہ اقوام کی کنیت حاصل کر کے دوسروں کے غالبانہ حملوں سے اپنے کو محفوظ کر سکیں گے لیکن اس علاقہ کی جمعیت کے ایک رکن چین کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے وہ بہت امید افزا نہیں ہے۔ نہ اس کے زیادہ اسکانات ہیں کہ کوئی بڑی مغربی قوت ان جزائر سے جارحانہ اور مداخلتہ معاہدہ کرے۔ اس لئے کہ اس معاہدہ سے اس قوت کو چنداں فائدہ نہ پہنچے گا اور جاپان کو رقابت خواہ مخواہ کو پید ا ہو جائے گی۔ ایک صورت یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ تمام دول مل کر اس علاقہ کی غیر جانبداری کی ضامن بن جائیں۔ لیکن اس میں بھی جاپان عامل ہو گا جو اس علاقہ کے معاملات میں کسی دوسری قوت کی غفلت کو روک رکھنے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔ اور یقیناً جاپان کی نظر ان جزائر پر ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ یہاں اپنا اقتدار قائم کر سکے تو ایشیا کے مشرقی ساحل کے تمام جزیروں پر اس کا قابو ہو جائے گا۔ اور مشرق الہند میں اسے سیاسی اور تجارتی نفوذ کے لئے بڑا سہارا مل جائے گا۔ یعنی مشرق بعید میں جاپان کے اقتدار میں اور کوئی سامی نہ رہے گا۔

غلامی کی مصیبت سے نکلنے کے بعد آزادی کے خطرات بھی کچھ کم فکر میں ڈالنے والے نہیں ہوتے۔ مگر جوان سے وہ چار نہ ہو وہ انہیں حل کیسے کرے۔ امید رکھنی چاہئے کہ فلپائن والے ان دشواریوں کا کوئی حل نکال سکیں گے چاہے اس میں اپنے نظام معیشت کو بدلنے کی ضرورت ہی کیوں نہ پڑے لہٰذا دس سال کے زمانہ امیدواری کے گزرنے پر ان دقتوں سے بچنے کے لئے پھر امریکہ کا اقتدار قائم کرانے میں مدد ہونگے۔ آزادی کی گچی طلب کا یہی امتحان ہے، کہ قوم آزادی کے نقصان کو غلامی کے نفع پر ترجیح دینے کے لئے آمادہ ہو۔



